شرح بانگ درا

مؤلفہ

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

عشرت پبلشنگ ہاؤس
ہسپتال روڈ، انار کلی، لاہور

قیمت چھ روپے

بار اوّل ۱۰۰۰ جلد

شرح بانگ درا

مؤلفہ

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

عشرت پبلشنگ ہاؤس
ہسپتال روڈ، انارکلی، لاہور

بار اوّل ....؍جلد　　　قیمت چھ روپے

انتساب

میں اس کتاب کو عزت مآب عالی جناب
ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب قریشی
وزیر مملکت پاکستان کے نام معنون کرنے
کی عزت حاصل کرتا ہوں ۔

نیاز کیش
سلیم چشتی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

بانگ درا، علامہ اقبال مرحوم کی سب سے زیادہ مشہور کتاب بلکہ انکی شہرت کا سنگِ بنیاد ہے حقیقت یہ ہے کہ عوام میں اسی کی بدولت انہیں لازوال شہرت حاصل ہوئی جس میں دوسری کتابوں کی وجہ سے اضافہ ہوتا رہا - اقبال کی غزلوں اور نظموں کا یہ دلکش مجموعہ ۱۹۲۴ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوا تھا - اُس وقت سے لیکر اس وقت تک یہ کتاب تیرہ ۱۳ مرتبہ طبع ہو چکی ہے اور اسکے اٹھتر ۷۸ ہزار نسخے شائع ہو چکے ہیں -

اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی ۱۹۱۴ء اور ۱۹۱۵ء میں اور پیام مشرق ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی - لیکن یہ تینوں کتابیں فارسی میں ہیں اور بہت مشکل ہیں - اسلئے جب ۱۹۲۴ء میں بانگ درا شائع ہوئی تو لوگوں نے اسکو ہاتھوں ہاتھ لیا - اور اسکی بدولت اقبال کا نام ہندستان کے طول و عرض میں مشہور ہو گیا -

اس کتاب کی مقبولیت یا ہر دلعزیزی کی وجوہ حسبِ ذیل ہیں :-

(۱) یہ کتاب اُردو زبان میں ہے اور دوسری کتابوں کے مقابلہ میں آسان ہے - (اگرچہ بجائے خود کافی مشکل ہے) -

(۲) اس میں وہ غزلیں اور نظمیں شامل ہیں جو برسوں پہلے سارے ملک میں مشہور ہو چکی تھیں، اور بعض غزلیں تو لاہور سے حیدرآباد (دکن) تک لوگوں کی زبان پر چڑھ چکی تھیں مثلاً ع کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں -

(۳) اس میں وہ غزلیں اور نظمیں بھی ہیں جن سے وطن دوستی (نیشنلزم) کا رنگ ٹپکتا ہے مثلاً ع سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا ، اسلئے مسلمانوں کے علاوہ ہندو بھی ان کو بڑے شوق سے پڑھتے تھے -

(۴) اس میں وہ نظمیں بھی شامل ہیں جو علامہ نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسوں میں پڑھی تھیں اور اُن کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہو چکی تھی -

(۵) اس میں وہ غزلیں بھی شامل ہیں جو داغ اور امیر کے رنگ میں لکھی گئی ہیں - اور اس صدی کے آغاز میں یہ رنگ، قبول عام کی سند حاصل کر چکا تھا -

(۶) اس میں وہ نظمیں بھی شامل ہیں جن میں مرحوم نے غیر مذاہب کے بزرگوں، مثلاً گرو نانک ، شری رام چندر ، اور سوامی رام تیرتھ ، کی مدح کی ہے -

(۷) اس میں وہ غزلیں اور نظمیں بھی شامل ہیں جو بانگ درا کی اشاعت سے برسوں پہلے ہندستان کے مختلف رسائل میں شائع ہو کر عوام اور خواص دونوں میں مقبول ہو چکی تھیں - مثلاً اس کتاب کی پہلی نظم "ہمالہ" ۱۹۰۱ء میں مخزن میں شائع ہوئی تھی -

بانگ درا میں اقبال نے اپنی بعض غزلیں اور نظمیں شامل نہیں کی ہیں - اور بعض غزلیں اور نظمیں ایسی ہیں، جن میں سے بعض اشعار خارج کر دیئے گئے ہیں - مثلاً نظم موسومہ نالۂ یتیم جو انہوں نے ۱۸۹۹ء میں انجمن حمایت اسلام کے جلسہ میں پڑھی تھی ، اور ابر گہر بار ، جو فریاد امت کے نام سے الگ شائع ہوئی تھی ، اس مجموعہ میں شامل نہیں ہیں ، یا مثلاً یہ غزل بھی بانگ درا میں نہیں ہے -

طور پہ تو نے جو اے دیدۂ موسیٰ دیکھا　　وہی کچھ قیس نے دیکھا پسِ محمل ہو کر
میری ہستی ہی جو تھی، میری نظر کا پردہ　　اُٹھ گیا بزم سے میں پردۂ محفل ہو کر
عین ہستی ہوا ، ہستی کا فنا ہو جانا　　حق دکھایا مجھے اس نقطے نے باطل ہو کر
خلق معقول ہے ، محسوس ہے خالق اے دل　　دیکھ نادان ذرا آپ سے غافل ہو کر

نظم نیا شوالہ ، اور عقل و دل میں سے بعض اشعار حذف کر دیئے گئے ہیں -

بعض اشعار غزلوں میں سے اسلئے حذف کر دیئے گئے کہ انہیں اقبالؔ کو زبان کی خامیاں نظر آئیں۔

بانگ درا تین حصّوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصّہ میں وہ نظمیں اور غزلیں شامل ہیں جو اُنہوں نے ابتدائے شاعری سے ۱۹۰۵ء تک لکھیں۔ اس دور کی خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

(۱) سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اُس زمانہ میں اُن پر وطن پروری (نیشنلزم) کا جذبہ غالب تھا۔ چنانچہ "ہمالہ" "صدائے درد" "تصویر درد" "آفتاب" "ترانہ ہندی" اور "نیا شوالہ" اسکی بہترین مثالیں ہیں۔ وطن پروری پر "تصویر درد" سے بہتر کوئی نظم اُردو میں نہیں لکھی گئی۔

(۲) اس دور کی غزلوں میں داغؔ اور امیرؔ کا رنگ بہت نمایاں ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ انکی شاعری کی ابتدا غزلوں ہی سے ہوئی تھی۔ اور اس سلسلہ میں اُنہوں نے داغؔ سے اصلاح بھی لی تھی، چنانچہ خود کہتے ہیں :-

نسیم و تشنہ ہی اقبالؔ کچھ اس پر نہیں نازاں
مجھے بھی فخر ہے شاگردیٔ داغِ سخنداں کا

(۳) بعض نظموں میں انہوں نے مشہور مغربی شعرا، مثلاً: ایمرسن، کاؤپر، لانگ فیلو اور ٹینی سن کے خیالات کو اُردو نظم کا جامہ پہنایا ہے۔ مثلاً "رخصت اے بزم جہاں" ایمرسن سے، "ہمدردی" کاؤپر سے، "پیام صبح" لانگ فیلو سے اور "عشق اور موت" ٹینی سن سے ماخوذ ہے۔

(۴) بعض نظموں میں تصویر کشی اور منظر نگاری کے بہت عمدہ نمونے پائے جاتے ہیں۔ مثلاً ہمالہ۔ گل رنگیں، ابر کہسار، آفتاب صبح، چاند اور صبح کا ستارہ وغیرہ۔

(۵) بعض نظموں میں بہت عمیق اور سنجیدہ خیالات پائے جاتے ہیں۔ مثلاً شمع اور انسان اور بزم قدرت،

(۶) بعض نظمیں بچوں کے لئے لکھی ہیں۔ مثلاً ایک مکڑا اور مکھی، ایک پہاڑ اور گلہری، ایک گائے اور بکری، بچے کی دعا، ماں کا خواب، پرندے کی فریاد، ہندستانی بچوں کا قومی گیت، اور "ہمدردی" وغیرہ، ان نظموں کی زبان بہت آسان ہے۔ فارسی تراکیب یا مشکل الفاظ کہیں استعمال نہیں کئے لیکن یہ سب نظمیں بہت سبق آموز ہیں جن سے بڑی عمر کے لوگ بھی مستفید ہو سکتے ہیں۔

(۷) ابتدائی کلام کا مطالعہ کرنے سے یہ بات بھی واضح ہو سکتی ہے کہ اس زمانہ میں اقبالؔ پر مناظر فطرت کے مطالعہ کا شوق بہت غالب تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ابر رنگیں، ابر کوہسار، آفتاب، ماہ نو، چاند، ابر، صبح، اختر صبح، پیام صبح، جگنو اور شمع پر نظمیں لکھیں۔ اس قسم کی کوئی نظم ضرب کلیم میں نظر نہیں آتی۔

(۸) ابتدائی دور کی نظموں میں، تلاش، تحقیق اور تجسّس کا رنگ بہت نمایاں ہے چنانچہ گل رنگیں' میں لکھتے ہیں :-

مُطمئن ہے تو، پریشاں مثلِ بُو رہتا ہوں میں
زخمیٔ شمشیرِ ذوقِ جستجو رہتا ہوں میں

آفتاب صبح میں، آفتاب سے یوں خطاب کیا ہے۔

دردِ استفہام سے واقف ترا پہلو نہیں
جستجوئے رازِ قدرت کا شناسا تو نہیں

ان نظموں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں اقبالؔ حقیقت کی جستجو میں منہمک تھے۔

(۹) اس زمانہ میں اقبالؔ اُس اختلاف سے بہت آزردہ خاطر تھے جو ہندو مسلمانوں میں بتدریج ترقی پذیر تھا، چنانچہ اس آزردگی کا اظہار اُنہوں نے صدائے درد میں کیا ہے، جسکے دو شعر ذیل میں درج کرتا ہوں :-

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے   ہاں ڈبو دے اے محیطِ آبِ گنگا تو مجھے

سرزمیں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے
وصل کیسا؟ یاں تو اک قرب فراق آمیز ہے

(۱۰) جو نظمیں اُنہوں نے وطن پروری کے جذبہ سے متاثر ہو کر لکھی ہیں، ان میں فارسی کے بجائے ہندی الفاظ استعمال کئے ہیں۔ مثلاً نئے شوالہ کا یہ شعر:-

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

بالکل ہندی زبان میں ہے:-

(۱۱) اس دور کی بعض نظمیں ایسی بھی ہیں جن میں فلسفیانہ خیالات پائے جاتے ہیں یعنی ان میں اُنہوں نے کائنات کے اہم مسائل مثلاً حیات، مآخذ حیات، مقصدِ حیات، انجام حیات، حیات بعد الموت، شعور ذات، خودی، عشق اور حُسن، کی ماہیت سے بحث کی ہے۔ ان نظموں میں، ہمیں انکی آئندہ فلسفیانہ شاعری کے ابتدائی نقوش صاف نظر آ سکتے ہیں۔ یہ رنگ خاص طور سے گل رنگیں، خفتگانِ خاک سے استفسار، شمع، ماہ نو، انسان اور بزم قدرت، بچہ اور شمع، جگنو اور دل میں نظر آتا ہے۔

(۱۲) یورپ جاتے وقت حضرت محبوب الٰہیؒ کے مزار مبارک پر حاضر ہو کر، جن خیالات اور جذبات کا اُنہوں نے اظہار کیا ہے، انکے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو شروع ہی سے بزرگان دین کے ساتھ دلی عقیدت تھی۔ اور میری رائے میں یہ لازمی نتیجہ ہے جذبۂ عشق رسولؐ کا جو اقبالؔ کی رگ و پے میں سمایا ہوا تھا۔

(۱۳) ابتدائی دور میں اُنہوں نے اکبر الہ آبادی مرحوم کے رنگ میں بھی نظمیں لکھی تھیں جو بانگ درا کے آخر میں ظریفانہ کے عنوان سے شامل ہیں۔ لیکن جسطرح غالبؔ نے کچھ عرصہ کے بعد طرز بیدلؔ میں ریختہ لکھنے کے خیال کو ترک کر دیا، اسی طرح اقبالؔ نے بھی کچھ سوچ سمجھ کر آئندہ اس رنگ میں لکھنا چھوڑ دیا، سچ کہا ہے کسی نے۔

ع ہر کسے را بہر کارے ساختند

بانگ درا کے دوسرے حصّے میں وہ نظمیں اور غزلیں شامل ہیں جو اُنہوں نے قیام یورپ (۱۹۰۵ء تا ۱۹۰۸ء) کے دوران میں لکھیں۔ انکی تعداد نسبتاً کم ہے اور اسکی وجہ یہ ہے کہ یورپ جاکر انکے خیالات میں ایسا انقلاب آیا کہ وہ شاعری ہی سے دل برداشتہ ہو گئے تھے۔ لیکن بعض دوستوں اور بزرگوں کے سمجھانے سے اُنہوں نے اپنی رائے میں تبدیلی پیدا کر لی اور دوبارہ شعر گوئی شروع کر دی۔

زمانہ قیام یورپ میں انکی شاعری میں ایک خوش آئند، مگر عظیم الشان انقلاب پیدا ہو گیا، جسکی تفصیل یہ ہے کہ وہاں اُنہوں نے مغربی تہذیب و سیاست کو بہت نزدیک سے دیکھا، جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ان دونوں چیزوں کے مفاسد ان پر بخوبی آشکار ہو گئے۔ بالفاظ دگر ان پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی۔ کہ نظریۂ قومیت و وطنیت، بنی آدم کے حق میں کبھی مفید نہیں ہو سکتا، کیونکہ اسکی بنیاد تعصب اور تنگ نظری پر ہے۔ دوسری بات یہ کہ مغربی تہذیب، کا نتیجہ انسانوں کے حق میں تباہی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ کیونکہ اسکی بنیاد مادیت اور انکار خدا پر ہے۔

علاوہ بریں اس عرصہ میں اُنہوں نے اسلامی اُصول اور اسلامی تاریخ کا بہت غور کے ساتھ مطالعہ کیا۔ اسلئے وہ اس نتیجہ پر پہونچے کہ دنیا کی نجات، اسلامی اصول زندگی کی تبلیغ و اشاعت ہی میں مضمر ہے۔ اسی زمانہ میں انکو اس حقیقت کا علم ہوا کہ وہ فارسی زبان میں بھی بڑی آسانی کے ساتھ شعر کہہ سکتے ہیں۔ اسلئے اُنہوں نے فیصلہ کیا کہ آئندہ اپنے خیالات، اسی زبان میں پیش کریں جو ہندستان سے باہر دوسرے ملکوں مثلاً افغانستان، ترکستان، ایران اور عراق میں بھی سمجھی جاتی ہے۔

جب اُنہوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ آئندہ، اپنی شاعری کو اسلامی اُصولوں کی تبلیغ کے لئے وقف کر دینگے، تو قدرتی طور پر ان کی شاعری میں "پیغام" کا رنگ پیدا ہو گیا۔ جو ۱۹۰۸ء سے لیکر ۱۹۳۸ء تک ہر تصنیف اور ہر نظم میں نظر آتا ہے۔ چنانچہ اس شعر میں اسی انقلاب کی طرف اشارہ ہے۔

یہ ہند کے فرقہ ساز اقبالؔ آذری کر رہے ہیں گویا
بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبارِ راہِ حجاز ہو جا

اب ہم اس دور کی بعض خصوصیات درج کرتے ہیں۔

(۱) سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اضطراب، جستجو، اور تذبذب کا رنگ زائل ہو گیا۔ اور اسکے بجائے انکی شاعری میں یقین اور پیغام کا رنگ پیدا ہو گیا۔ چنانچہ ۱۹۰۷ء میں اُنہوں نے یورپ سے جو نظم علی گڑھ کالج کے طلبہ کے نام لکھ کر بھیجی تھی، وہ دراصل انکا پہلا پیغام ہے، جو اُنہوں نے اپنی قوم کی وساطت سے دنیا کو دیا۔ اور غور سے دیکھا جائے تو اُنہوں نے اپنی زندگی کے باقی ماندہ تیس سال اسی پیغام کی وضاحت میں صرف کر دیئے۔

(۲) اس دور کی شاعری میں، وطن پرستی کا رنگ کہیں نظر نہیں آتا، جسکی وجہ میں اوپر لکھ چکا ہوں، اسکے بجائے اُنہوں نے اسلامی اصولوں کی تبلیغ و اشاعت کے لئے اپنی شاعری بلکہ زندگی وقف کر دینے کا اعلان کر دیا۔ چنانچہ ۱۹۰۷ء میں اُنہوں نے ایک نظم لکھی تھی جس میں وہ کہتے ہیں ؎

میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری، نفس میرا شعلہ بار ہو گا

دنیا جانتی ہے، اقبالؔ نے اس شعر میں، جو کہا تھا وہ کر دکھایا۔ پاکستان کا وجود اسی مردِ خود آگاہ کے تخیل کی خارجی تعبیر ہے۔

(۳) اس دور کے کلام کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو سکتی ہے کہ اب اقبالؔ دنیا کی نجات، اسلامی اُصولوں کی اشاعت میں منحصر سمجھنے لگے تھے۔ اسی لئے اُنہوں نے اپنی قوم کے اندر جوش اور ولولہ پیدا کرنے والی نظمیں لکھیں، اور مسلمانوں کو ان کے شاندار ماضی سے آگاہ کیا۔ نظم صقلیہ اسی مقصد کے لئے لکھی گئی تھی۔ اس نظم کا یہ شعر جس میں وہ اس جزیرے سے خطاب کرتے ہیں، اقبالؔ کے جذباتِ قلبی کا مرقع ہے ؎

درد اپنا مجھ سے کہہ، میں بھی سراپا درد ہوں
جسکی تو منزل تھا میں اُس کارواں کی گرد ہوں

جب ہندوؤں نے اقبالؔ کی شاعری میں یہ انقلاب دیکھا، تو اُنہیں قدرتی طور پر بہت شکایت پیدا ہوئی۔ کیونکہ وہ کب پسند کر سکتے تھے کہ کوئی شخص نخچیروں کو صیاد کے ارادوں سے آگاہ کرے۔ اس غصّہ کا اندازہ اُن کے ایک ہموطن (کشمیری پنڈت) کی نظم سے ہو سکتا جسکے دو شعر ذیل میں درج کرتا ہوں۔

ہندی ہونے پہ ناز جسے کل تک تھا، حجازی بن بیٹھا
اپنی محفل کا رند پرانا، آج نمازی بن بیٹھا

محمل میں چھپا ہے قیسِ حزیں، دیوانہ کوئی صحرا میں نہیں
پیغامِ جنوں جو لایا تھا، اقبالؔ وہ اب دنیا میں نہیں

ان شعروں کے مطالعہ سے ثابت ہے کہ ہندو کی نظر میں اس سے بڑا کوئی جرم نہیں کہ مسلمان حجازی یا نمازی بن جائے۔

(۴) قیامِ یورپ کی بدولت اقبالؔ کو اس حقیقت سے آگاہی ہو گئی تھی، کہ مغربی تہذیب چونکہ انکارِ خدا پر مبنی ہے اسلئے اسکی بربادی یقینی ہے۔ چنانچہ اُنہوں نے اسی زمانہ میں یہ پیشگوئی کر دی تھی:—

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہو گا

(۵) اس زمانہ کی غزلوں میں کہیں کہیں نعتِ رسولؐ کا رنگ بھی نظر آتا ہے۔ ایک طویل غزل کے دو شعر ذیل میں درج کرتا ہوں۔

سراپا حسن بن جاتا ہے جسکے حسن کا عاشق — بھلا اے دل حسیں ایسا بھی ہے کوئی حسینوں میں
پھڑک اُٹھا کوئی تیری ادائے "ما عرفنا" پر — ترا رتبہ رہا بڑھ چڑھ کے سب ناز آفرینوں میں

(۶) اس دور کی نظموں میں بعض اشعار ایسے پائے جاتے ہیں جن سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ اقبالؔ نے عشق و محبت کو اپنا مسلکِ زندگی قرار دیدیا تھا، دو شعر لکھتا ہوں۔

عشق نے کر دیا تجھے ذوقِ تپش سے آشنا — بزم کو مثلِ شمعِ بزم، حاصلِ سوز و ساز دے
تارے میں وہ قمر میں وہ جلوہ گہِ سحر میں وہ — چشمِ نظارہ میں نہ تو سرمۂ امتیاز دے

(۷) ابتدائی دور میں جیسا کہ میں واضح کر چکا ہوں، اقبالؔ شہیدِ جستجو نظر آتے ہیں لیکن یورپ جا کر انہیں گوہرِ مقصود ہاتھ آگیا، چنانچہ لکھتے ہیں:—

جستجو جس گل کی تڑپاتی تھی اے بلبل مجھے
خوبیٔ قسمت سے آخر مل گیا وہ گل مجھے

اقبالؔ کے آئندہ کلام کے مطالعہ سے واضح ہو سکتا ہے کہ "وہ گل" قرآن حکیم کا پیغام ہے۔ جسکی اشاعت وہ آخر وقت تک کرتے رہے۔

(۸) اس دور میں یہ حقیقت ان پر منکشف ہو گئی تھی کہ زندگی سراسر حرکت، عمل، اور جد و جہد کا نام ہے، چنانچہ چاند ستاروں سے کہتا ہے ؎

جنبش سے ہے زندگی جہاں کی
یہ رسم قدیم ہے یہاں کی

ابتدائی دور میں وہ "رازِ حیات" کے جویا نظر آتے ہیں لیکن اس دوسرے دور

میں وہ اسکی حقیقت کو ان لفظوں میں بیان کرتے ہیں۔

رازِ حیات پوچھ لے خضرِ خجستہ گام سے
زندہ ہر ایک چیز ہے کوششِ ناتمام سے

(۹) اس دور میں اقبالؔ نے، ہندی وطنیت کو خیرباد کہکر، اسکے بجائے اسلامی تعلیم کی تبلیغ شروع کر دی۔ یعنی مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد وطن نہیں بلکہ مذہب ہے۔

نرالا سارے جہاں سے اسکو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

(۱۰) یورپ میں قیام کی بدولت جو عظیم الشان انقلاب، اقبالؔ کی زندگی میں آیا اُسکا نقشہ اُنہوں نے اس نظم میں کھینچا ہے جو اپنے دوست سر عبد القادر مرحوم کے نام لکھی ہے۔ یہ نظم اس لحاظ سے بہت قیمتی ہے کہ اس سے ہمیں یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ اب اقبالؔ نے اپنے لئے ایک نصب العین متعین کر لیا تھا، یعنی خدمتِ اسلام۔

اگر کوئی شخص اس نظم کو غور سے پڑھے تو اسے اقبالؔ کی آئندہ شاعری کے تمام نقوش بلکہ بنیادی تصورات اس میں نظر آ سکتے ہیں۔ مثلاً

رختِ جاں بتکدۂ چیں سے اُٹھا لیں اپنا — سب کو محوِ رخِ سعدیٰ و سلیمیٰ کر دیں
دیکھ یثرب میں ہوا ناقۂ لیلیٰ بیکار — قیس کو آرزوئے نو سے شناسا کر دیں

شمع کی طرح جئیں بزم گہِ عالم میں
خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

بانگِ درا کے تیسرے حصّہ میں وہ نظمیں اور غزلیں شامل ہیں جو اُنہوں نے ولایت سے واپسی کے بعد، ۱۹۰۹ء سے ۱۹۲۳ء تک لکھیں۔ اس دور کی خصوصیات حسبِ ذیل ہیں۔

(۱) زبان زیادہ صاف اور سلیس ہو گئی ہے، زاویۂ نگاہ آفاقی ہو گیا ہے اور کلام میں

سوز و گداز اور محاسن شعری کے ساتھ ساتھ فلسفیانہ غور و فکر کا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔

(۲) اُردو پر فارسی کا اثر غالب ہو گیا ہے جسکی وجہ یہ ہے کہ ۱۹۱۲ء اور ۱۹۱۵ء میں اُنہوں نے اپنی غیر فانی مثنویاں اسرارِ خودی، اور رموزِ بیخودی، اور ۱۹۲۳ء میں پیامِ مشرق، یہ تینوں کتابیں فارسی ہی میں لکھی ہیں۔ فارسی زبان سے جو وابستگی اُن کو ہو گئی تھی اسکا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ اُنہوں نے طلوعِ اسلام کا آخری بند بالکل فارسی میں لکھا ہے۔ اور شمع و شاعر کا پہلا بند بھی اسی شیریں زبان میں قلمبند کیا ہے۔

(۳) زبان کے ساتھ ساتھ خیالات میں بھی انقلابِ عظیم رونما ہو گیا۔ چنانچہ تیسرے دور میں نہ تو کوئی نظم انگریزی شعرا کے کلام سے ماخوذ ہے نہ کوئی نظم کرٹی یا گائے پر ہے۔ نہ کسی نظم میں بادل چاند دریا یا ستارہ سے خطاب کیا ہے بلکہ اب انکا موضوع حیات، خودی، خدا، فلسفۂ خودی، فلسفۂ بیخودی اور عشق ہے جو شخص کسی زمانہ میں دامنِ کوہ میں ایک چھوٹا سا جھونپڑا بنانا چاہتا تھا اب اپنے یقین کی پوری قوت کے ساتھ دنیا کو یہ پیغام دیتا ہے۔

تو رازِ کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا!
خودی کا رازداں ہو جا خدا کا ترجماں ہو جا!

خودی میں ڈوب جا غافل یہ سرِّ زندگانی ہے
نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا

اقبالؔ کے جاننے والوں سے یہ حقیقت مخفی نہیں ہے کہ خودی میں ڈوب جانیکی جو تعلیم اُنہوں نے ۱۹۲۳ء میں دی تھی یہی تعلیم انہوں نے ۱۹۳۴ء میں اس غیر فانی شعر میں دی۔

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سُراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا، نہ بن، اپنا تو بن

(۴) سرکارِ دوعالم صلیٰ اللہ علیہ وسلّم سے انکی عقیدت بہت زیادہ ہو گئی اور اس میں آخر دم تک اضافہ ہی ہوتا رہا۔ حتیٰ کہ مرنے سے پہلے وہ میری رائے میں عشقِ رسول میں فنا ہو چکے تھے۔

نوٹ: میں نے یہ رائے اسلئے قائم کی ہے کہ اگر وہ فنا فی الرسول کے مقام پر نہیں پہنچے تھے تو مرنے کے بعد "زندہ" کیسے ہو گئے؟

حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذات گرامی تو بڑی چیز ہے، ان کو تو سرزمینِ حجاز سے بھی محبت ہو گئی تھی۔ دو شعر ملاحظہ ہوں:-

میں نے کہا کہ موت کے پردہ میں ہے حیات | پوشیدہ جس طرح ہو حقیقت مجاز میں
اوروں کو دیں حضور یہ پیغامِ زندگی | میں موت ڈھونڈتا ہوں زمینِ حجاز میں

اقبالؔ نے اس دور میں "میں اور تو" کے عنوان سے ایک "قیامت در بغل" نظم لکھی تھی، جس کا آخری شعر، عاشقانِ رسولؐ کی نگاہ میں "گنجِ شائگاں" سے بھی زیادہ قیمتی ہے:-

کرم اے شہِ عرب و عجم! کہ کھڑے ہیں منتظرِ کرم
وہ گدا کہ تو نے عطا کیا ہے جنہیں دماغِ سکندری

ناممکن ہے کہ کوئی مسلمان اس شعر کو پڑھے اور اُس پر مستی کا عالم طاری نہ ہو جائے۔

(۵) اس دور کی اکثر نظموں میں اُنہوں نے مسلمانانِ عالم کے قلبی جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ اسکی تفصیل یہ ہے کہ علامہ مرحوم جب ۱۹۰۸ء میں یورپ سے واپس آئے تو اسی زمانہ سے دنیائے اسلام پر حوادثِ ارضی و سماوی کا نزول شروع ہو گیا۔ ۱۹۰۸ء میں ایران میں زبردست سیاسی انقلاب برپا ہوا یعنی روس اور برطانیہ نے اس بدقسمت ملک کے اندرونی اور داخلی معاملات میں مداخلت شروع کردی۔ ۱۹۰۹ء میں ترکوں نے سلطان عبد الحمید کو معزول کر دیا۔ ۱۹۱۱ء میں اطالیہ نے بلا وجہ طرابلس پر حملہ کر کے اس ملک کو اپنے مظالم کا تختۂ مشق بنا لیا۔ برطانیہ نے بھی بالواسطہ اس کارِ خیر میں اطالیہ کی مدد کی تھی۔ ۱۹۱۲ء میں بلقانی ریاستوں نے، برطانیہ کے ایما سے ترکوں کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ ۱۹۱۳ء میں انگریزوں نے کانپور میں مچھلی بازار کی مشہور مسجد کے ایک حصّہ کو محض اسلئے شہید کر دیا، کہ مجوّزہ شارعِ عام میں کجی پیدا نہ ہو۔ انگریزوں کے اس انسانیت سوز اور ملت کش طرزِ عمل کے خلاف سارے ہندوستان میں آگ لگ گئی تھی۔ اور اقبالؔ پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ انگریز کی ذہنیت یہ ہے کہ بیشک اسلامیانِ ہند کے قلوب پاش پاش ہو جائیں، لیکن سڑک میں کوئی عیب پیدا نہ ہو۔

۱۹۱۵ء میں ترکی شریکِ جنگ ہوئی اور انگریزوں نے کمال عیاری سے کام لیکر عربوں کو ترکوں کے خلاف صف آرا کر کے مسلمانوں کے خون کو پانی سے بھی ارزاں کر دیا۔ ۱۹۱۹ء میں انگریزوں نے ترکی سلطنت کو ختم کرنے کی سازش مکمل کر لی۔ چنانچہ ۱۹۲۱ء میں یونان کو خفیہ جنگی امداد دیکر ترکوں کے خلاف اعلانِ جنگ پر آمادہ کر دیا۔

تیسرے دور کی شاعری میں اقبالؔ نے انگریزوں کی اسلام دشمنی کے ان تمام شواہد کو صراحتًا یا کنایتًا اپنی نظموں میں بیان کر کے مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ کل اشعار تو کہاں تک لکھوں گا۔ صرف ایک شعر پر اکتفا کرتا ہوں۔

اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

(۶) اس دور کی نظموں کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو سکتی ہے کہ ۱۹۰۸ء کے بعد سے اقبال کے خیالات میں بہت وسعت، تخیلات میں بلندی، جذبات میں شدت اور احساسات میں ذکاوت پیدا ہو گئی تھی۔ اور وہ شاعر کے مرتبے سے بلند ہو کر پیغامبر بن گئے تھے۔ چنانچہ خضرِ راہ میں انکی پیغامی شاعری کا رنگ صاف نمایاں ہے۔

(۷) اب اُنہوں نے عشق کو اپنا مسلک بنا لیا، اور انکی شاعری اسی مسلک کی تبلیغ و اشاعت کے لئے وقف ہو گئی۔

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

(۸) ان کا زاویۂ نگاہ آفاقی ہو گیا، چنانچہ اب وہ یہ کہتے ہیں ؎

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

(۹) اب اُنہوں نے اپنی شاعرانہ قوتوں کو مسلمانوں کے دل میں ولولہ پیدا کرنے کے لئے وقف کر دیا۔ چنانچہ خطاب بجوانانِ اسلام، مسلم، شعاعِ آفتاب، نویدِ صبح ان سب نظموں میں اُنہوں نے قوم کو اُمید اور یقین کا پیغام دیا ہے۔ اور اطاعتِ اسلام کے جذبہ کو اُبھارا ہے۔ اور اسکے ساتھ ساتھ اُنہوں نے مسلمانوں کو تہذیبِ مغرب کے خطرات سے بھی آگاہ کیا ہے۔ چنانچہ، مسلمان اور تعلیمِ جدید، اور مذہب' میں اُنہوں نے اس فرض کو بڑی خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا ہے۔

(۱۰) اس دور میں اُنہوں نے بعض ایسی نظمیں لکھیں، جنکی بدولت اگر ایک طرف اُردو ادب کا دامن جواہرات سے مالامال ہو گیا۔ تو دوسری طرف خود اُنہیں غیر فانی شہرت حاصل ہو گئی۔ مثلاً شکوہ، جوابِ شکوہ، شمع اور شاعر، والدۂ مرحومہ کی یاد میں، خضرِ راہ اور طلوعِ اسلام، اُردو ادب میں ان نظموں میں سے کسی کا جواب نہیں مل سکتا۔

(۱۱) چونکہ اسلام، انسان کو، تمام مذاہب کے بزرگوں کی عزت کرنا سکھاتا ہے،

اسلئے اسلامی تعلیمات کے شائق ہونیکے باوجود اقبال کی وسعتِ نظر اور کشادگیٔ قلب کا وہی عالم رہا جو ۱۹۰۵ء سے پہلے تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں بھی اُنہوں نے، اگر ایک نظم حضرت صدیق اکبرؓ کی شان میں لکھی ہے تو دوسری نظم میں شری رام چندر کی سیرت کے بعض پہلوؤں کو سراہا ہے۔

(۱۲) اس حصہ میں بعض نظمیں ایسی ہیں جن میں اُنہوں نے بعض فارسی شعراء کے اشعار پر تضمین کی ہے، جن سے اُن کے مطالعہ کی وسعت کا پتہ چلتا ہے۔

(۱۳) چونکہ اس زمانہ میں اُنہوں نے اپنا فلسفۂ خودی مدوّن کرکے اسرارِ خودی کی صورت میں دنیا کے سامنے پیش کر دیا تھا۔ اسلئے انکی بعض اُردو نظموں میں بھی اسکے اشارات ملتے ہیں، مثلاً انسان اور بزمِ قدرت، عقل و دل، ایک پرندہ اور جگنو، کنارِ راوی، اور طلوعِ اسلام میں فلسفۂ خودی کے اکثر مسائل نہایت دلکش انداز میں نظم کئے ہیں۔

(۱۴) اس دور کی شاعری میں انکی نظموں اور غزلوں کی زبان بہت منجھ گئی ہے۔ اور فارسی ادبیات کے گہرے مطالعہ کی بدولت اُن کو اپنے خیالات کے اظہار پر بے پناہ قدرت حاصل ہو گئی ہے۔ جس کا ثبوت شیکسپیئر، اسیری، ارتقاء اور دوسری نظموں سے بآسانی مل سکتا ہے۔

(۱۵) اس دور کی غزلوں میں جوش اور سرمستی کا رنگ بہت نمایاں ہے۔

بانگِ درا پر اک طائرانہ نظر

یہ مسلّم ہے کہ اقبال نے اُردو شاعری میں اپنے کلام کی بدولت ایک نئے دور کا آغاز کر دیا، اور آج کوئی شاعر ایسا نہیں جو کسی نہ کسی رنگ میں اُن کے اندازِ بیان سے متاثر نہ ہو۔ یہ دوسری بات ہے کہ جس طرح میرؔ کا انداز بہت کم شعرا کو نصیب ہو سکا، اسی طرح اقبالؔ کے رنگ کی کامیاب پیروی بھی بہت کم شعراء کے حصہ میں آسکی۔

یہ سچ ہے کہ بالِ جبریل میں انکی اُردو شاعری اپنے مرتبۂ کمال کو پہونچ گئی ہے اور اس لحاظ سے ہم بانگِ درا کا مقابلہ یا موازنہ اسکے ساتھ نہیں کر سکتے۔ لیکن اس سے قطع نظر کرکے اپنی جگہ بانگِ درا بھی لائقِ صد تحسین و آفرین ہے اور اس میں بھی شاعری کی تمام خوبیاں موجود ہیں ۔۔ وہ خوبیاں جنکی بدولت کسی شاعر کو دنیا کے صفِ اوّل کے شعراء میں نمایاں جگہ حاصل ہو سکتی ہے۔ چونکہ یہ مقدمہ تفصیل کا متحمل نہیں ہو سکتا اسلئے ہم اختصار کے ساتھ، ذیل میں بانگِ درا کی چند شاعرانہ خصوصیات درج کرتے ہیں۔

واضح ہو کہ بانگِ درا میں غزلیں بھی ہیں، اور نظمیں بھی ہیں۔ ابتدائی غزلوں میں داغؔ کا رنگ پایا جاتا ہے۔ لیکن جوں جوں اُن کے خیالات میں وسعت اور فکر میں بلندی پیدا ہوتی گئی۔ تیوں تیوں اُنکی غزلوں میں غالبؔ کا رنگ پیدا ہوتا گیا۔ ہم اس بات کو مثالوں سے واضح کر سکتے ہیں۔

تامل تو تھا اُن کو آنے میں قاصد — مگر یہ بتا طرزِ انکار کیا تھی؟

اس شعر میں داغؔ کا رنگ جھلکتا ہے۔

سکونِ دل سے سامانِ کشود کار پیدا کر — کہ عقدہ خاطرِ گرداب کا آبِ رواں تک ہے

اس شعر میں غالبؔ کا اندازِ بیان پایا جاتا ہے۔

داغؔ اور غالبؔ کے علاوہ اقبالؔ کی بعض غزلوں میں میرؔ کا رنگ بھی پایا جاتا ہے۔ مثلاً:

زمانے بھر میں رسوا ہوں مگر اے وائے نادانی — سمجھتا ہوں کہ میرا عشق میرے رازداں تک ہے

محبت کے لئے دل ڈھونڈ کوئی ٹوٹنے والا!
یہ وہ مے ہے جسے رکھتے ہیں نازک آبگینوں میں

کوئی دم کا مہماں ہوں اے اہلِ محفل — چراغِ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں

بانگِ درا میں اقبالؔ نے مختلف النوع نظموں پر طبع آزمائی کی ہے مثلاً

(۱) فطری یا نیچرل نظمیں جن میں اقبالؔ نے مناظرِ فطرت کی تصویر کھینچی ہے۔ مثلاً ہمالہ، گلِ رنگیں، ابرِ کوہسار، آفتابِ صبح، چاند، جگنو، شمع، اور بزمِ انجم وغیرہ۔

(۲) وطنی اور قومی نظمیں جن میں اُنہوں نے وطن دوستی کے جذبات کو اُبھارا ہے، یا قوم کو عمل کی دعوت دی ہے۔ مثلاً ہندستانی بچوں کا قومی گیت، ترانۂ ملی، نیا شوالہ، وطنیت، خطاب بہ جوانانِ اسلام اور ہلالِ عید وغیرہ۔

(۳) اخلاقی نظمیں، جن میں اُنہوں نے قوم کو اپنے اندر اخلاقِ حسنہ پیدا کرنے کی تلقین کی ہے، یا کسی واقعہ سے کوئی سبق اخذ کیا ہے۔ مثلاً گلِ پژمردہ، زہد اور رندی، طفلِ شیر خوار، گورستانِ شاہی، شبنم اور ستارے وغیرہ۔

(۴) تاریخی نظمیں، جن میں تاریخی واقعات نظم کئے ہیں، یا بعض مشاہیر کا تذکرہ کیا ہے۔ مثلاً بلالؓ، صقلیہ، غلام قادر رہیلہ، حضورِ رسالتمآبؐ میں، فاطمہ بنت عبداللہ، محاصرۂ ادرنہ، صدیق اکبرؓ، بلادِ اسلامیہ وغیرہ۔

(۵) فلسفیانہ نظمیں، جن میں فلسفہ اور حکمت کے نکتے بیان کئے گئے ہیں۔ مثلاً شمع، موجِ دریا، سرگذشتِ آدم، جگنو، بچہ اور شمع، محبت، نوائے غم، فلسفۂ غم، بزمِ انجم، انسان، مکالمہ، ارتقاء وغیرہ۔

(۶) دعائیہ نظمیں، جن میں اُنہوں نے دعائیں کی ہیں مثلاً التجائے مسافر، ایک آرزو، دعاء۔

(۷) بعض نظموں میں اُنہوں نے فارسی شعراء کے اشعار پر تضمین کی ہے۔ مثلاً تضمین بر شعر انیسی شاملو، ملا عرشی، ابو طالب کلیم، فیضی، رضی دانش، ملک قمی، مرزا صائب اور مرزا بیدل وغیرہ۔

(۸) بعض نظموں میں اُنہوں نے مشہور شعراء کی خدمت میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے مثلاً داغؔ، حالیؔ، شبلیؔ، غالبؔ، عرفیؔ اور شیکسپیئر۔

(۹) بعض نظموں میں اُنہوں نے، ہندوستان کے مشہور مذہبی رہنماؤں کی، عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ مثلاً، گوتم، رام چندر، نانک اور رام تیرتھ۔

(۱۰) ظریفانہ نظمیں، جن میں اُنہوں نے بعض اہم معاشرتی اور سیاسی مسائل پر ظرافت اور طنز کے پیرایہ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اقبالؔ نے اپنی نظموں میں فارسی تراکیب بکثرت استعمال کی ہیں۔ بعض شعر ایسے ہیں کہ اگر اُردو کے بجائے فارسی کا ایک لفظ رکھدیا جائے تو پورا شعر فارسی زبان کا ہو جائیگا۔ مثلاً

غم زدۂ دلِ افسردۂ دہقاں ہونا
رونقِ بزمِ جوانانِ گلستاں ہونا

اس شعر میں 'ہونا' کے بجائے 'بودن' رکھدیجئے تو یہ شعر فارسی کا ہو جائیگا۔ اسی خصوصیت کو دیکھکر ناقدین نے یہ رائے قائم کی ہے کہ اقبالؔ نے غالبؔ کے اندازِ بیان کا تتبع کیا ہے۔ مثال کے طور پر غالبؔ کے اس شعر میں

شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا

اگر 'آیا' کی جگہ 'آمد' رکھدیا جائے تو یہ شعر فارسی کا ہو جائیگا۔

ذیل میں چند اشعار یا مصرعے درج کرتا ہوں:۔

ع تو شناسائے خراشِ عقدۂ مشکل نہیں
ع یہ نظرِ غیر از نگاہِ چشمِ صورت بیں نہیں

یہ تلاشِ متصل شمعِ جہاں افروز ہے　　　توسنِ ادراکِ انساں کو خرام آموز ہے

ع آہنگِ طبع ناظمِ کون و مکاں ہوں میں

ع عالم ظہورِ جلوۂ ذوقِ شعور ہے!

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اقبالؔ نے اپنے مفہوم کو واضح کرنے کے لئے بہت سی جدید تراکیب وضع کی ہیں جنکی بدولت اُردو زبان میں وسعت پیدا ہو گئی ہے، اور یہ بات عرفیؔ کی طرح انکے قادرالکلام اور طباّع ہونے کی دلیل ہے۔ چونکہ اختصار مدنظر ہے۔ اسلئے چند مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں۔

توسنِ ادراکِ انساں۔ ناقۂ شاہدِ رحمت۔ قتیلِ ذوقِ استفہام۔ قربِ فراق آمیز۔ یزدانِ ساکنانِ نشیب و فراز۔ تپش آموزِ جانِ عشق۔ طوق گلوئے حُسنِ تماشا پسند۔ شورشِ میخانۂ انساں۔ دخترِ خوش خرامِ ابر۔ جوئے سرود آفریں۔ شانۂ موجِ صرصر۔ داغِ ملالِ شب۔ سیارۂ ثابت نما۔ کلیمِ ذروۂ سینائے علم۔ مایہ دارِ اشکِ عنابی۔ شکستِ رشتۂ تسبیحِ شیخ۔

چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ بانگِ درا کے بہت سے اشعار اپنی برجستگی، دلکشی، معنویت، اور موزونیت کی وجہ سے زبان زدِ خلائق ہو گئے ہیں۔ چند مثالیں لکھتا ہوں:۔

گیسوئے اُردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے　　　شمع یہ سودائیِ سوزِ دلِ پروانہ ہے

جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا

ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے　　　مسلماں کو ہے ننگ وہ بادشاہی

پروانہ کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس　　　صدیقؓ کے لئے ہے خدا کا رسولؐ بس

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں

موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل　　　لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی!

یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

تری خاک میں ہے اگر شرر، تو خیالِ فقر و غنا نہ کر

کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں

جو ہو ذوقِ یقیں پیدا، تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

ان اشعار کے علاوہ، شکوہ، جوابِ شکوہ، شمع اور شاعر، خضرِ راہ، اور طلوعِ اسلام کے اکثر اور بیشتر بند لوگوں کو حفظ یاد ہیں، جن کو قومی جلسوں اور مذہبی تقریروں میں بڑے ذوق و شوق کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔

پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ اسکی اکثر نظموں میں سوز و گداز کی وہ کیفیت پائی جاتی ہے، جسے مبصرینِ کلام اقبالؔ نے "کیفِ غم" سے تعبیر کیا ہے۔ چونکہ یہ کیفیت، سراسر ذوقی چیز ہے، اسلئے میں نہ اسکی منطقی تعریف کر سکتا ہوں اور نہ چند سطروں میں وضاحت کر سکتا ہوں۔ ہاں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اقبالؔ کا دل چونکہ سوز و گداز سے لبریز تھا، اسلئے یہ رنگ ہر جگہ نمایاں ہے۔ بلکہ ان کی طبیعت ثانیہ بنگیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ پیرِ مغاں سے "خانہ ساز" کی فرمائش کرتے ہیں ؎　　پیرِ مغاں! فرنگ کی مے کا نشاط ہے اثر

اس میں وہ کیفِ غم نہیں، مجھکو تو خانہ ساز دے

اگر ناظرین اس کیفیت سے آگاہ ہونا چاہتے ہیں تو بانگِ درا کا اوّل سے آخر تک بڑے غور کے ساتھ مطالعہ کریں۔ اقبالؔ کی مشہور نظم "ایک آرزو" اسی جذبہ کی شدت کا نتیجہ ہے۔

چھٹی خصوصیت یہ ہے کہ اسکی بعض نظموں سے "وحدت الوجود" کا رنگ ٹپکتا ہے۔ مثلاً "شمع"۔ اس نظم کو پڑھکر ہر شخص اس نتیجہ پر پہونچیگا کہ تصوف کا مذاق ابتدا ہی سے اقبالؔ کے دل میں جاگزیں تھا۔ اور بالِ جبریل میں یہی شرابِ عالم بیخودی میں ان کے پیمانۂ دل سے چھلک پڑی ہے۔ اگر انہوں نے ۱۹۳۶ء میں یہ شعر کہا:

یہ ہے خلاصۂ علمِ قلندری کہ حیات

خدنگِ جستہ ہے لیکن کماں سے دور نہیں

تو کوئی نئی بات نہیں کہی، وہ اسی بات کو ۱۹۰۶ء میں یعنی ۳۰ سال پہلے کہہ چکے تھے۔

صیاد آپ، حلقۂ دامِ ستم بھی آپ　　　بامِ حرم بھی، طائرِ بامِ حرم بھی آپ

ہاں آشنائے لب ہو نہ رازِ کہن کہیں　　　پھر چھڑ نہ جائے قصۂ دار و رسن کہیں

عقدۂ اضداد کی کاوش نہ تڑپائے تجھے　　　حُسنِ عشق انگیز ہر شئے میں نظر آئے مجھے

کچھ دکھانے دیکھنے کا تھا تقاضا طور پر　　　کیا خبر ہے تجھکو اے دل فیصلہ کیونکر ہوا

کھولی ہیں ذوقِ دید نے آنکھیں تری اگر　　　ہر رہگذر میں نقشِ کفِ پائے یار دیکھ

ساتویں خصوصیت یہ ہے کہ بانگِ درا کی اکثر نظموں سے اقبالؔ کی شخصیت اور سیرت کے پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔ اور اگر کوئی شخص چاہے تو اس کتاب کے مختلف اشعار سے انکی سیرت کا مرقع تیار کر سکتا ہے۔

(۱) نوجوانی میں اقبالؔ ایک غزل گو شاعر کی حیثیت سے نمودار ہوتے ہیں۔

(ب) اُس زمانہ کے نامور محبانِ وطن کی تحریروں اور تقریروں سے متاثر ہو کر، وطن کی عظمت کا راگ اَلاپنے لگتے ہیں۔

(ج) لیکن ہندوؤں کی تنگ نظری، مُسلم آزاری اور افتراق انگیزی کو دیکھ دیکھ کر ان کے دل کو سخت ایذا پہونچتی ہے۔ اور وہ "بیتاب ہو کر" مادرِ وطن" سے یہ کہتے ہیں کہ

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے

ہاں ڈبو دے اے محیطِ آبِ گنگا تو مجھے

(د) یورپ جا کر اُن کے اندر انقلابِ عظیم پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ وطنیت کے ملت کش نظریہ سے ہمیشہ کے لئے متنفر ہو کر، اسلامی اخوت اور مساوات کے علمبردار بن جاتے ہیں۔

(ہ) انگریزوں کی اسلام دشمنی کا مطالعہ کرنے کے بعد وہ اپنی شاعری (دل و دماغ کی بہترین قوتوں) کو اس قوم کی عیاریوں کا پردہ چاک کرنے کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔ چنانچہ اگر وہ ۱۹۳۳ء میں یہ کہتے ہیں

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل

خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز

تو وفات سے صرف تین ماہ پہلے اپنی قوم کو یوں متنبہ کرتے ہیں:۔

مبر پیشِ فرنگی حاجتِ خویش　　　زطاقِ دل فرو ریز ایں صنم را

میرا خیال ہے کہ جو شخص بانگِ درا کا غور سے مطالعہ کریگا، وہ اہلِ مغرب خصوصاً انگریزوں کی اسلام دشمنی سے بخوبی آگاہ ہو جائیگا۔

آٹھویں خصوصیت یہ ہے کہ بانگِ درا کی نظموں میں اقبالؔ نے تہذیبِ مغرب کے زہر کا تریاق مہیا کیا ہے۔ اور مسلمانوں کو صاف لفظوں میں آگاہ

کر دیا ہے کہ تہذیبِ مغرب کی ظاہری ٹیپ ٹاپ پر فریفتہ مت ہو جانا چنانچہ کہتے ہیں:-

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

نویں خصوصیت یہ ہے کہ بانگ درا سے محبت نوعِ انسانی کا سبق حاصل ہو سکتا ہے۔ اور میری رائے میں اسی چیز نے اقبال کی شاعری کو غیر فانی بنا دیا۔

خدا کے بندے تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اسکا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

دسویں خصوصیت یہ ہے کہ جس طرح حالی نے ۱۸۷۹ء میں مسدس لکھ کر اُردو زبان میں اصلاحی شاعری کا دور شروع کیا تھا، اسی طرح اقبال نے ۱۹۲۲ء میں خضرِ راہ لکھ کر اُردو زبان کو انقلابی شاعری سے روشناس کر دیا۔ آج جس قدر شعراء، مظلوموں اور مزدوروں کی حمایت میں آواز بلند کر رہے ہیں، اُن سبھوں کی رہنمائی خضرِ راہ ہی کے ان اشعار نے کی ہے:-

اے کہ تجھکو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر — شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
ساحر الموط نے تجھکو دیا برگِ حشیش — اور تو اے بےخبر سمجھا اُسے شاخِ نبات

اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

بانگ درا کی شاعرانہ خوبیاں

گذشتہ اوراق میں جو خصوصیات سپردِ قلم کی گئی ہیں اُن کے مطالعہ سے یہ حقیقت بآسانی واضح ہو سکتی ہے کہ بانگ درا تمام نقادانِ فن کی نظر میں اُردو ادب میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔ مثلاً ہندستان کے نامور ادیب اور نقاد، اور پروفیسر

عبد القادر سروری لکھتے ہیں کہ: "اُردو زبان کی جو خدمت اقبال کی شاعری انجام دیتی ہے وہ نہایت مہتم بالشان ہے۔ میر اور غالب کو چھوڑ کر، اُردو میں سوائے اقبال کے کوئی ایسا شاعر نہیں ملیگا جس نے زبان پر اتنا گہرا اثر ڈالا ہو۔ انہوں نے اُردو میں جتنے نئے اور خوبصورت الفاظ داخل کئے جتنی ادبی ترکیبیں وضع کیں۔ اور نفیس تشبیہوں اور استعاروں کا جس قدر وافر ذخیرہ فراہم کر دیا اسکی تفصیل کی اس اجمال میں گنجائش نہیں ہے۔" (جدید اُردو شاعری ص ۱۸۹)

افسوس کہ میں بھی اس مختصر مقدمہ میں، بانگ درا کے محاسنِ شعری بالوضاحت درج نہیں کر سکتا۔ صرف چند نمایاں خوبیوں کے بیان پر اکتفا کرونگا۔

(۱) تشبیہہ و استعارہ:- یہ کلام اقبال کی سب سے نمایاں خوبی ہے، اور بانگ درا ہی پر منحصر نہیں ہے، یہ حُسن اُنکی ہر تصنیف میں پایا جاتا ہے۔ لیکن بانگ درا میں اُنہوں نے اسکو اس فراوانی کے ساتھ استعمال کیا ہے کہ اگر کوئی شخص اس زاویہ نگاہ سے اس کتاب کا مطالعہ کریگا تو بے اختیار پکار اُٹھے گا کہ اقبال تشبیہہ و استعارہ کا بادشاہ ہے۔ طلبہ اور عام شائقین کی سہولت کے لئے میں انکی تعریف ذیل میں درج کرتا ہوں:-

(۲) تشبیہہ: شبہ سے ماخوذ ہے، لغوی معنی مشابہت دینا۔

علم بیان کی اصطلاح میں تشبیہہ کہتے ہیں اُن دو چیزوں کو جو مختلف بالذات ہوں، کسی ایک معنی میں شریک کرنا لیکن یہ اشتراک دونوں میں برابر نہو۔ مثلاً

چہرہ انور سے تیرے ماہِ کامل آشکار
اور گیسوئے معنبر سے شبِ یلدا عیاں

یہاں معشوق کے چہرہ کو ماہِ کامل سے اور اسکی زلفوں کو شبِ تاریک سے تشبیہہ دی ہے۔

(ب) استعارہ:- عاریہ سے ماخوذ ہے لغوی معنی مانگنا طلب کرنا۔

علم بیان کی اصطلاح میں استعارہ کہتے ہیں، تشبیہہ کے مختصر کرنے اور اس میں مبالغہ پیدا کرنے کو، بالفاظ دگر، جب ہم کسی لفظ کو مجازی معنی میں استعمال کریں تو حقیقی اور مجازی معنی میں مشابہت کا علاقہ پایا جائے۔ مثلاً بادام، یا نرگس کہیں اور آنکھ مراد لیں، یا صنم کہیں اور معشوق مراد لیں، یا شیر کہیں اور مردِ شجاع مراد لیں۔

(ج) اگر مشبہ کو حذف کر دیں اور مشبہ بہ کو بیان کر دیں تو یہ استعارہ تصریحیہ ہے۔ اور اگر اسکے برعکس مشبہ بہ کو حذف کر دیں، اور مشبہ کو بیان کر دیں تو یہ استعارہ بالکنایہ ہے۔ جیسے:-

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھئے
ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے!

واضح ہو کہ خامہ کوئی انسان نہیں ہے کہ انگشت بدنداں ہو سکے۔ دراصل شاعر نے خامہ کو انسان متحیر کے ساتھ تشبیہہ دی ہے جو محذوف ہے۔ واضح ہو کہ یہ وہ استعارہ ہے جس میں کنایہ کا رنگ پایا جاتا ہے۔

(د) مجاز مرسل:- ہم پہلے واضح کر چکے ہیں کہ کسی لفظ کو مجازی معنی میں استعمال کرنے کے لئے حقیقی اور مجازی معنی میں کوئی علاقہ ہونا ضروری ہے۔ اگر وہ علاقہ تشبیہہ کا ہے تو استعارہ ہے، اور اگر غیر تشبیہی ہے تو اسے مجاز مرسل کہتے ہیں مثلاً

(۱) ظرف بول کر مظروف مراد لینا۔ جیسے

ع سارے گھر کو ترے بیمار نے سونے نہ دیا

یہاں 'گھر' سے 'گھر والے' مراد ہیں۔

(۲) کل بول کر جز مراد لینا، جیسے ع ہاروت نے کی دیدۂ ماروت میں اُنگلی'

یہاں اُنگلی سے اُنگلی کی پور مراد ہے۔

(۵) کنایہ:- کنایہ کے لغوی معنی ہیں مبہم بات، یا مخفی اشارہ، اصطلاح میں کنایہ عبارت ہے اُس لفظ سے کہ اُسکے معنی کا لازم مراد ہو، اگرچہ معنیٔ مذکور کا لینا بھی جائز ہو۔ مثلاً:

آئینہ کو دیکھ جب وہ زلف سلجھانے لگے
ہند کے کالے حلب میں جاکے لہرانے لگے

یہاں 'کالے' کو سانپ کے بجائے زلفوں کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔

ساقی وہ دے ہمیں کہ ہوں جسکے سبب بہم
محفل میں آب و آتش و خورشید ایک جا

ظاہر ہے کہ یہ تینوں اوصاف شراب ہی میں پائے جاتے ہیں۔

نوٹ:- بانگ درا میں چونکہ یہ پانچ صنائعِ معنوی بکثرت پائی جاتی ہیں، اسلئے میں نے ان پانچوں کی مختصر تعریف قلمبند کر دی ہے، تاکہ شائقین ان کو مدِ نظر رکھکر خود کلامِ اقبال کی ان خوبیوں سے لطف اندوز ہو سکیں۔

تشبیہہ کی مثالیں:-

ہائے کیا فرطِ طرب میں جھومتا جاتا ہے ابر — فیلِ بے زنجیر کی صورت اُڑا جاتا ہے ابر
آنکھیں ہیں کہ ہیرے کی چمکتی ہوئی کنیاں — جوہر آپ کا اللہ نے کلغی سے سجایا
تیرے احساں کا نسیمِ صبح کو اقرار تھا — باغ تیرے دم سے گویا طبلۂ عطار تھا
چرخ نے بالی چرا لی ہے عروسِ شام کی؟ — نیل کے پانی میں یا مچھلی ہے سیمِ خام کی؟
جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں — یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں
آیا ہے آسماں سے اُڑ کر کوئی ستارہ — یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں

استعارہ کی مثالیں :-

تو اگر کوئی مدبّر ہے تو سُن میری صدا   ہے دلیری دستِ اربابِ سیاست کا عصا
سونے والوں کو جگا دے شعر کے اعجاز سے   خرمنِ باطل جلا دے شعلۂ آواز سے
بستۂ رنگِ خصوصیت نہ ہو میری زباں   نوعِ انساں قوم ہو میری، وطن میرا جہاں
شوق آزادی کے دنیا میں نہ نکلے حوصلے   زندگی بھر قیدِ زنجیرِ تعلق میں رہے

استعارہ بالکنایہ کی مثالیں :-

ٹوٹ کر خورشید کی کشتی ہوئی غرقابِ نیل   ایک ٹکڑا تیرتا پھرتا ہے روئے آبِ نیل
ساتھ لے سیارۂ ثابت نما لے چل مجھے   خارِ حسرت کی خلش رکھتی ہے اب بیکل مجھے
اے کہ تیرا مرغِ جاں تارِ نفس میں ہے اسیر   اے کہ تیری روح کا طائر قفس میں ہے اسیر
خالی شرابِ عشق سے لالہ کا جام ہو   پانی کی بوند گریۂ شبنم کا نام ہو
صبحِ ازل جو حسن ہوا دلستانِ عشق   آوازِ "کُن" ہوئی تپش آموزِ جانِ عشق
دی عشق نے حرارتِ سوزِ دروں مجھے   اور گل فروشِ اشکِ شفق گوں کیا مجھے
غم خانۂ جہاں میں جو تیری ضیا نہ ہو   اس تفتہ دل کا نخلِ تمنا ہرا نہ ہو

کنایہ کی مثالیں :-

شاہدِ مضموں تصدّق ہے ترے انداز پر   خندہ زن ہے غنچۂ دلی گلِ شیراز پر
بدلے یک رنگی کے یہ نا آشنائی ہے غضب   ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب
اے شمع انتہائے فریبِ خیال دیکھ   مسجودِ ساکنانِ فلک کا مآل دیکھ
گوہر کو مشتِ خاک میں رہنا پسند ہے   بندش اگرچہ سست ہے مضموں بلند ہے
اس چمن کے نغمہ پیراؤں کی آزادی تو دیکھ   شہر جو اجڑا ہوا تھا اسکی آبادی تو دیکھ

مجاز مرسل کی مثالیں :-

پاک رکھ اپنی زباں، تلمیذِ رحمانی ہے تو   ہو نہ جائے دیکھنا تیری صدا بے آبرو

وصل کے اسباب پیدا ہوں تری تحریر سے   دیکھ کوئی دل نہ دکھ جائے تری تقریر سے
غافل ہے تجھ سے حیرتِ علم آفریدہ دیکھ   جویا نہیں تری نگہِ نارسیدہ دیکھ
پنہاں درونِ سینہ کہیں راز ہو ترا   اشکِ جگر گداز نہ غمّاز ہو ترا!

(۲) سلاست اور روانی :- بانگ درا کی اکثر غزلوں اور نظموں میں غضب کی روانی پائی جاتی ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ اقبال شعر کہتے ہی اُس وقت تھے جب انکی طبیعت شعر گوئی پر مائل ہوتی تھی۔ چند مثالیں لکھتا ہوں : تصویرِ درد، ترانۂ ملّی، شکوہ، جواب شکوہ، شمع اور شاعر، حضورِ رسالت مآب میں، طلوعِ اسلام، اور خضرِ راہ، ان نظموں میں سلاست اور روانی کے بہترین نمونے مل سکتے ہیں۔ بخوفِ طوالت، اشعار نقل کرنے سے اجتناب کرتا ہوں۔

(۳) مصوّری : بانگ درا میں بہت سی نظمیں ایسی ہیں جن میں اقبال نے مناظرِ قدرت کی تصویر کھینچی ہے۔ چونکہ انکی قوتِ متخیلہ بہت بڑھی ہوئی تھی، اسلئے انہوں نے اس فن کے بہترین نمونے اپنی شاعری میں پیش کر دیے ہیں۔

ہمالہ، ابرِ کوہسار، انسان اور بزمِ قدرت، ابر، اور ایک شام، ان نظموں میں اقبال نے مصوّری اور منظر کشی کا کمال دکھایا ہے۔ مشہور نظم "ایک آرزو" سے چند شعر نقل کرتا ہوں :-

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں   ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو
ہو دلفریب ایسا کہسار کا نظارہ   پانی بھی موج بن کر اُٹھ اُٹھ کے دیکھتا ہو
آغوش میں زمیں کی سویا ہوا ہو سبزہ   پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو
پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی   جیسے حسین کوئی، آئینہ دیکھتا ہو

مہندی لگائے سورج جب شام کی دلہن کو
سُرخی لئے سنہری ہر پھول کی قبا ہو

(۴) رفعتِ تخیّل اور بلندیٔ فکر :- کلامِ اقبال کی یہ وہ خصوصیت ہے جسکی بنا پر اُن کا شمار دنیا کے بہترین شعرا میں کیا جا سکتا ہے۔ ہندوستان میں عرفی، بیدل اور غالب کے علاوہ اور کوئی شاعر، اس صنعت میں انکا ہمسر نہیں ہے۔ چند مثالیں ذیل میں درج کرتا ہوں :-

عشق کچھ محبوب کے مرنے سے مر جاتا نہیں   روح میں غم بن کے رہتا ہے مگر جاتا نہیں
مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں   یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں
ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز   چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی
دفترِ ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات   تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات
موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے   خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے
جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں   طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں
برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی   ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی
رہ یک گام ہے ہمت کے لئے عرشِ بریں   کہہ رہی ہے یہ مسلمان سے معراج کی رات
بے خبر تو جوہرِ آئینۂ ایام ہے   تو زمانہ میں خدا کا آخری پیغام ہے

(۵) حُسنِ ادا :- یہ کلامِ اقبال کی پانچویں خصوصیت ہے جو بانگ درا کی غزلوں اور نظموں میں جا بجا نظر آتی ہے۔ اقبال کو خدا نے بات کہنے کا ایسا دلپذیر انداز عطا کیا ہے کہ ذوقِ سلیم وجد کرنے لگتا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں :-

حُسن آئینۂ حق، اور دل آئینۂ حُسن   دلِ انساں کو ترا حُسنِ کلام آئینہ
پہونچ سکتی ہے تو لیکن ہماری شاہزادی تک   کسی دُکھ درد کے مارے کا اشکِ آتشیں ہو کر
تارِ شررِ آہ ہیں انساں کی زباں میں   میں گریۂ گردوں ہوں گلستاں کی زباں میں
نشا پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے   مزا تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی
اس ذرہ کو رہتی ہے وسعت کی ہوس ہر دم   یہ ذرہ نہیں شاید سمٹا ہوا صحرا ہے،

سورج نے جاتے جاتے شامِ سیہ قبا کو   طشتِ افق سے لیکر لالے کے پھول مارے

(۶) فلسفہ طرازی :- یہ اقبال کا خاص رنگ ہے جو ہمالہ (۱۹۰۱ء) سے لیکر حضرتِ انسان (۱۹۳۵ء) تک کم و بیش ہر نظم میں موجود ہے، کہیں نمایاں کہیں پنہاں، اسکی وجہ یہ ہے کہ اقبال، فلسفیانہ طبیعت لیکر دنیا میں آئے تھے اُنہوں نے بانگ درا کی نظموں میں پیش پا افتادہ امور سے عمیق فلسفیانہ نکتے پیدا کئے ہیں، چند شعر ذیل میں درج کرتا ہوں :-

ہے جذبِ باہمی سے قائم نظام سارے   پوشیدہ ہے یہ نکتہ تاروں کی زندگی میں
چاہے تو بدل ڈالے ہیئت چمنستاں کی   یہ ہستی دانا ہے، بینا ہے، توانا ہے

کمالِ وحدت عیاں ہے ایسا کہ نوکِ نشتر سے تو جو چھیڑے
یقیں ہے مجھکو گرے رگِ گل سے قطرہ انساں کے لہو کا

قوم مذہب سے ہے مذہب جو نہیں تم بھی نہیں
جذبِ باہم جو نہیں، محفلِ انجم بھی نہیں

ذرہ ذرہ دہر کا زندانیٔ تقدیر ہے   پردۂ مجبوری و بیچارگی، تدبیر ہے
جو ہے بیدار انساں میں وہ گہری نیند سوتا ہے   شجر میں، پھول میں، حیواں میں، پتھر میں، ستارے میں
آشکارا ہے یہ اپنی قوتِ تسخیر سے   گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی
خودی میں ڈوب جا غافل یہ سرِّ زندگانی ہے   نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا

(۷) سوز و گداز :- یہی وہ وصف ہے جسکی بنا پر، انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں ہزاروں آدمی (عالم کم جاہل زیادہ) کیف کی حالت میں مرحوم کی نظموں کو سُنتے رہتے تھے۔ اور جب انکی زبان سے کوئی شعر سوز و گداز میں ڈوبا ہوا نکلتا تھا، تو بے اختیار گریہ طاری ہو جاتا تھا۔ مثلاً جب ۱۹۲۲ء میں مرحوم نے خضرِ راہ کے یہ دو شعر پڑھے :-

بیچتا ہے ہاشمی ناموسِ دینِ مصطفےٰ — خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش
آگ ہے، اولادِ ابراہیم ہے، نمرود ہے — کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

تو دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ سارے مجمع میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جسکی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز نہ ہوگئی ہوں۔ خود اقبال زار و قطار رو رہے تھے چند شعر ملاحظہ ہوں:-

الٰہی پھر مزہ کیا ہے یہاں دنیا میں رہنے کا — حیاتِ جاوداں میری نہ مرگِ ناگہاں میری
مرا رونا نہیں رونا ہے یہ سارے گلستاں کا — وہ گل ہوں میں خزاں ہر گل کی ہے گویا خزاں میری
دیکھ مسجد میں شکستِ رشتۂ تسبیحِ شیخ — بتکدے میں برہمن کی پختہ زناری بھی دیکھ
بارشِ سنگِ حوادث کا تماشائی بھی ہو — امتِ مرحوم کی آئینہ دیواری بھی دیکھ
سازِ عشرت کی صدا مغرب کے ایوانوں میں سن — اور ایراں میں ذرا ماتم کی تیاری بھی دیکھ
تھا جنہیں ذوقِ تماشا وہ تو رخصت ہوگئے — لیکے اب تو وعدۂ دیدارِ عام آیا تو کیا!
آہ جب گلشن کی جمعیت پریشاں ہو چکی — پھول کو بادِ بہاری کا پیام آیا تو کیا!
آخرِ شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ — صبحدم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا!

تصویرِ درد، صقلیہ، شمع و شاعر، فاطمہ بنت عبداللہ، والدہ کی یاد میں، یہ نظمیں سراپا سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ میری رائے میں سوز و گداز، شاعری کی جان ہے، چنانچہ اقبال خود کہتے ہیں:-

سخن میں سوز الٰہی کہاں سے آتا ہے
یہ چیز وہ ہے کہ پتھر کو بھی گداز کرے

(۸) **جوشِ بیان:-** چونکہ اقبال فطری شاعر ہیں، اور ان کے دل میں جذبات کا سمندر موجزن ہے، اسلئے ان کے کلام میں قدرتی طور پر جوشِ بیان کی صفت پیدا ہوگئی ہے جو ہر جگہ نظر آتی ہے۔ چند مثالیں لکھتا ہوں:-

ہویدا آج اپنے زخمِ پنہاں کرکے چھوڑوں گا
لہو رو رو کے محفل کو گلستاں کرکے چھوڑوں گا

تصویرِ درد کا یہ پورا بند جوشِ بیان کی عمدہ مثال ہے۔

وہ زمیں ہو تو مگر اے خوابگاہِ مصطفےٰ — دید ہے کعبہ کو تیری حجِ اکبر سے سوا

یہ پورا بند بھی جوشِ بیان کی عمدہ مثال ہے۔ نیز شکوہ اور جوابِ شکوہ کے اکثر بند جوشِ بیان کی بہترین مثالیں ہیں۔

تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی — کہ تو گفتار وہ کردار، تو ثابت وہ سیارا

اور اسکے بعد جو اشعار ہیں ان میں بھی یہی جوش و خروش پایا جاتا ہے۔

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا — دانہ تو کھیتی بھی تو باراں بھی تو حاصل بھی تو
وائے نادانی کہ تو محتاجِ ساقی ہوگیا — مے بھی تو مینا بھی تو ساقی بھی تو محفل بھی تو
شعلہ بن کر پھونک دے خاشاکِ غیر اللہ کو — خوفِ باطل کیا، کہ ہے غارتگرِ باطل بھی تو

یہ ساری نظم جوشِ بیان سے لبریز ہے میں نے مثالاً تین شعر نقل کردیئے ہیں۔

(۹) **طنز اور شوخی:-** فلسفیانہ سنجیدگی کے ساتھ ساتھ اقبال کی طبیعت میں ظرافت اور شوخی کا مادہ بھی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انکی شاعری بھی اس دولت سے مالامال ہے۔ نظموں سے بڑھکر غزلوں میں یہ رنگ نمایاں ہے۔

حصّہ سوم میں نصیحت کے عنوان سے جو نظم انہوں نے لکھی ہے اس میں شوخی، طنز اور ظرافت تینوں خصائص کا خوشگوار امتزاج نظر آتا ہے۔ اسکے عنوان ہی میں طنز کا نشتر پوشیدہ ہے۔ چند متفرق شعر ذیل میں درج کرتا ہوں:-

غضب ہیں یہ مرشدانِ خودبیں، خدا تری قوم کو بچائے
بگاڑ کر تیرے مسلموں کو، یہ اپنی عزت بنا رہے ہیں

نہ پوچھ اقبال کا ٹھکانا ابھی وہی کیفیت ہے اسکی — کہیں سرِ رہگذار بیٹھا ستم کشِ انتظار ہوگا
بھلا نبھیگی تری ہم سے کیونکر اے واعظ — کہ ہم تو رسمِ محبت کو عام کرتے ہیں
واعظ ثبوت لائے جو مے کے جواز میں — اقبال کو یہ ضد ہے کہ پینا بھی چھوڑ دے
کوئی یہ پوچھے کہ واعظ کا کیا بگڑتا ہے — جو بے عمل پہ بھی رحمت وہ بے نیاز کرے
بڑی باریک ہیں واعظ کی چالیں — لرز جاتا ہے آوازِ اذاں سے

(۱۰) **مضمون آفرینی:-** غالب کا یہ قول ہے کہ شاعری، دراصل مضمون آفرینی کا نام ہے نہ کہ قافیہ پیمائی کا۔ بانگِ درا کی نظموں کو اس معیار پر جانچا جائے تو ناقد پریشان ہوجائیگا کہ مضامین کے انبار میں سے کس شعر کو منتخب کرے اور کسے چھوڑ دے، اشعار تو کس شمار میں ہیں، یہاں تو پوری پوری نظمیں مضمون آفرینی کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ مثال کے طور پر انسان اور بزمِ قدرت، دردِ عشق، شمع، عاشقِ ہرجائی، محبت، صبح کا ستارہ، ستارہ، پھولوں کی شہزادی، اور جگنو، کا مطالعہ کیجئے۔ تو آپ اس بات کے اعتراف پر مجبور ہونگے کہ اس زمانہ میں کوئی شاعر اس صنعت میں انکا ہمسر نہیں ہے۔ چند اشعار ذیل میں درج کرتا ہوں:-

ابر کے ہاتھوں میں رہوارِ ہوا کے واسطے — تازیانہ دے دیا برقِ سرِ کہسار نے
چھیڑتی جا اس عراقِ دلنشیں کے ساز کو — اے مسافر دل سمجھتا ہے تری آواز کو
مجھ سے خبر نہ پوچھ حجابِ وجود کی — شامِ فراق صبح تھی میری نمود کی
قصۂ دار و رسن بازیٔ طفلانۂ دل — التجائے ارنی سرخیٔ افسانۂ دل
یارب اس ساغرِ لبریز کی مے کیا ہوگی — جادۂ ملکِ بقا ہے خطِ پیمانۂ دل
تو سمجھتا نہیں اے زاہدِ ناداں اسکو — رشکِ صد سجدہ ہے اک لغزشِ مستانۂ دل
اندازِ گفتگو نے دھوکے دیئے ہیں ورنہ — نغمہ ہے بوئے بلبل، بو پھول کی چہک ہے
کثرت میں ہوگیا ہے وحدت کا راز مخفی — جگنو میں جو چمک ہے وہ پھول میں مہک ہے

(۱۱) **مثال نگاری:-** کلامِ اقبال کی دلکشی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ پہلے مصرع میں جو بات کہتے ہیں، دوسرے مصرع میں اسے کسی مثال کے ذریعے ثابت کردیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بات دل میں گھر کر جاتی ہے۔ چند مثالیں درج کرتا ہوں:-

مرے اشعار اے اقبال کیوں پیارے نہ ہوں مجھکو — مرے ٹوٹے ہوئے دل کے یہ دردانگیز نالے ہیں
جوانی ہی تو ذوقِ دید بھی لطفِ تمنا بھی — ہمارے گھر کی آبادی قیامِ میہماں تک ہے
چشمِ نابینا سے مخفی معنیٔ انجام ہے — تھم گئی جس دم تڑپ سیمابِ سیمِ خام ہے

نہ ہو طبیعت ہی جنکی قابل وہ تربیت سے نہیں سنورتے
ہوا نہ سرسبز رہ کے پانی میں عکسِ سروِ کنارِ جو کا
فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں
تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیالِ فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند — قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند

(۱۲) **رنگِ تغزل:-** علامہ مرحوم نے اپنی شاعری غزلگوئی سے شروع کی تھی، اسلئے بانگِ درا میں انکی چند غزلیں بھی شامل ہیں، اور ان میں میر، مومن، غالب، اور داغ کا رنگ جھلکتا ہے۔ لیکن جو چیز ان کو سب سے جدا کرتی ہے وہ یہ ہے کہ انکی غزلوں میں فلسفہ اور مذہب یہ دونوں سنجیدہ عناصر بھی پائے جاتے ہیں۔ ذیل میں چند اشعار نقل کرتا ہوں جن سے ان کے رنگِ تغزل کا اندازہ ہوسکیگا۔

مانا کہ تیری دید کے قابل نہیں ہوں میں — تو میرا شوق دیکھ، مرا انتظار دیکھ
پاس تھا ناکامیٔ صیاد کا اے ہم صفیر — ورنہ میں اور اڑ کے آتا ایک دانہ کے لئے
میرے مٹنے کا تماشا دیکھنے کی چیز تھی — کیا بتاؤں ان کا میرا سامنا کیونکر ہوا
نہ پوچھو مجھ سے لذت خانماں برباد رہنے کی — نشیمن سیکڑوں میں نے بنا کر پھونک ڈالے ہیں

مل ہی جائیگی کبھی منزل لیلیٰ اقبالؔ — کوئی دن اور ابھی بادیہ پیمائی کر

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

(۱۳) **عشق رسولؐ** :- یہ رنگ چونکہ اقبالؔ نے اپنے والدین سے ورثہ میں پایا تھا اسلئے بانگ درا سے لیکر ارمغان حجاز تک انکی ہر تصنیف میں موجود ہے، اور میری رائے میں اسی کی بدولت انہیں بقائے دوام کی نعمت حاصل ہوئی۔ چند شعر لکھتا ہوں:-

پھڑک اٹھا کوئی تیری ادائے ما عرفنا پر — ترا رتبہ رہا بڑھ چڑھ کے سب ناز آفرینوں میں
ہوا ہو ایسی کہ ہندوستاں سے اے اقبالؔ — اڑا کے مجھ کو غبار رہ حجاز کرے
وہ زمیں ہے تو مگر اے خوابگاہ مصطفیٰ — دید ہے کعبہ کو تیری حج اکبر سے سوا
سالار کارواں ہے میر حجاز اپنا — اس نام سے ہے باقی آرام جاں ہمارا
اقبالؔ! کس کے عشق کا یہ فیض عام ہے — رومی فنا ہوا، حبشی کو دوام ہے

کرم اے شہ عرب و عجم، کہ کھڑے ہیں منتظر کرم
وہ گدا کہ تو نے عطا کیا ہے جنہیں دماغ سکندری

(۱۴) **رمز و ایماء** :- یہ وہ خوبی ہے جو کسی شاعر میں وسعت مطالعہ اور قدرت کلام کی بدولت پیدا ہو سکتی ہے۔ بانگ درا میں ایمائی شاعری کے نمونے بکثرت موجود ہیں، ذیل میں چند اشعار درج کرتا ہوں:-

نشان برگ گل تک بھی نہ چھوڑ اس باغ میں گلچیں
تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں

کبھی میں غار حرا میں چھپا رہا برسوں — دیا جہاں کو کبھی جام آخریں میں نے
اے آب رود گنگا! وہ دن ہیں یاد تجھکو — اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا
بادہ ہے نیم رس ابھی شوق ہے نارسا ابھی — رہنے دو خم کے سر پہ تم خشت کلیسا ابھی

رولے اب دل کھول کر اے دیدۂ خونابہ بار — وہ نظر آتا ہے تہذیب حجازی کا مزار

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

نہ ستیزہ گاہ جہاں نئی، نہ حریف پنجہ فگن نئے
وہی فطرت اسد اللہی وہی مرحبی وہی عنتری

(۱۵) **اسلوب بیان** :- چونکہ فطرت نے اقبالؔ کو زبردست قوت متخیلہ کے ساتھ ساتھ زبان پر بھی قدرت عطا فرمائی تھی اسلئے انکا اسلوب بیان بڑا دلکش ہے۔ چند مثالیں لکھتا ہوں:-

اے کہ تجھکو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر — شاخ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما — لیکے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ
سطوت توحید قائم جن نمازوں سے ہوئی — وہ نمازیں ہند میں نذر برہمن ہوگئیں
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے — جو پیرہن اسکا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

مجھے پھونکا ہے سوز قطرۂ اشک محبت نے
غضب کی آگ تھی پانی کے چھوٹے سے شرارے میں

نفی ہستی اک کرشمہ ہے دل آگاہ کا!
لا کے دریا میں نہاں موتی ہے الا اللہ کا

(۱۶) **حقائق و معارف قرآنی** :- بانگ درا ہی نہیں بلکہ اقبالؔ کی پوری شاعری کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے شعر کے لباس میں اسلام کی تعلیمات کو پیش کیا ہے۔ بال جبریل اور ضرب کلیم میں یہ رنگ بہت شدت کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ لیکن بانگ درا میں بھی ہمیں اسکے بعض اعلیٰ نمونے مل سکتے ہیں چند شعر لکھتا ہوں:-

بندۂ مومن کا دل بیم و ریا سے پاک ہے — قوت فرمانروا کے سامنے بیباک ہے

نرالا سارے جہاں سے اسکو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصار ملت کی اتحاد وطن نہیں ہے

ہے ترک وطن سنت محبوب الٰہیؐ — دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے — تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں!
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں!

ہمنشیں مسلم ہوں میں، توحید کا حامل ہوں میں
اس صداقت پر ازل سے شاہد عادل ہوں میں

چھوتی نہ تھی یہود و نصاریٰ کا مال فوج — مسلم خدا کے حکم سے مجبور ہوگیا!
دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں — اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی
حنا بند عروس لالہ ہے خون جگر تیرا — تری نسبت براہیمی ہے معمار جہاں تو ہے

بتان رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہوجا!
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی!

ولایت پادشاہی، علم اشیاء کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں؟ فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں

نوٹ :- مجھے اعتراف ہے کہ اختصار کو مدنظر رکھنے کی وجہ سے بانگ درا کے محاسن شعری پر کما حقہ تبصرہ نہ کرسکا، لیکن جو کچھ میں نے لکھا ہے، طلبہ کی ضرورت کو پورا کرنے اور اقبالؔ کی شاعری کو سمجھنے کے لئے کافی ہے۔ اس مختصر مقدمہ کے بعد اب میں بانگ درا کی شرح شروع کرتا ہوں ---

---

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حصۂ اوّل

پہلی نظم برص ۳

حل لغات اور تشریح مشکلات | ہمالہ، لغوی معنی برف کا گھر، مراد ہے، وہ پہاڑ جو ہندستان کے شمال میں واقع ہے 'ہم' سنسکرت میں برف کو اور 'آلے' گھر کو کہتے ہیں۔ خلوت گاہ دل سے مراد ہے، خلوت میں غور و فکر۔ دامن کش سے مراد ہے مائل کرنے والا۔ فصیل، فصل سے نکلا ہے، لغوی معنی جدا کرنا، مراد ہے دیوار (شہر یا قلعہ کی)۔ دیرینہ روزی، کہنگی، پرانا پن۔ کلیم طور سینا۔ حضرت موسیٰ، جنہوں نے کوہ طور پر خدا کی تجلی دیکھی تھی + چشم بینا سے مراد ہے عقلمند آدمی + امتحان دیدۂ ظاہر۔ بقا بر + مطلع اوّل - غزل یا دیوان کا پہلا شعر + دستار فضیلت سے بزرگی اور عظمت مراد ہے + خندہ زن ہے، یعنی آفتاب کو شرماتی ہے + ثریا، چند ستاروں کا مجموعہ جو زمین سے بہت دور ہے + پہنا، بمعنی وسعت یا چوڑائی + سیال، جامد کی ضد ہے بمعنی بہتا ہوا + رہوار بمعنی گھوڑا + فراز بمعنی بلندی + کوثر، تسنیم، جنت کی نہروں کے نام ہیں + شاہد بمعنی محبوب + عراق ایرانی موسیقی میں ایک راگنی بھی ہے، اور ایک مقام کا نام بھی ہے جس میں کئی راگنیاں گائی جاتی ہیں + زلف رسا، بالوں کی درازی اور کثرت کو لفظ رسا سے ظاہر کرتے ہیں + آبشار جھرنا + آبائے انسان۔ مراد ہے قدیم زمانہ کے لوگ +

نظم کا مطلب | شاعر کوہ ہمالیہ سے خطاب کرتا ہے کہ تو ہندستان کی حفاظت کے لئے دیوار یا شہر پناہ کا کام دیتا ہے۔ اور تو اسقدر بلند ہے کہ آسمان بھی تیری پیشانی کو جھک کر چومتا ہے۔ تو دنیا کی پیدائش کے وقت سے موجود ہے لیکن ابھی تک جوان ہے۔ تجھ میں کسی طرح ضعف کے آثار پیدا نہیں ہوئے۔ حضرت موسیٰ نے تو جبل طور پر ایک تجلی دیکھی تھی۔ لیکن عقلمندوں کی نگاہ میں تو سراپا تجلی ہے یعنی تیرا وجود از سرتاپا، قدرت خداوندی پر شاہد ہے۔

بظاہر تو پہاڑ ہے۔ لیکن دراصل قدرت نے تجھے ہندوستان کا محافظ بنادیا ہے تو اسقدر اونچا ہے کہ اگر تجھے دیوان قرار دیا جائے تو یہ آسمان اس دیوان کا پہلا شعر ہے۔ اور تجھے دیکھکر ہر شخص کے دل میں تیری عظمت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ تیری چوٹیوں پر ہمیشہ برف جمارہتا ہے۔ اور یہ برف ایسا معلوم ہوتا ہے گویا تیرے سر پر فضیلت (بزرگی) کی پگڑی بندھی ہوئی ہے۔ اور یہ پگڑی اسقدر ارفع اور محترم ہے کہ کلاہ آفتاب کو بھی شرماتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شاعر ہمالیے دل پر کوہ ہمالہ کی بلندی اور عظمت کا نقش جمانا چاہتا ہے۔

اے ہمالہ! تیری چوٹیاں، ستاروں سے باتیں کرتی ہیں۔ یعنی بہت بلند ہیں اگرچہ تو زمین پر قائم ہے لیکن وسعت کے لحاظ سے آسمان معلوم ہوتا ہے۔ تیری وادیوں میں جو ندیاں بہتی ہیں، ان کا پانی نہایت شفاف ہے۔ اور ہوا، ان ندیوں کی سطح آب کو صاف کرتی رہتی ہے۔

بادل گویا ہوا کے گھوڑوں پر سوار ہیں اور بجلیاں گویا بادل کے ہاتھوں میں تازیانے ہیں تاکہ وہ ہوا کو زیادہ تیز چلا سکیں۔ قدرت نے تجھے عناصر اربعہ کے بمنزلہ بازیگاہ (کھیل کا میدان) بنایا ہے تیرے دامنوں میں بادل اسقدر تیزی کے ساتھ ہوا میں اڑتے ہیں، جیسے فیل بے زنجیر۔

تیرے دامن میں صدہا اقسام کے پھول کھلے ہوئے ہیں، جو ہوا کے جھونکوں سے ہلتے رہتے ہیں۔ ہر پھول اپنی پتی کی زبان سے یہ کہتا ہے کہ ہم تک کسی گلچیں کا ہاتھ نہیں پہونچ سکتا۔ اور قدرت نے ہمارا گھر ایسے بلند مقام پر بنایا ہے کہ وہاں کسی غیر کا گذر نہیں ہو سکتا۔

اب شاعر منظر کشی کا کمال دکھاتا ہے اور کہتا ہے کہ پہاڑ کی بلندی سے جو ندی گاتی ہوئی آرہی ہے اسکا پانی اسقدر شفاف اور خوشگوار ہے کہ جنت کی نہروں کے پانی سے مشابہ ہے اور اس میں اردگرد کی چیزوں کا عکس بھی نظر آتا ہے۔ کبھی بڑے بڑے پتھروں سے بچکر نکل جاتی ہے۔ اور کبھی اُن سے ٹکرا جاتی ہے۔

چونکہ پہاڑی ندیوں کے بہنے سے بہت خوش آئند آوازیں پیدا ہوتی ہیں۔ اسلئے شاعر نے 'ندی' کو ایک گویّا یا ماہر موسیقی فرض کرکے اُس سے خطاب کیا ہے کہ اے ندی! تیری طرح میرا دل بھی نغموں سے لبریز ہے۔ میں تیرا ہمدم، اور ہمراز ہوں، اسلئے تو میرے دل کے ساز کو بھی چھیڑتی جا، جس میں نہایت دلکش موسیقی پوشیدہ ہے۔

یہ بہت خوبصورت مصرع ہے، شاعر نے پہلے تو اپنے دل کو ساز سے تشبیہہ دی ہے۔ پھر اُس ساز کو "عراق دلنشیں" قرار دیا ہے۔

"دل سمجھتا ہے تیری آواز کو" اسکے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک تو وہ، جو میں نے اوپر بیان کردیئے۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ اقبال کے یہاں 'ندی' زندگی کی علامت ہے۔ یعنی وہ زندگی کو ندی یا جوئے آب سے تشبیہہ دیا کرتے ہیں چنانچہ اسی کتاب کے صفحہ ۱۷ پر جو نظم اُنہوں نے فلسفۂ غم کے عنوان سے لکھی ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں ؎

ایک اصلیت میں ہے نہرِ روانِ زندگی
گر کے رفعت سے ہجوم نوعِ انساں ہوگئی

اس معنی کو مدنظر رکھا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ اے ندی! میرا دل تیری حقیقت سے آگاہ ہے، کیونکہ جسطرح تو مسلسل رواں ہے، انسانی زندگی بھی اسی نہج پر بسر ہو رہی ہو۔ یعنی یہی حال حیات انسانی کا ہے۔

جب شام ہو جاتی ہے تو آبشاروں کی صدا بہت دلکش معلوم ہوتی ہے پہاڑوں میں شام کی خموشی گفتگو سے بھی زیادہ دلپذیر ہوتی ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا درخت، کھڑے کچھ سوچ رہے ہیں۔ اور رنگ شفق ایسا معلوم ہوتا ہے، گویا کسی نے پہاڑ کے رخسار پر غازہ (پوڈر) لگا دیا ہو۔

اسکے بعد جب شاعر ہمالہ کی قدامت پر غور کرتا ہے تو قدرتی طور پر اسکا ذہن قدیم زمانہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور وہ اس زمانہ کا تصور کرتا ہے جب انسان فیشن اور بناوٹ سے بالکل ناواقف تھا۔

تبصرہ | یہ اقبال کی سب سے پہلی نظم ہے جو سنہ ۱۹۰۱ء میں رسالہ مخزن کے پہلے نمبر میں شائع ہوئی تھی، اسکی دوسری خصوصیات حسب ذیل ہیں:۔

(۱) اس میں "وطن پرستی" کے جذبات پوشیدہ ہیں۔

(۲) اسالیب بیان اور تراکیب الفاظ دونوں میں انگریزی ادب کا عکس نظر آتا ہے۔

(۳) اسکی زبان میں فارسی کا رنگ ہے۔

(۴) اس میں منظر کشی کا کمال نظر آتا ہے۔

(۵) اثر آفرینی کی غرض سے اقبال نے نہایت موزوں الفاظ کا انتخاب کیا ہے۔

(۶) سلاست اور روانی کے ساتھ ساتھ خیالات کی دلکشی اور رعنائی بھی موجود ہے۔

(۷) "چھیڑتی جا!" کہکر اقبال نے شخصی رنگ پیدا کردیا ہے۔ اور اس طرز خطاب سے پوری نظم میں زندگی پیدا ہوگئی ہے۔

(۸) چونکہ یہ نظم وطن پرستی کے جذبہ کے تحت لکھی گئی ہے، اسلئے مبالغہ کا رنگ جگہ جگہ نمایاں ہے۔ مثلاً ع چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں'

(۹) اس نظم میں اقبال کا تخیل بہت حسین ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے اپنی روح کو وطن کے اس منظر سے ہم آہنگ کرلیا ہے۔

(۱۰) اقبال کی شاعری کے پہلے دور کی دو خصوصیات ہیں وطن پرستی اور ادبی مصوری (منظر کشی) اور یہ دونوں خصوصیتیں اس نظم میں بطرزِ احسن موجود ہیں۔

(۱۱) اس نظم میں اُن صوری اور معنوی خوبیوں کے سارے ابتدائی نقوش پائے جاتے ہیں، جنھوں نے آگے چل کر اقبال کو زندۂ جاوید بنا دیا۔

(۱۲) اس نظم میں معنی اور صورت دونوں کے لحاظ سے بہترین بند یہ ہے:۔

آتی ہے ندی فرازِ کوہ سے گاتی ہوئی
کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی

دوسری نظم [illegible]

حلِ لغات اور تشریح مشکلات | شناسائے خراش عقدۂ مشکل۔ اسکے لفظی معنی ہیں۔ مشکل مسئلہ کی پریشانی سے واقف۔

چونکہ 'گل' کا شمار محبوبوں میں ہے، اور محبوب کے متعلق شاعری میں طے کرلیا گیا ہے کہ وہ دنیا کی کسی تکلیف، مصیبت، پریشانی یا رنج و غم سے آشنا نہیں ہوتا۔ اسلئے اس نظم میں شاعر نے "گل" سے ان الفاظ خطاب کیا ہے۔ ترے پہلو میں دل نہیں۔ یعنی تیری زندگی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تو کبھی کسی پر عاشق نہیں ہوا۔ زیب محفل، بمعنی محفل کی رونق یا زیبائش۔ شریک شورشِ محفل۔ یعنی تو عاشقوں

کی جماعت میں شامل نہیں ہے + چمن سے مراد ہے دنیا + میں سراپا سوز و سازِ آرزو ہوں - یعنی عاشق ہوں + بے گدازِ آرزو یعنی تجھے کسی کی تمنا نہیں ہے + آئین یعنی طریقہ یا ضابطہ + بہ نظر غیر از نگاہِ چشمِ صورت بیں نہیں - یعنی یہ طریقہ ظاہر پرست لوگوں کا ہوتا ہے، جو حقیقت سے ناآشنا ہوتے ہیں + دستِ جفا جو - ظلم کرنے والا ہاتھ مراد ہے، گلچیں کا ہاتھ + دیدۂ حکمت - حکمت کی آنکھ یعنی، فلسفی یا سائنسداں کا طریقِ کار + دیدۂ بلبل - بلبل کی آنکھ یعنی عاشق کا طریقِ کار + سوز بانوں پر - گل کی پتیوں کو زبان سے تشبیہہ دیتے ہیں - برگِ ریاضِ طور - لغوی معنی کوہِ طور کے مقدس باغ کا پتہ یا پھول مراد ہے، تو بھی اپنی اصل کے لحاظ سے مقدس ہے + میں چمن سے دور ہوں - اشارہ ہے حضرت آدمؑ کے جنت سے اخراج کی طرف - شاعر کا مطلب یہ ہے کہ میں بھی اپنے وطن سے دور ہوں + زخمیٔ شمشیرِ ذوقِ جستجو - لفظی معنی ذوقِ تلاش کی تلوار کا زخمی - مراد یہ ہے کہ انسان میں تحقیق اور تلاش کا مادہ پایا جاتا ہے - اور یہی جوہر اُسے دیگر تمام حیوانات سے متمیز کرتا ہے + سامانِ جمعیت، یعنی اطمینانِ قلب کا سبب + جگر سوزی، بمعنی کاوش، تلاش، جستجو + چراغِ خانۂ حکمت، یعنی سائنس کی ترقی کا ذریعہ یا انسانی معلومات میں اضافہ کا وسیلہ + جامِ جم، جمشید کا پیالہ، جس میں ساری دنیا کا حال نظر آتا تھا - جمشید قدیم ایران کا نامور بادشاہ گذرا ہے - جامِ جمشید فارسی ادب میں مشہور ترکیب ہے + آئینۂ حیرت - یعنی حیرت مراد ہے - وہ حیرت جو غور و فکر اور تحقیق کے وقت پیدا ہوتی ہے - اور یہی حیرت، انسان کو تحقیق اور تلاش پر اکساتی ہے - آئینۂ حیرت کی ترکیب ادبی نقطۂ نگاہ سے بہت خوب ہے، کیونکہ شعراء آئینہ کو خود حیراں باندھتے ہیں + تلاشِ متصل - جستجوئے مسلسل جو انسان کا خاصہ

ہے - توسن بمعنی گھوڑا - توسنِ ادراکِ انسان کو خرام آموز ہے - یعنی شاعر نے ادراک کو توسن قرار دیکر اسکے لئے خرام ثابت کیا ہے - یہ استعارہ بالکنایہ کی بہت عمدہ مثال ہے - مطلب یہ ہے کہ تلاشِ متصل ہی کی بدولت، دنیا میں تمدن کی ترقی ہوتی ہے - اسی لئے تلاش کو شمعِ جہاں افروز سے تعبیر کیا ہے تلاش اور تحقیق سے انسان کی قوتِ مدرکہ میں ترقی ہوتی ہے - اور اسکی ترقی سے دنیا ترقی کرتی ہے - اگر انسان میں تحقیق اور تلاش کا مادہ نہوتا تو آج نہ ریڈیو ہوتا، نہ تار، نہ بجلی کی روشنی ہوتی، نہ ریل اور موٹر کار - نہ تہذیب و تمدن کا نشان ہوتا، نہ علوم و فنون کا چرچا ہوتا -

تبصرہ | اس نظم میں بنیادی تصور یہ ہے کہ پھول بہت دلکش ہوتا ہے - لیکن اس میں تحقیق اور تلاش کا مادہ نہیں ہے - اور انسان اگرچہ سراپا درد و غم ہے، یکسر سوز و گداز ہے - لیکن اس میں ادراک یعنی علم حاصل کرنے کی قوت موجود ہے -

دوسری بات غور طلب یہ ہے کہ یہ نظم اُس زمانہ کی ہے، جب شاعر فطرت کا مطالعہ کر رہا تھا، اور تحقیق و تلاش میں مصروف تھا - تیسری بات یہ ہے کہ اس نظم کا موضوع بہت معمولی ہے، لیکن شاعر نے اس سے بہت اعلیٰ نکتہ پیدا کیا ہے - اس نظم کا انداز بھی انگریزی نظموں سے ملتا جلتا ہے - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں اقبالؔ انگریزی شعراء کا مطالعہ کر رہے تھے -

مطلب | اے گلاب کے حسین پھول! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تیرے سینہ میں دل نہیں ہے - اگر ہوتا، تو، تو بھی میری طرح سراپا تلاش اور آرزو ہوتا، تیری زندگی میں کوئی آرزو نہیں پائی جاتی - تو دردِ الفت سے واقف نہیں ہے، لیکن میں تو سراپا آرزو ہوں -

تو مطمئن رہ! میں نہ گلچیں ہوں، نہ صورت بیں، (ظاہر پرست) اسلئے میں تجھے شاخ سے جدا کر کے کسی قسم کی تکلیف نہیں پہونچاؤنگا - میں ماہرِ علمِ نباتات بھی نہیں ہوں کہ پہلے تجھے شاخ سے جدا کروں، پھر تیری پتیاں الگ الگ کروں، پھر اُن کے ٹکڑے کروں، اور دیکھوں کہ تیری پتی کن اجزا سے مرکب ہے - بلکہ میں تو حسن پرست یعنی عاشقِ فطرت ہوں - میں تو تجھے عاشق کے زاویۂ نگاہ سے دیکھتا ہوں - یعنی تیرے حسن و جمال سے لطف اندوزی کے لئے، تجھکو شاخ سے توڑنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے -

اے گل! تو چُپ چُپ رہتا ہے! یہ بات کیا ہے؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تیرے سینہ میں کوئی راز پوشیدہ ہے، کیا تجھے اپنے اصلی وطن - باغِ جنت - سے جدائی کا خیال ستا رہا ہے؟ یہ بات تو ٹھیک ہے، قرینِ قیاس ہے - کیونکہ تیری اور میری دونوں کی اصل، یہ دنیا تو نہیں ہے - تو بھی جنت سے آیا ہے، اور میں بھی جنت ہی سے آیا ہوں -

لیکن ہم دونوں میں فرق بھی ہے - وہ یہ کہ تو اپنی حالت سے بالکل مطمئن ہے، مگر میں تیری خوشبو کی طرح پریشان (منتشر) رہتا ہوں، کیونکہ زخمیٔ شمشیرِ تحقیق و تلاش ہوں، میرے اندر تحقیق و جستجو کا مادہ ہے - اور یہ مادہ مجھے ہر وقت آمادۂ تلاش رکھتا ہے -

بظاہر تو میری زندگی سراپا سوز و گداز ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ فطرت نے میرے ساتھ ناانصافی نہیں کی ہے - میری یہ پریشانی ہی دراصل، میری فارغ البالی کا سنگِ بنیاد ہے - اور تحقیق و تلاش کے سلسلہ میں جسقدر جگر سوزی اور کاوش مجھے کرنی پڑتی ہے، اسکا صلہ یہ ملتا ہے کہ میرے علم میں اضافہ ہوجاتا ہے - بظاہر میں ناتواں ہوں، نہ شیر کے سے پنجے ہیں، نہ ناخن ہیں،

لیکن یہی ناتوانی، مجھے حفاظت کے سامان مہیا کرنے پر آمادہ کرتی ہے - اور اگرچہ میں حیران رہتا ہوں، لیکن یہی حیرانی مجھے تحقیق پر راغب کرتی ہے - سچ تو یہ ہے کہ یہ جستجوئے پیہم، جو بظاہر مجھے پریشان رکھتی ہے - اس دنیا کی ساری دلفریبی کا سبب ہے - اگر یہ جذبہ کارفرما نہوتا تو انسان ابھی تک عالمِ برہنگی میں غاروں کے اندر ہی زندگی بسر کرتا ہوتا - اسی جذبۂ تحقیق نے انسان کی قوتِ مدرکہ کو ترقی اور بلندی کی راہ پر گامزن کیا ہے - یعنی اسی جذبہ کی بدولت تہذیبِ انسانی نے موجودہ بلند مرتبہ تک ترقی کی ہے -

تیسری نظم بر ص ۸

حلِ لغات اور توضیحِ مشکلات | دیارِ نو، بمعنی نیا شہر، نئی جگہ + وسعتِ آغوشِ مادر، مراد ہے ماں کی گود + شورشِ زنجیرِ در - لفظی معنی دروازہ کی کنڈی کا شور، جب بچے روتے ہیں، تو مائیں اُن کو کنڈی بجا کر بہلاتی ہیں + دروغِ مصلحت آمیز - لفظی معنی وہ جھوٹ جو کسی مصلحت کے لئے بولا جائے - جیسے مائیں بعض اوقات بچوں کے سوالات کے جواب میں بولا کرتی ہیں - مثلاً جب بچے دریافت کرتے ہیں کہ چاند میں یہ کالا کالا کیا ہے تو مائیں کہدیتی ہیں کہ بیٹا یہ بڑھیا ہے جو چرخہ کات رہی ہے - یہ ترکیب گلستاں کے اس مشہور مقولہ سے ماخوذ ہے - "دروغِ مصلحت آمیز، بہ ز راستیٔ فتنہ انگیز"۔

اس نظم میں اقبالؔ نے چھوٹے بچوں کی نفسیاتی زندگی کی تصویر کھینچی ہے - جس سے اُن کی قوتِ مشاہدہ کا ثبوت مل سکتا ہے -

چوتھی نظم ص ۹

حلِ لغات اور تشریح تراکیب | فکر - لغوی معنی، غور، تردد، تدبر، سوچ وچار۔ فلسفہ کی اصطلاح میں فکر کہتے ہیں، معانی جدیدہ کے حصول کی غرض سے ذہنی تردد کرنا - یعنی جن چیزوں کی معرفت ہمیں حاصل ہو چکی ہے، اُن کو اس غرض سے پیشِ نظر رکھنا کہ ان کی مدد سے کوئی نئی بات حاصل ہو سکے فکر کا خاص وظیفہ یہ ہے کہ اسکی بدولت ہم نتائج نکالتے ہیں + تخیل، لغوی معنی ہیں، خیال میں آنا۔ منطق کی اصطلاح میں اسکا مفہوم یہ ہے کہ جب نفس مدرک اُن تصویر جزئیہ کا ادراک کرتا ہے جو بذریعہ حواس خمسہ ظاہری، خزانۂ خیال میں جمع ہو جاتی ہیں تو اس کیفیتِ ادراکیہ کو تخیل کہتے ہیں۔ - شاعر کی عظمت اسکے تخیل کی بلندی پر موقوف ہے + بربط - ایک عجمی ساز کا نام ہے، یہاں مراد ہے فنِ شاعری + سرمایہ دارِ سے مراد ہے محترم یاذی وقار + انداز، یہاں مراد ہے اسلوب بیان + غنچۂ دلی سے مراد ہے غالب کی شاعری - اور گلِ شیراز سے مراد ہے حافظ اور سعدی کی شاعری + ویمر (WEIMAR) جرمنی میں ایک قصبہ ہے، جسکی شہرت دنیائے ادب میں اسلئے ہے کہ یہاں ایک زمانہ میں جرمنی کے چار نامور ادیب رہتے تھے یعنی گوئٹے، ہرڈر، شلر اور ویلینڈ - گوئٹے اسی جگہ مدفون ہے۔ قصبہ کی آبادی پچاس ہزار ہے + لطفِ گویائی سے شاعری مراد ہے + نظارہ آموزِ نگاہِ نکتہ بیں کا مطلب یہ ہے کہ ہندستان کی سرزمین، عقلمندوں کے لئے اپنے اندر بہت کچھ سامانِ عبرت رکھتی ہے + جہان آباد - دلّی کا لقب ہے۔ ع

اے جہاں آباد! اے اسلام کے دارالعلوم + شمس و قمر سے علما، اور اُدبا مراد ہیں۔

تبصرہ | اس نظم میں جسے ہم مرثیہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اقبال نے ہندستان کے سب سے بڑے فارسی شاعر کی خدمت میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ غالب ۱۷۹۶ء میں بمقام آگرہ پیدا ہوئے۔ اور ۱۸۶۹ء بمقام دلّی وفات پائی۔ انکا مزار بستی نظام الدین (دلی) میں چونسٹھ کھمبے کی دیوار سے ملحق ہے۔ اقبال نے چونکہ غالب کے اندازِ بیان سے استفادہ کیا ہے۔ اور اُن کے کلام سے معنوی رنگ میں فیض بھی حاصل کیا ہے۔ اسلئے اُنہوں نے بڑے خلوص کے ساتھ اس نظم میں غالب کے کمالات کو واضح کیا ہے۔ اور اسکی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں ضمنی طور پر، اُنہوں نے غالب کی شاعری پر تبصرہ بھی کر دیا ہے۔ اور اس میں کیا شک ہے کہ محاسن کلام غالب کو اقبال سے بڑھ کر کون سمجھ سکتا ہے؟ جیسا کہ میں مقدمہ میں لکھ چکا ہوں، بانگ درا کی غزلوں اور نظموں کا بغور مطالعہ کیا جائے تو اقبال کی ابتدائی شاعری پر غالب کا اثر صاف نمایاں ہو سکتا ہے۔

نظم کا مطلب | کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ انسانی تخیل کا منتہائے پرواز کیا ہے؟ انسانی تخیل کہاں تک پرواز کر سکتا ہے؟ تو اُسے غالب کے (فارسی) کلام کا مطالعہ کرنا چاہئے[1] اگر شاعری کی محفل کو جسم قرار دیا جائے تو غالب اسکی روح ہے۔ "محفل سے پنہاں بھی رہا" اسکے دو معنی ہیں، ایک تو یہ کہ چونکہ روح، نظر نہیں آتی، اسلئے غالب پنہاں رہا۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ اس جملہ میں لطیف اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ غالب کا کلام اسقدر بلند ہے کہ بہت کم لوگ اسکو سمجھ سکتے ہیں۔ یعنی اسکے معانی عام لوگوں کی نگاہوں سے پنہاں ہیں۔ غالب اس حُسن کا جویا ہے جو سوزِ حیات بنکر، ہر شئے میں پوشیدہ ہے۔ یعنی اسکے کلام میں حُسنِ مطلق کا جلوہ نظر آتا ہے۔

[1] فارسی کی قید میں نے بڑھائی ہے اسلئے کہ غالب کے تخیل کی بلندی کا اندازہ اسکے فارسی کلام سے ہو سکتا ہے نہ کہ اُردو سے ۱۲

دوسرا بند | جس طرح پہاڑی ندی کے شور (نغمہ) سے کوہساروں میں دلکشی اور جاذبیت پیدا ہو جاتی ہے، اُسی طرح تیری شاعری (بربط) سے دنیا کی محفل میں وقار اور تمکنت کی شان پیدا ہو گئی ہے۔ تیرے تخیل کی بدولت، قدرت (فطرت) کے حُسن کو چار چاند لگ گئے ہیں۔ تو نے اپنی اس خداداد قوت سے فطرت کی خوبیوں کو واضح کر دیا ہے۔ قوتِ متخیلہ کے علاوہ، قدرت نے تجھے قوت مفکرہ، یعنی غور وفکر کی طاقت بھی عطا کی ہے۔ اور اس قوت کی بنا پر تو نے اپنے کلام میں نئے نئے (اچھوتے) مضامین باندھے ہیں۔ ان دو بنیادی خوبیوں کے علاوہ تیرے کلام میں ایسی شوخی پائی جاتی ہے کہ اسکی وجہ سے تیرے اشعار میں زندگی پیدا ہو گئی ہے۔ تیرے کلام میں ادبی مصوّری کا کمال بھی پایا جاتا ہے۔ یعنی تو نے اپنے اشعار میں وارداتِ عاشقی کی ہوبہو تصویریں کھینچ دی ہیں۔

تیسرا بند | تیرا کلام، انسان کی قوت بیان کے لئے باعثِ صد عز و افتخار ہے اور تیرا تخیل اسقدر بلند ہے کہ ثریا بھی اسکی بلندی پر محوِ حیرت ہے۔ تیرا اندازِ بیان اسقدر دلکش اور حسین ہے کہ خود مضامین، اسیر شکار ہونے کو آمادہ نظر آتے ہیں تیرے کلام میں اسقدر حلاوت اور شیرینی ہے کہ اسکے سامنے حافظ اور سعدی کا رنگ بھی پھیکا معلوم ہوتا ہے۔ شاعری میں تیرا ہم پلہ، تیرے ہمعصروں میں اگر کوئی ہوا ہے تو وہ جرمنی کا مشہور شاعر گوئٹے تھا۔ لیکن کیا زمانہ کا انقلاب ہے کہ تو جس شہر میں مدفون ہے وہ اُجڑ چکا ہے، اور گوئٹے جس شہر میں مدفون ہے وہ آباد ہے۔ یعنی تو اُس قوم میں پیدا ہوا جو رو بہ زوال ہے، اور وہ اس قوم میں پیدا ہوا جو رو بہ ترقی ہے۔

نوٹ :- گوئٹے ۱۷۴۹ء میں پیدا ہوا اور اس نے ۱۸۳۲ء میں وفات پائی۔

چوتھا بند | شاعری کے میدان میں وہی شاعر تیری ہمسری کر سکتا ہے، جسے قدرت نے تیری طرح قوت متخیلہ اور قوت مفکرہ (تخیل اور فکر) دونوں عطا کی ہوں۔ کیسی عبرت کا مقام ہے کہ اب ہندستان میں ایسے حالات پیدا ہو گئے ہیں، کہ کسی دوسرے غالب کے ظہور کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ حالانکہ زبان اُردو، ابھی مرتبۂ کمال کو نہیں پہونچی ہے۔ اسلئے ضروری ہے کہ کوئی ایسا شخص پیدا ہو جو اسکو سنوارے، یعنی زبان اُردو اُس شمع کی مانند ہے جسے پروانہ (شاعر) کی دلسوزی درکار ہو۔

پانچواں بند | اے دہلی! تو صدیوں سے علم وہنر کا مرکز رہی ہے۔ تیری تاریخ ناموروں کے تذکروں سے معمور ہے۔ تیری عمارات زبانِ حال سے اُن پر نوحہ خوانی کر رہی ہیں۔ تیری خاک میں بڑے بڑے نامور شعرا اور ادیب مدفون ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ غالب جیسا اور نادرِ روزگار شاعر، تیری خاک سے پیدا نہیں ہوا۔

تبصرہ | اس نظم میں اقبال نے غالب کی شاعری پر ایسی جامع اور مانع تنقید کی ہے کہ اس سے بہتر شاید ہی ہو سکے۔ اسکے مطالعہ سے کلام غالب کی حسب ذیل خوبیاں ہمارے سامنے واضح ہو سکتی ہیں۔

(۱) غالب، غیر معمولی قوتِ تخیل اور قوتِ فکر کا مالک تھا۔ اقبال نے اس نظم میں متعدد طریقوں سے ان دونوں بنیادی خوبیوں کو واضح کیا ہے۔ یہ وہ خصوصیات ہیں، جن کی بنا پر غالب کو ہندستان کے صفِ اوّل کے شعراء میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ اور میری رائے میں بیدل کے علاوہ اور کوئی شاعر ان خصوصیات میں اسکی ہمسری نہیں کر سکتا۔ عرفی کا شمار بھی اسی صف میں ہے لیکن وہ ہندی نہیں تھا۔

(۲) غالب کے کلام میں سوز و حیات کا رنگ پایا جاتا ہے۔

(۳) غالب اس دنیا میں حسنِ مطلق کے دیدار کا آرزومند تھا۔ اسلئے اسکے کلام میں اسکی جستجو کا تصور جا بجا پایا جاتا ہے۔
(۴) اسکے کلام میں بلا کی شوخی پائی جاتی ہے۔
(۵) اسکا اسلوبِ بیان نہایت دلکش اور بدیع ہے۔
(۶) اسکے کلام میں حافظ اور سعدی کی سی سرمستی اور حلاوت موجود ہے۔
(۷) انیسویں صدی میں اگر دنیا میں کوئی شاعر اسکا ہمسر تھا تو وہ گوئٹے تھا۔
(۸) اسکے کلام میں پروازِ تخیل کے ساتھ ساتھ فکر کی بلندی بھی موجود ہے۔
اور یہ امتزاج دنیا کے معدودے چند شعراء ہی کے کلام میں پایا جاتا ہے۔

واضح ہو کہ اقبال نے یہ محاسن غالب کے فارسی کلام کو مدنظر رکھکر بیان کئے ہیں، کیونکہ یہ خوبیاں بطرز احسن اور بوجہِ اتم، فارسی کلام ہی میں نظر آتی ہیں۔ چنانچہ غالب نے خود اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے۔

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو، کہ بیرنگ من است

یعنی اے مخاطب! اگر تو میرے مرتبہ سے واقف ہونا چاہتا ہے تو میرے اردو کلام کے بجائے فارسی کلام کا مطالعہ کر۔ میرا خیال یہ ہے کہ غالب کے فارسی دیوان کا جواب بیدل کے علاوہ سارے فارسی لٹریچر میں نہیں مل سکتا۔ افسوس کہ میں اس شرح میں اپنے اس دعوی پر دلائل پیش نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ شرح ان مباحث کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اگر خدا نے دیوان غالب کی شرح لکھنے کا موقع دیا تو شاید کچھ عرض کر سکوں۔

نظم نمبر ۱۱

حل لغات و شرح مشکلات | بلندی سے، یعنی بلندی کے سبب۔ فلک بوس،

آسمان کو چھونے والا یعنی بہت بلند + نشیمن، بمعنی گھونسلہ یا آرامگاہ، یا جائے قیام + گل پاش، بمعنی پھول بکھیرنے والا۔ میرا دامن گل پاش ہے۔ یعنی بارش ہی پھولوں کے اگنے کا باعث ہے + دُر افشاں، لغوی معنی موتی بکھیرنے والا۔ شاعر نے بوندوں کو موتیوں سے تشبیہ دی ہے، اور کسانوں کی نظر میں بارش کی بوندیں، موتیوں سے بھی بڑھکر ہوتی ہیں۔

ناقۂ شاہدِ رحمت کا حدی خواں ہونا۔ مطلب یہ ہے کہ بادل اللہ کی رحمت کا نشان ہے، اسی لئے شاعر نے اسے شاہدِ رحمت کے ناقہ کا حدی خواں ہونا قرار دیا ہے۔ یہ مصرع استعارہ بالکنایہ کی بہت عمدہ مثال ہے۔ شاعر نے پہلے اللہ کی رحمت کو ایک پردہ نشین حسینہ قرار دیا۔ پھر اسکے لئے ناقہ ثابت کی۔ کیونکہ شریف پردہ نشین حسینہ عموماً محمل ہی میں ہوتی ہے۔ اسکے بعد اس ناقہ کے لئے ایک حدی خواں ثابت کیا۔ کیونکہ جب حدی خواں، ناقہ کو سرود سناتا ہے تو وہ تیز چلتی ہے + ناقہ بمعنی تیز رفتار اونٹنی + شاہد کثیر المعانی لفظ ہے یہاں حسینہ مراد ہے + حدی، وہ نغمہ یا سرود جو شتربان اونٹوں کو تیز چلانے کے لئے گاتے ہیں + غم زدا۔ زدودن بمعنی مٹانا، دور کرنا صاف کرنا۔ غم زدا، یعنی غم کو دور کرنے والا + گیسو بکر بخ ہستی پہ بکھر جاتا ہوں۔ یہ مصرع استعارہ بالکنایہ کی عمدہ مثال ہے۔ جس طرح گیسو کسی حسینہ کے رخساروں پر بکھر جاتے ہیں تو اسکے حسن کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔ اسی طرح جب بادل زمین پر برستا ہے تو سبزہ لہلہانے لگتا ہے اور زمین خوبصورت معلوم ہونے لگتی ہے شانۂ موجۂ صرصر بھی استعارہ بالکنایہ ہے۔ پہلے ہوا کو ایک موج فرض کیا پھر گیسو کی رعایت سے موجۂ صرصر کو شانہ قرار دیا۔ تاکہ وہ گیسوئے ابر کو سنوار سکے۔ شانۂ موجۂ صرصر سے سنور جاتا ہوں۔ یعنی تیز ہوائیں مجھے دوبارہ مجتمع کر دیتی ہیں + لبِ جو، یعنی نہر یا ندی کے کنارے + گرداب کی بالیاں پہناتا ہوں، جب پانی میں بوندیں پڑتی ہیں تو قدرتی طور پر حلقے پیدا ہو جاتے ہیں، ان کو شاعر نے گرداب (بھنور) فرض کیا ہے۔ یہ مصرع تصویر کشی کی عمدہ مثال ہے + مزرع نوخیز، بمعنی نئی اگی ہوئی کھیتی + امید ہوں میں، یعنی اسکی شادابی مجھ پر موقوف ہے + زادۂ بحر، یعنی سمندر کا بیٹا۔ جب آفتاب سمندر پر چمکتا ہے تو پانی بھاپ بنکر اڑتا ہے، اور وہ بھاپ اوپر جاکر بادل کی شکل اختیار کر لیتی ہے + پروردۂ خورشید یعنی مجھے آفتاب نے پالا پوسا ہے + چشمۂ کوہ بمعنی پہاڑی ندی، جو عموماً شور کرتی ہے + شورش قلزم بمعنی سمندر کی طغیانی یا اسکا جوش و خروش جب پہاڑوں پر بارش ہوتی ہے تو پہاڑی ندیوں میں غیر معمولی جوش پیدا ہو جاتا ہے۔ محوِ ترنم۔ نغمہ سرائی یا موسیقی میں مست + قم عربی لفظ ہے، لغوی معنی ہیں اٹھ! مراد ہے زندہ کر دینا۔ جب بارش ہوتی ہے تو خشک گھاس ہری ہو جاتی ہے۔ غنچہ کو ذوق تبسم دینے سے مراد یہ ہے کہ غنچے شگفتہ ہو کر پھول بنجاتے ہیں۔

آخری شعر میں تعقیدِ لفظی ہے۔ اسکی نثر یوں ہوگی: دامن کو جھاڑ دیا دہقانوں کے جھونپڑے، میرے فیض سے شبستانوں کے نمونے بنگئے ہیں۔ یعنی جب بادل گھر کر آتا ہے۔ تو دہقانوں کے دل خوشی سے لبریز ہو جاتے ہیں۔

نظم نمبر ۱۴

اس نظم میں اقبال نے بچوں کو یہ نصیحت کی ہے کہ دشمن کی چکنی چپڑی باتوں میں ہرگز نہ آنا چاہئے۔

نظم نمبر ۱۵

اس نظم کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں کوئی چیز بری نہیں ہے۔ یہ نظم ایمرسن (R. W. EMERSON) کے کلام سے ماخوذ ہے۔ امریکہ کا یہ نامور شاعر، خطیب اور انشا پرداز ۱۸۰۳ء میں بمقام بوسٹن (U.S.A.) پیدا ہوا تھا، اور اسکی نظموں کا مجموعہ ۱۸۴۷ء میں شائع ہوا تھا۔ اس نے بڑی عزت کی زندگی بسر کرنے کے بعد ۱۸۸۲ء میں وفات پائی۔

نظم نمبر ۲۰

اس نظم میں اقبال نے بچوں کو ہمدردی کا سبق دیا ہے۔ یہ نظم مشہور انگریز شاعر ولیم کاؤپر کے کلام سے ماخوذ ہے۔ جو ۱۷۳۱ء میں پیدا ہوا تھا اور ۱۸۰۰ء میں فوت ہوا۔ اٹھارہویں صدی میں اسکی نظمیں انگلستان میں بہت مقبول تھیں۔

نظم نمبر ۲۱

حل لغات و شرح مشکلات | خفتگانِ خاک یعنی مردے۔ استفسار بمعنی سوال کرنا یا دریافت کرنا + اٹھی نقاب روئے شام، یعنی شام ہو گئی + شانۂ ہستی پہ گیسوئے شام بکھر گیا۔ یعنی دنیا پر تاریکی چھا گئی + مگر بمعنی شاید، آسمانِ لب گفتار پہ جادو کر رہا ہے۔ یعنی لوگوں پر نیند کا غلبہ ہوتا جاتا ہے۔ دد، بمعنی گھنٹہ + نفور، نفرت کرنے والا + حیرت خانۂ امروز و فردا، یعنی کیا وہاں بھی اس دنیا کی طرح دن کے بعد رات اور رات کے بعد دن ہوتا ہے + پیکارِ عناصر، عناصر اربعہ کی لڑائی یا تصادم۔ اس سے کون و فساد مراد ہے + دل کی مجبوری سے انسان کا مجبور ہونا مراد ہے + پہلو سے دل نکل جاتا ہے۔ یعنی انسان بے چین ہو جاتا ہے + رشتہ و پیوند، مراد رشتہ داری یا دوستی + ایک معیشت اور سو افتاد سے مراد یہ ہے کہ ایک زندگی اور سیکڑوں پریشانیاں لاحق ہیں + کیا وہاں کے انسان بھی اپنی اصلیت سے بیگانہ ہیں؟ مراد تکبر اور غرور ہے۔ انسان اگر

اپنی اصلیت پر غور کرے تو کبھی تکبر نہیں کر سکتا، کیونکہ اسکی اصل مٹی ہے + امتیاز ملت و آئین سے فرقہ بندی اور باہمی نفرت مراد ہے + حُسنِ ازل سے ذاتِ خداوندی مراد ہے۔ معصیت سوزی، یعنی گناہوں کو جلانا + تادیب بمعنی ادب سکھانا، یا اصلاح حال کرنا + لن ترانی سے مراد یہ ہے کہ انسان خدا کو نہیں دیکھ سکتا + تشنیِ ذوقِ استفہام سے مراد ہے دل میں جستجو تلاش اور دریافت کا شوق + گنبدِ گرداں لغوی معنی گھومنے والا گنبد، مراد ہے آسمان۔

خفتگان خاک سے استفسار کے پردہ میں شاعر نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ موت انسان کے لئے ایک معما ہے۔ اور ہر انسان اسکا راز معلوم کرنا چاہتا ہے کہ مرنے کے بعد جو دنیا ہوگی وہ کیسی ہوگی؟ اسی دنیا کی طرح؟ یا اس سے مختلف ہوگی؟ اس نظم کی خوبی یہ ہے کہ اس میں اقبال نے اس دنیا کی زندگی کا صحیح اور پُرنم نقشہ کھینچ دیا ہے۔ اور سب سے بڑا سوال یہ کیا ہے کہ یہاں تو ہم خدا کو نہیں دیکھ سکتے تو کیا اُس دنیا میں اسکی دید سے دل مہجور کو تسکین حاصل ہو سکیگی یا وہاں بھی دیدار کے سوال کے جواب میں "لن ترانی" ہی سُنیں گے؟ حضرت موسیٰ نے اللہ سے کہا تھا، ربّ ارنی، اے رب تو اپنے آپ کو مجھے دکھا تو اللہ نے جواب دیا، لن ترانی، یعنی تو مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتا۔

نظم بر صـ۲۷

حل لغات اور شرح مشکلات | سیماب وار، یعنی مضطرب + طواف، بمعنی کسی کے گرد پھرنا + تفتہ، بمعنی جلا ہوا تفتہ دل کنایہ ہے عاشق سے + تفتہ دل کا نخل تمنا ہرا نہ ہو۔ یہ استعارہ بالکنایہ ہے۔ مراد یہ ہے کہ عاشق کامیاب نہو + عاشقِ حسنِ قدیم سے خدا کا عاشق مراد ہے اس مختصر نظم میں اقبال نے ایک مشہور مظہر فطرت یعنی شمع و پروانہ کے باہمی تعلق کی دلکشی

انداز میں حکاسی کی ہے۔

نظم بر صـ۲۸

حل لغات اور شرح مشکلات | رسا، یہاں مراد یہ ہے کہ میری پہونچ بہت دُور تک ہے + خضر ایک مشہور روحانی بزرگ کا نام ہے۔ جو بھولے بھٹکوں کو راستہ دکھاتے ہیں + خجستہ پا، لغوی معنی ہیں وہ شخص جسکے پاؤں مبارک ہوں، مراد ہے وہ شخص جسکا وجود دوسروں کے لئے برکت کا باعث ہو + مفسّر، تفسیر یا شرح کرنے والا + کتاب ہستی سے ہستی مراد ہے۔ مظہر شانِ کبریا۔ اللہ کی شان کی مظہر۔ "مظہر" کو دو طرح پڑھ سکتے ہیں۔ مُظہِر، بمعنی ظاہر کرنے والا۔ اور مَظہَر بمعنی جائے ظہور۔ یہاں مراد ہے وہ اشیا جو آنکھوں سے نظر آئیں، یا حواس کے ذریعہ سے محسوس ہوں۔ باطن بمعنی اندرونی یا پوشیدہ، یا ظاہر کی ضد ہے۔ ہر شئے کا باطن وہ ہے جو آنکھ یا حواس سے مخفی ہو۔ مثلاً جسم، انسان کا ظاہر ہے، اور روح باطن ہے + علم کے معنی ہیں جاننا، اور معرفت کے معنی ہیں پہچاننا۔ یہاں مراد ہے حقیقت سے آشنا ہو جانا۔ علم اور معرفت میں یہ فرق ہے کہ فلسفی یا منطقی کو خدا کا علم تو ہو سکتا ہے لیکن اسکی معرفت حاصل نہیں ہو سکتی + بے تابی سے اس جگہ شک و شبہ یا حیرت یا پریشانی مراد ہے جو حقیقت سے آگاہ نہونے کی بنا پر لاحق ہو جاتی ہے + صداقت سے مراد وہ حقائق ہیں جو علم یا فلسفہ کی بدولت حاصل ہوتے ہیں + حسن کی بزم سے عاشقانہ زندگی مراد ہے + زمان و مکان، دنیا میں کوئی شخص نہیں جو ان دو لفظوں سے واقف نہو، لیکن بہت کم لوگ ہیں جو ان کی حقیقت سے آگاہ ہیں + رشتہ بپا، مراد ہے قیدی یا اُلجھا ہوا یا گرفتار یعنی ہر شخص زمان و مکان کی قید میں ہے + طائر سدرہ آشنا، لغوی معنی وہ پرند جو سدرہ سے واقف ہو، یعنی جسکی پرواز درخت سدرہ تک ہو۔ سِدرہ، بیری کے

یعنی کائنات کی حقیقت + مظاہر۔ مظہر کی جمع ہے، بمعنی جائے ظہور۔

درخت کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ قرآن مجید کی سورت ۵۳ میں آیا ہے۔ یہ درخت ساتویں آسمان کے اوپر ہے اور فرشتے اس سے آگے نہیں جا سکتے۔ اسی لئے اسکو سدرۃ المنتہیٰ کہتے ہیں۔ عرش سے خدا کا تختِ حکومت یا اسکا اقتدار اور قبضہ مراد ہے۔ لغوی معنی چھت۔

تبصرہ | اس نظم میں اقبال نے عقل پر دل کی برتری ثابت کی ہے۔ عقل اور دل، یہ انسان کی دو قوتوں کے نام ہیں۔ عقل وہ قوت ہے جسکی بدولت انسان، نئی باتیں دریافت کرتا ہے۔ مثلاً جزو اپنے کُل سے چھوٹا ہے۔ یا انسان فانی ہے یہ باتیں انسان نے عقل کے ذریعہ سے معلوم کی ہیں۔ دل وہ قوت ہے جسکی مدد سے انسان اُن حقائق کا یقین حاصل کرتا ہے۔ جو حواس یا عقل کی دسترس سے بالاتر ہیں۔ مثلاً خدا اور روح۔ خدا کی ہستی کا یقین، دل کی بدولت پیدا ہو سکتا ہے۔

یہ نظم اقبال نے اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں لکھی تھی، اُس وقت تک اُنہوں نے اپنا فلسفیانہ نظام جسے عرف عام میں فلسفہ خودی کہتے ہیں، مدوّن نہیں کیا تھا لیکن اسکے ابتدائی نقوش اس نظم میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اقبال کے فلسفہ کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ حقیقت رسی کا ذریعہ عقل نہیں بلکہ دل ہے۔ اسی بنیادی تصور پر اُنہوں نے اپنے فلسفہ کا محل تعمیر کیا ہے۔ اور یہ تصور، نہایت واضح طور پر اس نظم میں موجود ہے۔ جو بات اقبال نے اس آسان نظم میں بیان کی ہے، یعنی عقل پر عشق کی برتری۔ وہی بات اُنہوں نے ساری عمر اپنی ساری تصانیف میں مختلف الفاظ میں واضح کی ہے۔

ہم ذیل میں اس موازنہ کو آسان الفاظ میں درج کرتے ہیں۔

عقل نے دل سے کہا کہ

(۱) میں دنیا میں ہر شخص کی رہنمائی کرتی ہوں، اور اغلاط سے بچاتی ہوں۔

(۲) حقائق کائنات کو واضح کرتی ہوں اور فطرت کی قوتوں کو آشکارا کرتی ہوں۔

(۳) میری بدولت انسان کو خدا کی ہستی کا علم حاصل ہوتا ہے۔

یہ سُن کر دل نے کہا کہ

(۱) تو رازِ ہستی کو سمجھتی ہے یا خدا کے وجود پر دلائل قائم کرتی ہے، لیکن میں اُسے آنکھوں سے دیکھ سکتا ہوں، ع شنیدہ کے بود مانندِ دیدہ۔

(۲) تو صرف حوادث اور مظاہر کائنات سے تعلق رکھتی ہے۔ لیکن میں پردوں کو ہٹا کر باطن تک پہونچ جاتا ہوں۔ تو بیرونِ در ہے، میں محرمِ دائرِ درون ہوں۔

(۳) تو انسان کو علم عطا کرتی ہے، لیکن میں اُسے معرفت عطا کرتا ہوں اور سب جانتے ہیں کہ معرفت کا درجہ، علم سے بدرجہا بڑھا ہوا ہے۔

(۴) تو خدا کو ڈھونڈتی ہے لیکن میں خدا کو دکھا سکتا ہوں۔

عقل "خدا جو" ضرور ہے لیکن اُسے پا نہیں سکتی۔ کیونکہ خدا کو پانا عقل کی طاقت سے باہر ہے۔ اسکے مقابلہ میں دل تو "خدا نما" ہے۔ یعنی دل وہ طاقت ہے جسکی بدولت انسان، خدا کو دیکھ سکتا ہے۔

(۵) علم کی انتہا یا اسکا ثمرہ بیتابی اور اضطراب کے سوا اور کچھ نہیں ہے لیکن لیکن دل (عشق) انسان کو اطمینان اور تسلی عطا کر سکتا ہے۔

(۶) عقل زمان و مکان کی قید میں رہتی ہے اور کبھی اس قید سے نہیں نکل سکتی لیکن دل، عقل کے ان پیدا کردہ تصورات کی حدود و قیود کو توڑ کر سدرۃ المنتہیٰ تک پہونچ جاتا ہے۔ اسی حقیقت کو ۳۲ سال کے بعد اقبال نے یوں بیان کیا۔

خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زنّاری
نہ ہے زماں نہ مکاں لا الٰہ الا اللہ

(۷) آخری اور سب سے بڑا فرق عقل اور دل میں یہ ہے کہ عقل تو خدا کی ہستی میں شکوک

پیدا کرتی رہتی ہے۔ لیکن دل، یہ وہ مکان ہے جہاں خود اللہ رہتا ہے۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ خدا عقل کی بدولت نہیں مل سکتا، اگر کسی کو خدا سے ملنا ہو تو عشق کا دامن اختیار کرے۔

نظم نمبر ۲۹

حل لغات اور شرح مشکلات | محیط، لغوی معنی احاطہ کرنے والا، مراد ہے، دریا کا پاٹ + قیامت کی نفاق انگیز ہے، یعنی بہت نفرت پیدا کرنے والی ہے + سرزمین سے اس جگہ مراد ہندستان ہے + قرب فراق آمیز، ایسی نزدیکی جس میں دوری بھی شامل ہو + یعنی بظاہر ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے قریب ہیں۔ لیکن اختلاف عقاید کی وجہ سے ان میں دوری بھی موجود ہے + یکرنگی بمعنی وحدت اتحاد یا اتفاق + خرمن، لغوی معنی کھلیان مراد ہے ہندستان + دانوں سے مراد ہے ہندو مسلمان + اخوت بمعنی بھائی چارا۔ چمن سے مراد ہے ملک + نغمہ پیرائی لغوی معنی موسیقی، مراد ہے ہندو مسلم اتحاد کا درس + قرب حقیقی، بمعنی سچا اتحاد + اختلاط موجہ و ساحل سے مراد ہے تصادم یا اختلاف باہمی + دانۂ خرمن نما، یعنی ایسا دانہ جس سے پورے خرمن کا حال معلوم ہو سکے + شاعر معجز بیاں، یعنی ایسا شاعر جس کا کلام دوسروں کو عاجز کر دے، دوسرے اسکی نظیر پیش نہ کر سکیں + واضح ہو کہ اقبال نے شاعر کو دانۂ خرمن نما سے تشبیہہ دی ہے، کیونکہ شاعر بھی، پوری قوم کی کیفیت کا آئینہ ہوتا ہے۔ شاعر کا کلام وہ آئینہ ہے جس میں پوری قوم کی تصویر نظر آسکتی ہے + دانہ کی ہستی سے مراد، دانہ یعنی شاعر کا وجود بھی ہے اور اسکی قدر و قیمت بھی۔ مطلب یہ ہے کہ اگر قوم ہی کا وجود نہو (ہندو اور مسلمان اگر دونوں مل کر ایک قوم نہ ہوسکیں) تو پھر شاعر کا پیغام اتحاد بھی بے معنی ہے، (جیسا کہ آگے چل کر ثابت ہو گیا) اسکی تفصیل یہ ہے کہ مولانا محمد علی مرحوم نے

برسوں ہندو مسلم اتحاد پر تقریریں کیں، بلکہ اس اتحاد کے جنون میں ایک نو مسلم خاتون کو جو آجکل امریکہ میں سفیر ہے، دوبارہ کفر کی آغوش میں واپس کر دیا۔ لیکن ہندوؤں نے ان کے اس پیغام کو پرکاہ کی برابر بھی وقعت نہ دی اور انجام کار مولانا کو "باحسرت و یاس" کانگرس سے قطع تعلق کرنا پڑا۔ اقبال کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اس حقیقت کا احساس ۱۹۰۴ء ہی میں کر لیا تھا۔

خودنما اسکے دو معنی ہیں ایک مغرور دوسرے لغوی یعنی اپنے آپ کو ظاہر کرنے والا۔ یہاں دوسرے معنی مراد ہیں + ذوقِ گویائی یعنی تقریر کی خواہش + آئینہ سے مراد دل یا طبیعت ہے + جوہر سے مراد صفت یا خوبی ہے + آئینہ کی مناسبت سے جوہر کا لفظ اس مصرع میں بہت موزوں ہے۔ کیونکہ آئینہ کی صیقل کو جوہر سے تعبیر کیا کرتے ہیں + کب زباں کھولی یعنی ہنے اُس وقت ہندو مسلم اتحاد کا پیغام دیا جب ہندو مسلم فسادات اور مناقشات نے ہندستان کو تباہ کر دیا۔

تبصرہ | یہ نظم اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ اقبال کو ۱۹۰۴ء ہی میں معلوم ہو گیا تھا کہ برادرانِ وطن کسی قیمت پر بد قسمت مسلمانوں سے انصاف کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ اقبال کی فراست پر بے اختیار تحسین و آفرین کے پھول نثار کرنے کو دل چاہتا ہے کہ انہوں نے یہ نظم تقسیم بنگال سے پہلے لکھی تھی، اور ہندوؤں کی ذہنیت سب سے پہلے اسی تقسیم کے بعد آشکارا ہوئی تھی، کہ انہوں نے محض اسلئے تقسیم بنگال کی مخالفت کی تھی کہ اس سے ایک صوبہ ایسا معرض وجود میں آگیا تھا، جس میں مسلمانوں کی اکثریت تھی، چنانچہ ہندوؤں نے اسکے خلاف اس قدر ہنگامہ برپا کیا کہ انگریزوں کو ۱۹۱۱ء میں تقسیم بنگال منسوخ کرنی پڑی۔

۱۹۰۵ء سے لیکر ۱۹۴۵ء تک ہندستان کی تاریخ، اقبال کی اسی نظم کی

جیتی جاگتی تصویر ہے۔ اقبال نے ہندو مسلمانوں کو ایک ہی خرمن کے دانوں سے تعبیر کیا ہے۔ یہ تصور انہوں نے سر سید احمد خاں مرحوم سے مستعار لیا تھا جنہوں نے ایک تقریر میں کہا تھا کہ: "ہندستان ایک دلہن ہے، اور ہندو مسلمان اسکی دو آنکھیں ہیں، اور اسکا حسن دونوں آنکھوں کی بقا پر موقوف ہے۔ اگر ایک آنکھ جاتی رہے تو یہ دلہن کانی ہو جائیگی"۔ لیکن اگر کسی قوم کو کانی ہی دلہن پسند ہو تو اس میں بیچارے سر سید یا اقبال کا کیا قصور ہے!

اقبال ہندوؤں کی ذہنیت سے اسدرجہ مایوس ہو چکے تھے کہ وہ اس "دیس" ہی کو ترک کر دینا چاہتے تھے۔ اس نظم کے حسب ذیل اشعار جو بانگ درا میں نہیں ہیں اس حقیقت پر شاہد ہیں:۔

یا سے چل پھر مجھے لے کشتیٔ موج اٹک | اب نہیں بھاتی یہاں کے بوستانوں کی مہک
الوداع لے سیرگاہِ شیخ شیراز الوداع | لے دیار بلبلِ نکہت پروانہ الوداع
الوداع لے مدفنِ ہجویریٔ اعجاز دم | رخصت لے آرام گاہِ شنکرِ جادو رقم

نظم نمبر ۳۰

حلّ لغات اور شرح مشکلات | رواں، بمعنی جان، زندگی۔ روحِ روانِ جہاں یعنی دنیا کی زندگی + شیرازہ بند۔ شیرازہ باندھنے والا۔ شیرازہ اصطلاح میں اُس سلائی کو کہتے ہیں جسکی بدولت کتاب کے اوراق جلد کے شکستہ ہو جانے کے بعد بھی منتشر ہونے سے محفوظ رہتے ہیں + دفتر سے اس جگہ کتاب مراد ہے + کون و مکان سے یہ کائنات مراد ہے + مصرع کا مطلب یہ ہے کہ آفتاب کائنات کی کتاب کا شیرازہ بند ہے۔ اگر وہ نہو تو کائنات تباہ ہو جائے + وجود و عدم۔ فلسفہ کی اصطلاح ہے۔ عدم وجود کی ضد ہے۔ جو شے معدوم ہے اُسے موجود

نہیں کہہ سکتے۔ وجود کے لغوی معنی وہ شے جو پائی جائے + عدم بمعنی نیستی یا نہونا + نمود بمعنی ظہور + ہست و بود کے لغوی معنی ہے اور تھا۔ مراد ہے یہ کائنات جس میں ہر وقت ہست و بود کا سلسلہ جاری ہے + عنصر۔ طبیعات کی اصطلاح ہے۔ وہ شے جو دوسری شے کے لئے بمنزلۂ اصل و بنیاد ہو۔ پہلے زمانہ میں چار عناصر دریافت ہوئے تھے۔ آگ پانی مٹی اور ہوا، جنکو عناصر اربعہ کہتے ہیں۔ لیکن اب انکی تعداد ۹۲ ہے + "عنصروں کا تماشا" اس سے مراد ہے کائنات میں اشیاء کی تخلیق ترکیب یا ترتیب، جو ہر دم ہوتی رہتی ہے + زندگی کا تقاضا، یعنی زندہ رہنے کی خواہش یا صلاحیت + ثبات بمعنی استقلال، قیام، دوام + سوز و ساز۔ اقبال نے اس ترکیب کو ہر کتاب میں صدہا مقامات پر استعمال کیا ہے۔ آفتاب، سوز و ساز کا سب سے بڑا منظر ہے۔ سوز بمعنی آتش، حرارت یا جلنا۔ ساز بمعنی موافقت + ضیائے شعور۔ شعور سے یہاں عقل و فہم مراد ہے + محفل وجود سے کائنات مراد ہے + سامان طراز سے منتظم مراد ہے + یزدانِ ساکنانِ نشیب و فراز، لغوی معنی اے آفتاب تو دنیا کی نیچی اور اونچی جگہوں کے رہنے والوں کا خدا ہے۔ اس مصرع میں یہی لغوی معنی مراد ہیں۔ کیونکہ اقبال نے جس منتر کا ترجمہ کیا ہے اس میں آفتاب کو "یزداں" ہی قرار دیا گیا ہے + حیات کا پروردگار۔ یعنی دنیا میں جس قدر زندگی ہے اور جہاں جہاں زندگی ہے وہ سب آفتاب ہی کی بدولت ہے۔ زندگی آفتاب ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ نمائندگانِ نور سے فرشتے مراد ہیں + تاجدار سے سردار یا حاکم اعلیٰ مراد ہے + مطلب یہ ہے کہ فرشتے بھی نوری ہیں اور آفتاب بھی نوری ہے۔ بلکہ سراپا نور ہے + آزادِ قیدِ اوّل و آخر، یعنی اے آفتاب تو ازلی ابدی ہے۔ تیری روشنی ابتداء اور انتہا کی قید سے پاک ہے۔ تو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہیگا +

تبصرہ | اس نظم میں اقبالؔ نے رگ وید کے مشہور اور مقدس ترین منتر کا جسے گائتری منتر کہتے ہیں، آزاد ترجمہ کیا ہے۔ اور اس نظم میں جو خیالات پیش کئے گئے ہیں وہ اقبالؔ کے ذاتی خیالات نہیں ہیں۔ مثلاً آخری شعر میں اُنہوں نے آفتاب کو ازلی اور ابدی قرار دیا ہے، تو یہ اُنہوں نے منتر کا ترجمہ کیا ہے۔ اپنا عقیدہ بیان نہیں کیا۔

واضح ہو کہ گائتری منتر کو ہندو لوگ رگ وید کی روح سمجھتے ہیں۔ اسی لئے جب کوئی مرنے لگتا ہے تو اسکے پاس بیٹھے ہوئے لوگ، اسکی آتما کی شانتی کے لئے گائتری منتر کا جاپ کرتے ہیں۔ رگ وید کے مشہور مفسر سائین اچاریہ نے لکھا ہے کہ رشیوں کی تعلیم یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ۴۰ دن تک پانی میں کھڑے ہو کر گائتری منتر کا جاپ کرے تو اس میں روحانی طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔

یہ منتر رگ وید کے تیسرے منڈل کے بھجن ۶۲ کے دسویں اشلوک میں آیا ہے۔ اسکے اصلی الفاظ یہ ہیں: "اُوم بھُو بھُوَا سُوَا تَتْ سَوِیتُرْ وَرے نیَمْ بھرگوُ دیوسیہ دِھی مہی دِھیو یُونہا پر چُودیاتْ" لفظی ترجمہ یہ ہے: وہ جو ساری کائنات کا خالق ہے، وہی اس لائق ہے کہ اسکا ذکر، اور دھیان کیا جائے، جو ساری چمکیلی اشیا کا خزانہ ہے، نور کا منبع ہے، ہم اُسی کا دھیان (ذکر) کرتے ہیں (اور اس سے پرارتھنا کرتے ہیں کہ) وہ ہماری عقل کو راہ راست پر چلائے (تاکہ ہم نیکی پر عمل کر سکیں)

نظم نمبر ۳۲

حل لغات اور شرح مشکلات | بزمِ جہان، دنیا کی محفل، یعنی دنیا + فریاد در گرہ یعنی سراپا فریاد ہوں + صفتِ دانۂ سپند۔ اسپند کے دانہ کی طرح۔ واضح ہو کہ اسپند کے دانہ کو جب آگ میں ڈالتے ہیں تو وہ زور سے چٹختا ہے، اور شعرا اس آواز کو فریاد سے تعبیر کیا کرتے ہیں + حرارتِ سوزِ درون۔ اُس عشق کی گرمی جو دل میں پوشیدہ ہو + گل فروشِ اشکِ شفق گوں۔ شفق کی طرح سرخ آنسوؤں کے پھولوں کا بیچنے والا مراد ہے اُس عاشق سے جو محبوب کی جدائی میں خون کے آنسو رو رہا ہو + شمع بزمِ عیش، یعنی وہ شمع جو عیش و عشرت کی محفلوں میں جلتی ہے۔ شمعِ مزار، وہ شمع، جو کسی مزار پر روشن ہو + اشکِ غم سے ہمکنار رہی۔ ہمکنار بمعنی ہم آغوش۔ جب شمع جلتی ہے تو موم پگھلتا ہے اور اسکے قطرے طشت میں گرتے ہیں، انکو شاعر نے شمع کے اشکِ غم سے تعبیر کیا ہے +

یک بیں۔ لغوی معنی صرف ایک کو دیکھنے والی۔ یہاں یک بیں سے مراد یہ ہے کہ شمع، مسجد اور مندر میں کوئی امتیاز نہیں کرتی۔ دونوں جگہ یکساں جلتی ہے۔ دوسری خوبی یہ ہے کہ ہر شمع کی لَو ایک ہی ہوتی ہے۔ اور لَو کو اگر آنکھ فرض کیا جائے تو ظاہر ہے کہ ایک آنکھ سے کوئی شئے دو نظر نہیں آسکتی + صفتِ عاشقانِ راز۔ یہ یک بینی نظر کی صفت ہے، کیونکہ عاشقانِ راز کو اس کائنات میں دوسری ہستی نظر نہیں آتی۔ واضح ہو کہ اس مصرع میں اقبالؔ نے دنیا کے اس اہم فلسفہ کے بنیادی تصوّر کی طرف اشارہ کیا ہے جسکی تعلیم یہ ہے کہ اس کائنات میں اللہ کے سوا اور کسی ہستی کا وجود نہیں ہے۔ سالک جب اس طریق پر گامزن ہوتا ہے تو اسکا پہلا سبق یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر شئے میں اُسی کا جلوہ دیکھے۔ دوسرے کے وجود کو تسلیم نہ کرے۔ اسکو اصطلاح میں وحدت الوجود، کہتے ہیں۔ یہ ۱۹۰۴ء کی نظم ہے، ۱۹۳۴ء میں اقبالؔ پر یہ رنگ پوری طرح چھا گیا تھا۔ چنانچہ بالِ جبریل کے اشعار اس پر شاہد ہیں۔

عاشقانِ راز، کی ترکیب بھی غور طلب ہے۔ کیونکہ لفظ راز میں یہ راز پوشیدہ ہے کہ مسئلہ وحدۃ الوجود ایک راز ہے، جس سے ہر شخص واقف نہیں ہو سکتا۔ یہ راز صرف اُن لوگوں پر فاش کیا جاتا ہے جو اسکے اہل ہوں + مایۂ آشوبِ امتیاز لفظی معنی امتیاز و اختلاف کے ہنگامہ کی پونجی۔ امتیاز تصوف کی اصطلاح ہے، اسکے معنی ہیں اشیائے کائنات میں امتیاز کرنا۔ اسکی مثال

(۱) زید کو اپنا دوست یا بھائی سمجھنا اور راجندر کو غیر یا دشمن سمجھنا۔
(۲) پھول کو اور بلبل کو اچھا سمجھنا اور کانٹے یا اُلّو کو بُرا سمجھنا۔

تصوف کی تعلیم اسکے برعکس یہ ہے کہ دنیا میں کوئی غیر نہیں ہے، سب اُسی کے بندے ہیں۔ اور پھول کی طرح کانٹے میں بھی حسن ہے۔ وہ بھی پھول کی طرح مظہرِ ذاتِ باری ہے۔ یعنی جس طرح ایک حسین چیز میں خدا کا جلوہ نظر آتا ہے اسی طرح ایک بدصورت شئے میں بھی اُسی کی شان دکھائی دیتی ہے۔ چونکہ اس امتیاز سے اختلاف اور اختلاف سے فسادات رونما ہوتے ہیں اسلئے شاعر نے آشوب کا لفظ استعمال کیا ہے + دودِ سیاہ، کالا دھواں۔ مطلب یہ ہے کہ شمع کی نگاہ میں دیر و حرم دونوں یکساں ہیں۔

آگہی بمعنی شعور، سمجھ + شرر۔ بمعنی چنگاری، شاعر نے آگہی کو شرر سے تعبیر کیا ہے + آتشکدہ وہ جگہ یا مکان جہاں آگ جلتی رہتی ہو۔ پارسیوں کی عبادت گاہ + اصل کشاکشِ من و تو، یعنی شعور کی بدولت دنیا میں "میں اور تو" کا امتیاز پیدا ہوتا ہے۔ اور اس امتیاز سے اختلافات رونما ہوتے ہیں + اصل بمعنی بنیاد یا سبب۔

دلستاں۔ دلفریب۔ دل چھین لینے والا + کُن لغوی معنی ہیں ہو جا، یہ لفظ قرآن مجید کی آیت سے ماخوذ ہے۔ جسکا مطلب یہ ہے کہ جب خدا کسی شئے کے پیدا کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے کُن، یعنی ہو جا، فیکون، پس وہ شئے موجود ہو جاتی ہے + تپش آموزِ جانِ عشق۔ اس شعر میں دونوں جگہ عشق سے عاشق مراد ہے۔ یعنی کُن کی آواز نے عاشق کی جان میں تپش پیدا کر دی + حجابِ وجود۔ لفظی معنی ہیں وہ حجاب جو وجود کی بدولت لاحق ہو۔ مطلب یہ ہے کہ تصوف کی تعلیمات کی رو سے زید کا وجود، زید اور خدا کے درمیان حجاب یا پردہ بنجاتا ہے + شامِ فراق صبح تھی میرے نمود کی۔ اس مصرع میں بھی تصوف کا رنگ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب انسان خدا سے جدا ہو گیا، تب اسکی نمود، ہوئی + درخت طور پر آشیانہ سے مراد ہے وہ زمانہ جب انسان دنیا میں نہیں آیا تھا + قفس کو چمن جانتا ہوں میں۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ یہ دنیا در اصل قفس ہے، جس میں روح مقید ہے۔ لیکن جہالت یا غفلت کی وجہ سے انسان، اس دنیا کو اپنا وطن سمجھتا ہے + غربت بمعنی پردیس۔ غربت کا غمکدہ، مراد ہے دنیا فسردگی، بمعنی رنج و غم + انتہائے فریبِ خیال سے مراد یہ ہے کہ انسان اس فریب میں مبتلا ہے کہ میں کوئی مستقل ہستی ہوں۔ اور یہ دنیا میرا وطن ہے + مسجودِ ساکنانِ فلک، یعنی وہ ہستی جسکو فرشتوں نے سجدہ کیا تھا۔ کنایہ ہے انسان سے، مآل، بمعنی انجام یا نتیجہ + مضمونِ فراق کا ہوں۔ یعنی میری حقیقت یہ ہے کہ میں اپنی اصل (خدا) سے دور ہوں + ثریا نشاں ہوں۔ یعنی اصل کے اعتبار سے زمینی نہیں ہوں، بلکہ خاک سے بہت بلند ہوں + آہنگِ طبعِ ناظمِ کون و مکان یعنی کون و مکاں کے خالق کی طبیعت سے مناسبت رکھتا ہوں، یا خدا سے ایک خاص رابطہ رکھتا ہوں + باندھا، یہ لفظ مضمون کی رعایت سے لائے ہیں، جو پہلے شعر میں ہے۔ مطلب ہے پیدا کیا۔ یعنی خدا نے مجھکو اسلئے اپنے سے جدا کیا کہ وہ میری نمود چاہتا تھا + دیوانِ ہست و بود سے یہ کائنات مراد ہے + تحریر کر دیا، یعنی پیدا کر دیا + گوہر کنایہ ہے روح سے + مشتِ خاک کنایہ ہے جسمِ انسانی

ہے + بندش اگرچہ سُست ہے مضمون بلند ہے۔ اس مصرع کے دو مفہوم ہیں ایک ظاہری دوسرا باطنی۔ شاعری کی اصطلاح میں اگر مصرع کے الفاظ موزوں نہوں، یا اُن سے مطلب ادا نہو سکے تو کہتے ہیں کہ اس مصرع کی بندش سُست ہے۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ اگرچہ انسان کی تخلیق پائیدار نہیں ہے لیکن انسان اپنی ذات کے اعتبار سے بہت بلند ہے۔

واضح ہو کہ ان تین مسلسل اشعار میں اقبالؔ نے اپنی شاعرانہ قوت کا کمال دکھایا ہے یعنی استعارات اور کنایات کا ڈھیر لگا دیا ہے۔

چشم غلط نگر سے مراد یہ ہے کہ انسان حقیقت سے آگاہ نہیں ہے۔ ورنہ یہ عالم، ذرّاتِ مادی کا کھیل نہیں ہے۔ بلکہ جلوۂ ذوقِ شعور کا ظہور ہے۔ یعنی عالم کی حقیقت یہ ہے کہ افراد اپنے ذاتی شعور کا اظہار چاہتے ہیں۔ اس ذوق کی تسکین کے لئے خدا نے یہ عالم بنایا ہے۔ لیکن انسان عموماً غلط نگر ہیں یعنی حقیقت سے آگاہ نہیں ہیں، اگر وہ اس حقیقت سے آگاہ ہوتے تو دنیا میں فتنہ و فساد کے بجائے اپنے شعور کی تکمیل کرتے + زمان و مکان کا سلسلہ کمند ہے یعنی انسان زمان و مکان کی قید میں ہے۔ اسی قید کو طوق سے تعبیر کیا ہے + طوق گلوئے حسنِ تماشا پسند ہے۔ یعنی حسنِ مطلق نے جو تماشا پسند ہے، زمان و مکان کو طوقِ گلو بنا دیا ہے۔ حسنِ مطلق سے خدا مراد ہے۔ تماشا پسند۔ اس حسن مطلق یا خدا کی صفت ہے۔ تصوف کی رو سے خدا اپنی مخلوقات میں اپنا جلوہ دیکھ رہا ہے، اسلئے اسے تماشا پسند سے تعبیر کیا۔ یعنی یہ کائنات دراصل وہ آئینہ ہے جس میں حسن (خدا) اپنا تماشا (جلوہ) دیکھ رہا ہے + منزل کا اشتیاق ہے منزل سے مراد وصال ہے۔ ہر روح کی آخری منزل یہ ہے کہ وہ اپنی اصل سے واصل ہو جائے۔ یہ مضمون مرشد رومیؒ کے اس شعر سے ماخوذ ہے۔

ہر کسے کو دور ماند از اصلِ خویش باز جوید روزگارِ وصلِ خویش

اسیرِ فریبِ نگاہ ہوں۔ یعنی مجھے دھوکا لگا ہوا ہے کہ میں اپنے آپ کو اُس سے جُدا سمجھتا ہوں، یا اپنے وجود کو مستقل بالذات سمجھتا ہوں + ناز، کنایہ ہے معشوق سے اور نیاز، کنایہ ہے عاشق سے + رازِ کہن کنایہ ہے حسین ابن منصور حلاج کے قول انا الحق سے + رازِ کہن، آشنائے لب نہو جائے، یعنی حلاّج کا قول میری زبان پہ نہ آجائے + قصّۂ دار و رسن کنایہ ہے حسین بن منصور کے قتل سے، اس شعر میں تلمیح ہے اس قصّہ کی طرف کہ حسین منصور نے جوشِ مستی میں انا الحق کہدیا تھا۔ یعنی میں خدا ہوں۔ اسپر اسکی تکفیر ہوئی اور اسے سولی پر چڑھا دیا گیا۔ مطلب یہ ہے کہ سچی بات تو یہی ہے کہ حق مجھ میں پوشیدہ ہے۔ لیکن میں انا الحق اسلئے نہیں کہتا کہ وہ پُرانا قصّۂ دار و رسن کہیں پھر تازہ نہ ہو جائے۔

تبصرہ | یہ نظم ہر اعتبار سے بہت غور طلب ہے۔

(۱) خیالات کی بلندی کے اعتبار سے، اس سے زیادہ مشکل نظم ساری کتاب میں نہیں ہے۔
(۲) اس نظم میں اقبالؔ نے وحدت الوجود کا فلسفہ پیش کیا ہے۔
(۳) اسکے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تصوف کا مذاق ابتدا ہی سے اقبالؔ کی طبیعت میں موجود تھا۔ عمر کے ساتھ ساتھ یہ رنگ پختہ تر ہوتا چلا گیا۔
(۴) اس نظم میں اقبالؔ نے شمع کے ساتھ اپنا موازنہ کیا ہے۔ انداز بیان بالکل غالبؔ کا سا ہے، وہی فارسی تراکیب، وہی بندش، وہی مضمون آفرینی، وہی فلسفہ طرازی۔
(۵) اقبالؔ نے اس نظم میں وحدت الوجود کی وہ تعبیر پیش کی ہے، جو شیخ اکبر حضرت ابن عربیؒ کے تصانیف میں پائی جاتی ہے۔ یعنی

صیاد آپ حلقۂ دامِ ستم بھی آپ
بامِ حرم بھی، طائرِ بامِ حرم بھی آپ

یہ وحدت الوجود کی وہ شکل ہے جس میں حسن اور عشق، ناز اور نیاز دونوں میں کوئی مغائرت نہیں ہوتی، جیسا کہ غالبؔ نے لکھا ہے۔

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

آگے چل کر یعنی بالِ جبریل کے زمانہ میں، اقبالؔ نے اس تعبیر کو ترک کرکے حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تعبیر کو اختیار کر لیا تھا جس کی رو سے حسن اور عشق (خالق اور مخلوق) میں مغائرت ہے۔ اس کی مختصر تشریح یہ ہے :-

(۱) ابن عربیؒ تو خدا کے علاوہ کسی کا وجود تسلیم ہی نہیں کرتے کائنات کا وجود موہوم ہے۔
(ب) حضرت مجددؒ مخلوقات کا وجود تسلیم کرتے ہیں، لیکن یہ وجود ظلّی ہے۔ خدا کے سامنے مخلوقات کے وجود کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ جس طرح دن کے وقت بھی ستارے موجود ہوتے ہیں لیکن آفتاب کے سامنے انکی کوئی حقیقت باقی نہیں رہتی۔ یعنی نظر نہیں آتے۔ اسی طرح مخلوقات بھی ظلّی طور پر موجود ہیں لیکن خدا کے سامنے ہیچ ہیں۔

اب میں اس نظم کا مطلب سلیس الفاظ میں لکھتا ہوں :-

اے شمع! اس دنیا میں، میں بھی تیری طرح غمگین ہوں۔ اور شدت غم سے نالہ و فریاد کرتا رہتا ہوں۔ تو محبت کی آگ میں جل رہی ہے، اور میں فراق میں خون کے آنسو بہا رہا ہوں۔

تیری نظر میں دیر و حرم دونوں یکساں ہیں، لیکن میں ابھی تک اپنی نگاہ میں یہ بلندی پیدا نہیں کر سکا۔ تیرے دھوئیں میں آہ کا رنگ پایا جاتا ہے۔ اس سے مجھے یہ گمان ہوتا ہے کہ تیرے سینہ میں بھی عاشق کا دل پوشیدہ ہے۔ تو بھی میری طرح کسی پر عاشق ہے تو کسی کے فراق میں جل رہی ہے۔ لیکن جو لوگ حقیقت سے آشنا نہیں ہیں، وہ تیرے سوز کو نور سمجھتے ہیں۔

یہاں تک شمع اور شاعر دونوں میں مشابہت ہے۔ اب اختلاف شروع ہوتا ہے۔ اسکی تفصیل یہ ہے کہ شمع کو اپنے عشق کا یا محبوب حقیقی سے فراق کا شعور نہیں ہے۔ لیکن انسان کو یہ شعور حاصل ہے اور اسکی وجہ یہ ہے کہ انسان میں آگاہی یعنی شعور ذاتی کی صفت پائی جاتی ہے۔ چنانچہ شاعر شمع سے کہتا ہے۔

تو جل رہی ہے لیکن تجھے خبر نہیں۔ میں بھی جل رہا ہوں لیکن مجھے یہ شعور ہے کہ میں جل رہا ہوں۔ میں شدت اضطراب سے تڑپ بھی رہا ہوں۔ اور مجھے اس تڑپنے کا شعور بھی حاصل ہے۔ بات یہ ہے کہ مجھے خدا نے اس بات کا احساس عطا کر دیا ہے کہ میں جل رہا ہوں۔

میری یہ آگہی۔ میرا یہ شعور ذاتی یا احساس۔ بس یہی تو میری بیقراری کا باعث ہے۔ انسان میں اگر شعور ذاتی نہوتا تو اُسے نہ کوئی جستجو ہوتی نہ اضطراب، نہ سوز و گداز، نہ لذتِ فراق، نہ گریۂ نیم شبی، نہ نالۂ سحرگاہی، نہ کشمکش، نہ ہنگامہ، انسانی زندگی بھی حیوانات اور طیور کی زندگی کی طرح پرسکون ہوتی۔

اس شعور سے بلندی اور پستی کا امتیاز پیدا ہوا۔ گل میں خوشبو اور شراب میں مستی کا احساس پیدا ہوا۔ کائنات میں ہر قسم کا امتیاز اسی ذاتی شعور کی کارفرمائی ہے۔ جب زیدؔ نے کہا کہ میں زید ہوں، تو دوسروں کو دیکھکر یہ کہا کہ یہ مثلاً بکر ہے یہ خالد ہے۔ اور یہ دونوں میرے غیر ہیں۔ مجھ سے جدا ہیں۔ اسی طرح یہ باغ ہے، یہ بلبل ہے، یہ گُل ہے، یہ خوشبو ہے، اور یہ سب ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ اور باہمدگر مغائرالوجود ہیں۔ (حالانکہ صوفی کی نگاہ میں "بُستان و بلبل، و گل و بو" ان سب کی اصل واحد ہے، اسلئے یہ سب ایک ہی حقیقت کی مختلف شکلیں ہیں جس طرح پانی کو گول برتن میں ڈالدو تو گول نظر آئیگا۔ اور مربع برتن میں چوکور دکھائی دیگا۔ اصل کے لحاظ سے اشیا میں اختلاف نہیں ہے۔)

اقبالؔ نے اس شعر میں اسی نکتہ کو واضح کیا ہے :-

کمالِ وحدت عیاں ہے ایسا کہ نوکِ نشتر سے تو جو چھیڑے
یقیں ہے مجھکو گرے رگِ گل سے قطرہ انسان کے لہو کا

اسکے بعد اقبالؔ وحدت الوجود کا فلسفہ بیان کرتے ہیں۔ جب تک کوئی شخص اس فلسفہ کے مبادی سے بخوبی واقف نہو، وہ اس نظم کو نہ سمجھ سکتا ہے۔ اور نہ اُسکے مطالب سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ افسوس ہے کہ اس مختصر شرح میں ان مباحث عالیہ کی تفصیل بیان نہیں کی جا سکتی۔ میں اقبالؔ اور تصوف کے موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھوں گا اس میں تفصیل کے ساتھ اس مسئلہ کو بیان کرونگا انشاءاللہ۔

اب اس نظم کے آخری بند کا جو صبح ازل سے شروع ہوتا ہے۔ مطلب لکھتا ہوں: جب اللہ کو یہ منظور ہوا کہ کوئی ہستی ایسی ہو جو میرے حسن و جمال پر شیدا ہو تو اُس نے کلمۂ کُن سے یہ کائنات پیدا کی اور حضرت انسان کو اس کا سردار بنایا اور اپنی محبت کی چنگاری اسکے دل میں پوشیدہ کردی۔

اقبالؔ نے یہ مضمون کُنتُ کَنزاً مخفیاً والی حدیث سے لیا ہے۔ یعنی اللہ نے فرمایا کہ میں ایک پوشیدہ خزانہ تھا، میں نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں، پس میں نے مخلوقات کو پیدا کیا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ انسان کی روح کہاں سے آئی؟ اسکا جواب یہ ہے کہ روح خدا سے جدا کوئی مستقل وجود نہیں رکھتی۔ کائنات کی ہر شئے میں، اُسی کی ذات و صفات کی تجلی، جلوہ گر ہے۔ اور یہ تجلی بدرجۂ اتم، اور بطرز احسن، حضرت انسان میں نظر آتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھو کہ روح انسانی اللہ کی آغوش میں تھی، اُس سے جدا ہو کر دنیا میں آئی ہے۔ اور جسم انسانی سے وابستہ ہو گئی ہے۔

اب آئندہ اشعار کا مطلب بآسانی سمجھ میں آ سکتا ہے۔

خدا نے انسان کو حکم دیا گلشن "کُن" کی بہار دیکھ۔ یعنی ہر شئے میں ہمارا جلوہ دیکھ! واضح ہو کر " اک آنکھ لیکے خواب پریشاں ہزار دیکھ!

اس مصرع میں "خواب پریشاں" کی ترکیب بہت اہم ہے۔ کیونکہ اس میں ہمہ اوست کا راز بیان کیا گیا ہے۔ عقیدہ ہمہ اوست کی رو سے ہماری حالت اُس انسان کی سی ہے، جو خواب دیکھ رہا ہو۔ خواب میں انسان جو کچھ دیکھتا ہے، اُسے بالکل صحیح اور حقیقی اور واقعی یقین کرتا ہے۔ مثلاً زید نے خواب میں دیکھا کہ میں بمبئی گیا ہوں، اور وہاں جا کر میں نے ایک حسین لڑکی سے شادی کی اور شام کے وقت موٹر میں سیر کو نکلا.... سڑک پر تصادم ہو گیا۔ یک لخت آنکھ کھل گئی، تو نہ بمبئی تھی نہ وہ حسینہ تھی، اور نہ وہ موٹر کار تھی، لیکن جب وہ خواب دیکھ رہا تھا، اُس وقت اُسے نہ بمبئی کے وجود میں شک تھا، اور نہ اُس حسینہ کے وجود میں کوئی شبہ تھا۔

بس یہی حالت ہماری ہے، ہم سب خواب دیکھ رہے ہیں۔ جب موت آئیگی یعنی جب آنکھ کھل جائیگی تو نہ لاہور ہوگا، نہ بانگ درا ہوگی، اور نہ اُس کی شرح ہوگی

ع خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سُنا افسانہ تھا

اب پڑھئے اس مصرع کو: اک آنکھ لیکے خواب پریشاں ہزار دیکھ! مطلب یہ ہے کہ کائنات میں جو کچھ نظر آتا ہے اسکی حقیقت خواب سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے، ہر انسان اپنی زندگی میں ہزاروں حادثات اور واقعات سے دوچار ہوتا ہے۔ لیکن یہ تمام حادثات "خواب پریشاں" سے زیادہ کوئی حقیقت یا اصلیت نہیں رکھتے۔ اب آگے چلئے شاعر کہتا ہے کہ یہ تو سچ ہے کہ اللہ نے عشاق کا مجمع پیدا کر دیا۔ لیکن اس تخلیق کا بندہ کے لئے ایک ناخوشگوار پہلو یہ نکلا کہ روح اور خدا میں "وجود" کا حجاب حائل ہو گیا۔ اگر یہ حجاب درمیان سے دور ہو جائے تو پھر بقول اقبال صورت یہ ہوگی کہ

صیاد آپ، حلقۂ دامِ ستم بھی آپ
بامِ حرم بھی، طائرِ بامِ حرم بھی آپ

پھر دوئی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی نکتہ کو ایک شاعر نے یوں بیان کیا ہے۔

وہ بزمِ یثرب میں آکے بیٹھیں ہزار مونہہ کو چھپا چھپا کر
نگاہِ عاشق کی دیکھ لیتی ہے پردۂ میم کو اُٹھا کر

قصۂ مختصر، جب میری نمود کی صبح ہوئی۔ یعنی جب میرا ظہور ہوا تو محبوب سے جدائی ہو گئی۔ یعنی نمود، فراق پر موقوف ہے۔ ہر انسان جو موجود ہے اپنی اصل سے جدا ہو کر اس عالم میں موجود ہوا ہے۔

جب دنیا میں آیا تو جسم کی قید میں بھی آ گیا۔ یعنی وہ دن گئے کہ قید سے میں آشنا نہ تھا۔ دنیا میں میری حالت قیدی کی سی ہے۔ لیکن افسوس کہ میں اپنی غفلت کی وجہ سے جیلخانہ (دنیا) کو اپنا وطن سمجھتا ہوں۔ یہی تو وجہ ہے کہ پختہ سے پختہ عمارت بنواتا ہوں۔ ع سامان سو برس کا ہے کل کی خبر نہیں۔

اب اس نظم کا مشکل ترین حصہ شروع ہوتا ہے۔ مضمون تو وہی ہے لیکن، انداز بیان بہت بلیغ ہے اسلئے مضمون، الفاظ کے پردہ میں پوشیدہ ہو گیا ہے گویا اس نظم میں الفاظ اور معنی دونوں کا کمال نظر آتا ہے۔ اقبالؔ نے ایک مشکل فلسفیانہ مضمون کو ادا کرنے کے لئے، غالبؔ کا مشکل انداز بیان اختیار کیا ہے۔

لے شمع انتہائے فریب خیال دیکھ، سے لیکر آخری شعر تک ہر مصرع استعارہ، کنایہ، استعارہ بالکنایہ، مجاز مرسل اور مجاز عقلی سے لبریز ہے۔ اقبالؔ نے ہر بات رمز و ایما کے پردوں میں بیان کی ہے۔ تیسری دشواری یہ پیدا کی ہے کہ فارسی تراکیب بکثرت استعمال کی ہیں۔ مثلاً: مسجودِ ساکنانِ فلک کا مآل" "آہنگِ طبعِ ناظمِ کون و مکاں" "سرِ دیوانِ ہست و بود" "عالمِ ظہورِ جلوۂ ذوقِ شعور" "طوق گلوئے حسن تماشا پسند ہے" ان تراکیب سے مصرعوں میں بلاغت کا رنگ پیدا ہو گیا ہے، اور کلام بلیغ کا سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں ہے۔

اب شاعر پھر شمع سے خطاب کرتا ہے اور اُسے اپنی حقیقت سے آگاہ کرتا ہے۔ اقبالؔ نے حقیقت انسانی کی وضاحت کے لئے خدا کو شاعر قرار دیا ہے اور خطاب کے بعد تین مسلسل اشعار میں شاعری کی اصطلاحوں میں اپنا مطلب بیان کیا ہے۔

خدا کو شاعر قرار دیکر، اقبالؔ نے اپنی ذات کو مضمون سے تعبیر کیا ہے۔ کہتے ہیں،

مضمون فراق کا ہوں ثریا نشاں ہوں میں

لفظ "مضمون" کی رعایت سے جملہ لوازم شاعری کا بیان کیا ہے ملاحظہ ہو۔ مضمون۔ آہنگ۔ ناظم۔ باندھا۔ تحریر۔ دیوان۔ بندش۔

اگر پڑھنے والا اس تلازمۂ تصورات کو مدنظر رکھے تو اُسے اقبالؔ کی قادر الکلامی کی داد دینی پڑیگی۔ اور یہ نظم اُنہوں نے سنہ ۱۹۰۲ء میں لکھی تھی۔

انسان کیا ہے؟ فراق کا مضمون ہے۔ یعنی اللہ سے جدا ہو گیا ہے۔ اپنی ذات کے لحاظ سے ثریا کی طرح بلند ہے۔ بلکہ خدا سے ہم آہنگ ہے۔ جو لوگ اس عالم کو مستقل بالذات شئے سمجھتے ہیں، وہ دراصل غلط نگر ہیں۔ حقیقت سے آشنا نہیں ہیں۔ یہ کائنات کچھ نہیں ہے۔ محض ذوق شعور کے جلوہ کے ظہور کی شدت کا نام ہے۔ اگر اللہ کو یہ منظور نہوتا کہ کوئی اُسے دیکھے اور اسکی حمد و ثنا کرے، اُس سے محبت کرے، تو یہ عالم موجود ہی نہوتا۔ کیوں؟ اسلئے کہ عالم کی اصل، وجود نہیں ہے بلکہ عدم ہے۔ اور عدم کا تقاضائے ذات عدم ہی ہوتا ہے نہ کہ وجود۔ یہ تو کسی کے موجود کرنے سے موجود ہوا ہے۔ اور جب اُسکی صفتِ تخلیق کی تجلی رُک جائیگی تو یہ کائنات اُسی طرح معدوم ہو جائیگی جس طرح "دیئے" کے رُک جانے سے پردۂ فلم پر تاریکی چھا جاتی ہے، نہ ثریا کا وجود باقی رہتا ہے، نہ مینا کا۔

بس اس کائنات کی حقیقت اسی قدر ہے کہ دکھائی تو دیتی ہے مگر فی الحقیقت موجود نہیں ہے۔

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

اے شمع! میں اپنی منزلِ مقصود کا مشتاق ہوں۔ اور اس دنیا میں میری کیفیت ایک گم کردہ راہ مسافر کی سی ہے۔ میں گم کردہ راہ کیوں ہوں؟ اسلئے کہ اسیرِ فریبِ نگاہ ہوں۔ سبحان اللہ! اقبال نے ایک مصرع میں پوری انسانی زندگی کا خلاصہ بیان کر دیا ہے۔ ہم میں سے ہر شخص بلا شبہ "اسیر فریب نگاہ" ہے۔ اور نگاہ کی سب سے بڑی آفت عورت ہے۔ اور اسکے حصول کے لئے زر اور زمین کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ اور دنیا انہی تین "برکات عالیہ" سے عبارت ہے۔ سارے فتنے انہی کی بدولت پیدا ہوتے ہیں۔

اقبال کہتے ہیں اے شمع! میں اسیر فریب نگاہ ہوں۔ اور اسی لئے زن، زر اور زمین کی محبت میں گرفتار ہوں۔ یا ان اشیائے کائنات کو اپنے سے غیر تصور کر کے ان کے حصول میں کوشاں ہوں۔ یا من و تو کے امتیاز میں مبتلا ہوں، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ میں خود ہی صیاد ہوں، خود ہی صید ہوں، خود ہی حلقۂ دام ہوں۔ خود ہی بامِ حرم ہوں اور خود ہی وہ طائر ہوں جو بامِ حرم پر بیٹھا ہوا ہو۔ خود ہی عاشق ہوں، خود ہی معشوق ہوں، خود ہی ناز ہوں، خود ہی نیاز ہوں۔

آخر میں کہتے ہیں کہ مصلحتِ وقت یہی ہے کہ اب خاموش ہو جاؤں، مبادا میرے ساتھ بھی وہی معاملہ ہو جائے جو چوتھی صدی ہجری میں حسین منصور حلاج کے ساتھ ہوا تھا۔

نظم نمبر ۳۵

__حلِ لغات اور شرحِ مشکلات__ | دل ہی بجھ گیا ہو۔ اس محاورہ سے مایوسی، اور ناکامی کی انتہا کا اظہار ہوتا ہے۔ یعنی وہ حالت جب دل میں کوئی آرزو باقی نہ رہے۔

شورش بمعنی ہنگامہ + عزلت بمعنی تنہائی + چشمے کی شورش سے پانی کی آواز مراد ہے۔ جو پتھروں سے ٹکرانے کے بعد پیدا ہوتی ہے + جہاں نما۔ اشارہ ہے جمشید کے ساغر کی طرف جس میں دنیا کا حال نظر آتا تھا + جلوت، خلوت کی ضد ہے۔ جلوت بمعنی انجمن یا محفل + دیر و حرم، بمعنی بتکدہ یا بتخانہ اور حرم بمعنی مسجد + درا وہ گھنٹہ جو قافلہ کی روانگی سے پہلے بجاتے ہیں۔

یہ نظم اپنی سادگی سلاست، تاثیر یعنی اثر آفرینی اور شاعرانہ خوبیوں کے لحاظ سے بانگ درا کی بہترین نظموں میں سے ہے۔ اقبال نے اس نظم میں شاعرانہ مصوری کا کمال دکھایا ہے۔ ان محاسن معنوی کے علاوہ انہوں نے اس میں بڑے پاکیزہ خیالات کا اظہار کیا ہے۔

یہ خیالات جن کا اظہار اقبال نے اس دلپذیر نظم میں کیا ہے، کم و بیش ہر اس شخص کے دل میں موجزن ہوتے ہیں جو دنیا اور دنیا والوں کی حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ اب اسکے بعد عمل کی منزل آتی ہے، تو جن لوگوں کی قوت ارادی زبردست ہوتی ہے۔ وہ ایک جھٹکے میں سارے تعلقات توڑ کر رکھدیتے ہیں اور دامن کوہ میں ایک چھوٹا سا جھونپڑا بنا کر اپنی زندگی عزلت میں بسر کر دیتے ہیں۔ اور جو اس نعمت (قوت ارادی) سے محروم ہوتے ہیں وہ راقم الحروف کی طرح ترک دنیا کی متصوفانہ بندیوں ہی میں زندگی گذار دیتے ہیں۔

حضرت اقبال اگرچہ پورے طور سے اس آرزو کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔ لیکن یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ انہوں نے اپنی زندگی میں بڑی حد تک درویشی، استغنا، اور عزلت کی شان پیدا کر لی تھی، اور انکی زندگی میں سادگی تو اسدرجہ نمایاں تھی کہ راقم الحروف نے آج تک اسکی نظیر نہیں دیکھی۔

اس نظم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ عزلت نشینی کی آرزو کے باوجود اقبال

دوسروں کے لئے جینا چاہتے ہیں۔ اور یہی ایک مسلمان کی شان ہے کہ وہ دوسروں کو فائدہ پہونچانے کے لئے جیتا ہے۔ اقبال ان لوگوں کو جو بیہوش پڑے ہیں جگانا چاہتے ہیں۔ اور مجھے خوشی ہے کہ اللہ تعالے نے اپنے فضل و کرم سے انکی یہ آرزو پوری کر دی۔ آج مسلمانوں میں جو کچھ بیداری نظر آتی ہے یہ سب اقبال کے پیغام ہی کا ثمرہ ہے۔

نظم نمبر ۳۶

__حلِ لغات اور شرحِ مشکلات__ | شورش میخانۂ انسان۔ انسانوں کی دنیا کے ہنگامے + زینتِ بزم فلک۔ آسمان کی محفل کی زینت + دُرگوش عروس صبح۔ صبح کی دلہن کے کان کا موتی یا آویزہ + سیمائے افق۔ افق کی پیشانی + داغِ مدادِ شب، رات کی سیاہی کا داغ + نقش باطل، وہ نقش جسے ثبات نہو + کوکب ستارہ۔ چشم ظاہر، وہ آنکھ جو چہرہ پر ہوتی ہے + چشم باطن، دل کی آنکھ مراد ہے۔ دانش یا عقل + قید زنجیر تعلق۔ دنیاوی تعلقات کی قید + زیر و بالا، پستی اور بلندی + اوروں کے غم میں۔ دوسروں کی ہمدردی میں + سرشک آباد ہو۔ آنسوؤں سے تر ہو + امتیازِ ملت و آئین۔ دنیا کے مختلف مذاہب اور قوانین میں امتیاز کرنا۔ اسطرح کہ کسی کو اچھا سمجھنا اور کسی کو بُرا + بستۂ رنگ خصوصیت۔ کسی جماعت سے وابستگی + رازِ نظم قدرت۔ قدرت کے انتظام کی حقیقت + شناسائے فلک، یعنی آسمان تک پہونچ سکے + شمع تخیل کا دھواں، مراد ہے شاعر کا تخیل یا اسکے خیالات + عقدۂ اضداد کی کاوش۔ دنیا کے اختلافات کی الجھن یا وہ پریشانی جو اختلافات سے پیدا ہوتی ہے + نیر اعظم، یعنی آفتاب ہمسر یک ذرۂ خاکِ درِ آدم نہیں، یعنی آفتاب انسان کی ہمسری نہیں کر سکتا۔ نورِ مسجودِ ملک، یعنی انسان + گرم تماشا، مشغول نظارہ یا مشاہدہ + لیلیٰ ذوقِ طلب، یعنی جستجو کا جذبہ، جو انسانی فطرت میں

داخل ہے + کشودِ عقدۂ مشکل۔ دشوار مسائل کا حل + سعی بے حاصل، ایسی کوشش جس کا کوئی نتیجہ بر آمد نہو + دردِ استفہام، ذوقِ جستجو۔

__تبصرہ__ | جیسا کہ میں مقدمہ میں واضح کر چکا ہوں، اقبال اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں فطرت کے مطالعہ میں منہمک تھے۔ اس نظم میں تلاش اور جستجو کا جذبہ کارفرما ہے۔ اقبال نے اس بات کو واضح کیا ہے کہ آفتاب ماہتاب اور دیگر مظاہر فطرت میں جستجو کا جذبہ نہیں پایا جاتا۔ یہ صفت صرف انسان میں پائی جاتی ہے۔ اسکے علاوہ انہوں نے اس نظم میں ہمیں ہمدردی نوع انسان کا سبق سکھایا ہے۔ جو اس نظم کا بہت دلکش اور موثر پہلو ہے۔

کہتے ہیں کہ آفتاب، دنیا کے ہنگاموں سے دور ہے۔ اسکا وجود آسمان کے لئے باعث زیب و زینت ہے۔ جب وہ طلوع ہوتا ہے تو تاریکی اور ستارے، دونوں غائب ہو جاتے ہیں۔ تمام دنیا اسکی روشنی سے منور ہو جاتی ہے۔ لیکن میں اس روشنی کا طالب ہوں جس سے دل کی آنکھیں منور ہو جائیں۔

آفتاب، انسانوں کی طرح، مادی اور دنیاوی تعلقات میں گرفتار نہیں ہے، اور وہ اسقدر بلند ہے کہ دنیا کی بلندیاں اور پستیاں دونوں اسکے لئے یکساں ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ میں بھی اپنے اندر یہی رنگ پیدا کرنا چاہتا ہوں جس طرح آفتاب کا فیض ہر شخص کے لئے عام ہے، کسی کی تخصیص نہیں ہے۔ اسی طرح میں بھی امتیازات سے بالاتر ہو کر زندگی بسر کرنی چاہتا ہوں۔ یعنی میری آرزو یہ ہے کہ میں دنیا میں ہر انسان سے محبت کروں۔ خواہ وہ کافر ہو یا مومن، کالا ہو، یا گورا میری ہمدردی کا دائرہ صرف میری قوم تک محدود نہو، بلکہ میں نوع انسان کو اپنی قوم سمجھوں، اور ساری دنیا کو اپنا وطن سمجھوں۔ مجھے ہر شئے میں خالق فطرت کا جلوہ نظر آئے۔ میرے اندر ہمدردی کا ایسا جذبہ پیدا ہو جائے کہ میں دوسروں کی مصیبت

متاثر ہو سکوں۔ اور عشق کا مسلک اختیار کروں تاکہ حقیقت سے آشنا ہو سکوں، میرے دل میں ساری کائنات کی محبت موجزن ہو اور انسانی ہمدردی کے علاوہ اور کوئی خیال میرے دل میں نہ آئے۔

اے آفتاب! اگر تو دنیا والوں کی مصیبت میں شریک نہیں ہے تو پھر تجھکو کوئی فضیلت حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور اگر تجھکو اپنے کمالات کا شعور حاصل نہیں تو پھر تو انسان سے ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

تجھ میں اور مجھ میں فرق یہ ہے کہ تو ذوقِ جستجو سے محروم ہے، میں حقیقت سے آگاہ ہونا چاہتا ہوں، اور اسکے لئے ہر دم کوشاں ہوں، مانا کہ مجھے اس میں کامیابی نہیں ہو سکتی، لیکن اس سعیٔ بے حاصل میں بھی ایک لطف پنہاں ہے جس سے تو مطلق آشنا نہیں ہے۔ تیرے اندر نہ ذوقِ استفہام ہے، اور نہ رازِ قدرت کی جستجو کا مادّہ ہے۔

نظم ۳۹

حلّ لغات اور شرح مشکلات | دردِ عشق۔ وہ درد جو عشق کی بدولت دل میں پیدا ہوتا ہے، مطلق عشق بھی مراد لے سکتے ہیں + گہرِ آبدار، نہایت حسین موتی + نامحرم وہ لوگ جو عشق کی قدر و قیمت یا لذت سے آگاہ نہیں ہیں۔ دوسرے معنی ہیں وہ لوگ جو مسلکِ عشق کا انکار کرتے ہیں، یعنی عقل پرست طبقہ + پنہاں تہ نقاب تری جلوہ گاہ ہے۔ یعنی اللہ جو محبوبِ حقیقی ہے، نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔ ظاہر پرست۔ وہ لوگ جو صرف مادّہ اور مادّیات پر یقین کرتے ہیں اور مادیات سے بالاتر کسی روحانی حقیقت کے معترف نہیں ہیں + محفلِ نو سے مراد ہے اس موجودہ دور کے مادّہ پرست جو عشق کی طاقت کے منکر ہیں + آئی نئی ہوا۔ نئی ہوا سے مادہ پرستانہ خیالات مراد ہیں۔ جو مغربی تعلیم کی بدولت مشرقی اقوام میں

شائع ہو رہے ہیں۔ چمن ہست و بود سے دنیا مراد ہے + درونِ سینہ، دل کے اندر + اشکِ جگر گداز، ایسے آنسو جن سے جگر خون ہو جائے + غمّاز بمعنی چغلخور، یا راز فاش کر دینے والا + گویا، بولنے والی۔ نَے بمعنی بانسری + حیرت علم آفریدہ۔ وہ حیرت یا پریشانی جو علم کا لازمی نتیجہ ہے۔ واضح ہو کہ علم انسان کے اندر شکوک اور شبہات پیدا کر دیتا ہے۔ علم سے کسی بات کی حقیقت معلوم نہیں ہو سکتی۔ اسلئے انسان پریشانی اور حیرانی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اسکے برعکس عشق سے انسان کو اطمینانِ قلب حاصل ہو جاتا ہے۔ یہی علم اور عشق میں بنیادی فرق ہے۔ اور اسی لئے صوفیا عشق کا طریق اختیار کرتے ہیں + جو یا بمعنی تلاش کرنے والی + نگہ نارسیدہ، یہ مجازِ مرسل ہے۔ اس سے مراد ہے وہ انسان جس کی نگاہ ناقص ہو۔ یعنی وہ انسان جو عشق سے ناآشنا ہو + دیدۂ حکمت پسند سے مراد فلسفی ہے جو انجام کار حیرانی میں مبتلا ہو جاتا ہے + کشتۂ نظارۂ مجاز۔ وہ شخص جو ظاہر پرست ہو، جسکی نگاہ صرف مادیات تک محدود ہو۔ خلوت سرائے راز سے مراد حقیقتِ کائنات ہے۔ یا ذاتِ مطلق۔ مے خیال سے عقلی قیاسات مراد ہیں۔ آجکل کے کلیموں سے فلسفی لوگ مراد ہیں جو صرف عقل پر بھروسہ کرتے ہیں +

مطلب | اس دلکش نظم میں، اقبالؔ نے عشق سے خطاب کیا ہے۔ اور اس خطاب کے پردہ میں اسکی فضیلت، اہمیت اور قیمت واضح کی ہے۔ یہ نظم اس اعتبار سے بہت اہم ہے۔ اور ہماری خاص توجہ کی مستحق ہے کہ اس میں ہمیں اُن تصورات کے ابتدائی نقوش ملتے ہیں جن پر آگے چل کر اقبالؔ نے اپنے فلسفہ کی بنیاد رکھی، یہ تصورِ عشق جو انہوں نے بانگِ درا میں پیش کیا ہے، دراصل وہ تخم ہے جو ارمغانِ حجاز میں ایک تناور درخت بن گیا۔

کہتے ہیں کہ اے عشق! تو ایک گوہرِ بے بہا ہے۔ اسلئے تو ان لوگوں پر ظاہر نہ ہو جو تیری قیمت سے آگاہ نہیں ہیں۔ اس شعر کا حقیقی مطلب یہ ہے کہ عاشق کو لازم ہے کہ وہ نااہلوں پر عشق کی حقیقت واضح نہ کرے۔ کیونکہ وہ اس جذبہ کی تحسین یا تکریم کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے۔ جو لوگ مادہ پرست ہیں، خدا کے منکر ہیں اشتراکیت کے پیرو ہیں۔ اُن کے سامنے روحانی حقائق بیان کرنا ایسا ہی ہے جیسے کور مادرزاد کی آنکھوں میں سرمہ لگانا۔

اے عشق! چونکہ اس زمانہ کے لوگوں کا زاویہ نگاہ مادہ پرستانہ ہے اسلئے یہ مغرب زدہ لوگ تیری قدر و قیمت کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے۔ یعنی اس زمانہ میں چونکہ لوگوں میں روحانیت کا فقدان ہے اور ظاہر پرستی کا شیوہ عام ہے، اسلئے عاشقانِ خدا کو، گوشۂ تنہائی اختیار کرنا مناسب ہے۔ خود نمائی، تشہیر اور شہرت طلبی سے اجتناب کرنا لازمی ہے۔ یہ باتیں سچے عاشقوں کے اُصول کے خلاف ہیں۔

اے عشق! یا اے عاشقانِ الٰہی! آجکل کے فلسفی منطقی اور سائنسداں آپ لوگوں سے غافل ہیں۔ بے تعلق ہیں۔ ان کے دل میں آپ حضرات کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ ناقص اور خام طبع لوگ مغربی تعلیم کی بدولت، بزرگانِ دین، اور عاشقانِ الٰہی کی تلاش نہیں کرتے۔ بلکہ اس تلاش کو رجعت پسندی اور اوہام پرستی سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسلئے آپ حضرات کو لازم ہے کہ حکمت پسند لوگوں کو وادیٔ حیرت میں سرگرداں رہنے دیں۔ یہ مادہ پرست دنیا، اور یہ زر پرست اور زن مرید لوگ عشق اور عاشقوں کی قدر نہیں کر سکتے۔ یہ انجمن یہ مادہ پرست دنیا، اس لائق نہیں کہ اس میں اللہ کے بندے، جہلا کے مجمع میں بیٹھکر اپنے اوقاتِ عزیز ضائع کریں۔ آجکل ہر شخص اپنے آپ کو ارسطو اور افلاطون کا ہمپایہ سمجھتا ہے۔ اور بزرگوں کی صحبت میں بیٹھنے کو اپنے لئے باعثِ ذلت خیال کرتا ہے۔

آجکل بھی کلیم پائے جاتے ہیں۔ لیکن ان کا "طور" وہ نہیں جہاں حضرت موسیٰ کو بجلی کی دولت حاصل ہوئی تھی، بلکہ ان کلیموں نے دولت کو اپنا کعبۂ مقصود بنایا ہے، اسلئے عاشقوں کو ان سے دور رہنا چاہئے۔

نظم ۴۱

حلّ لغات اور شرح مشکلات | موجِ صبا، ہوا کی موج، مراد ہے ہوا + گہوارۂ جنباں۔ بچوں کا پالنا جو ہل رہا ہو + جنباں، جنبیدن کا فعل حال ہے + گلِ خنداں یعنی شگفتہ پھول + طبلۂ عطار، عطر فروش کا صندوقچہ۔

اس نظم میں اقبالؔ نے ایک مرجھائے ہوئے پھول کو دیکھکر اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اے گلِ پژمردہ! تو مرجھا گیا اور مرجھانے کے بعد تیری حالت ایسی دگرگوں ہو گئی کہ اب کوئی شخص تجھکو پھول نہیں کہہ سکتا۔ تو وہی ہے جو مرجھانے سے پہلے بلبل کا محبوب تھا۔ اور بادِ صبا تیرا گہوارہ ہلاتی تھی۔ تیری وجہ سے نسیمِ صبح خوشبودار تھی۔ اور اُسی پر کیا منحصر ہے سارا باغ تیری خوشبو سے مہک رہا تھا، گویا عطر فروش کا صندوقچہ تھا۔

اب جبکہ تو مرجھا گیا تو میں تیری موت پر آنسو بہاتا ہوں، اور تیری طرح میرا دل بھی اداس ہے۔ میرا دل بھی اسی طرح مرجھایا ہوا ہے! تو میری زندگی کے خواب کی تعبیر ہے۔ اور میری بربادی کی چھوٹی سی تصویر ہے۔ بات یہ ہے کہ میں یعنی میری روح بھی اصل سے جدا ہو کر، تیری طرح پژمردہ اور افسردہ ہو گئی ہے، فارسی شعر کا ترجمہ یہ ہے: بانسری کی طرح میں بھی اپنے نیستاں کی حکایت بیان کرتا ہوں۔ اے گل میری داستان سُن! میں اپنے محبوب سے جدائی کی داستان بیان کر رہا ہوں۔

نوٹ: اس نظم کا بنیادی تصور یہ ہے کہ انسانی روح اپنی اصل سے جدا ہو گئی

ہے اسلئے رنجیدہ رہتی ہے۔ یہ شعر مرشد رومیؒ کے اس شعر سے ماخوذ ہے:۔

بشنو از نے چوں حکایت می کند
وز جدائیہا شکایت می کند

اس نظم سے معلوم ہوسکتا ہے کہ اقبالؔ شروع ہی سے تصوّف کی طرف مائل تھے۔ اور یہ مذاق اُن کے اندر ان کے والدین نے پیدا کیا تھا۔

نظم نمبر ۴۲

حل لغات اور شرح مشکلات | مرغ جاں۔ اسیر کی رعایت سے جان کو مرغ قرار دیا ہے۔ مرغ جاں سے مراد جان ہے + تار نفس سے نفس (سانس) مراد ہے + نغمہ پیرا۔ گانے والے۔ گرویدۂ تقریر۔ تقریر کی طرف مائل + لوح۔ مزار کا پتھر جس پر نام اور تاریخ وفات کندہ ہوتی ہے + وا کرنا، کھولنا۔ ہنگامۂ محشر قیامت کا ہنگامہ یعنی بڑا ہنگامہ + وصل سے یہاں مراد اتحاد ہے + رنگ پر آنا دلکش یا مفید ہونا + مدبّر، سیاسی رہنما یا لیڈر + جے دلیری، دست اسباب سیاست کا عصا۔ یعنی سیاسی لیڈر کو جری اور دلیر ہونا چاہئے + بیم و ریا۔ خوف اور دکھاوا۔ خامۂ معجز رقم۔ یعنی وہ شخص جو بے نظیر تحریر لکھنے پر قادر ہو۔ جام جم۔ جمشید کا پیالہ جس میں ساری دنیا کا حال نظر آتا تھا + تلمیذ رحمانی۔ خدا کا شاگرد۔ (شاعر، خدا کا شاگرد ہوتا ہے۔ کیونکہ شاعری خالص عطیۂ الٰہی ہے) اعجاز، وہ بات جو دوسروں سے ممکن نہ ہوسکے، معجزہ، خرمن باطل، یعنی باطل، جلانے کی رعایت سے باطل کو خرمن سے تعبیر کیا ہے۔ چونکہ جلانے کا تلازمہ باندھا ہے، اسلئے خرمن اور شعلہ کے الفاظ لائے ہیں۔

سرسیّد احمد خاں مرحوم و مغفور انیسویں صدی میں انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کی مادی اور سیاسی پشت پناہ تھے۔ مولانا محمد قاسمؒ نے دیوبند میں مسلمانوں کے دین کی بقا کے لئے مدرسہ قائم کیا۔ سرسید نے علی گڑھ میں اُن کی دنیا سنوارنے کے لئے کالج قائم کیا۔ اگرچہ علی گڑھ تحریک سے اسلام کو اور ضمناً مسلمانوں کو، کئی پہلوؤں سے نقصان پہونچا۔ لیکن اس کی ذمہ داری سرسیّد پر نہیں ہے، انکی نیت بھی نیک تھی، اور وہ انگریز پرستی کے بھی خلاف تھے۔ نیز انکے اندر اخلاقی جرأت تو اسقدر تھی کہ آجکل کے لیڈروں میں اسکا عشر عشیر بھی نظر نہیں آتا۔ اقبالؔ نے سرسیّد کی زندگی اور اصلاحی کارناموں سے جو اثر قبول کیا، اسکو سرسید موصوف کی لوح تربت کی زبان سے اس نظم میں ادا کیا ہے۔ یعنی اقبالؔ کی رائے میں سرسیّد نے اپنی قوم کے علما، سیاسی قائدین اور شعرا، کو حسب ذیل پیغام دیا ہے۔

سرسیّد علمار کو بایں الفاظ نصیحت کرتے ہیں کہ اگر آپ حضرات اپنی قوم کو دینی تعلیم دینی چاہتے ہیں تو بڑے شوق سے دیجئے، لیکن

(۱) دین کے ساتھ ساتھ دنیا کی اہمیت بھی اُن کے دماغوں میں جاگزیں کیجئے۔

(۲) فرقہ بندی سے اجتناب کرنے کی تلقین کیجئے، کیونکہ اس سے قوم تباہ ہوجاتی ہے۔

(۳) تصنیف و تالیف میں دل آزادی کا رنگ پیدا نہ ہونے پائے، ورنہ تصنیف کا مقصد فوت ہوجائیگا۔

(۴) اُن باتوں کو زیر بحث نہ لائیے جو گذر چکی ہیں، اور اب اُنکے دُہرانے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔

اسکے بعد مدبرین (ارباب سیاست) کو یہ نصیحت کرتے ہیں کہ قوم کے لیڈروں میں دلیری اور اخلاقی جرأت کا پایا جانا پہلی شرط ہے۔ مسلمان کی پہچان یہ ہے کہ نہ وہ ٹوڈی لوگ ہوتا ہے، اور نہ دنیا کار یا منافق، اور بادشاہوں کے سامنے کلمۂ حق کہنے سے بالکل نہیں ڈرتا۔[۱] اسکے بعد شعرا کو نصیحت کرتے ہیں کہ اپنی زبان کو ہجو، مذمت، اور بدگوئی سے پاک رکھو، اور کسی کی خوشامد مت کرو، کیونکہ پھر تمہارا کلام بے وقعت ہوجائیگا۔ اور اپنی شاعری کو قوم کے بیدار کرنے اور صداقت کی تبلیغ کے لئے وقف کردو۔

---

[۱] قائد اعظم مرحوم و مغفور میں یہ تمام صفات بدرجۂ اتم پائی جاتی تھیں۔

(۱) دلیری کی مثال یہ ہے کہ جب ایک گمراہ خاکسار نے ان پر قاتلانہ حملہ کیا، تو اُنہوں نے کمال دلیری کے ساتھ اُس کے وار کو روکا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چاقو گردن کے بجائے ٹھوڑی پر لگا۔ اور انکی جان بچ گئی۔

(۲) اخلاقی جرأت کی مثال یہ ہے کہ برسوں کانگرس میں رہنے کے باوجود، جب اُنہوں نے یہ دیکھا کہ یہ جماعت مسلمانوں کی بدخواہ ہے تو اُنہوں نے اس سے قطع تعلق کرلیا۔ مسٹر فضل الحق وزیر اعظم بنگال نے انکے فیصلہ کے خلاف ڈیفنس کاونسل کی رکنیت قبول کرلی تھی۔ چنانچہ اُنہوں نے "شیر بنگال" کو چشم زدن میں "روباہ و شغال" کے خانہ میں رکھدیا۔

(۳) انکے مخلص ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ مسٹر گاندھی نے ایک دفعہ یہ کہا تھا کہ جناح صاحب کا کریکٹر شکوک سے بالاتر ہے۔ اور اُن کے خلوص میں مجھے کوئی شبہ نہیں ہے۔ بلبل ہند مسز سروجنی نائڈو نے ایک دفعہ کہا تھا کہ کوئی شخص مسٹر جناح کی ذات پر کوئی اعتراض نہیں کرسکتا۔

(۴) انکی حق گوئی کا ثبوت یہ ہے کہ ۳۵ کروڑ ہندوؤں کی متفقہ مخالفت اور برطانیہ کی طاقت بھی انکو پاکستان کے مطالبہ سے ایک انچ اِدھر اُدھر نہ کرسکی۔

کاش! پاکستان کے نوجوان اس عظیم الشان انسان کے نقش قدم پر چل کر اقوام عالم کی صف میں اپنے لئے نمایاں مقام حاصل کرسکیں۔

نظم نمبر ۴۴

حل لغات اور شرح مشکلات | غرقاب نیل۔ دریائے نیل میں ڈوب گئی: روئے آب۔ پانی کی سطح پر + طشت گردوں۔ آسمان کا تھال یعنی آسمان۔ خون ناب۔ خالص خون + نشتر قدرت یعنی قدرت۔ سیم خام۔ کچی اسلئے نہایت سفید چاندی + بانگ درا، گھنٹے کی آواز + سیارۂ ثابت نما۔ چاند کو سیارۂ ثابت نما اسلئے کہا کہ در اصل چاند گردش کرتا ہے، لیکن بظاہر ساکن معلوم ہوتا ہے + طفلک سیماب پا۔ بیقرار یا بیچین چھوٹا بچہ۔ مکتب ہستی مراد دنیا ہے۔

تبصرہ | اس نظم میں اقبالؔ نے تشبیہات اور استعارات کی خوبی کو کمال تک پہونچایا ہے۔ ماہِ نو کو خورشید کی کشتی کا ٹکڑا، "عروس شام کی بالی" اور "سیم خام کی مچھلی" قرار دینا، کسقدر انوکھا خیال ہے۔ یہ تشبیہات انکی قوت تخئیل کی صناعی کی بہترین مثالیں ہیں۔

مطلب | کہتے ہیں کہ یہ پہلی رات کا چاند ہے یا خورشید کی کشتی کا ایک ٹکڑا ہے؟ یا عروس شام کی بالی ہے؟ یا سیم خام کی مچھلی ہے؟ یہ شفق کی سُرخی ہے یا قدرت نے آفتاب کی فصد کھولدی ہے؟ اسکے بعد ماہ نو سے خطاب کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ اے چاند! تو ایسی خاموشی سے اپنا سفر طے کرتا ہے کہ انسان تیرے چلنے کی آواز بالکل نہیں سُن سکتا۔ اے چاند! میں اس دنیا میں رہنا پسند نہیں کرتا، اسکی وجہ یہ ہے کہ میں نور کا طالب ہوں۔ اسلئے تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے چل تاکہ میں بھی مادی علائق سے بالاتر ہوکر نورانی زندگی بسر کرسکوں۔

نظم نمبر ۴۵

حل لغات اور شرح مشکلات | درخشاں، چمکیلا۔ بزم معمورۂ ہستی مراد ہے

کائنات + پرتو مہر، سورج کا عکس یا اسکی روشنی + سیم سیال، بہتی ہوئی چاندی۔ مطلب یہ ہے کہ جب آفتاب کا عکس دریاؤں میں پڑتا ہے تو پانی بہتی ہوئی چاندی معلوم ہوتا ہے + سورۂ والشمس کی تفسیر ہے گلزار مراد ہیں، کیونکہ پھولوں میں نکہت اور تازگی آفتاب ہی کی بدولت پیدا ہوتی ہے + مے گلرنگ، لال رنگ کی شراب + خم شام، شام کا مٹکا، مراد ہے شام + مستور، پوشیدہ + سطوت، شان و شوکت + تقدیر کا اختر جل گیا۔ کنایہ ہے بدنصیبی یا ناکامی سے + بود و نبود، ہستی اور نیستی یا وجود اور عدم + صحیفہ، کتاب۔ اس لفظ میں عظمت اور تقدس کی شان پائی جاتی ہے۔ مثلاً صحیفہ آسمانی، یا صحیفہ قدرت + بار جو مجھ سے نہ اٹھا وہ اٹھایا تو نے۔ اس مصرع میں تلمیح ہے اس آیت کی طرف :-

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ، إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا

اور ہم نے (اپنی) امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا (۳۳-۷۲)۔ لیکن ان سب نے اسکے اٹھانے سے انکار کیا، اور اس سے ڈر گئے۔ لیکن انسان نے (اس بار) امانت کو اٹھا لیا۔ بیشک وہ ظلوم وجہول ہے۔

بے منت خورشید چمک ہے تیری، یعنی کائنات تو اپنی چمک دمک کے لئے آفتاب کی محتاج ہے۔ لیکن انسان اپنے روحانی کمالات کے لئے آفتاب کا محتاج نہیں ہے۔ اگر آفتاب نہ ہو تو کائنات اپنا جمال و کمال مطلق ظاہر نہیں کر سکتی۔ لیکن انسان روحانی مدارج طے کرنے کے لئے یا اپنی خودی کو مرتبۂ کمال تک پہونچانے کے لئے آفتاب کا محتاج نہیں ہے + زنداں۔ قید خانہ + حلقۂ دام تمنا سے وہ آرزوئیں مراد ہیں جن میں انسان پھنسا رہتا ہے + پابند مجاز، یعنی ظاہر بیں، حقیقت سے ناواقف + گرم نیاز، وہ شخص، جو عاجزی یا طلب میں گرفتار ہو +

تبصرہ | یہ نظم اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس میں اقبال نے فلسفۂ خودی کا ابتدائی خاکہ یا نقشہ بیان کیا ہے۔ فلسفۂ خودی کی بنیاد یہ ہے کہ انسان، اشرف المخلوقات ہے۔ اسکے اندر، یعنی اسکی خودی میں روحانی ترقی کی غیر محدود صلاحیت مخفی ہے۔ اور یہی حقائق اقبال نے اس نظم میں بیان کئے ہیں۔

مطلب | شاعر کہتا ہے کہ جب صبح کے وقت میں نے آفتاب پر نظر کی تو کائنات سے یہ دریافت کیا کہ اس آفتاب کی بدولت، تجھے اجالے کی نعمت حاصل ہے، اور تیرے اندر جو کچھ حسن و جمال ہے، مثلاً یہ باغ، پھول، رنگ برنگ کے درخت بادلوں کی سرخی، شفق کی لالی، یہ سب آفتاب کا فیضان ہے۔ ساری چیزیں آفتاب کے نور سے فیض یاب ہیں۔ پھر یہ بات کیا ہے کہ میں اس نور سے محروم ہوں اور ظلمت میں گرفتار ہوں؟ میری بدنصیبی اور بدقسمتی کا کیا سبب ہے؟

جب میں نے کائنات سے یہ سوال کیا تو غیب سے یہ آواز میرے کانوں میں آئی (کائنات نے زبان حال سے یہ جواب دیا) کہ اے انسان! تو غلط فہمی میں مبتلا ہے اس کائنات کی ہستی در اصل تیرے نور سے وابستہ ہے۔ اور اسکی شوکت و سطوت تیری ذات پر موقوف ہے۔ تو اس کائنات کا باغبان (نگہبان) ہے۔ اگر تیری ہستی نہ ہو تو یہ ساری کائنات اجڑ جائے۔ تو عشق کی کتاب ہے۔ اور یہ کائنات کتاب عشق کی تفسیر ہے۔ تو اس کائنات کے بگڑے ہوئے کاموں کو بنانے والا ہے۔ تو نے امانت الٰہی (عشق یعنی اطاعت احکام الٰہی) کا وہ بار گراں اٹھا لیا جو اس ساری کائنات سے نہ اٹھ سکا۔ تو اس کائنات کا سردار اور آقا ہے۔ تو اشرف المخلوقات ہے۔

یہ کائنات، نور آفتاب کی محتاج ہے۔ لیکن تو اسکا محتاج نہیں ہے۔ اس کائنات کی رونق آفتاب کے دم سے ہے۔ لیکن تیری خودی آفتاب کی دست نگر نہیں ہے۔ افسوس یہ ہے کہ تو اس دنیا کی فانی دلچسپیوں میں منہمک ہو کر اپنی حقیقت سے غافل ہو گیا۔ تیرا مرتبہ یہ ہے کہ یہ ساری کائنات تیری محتاج ہے۔ لیکن تو طلسم رنگ و بو میں گرفتار ہو کر، اس کائنات کا محتاج بن گیا۔ یہ کائنات تیری خادم ہے، لیکن تو نے اپنی کوتاہ بینی کی بدولت اسکو اپنا مخدوم بنا لیا۔ در اصل یہ کائنات تیری طالب ہے۔ لیکن تو نے اپنی غلط بینی سے اسکو اپنا مطلوب قرار دے لیا۔ اگر تو اپنی حقیقت سے خبردار ہو جائے تو پھر نہ سیہ روز ہے اور نہ سیہ کار ہے۔

نوٹ :- یہ تمام مضمون قرآن مجید کی اس آیت کی تفسیر ہے :-

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً

اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں دنیا میں اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں واضح ہو کہ انسان، اس دنیا میں اللہ کا خلیفہ ہے۔ اسلئے اشرف المخلوقات ہے۔ یہی آیت اقبال کے فلسفۂ خودی کا سنگ بنیاد ہے۔

انسان خلیفۃ اللہ ہے۔ یہ ساری کائنات انسان کی خادم ہے۔ اب انسان کا فرض یہ ہے کہ وہ طریق عشق پر گامزن ہو کر، اللہ کے احکام کی اطاعت کرے۔ اس اطاعت سے اسکے اندر تسخیر کائنات کی طاقت پیدا ہو جائیگی۔ اور جب وہ کائنات کو مسخر کرے گا تو مقام خلافت و نیابت الٰہیہ پر فائز ہو جائیگا۔ اقبال نے اسرار خودی میں اسی نکتہ کی وضاحت کی ہے۔

نظم نمبر ۴

حل لغات اور شرح مشکلات | لانگ فیلو، مشہور اور ہر دلعزیز امریکن شاعر جس نے انگلستان میں بھی شہرت حاصل کی۔ ۱۸۰۷ء میں بمقام پورٹ لینڈ (امریکہ) پیدا ہوا۔ امریکہ کی مشہور درسگاہوں میں ادبیات عالیہ کا پروفیسر رہا۔ ۱۸۸۲ء میں کافی شہرت اور عزت حاصل کرنے کے بعد وفات پائی۔ بڑا عالم، بڑا شریف النفس بڑا شاعر، بڑا فیشن ایبل اور بڑا رقیق القلب تھا۔ جوانی میں ایک بار شکار کھیلنے گیا، اور ایک چڑیا ( ) ماری۔ اسکے تڑپنے سے اس درجہ متاثر ہوا کہ پھر ساری عمر بندوق کو ہاتھ نہیں لگایا۔

جبین شب کی افشاں۔ شاعر نے رات کو ایک عورت فرض کر کے اسکے ماتھے پر افشاں چنی ہے۔ افشاں پہلے زمانہ میں مقیش باریک کتر کے دلہن کی پیشانی پر چھڑک دیا جاتا تھا۔ جو مومی شمع کی مدھم روشنی میں ستاروں کی طرح چمکتا تھا۔ اب چونکہ دلہن کا فوٹو اخباروں میں شائع ہوتا ہے، اسلئے افشاں چننا رجعت پسندی کی دلیل سمجھا جاتا ہے۔ جبین شب کی افشاں کا اجالا رخصت ہو گیا۔ یعنی صبح ہو گئی۔ یہ مصرع اقبال کے شاعرانہ کمال کی دلیل ہے کہ انہوں نے رات کی تاریکی کے بجائے "افشاں کا اجالا" کہہ کر اپنا مطلب ادا کیا۔ جبین شب کی افشاں سے چھوٹے چھوٹے ستارے مراد ہیں۔ نسیم زندگی پیغام لائی، یعنی صبح ہو گئی۔ طلسم ظلمت شب، سورۂ والنور سے توڑا۔ سورہ نور قرآن مجید کی ۲۴ ویں سورت ہے۔ اقبال نے نور آفتاب کو، سورۂ نور سے تعبیر کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نور آفتاب نے رات کی تاریکی کو مٹا دیا۔ شمع شبستاں کا تاج زر، کنایہ ہے شمع کی لو سے۔ یعنی جب صبح ہو گئی تو شمع گل کر دی گئی۔ خوابیدگان دیر، بتخانہ کے وہ پجاری جو رات گئے تک بتوں سے لو لگائے بیٹھے رہتے ہیں۔ لغوی معنی ہیں بتخانوں یا مندروں میں سونے والے۔ افسون بیداری۔ جاگنے کا منتر۔ پہلے زمانہ میں مارگزیدہ پر فی الحقیقت پنڈت لوگ افسون بیداری پڑھا کرتے تھے۔ اس مصرع کا مطلب یہ ہے کہ مندروں کے پجاری بیدار ہو گئے۔ بام حرم، مسجد کی چھت کھٹکا، یہاں اس لفظ سے خوف یا ڈر مراد نہیں ہے۔ بلکہ تصور یا خیال، جو عموماً

مؤذن کے دل میں ہوتا ہے کہ مجھے طلوعِ آفتاب سے پہلے اُٹھکر اذان دینی ہے۔ گورغریباں سے عام قبرستان مراد ہوتا ہے۔

مطلب | جب رات ختم ہوگئی، تو زندگی صبح کا پیغام لائی۔ یعنی دنیا میں پھر چہل پہل شروع ہوگئی۔ پرندے اپنے آشیانوں میں، اور کسان کھیتوں کے کنارے بیدار ہوگئے۔ مندروں اور مسجدوں میں پجاری اور نمازی بیدار ہوگئے۔ برہمن نے ناقوس بجایا۔ مؤذن نے اذان دی۔ باغوں میں نسیمِ صبح چلی تو غنچے شگفتہ ہونے لگے۔ قافلے سفر پر روانہ ہونے لگے۔ جب زندگی قبرستان کی طرف گئی وہاں کا نظارہ دیکھ کر کہنے لگی، کہ تم ابھی آرام سے لیٹے رہو، میں پھر آؤنگی، ساری دنیا کو سُلا دونگی اور تم کو خواب سے جگا دونگی۔ مطلب یہ ہے کہ جب قیامت کی صبح نمودار ہوگی تو مردے دوبارہ زندہ ہو جائینگے۔

نظم بر ص ۴۸

حلِّ لغات اور شرحِ مشکلات | ٹینی سن، انگلستان کا مشہور شاعر ۱۸۰۹ء میں پیدا۔ ۱۸۵۰ء میں ورڈ سورڈ تھ کی وفات کے بعد، ملکہ انگلستان نے اسکو ملک الشعراء کے مرتبہ پر فائز کیا۔ بڑی عمر، بڑی عزت اور بڑی شہرت پاکر ۱۸۹۲ء میں وفات پائی۔ ۱۸۵۰ء اسکی زندگی کا مبارک ترین سال تھا، کیونکہ ملک الشعراء کا عہدہ پانے کے علاوہ اسی سال اُس نے ایک ایسی بھاگوان عورت کے ساتھ شادی کی جس نے اسکی زندگی کو مسرت سے لبریز کر دیا۔ نیز اسی سال اُس نے اپنی مشہور نظم — IN MEMORIAM شائع کی۔ جس کی بدولت اسکا شمار صفِ اوّل کے شعرا میں ہوگیا۔ ۱۸۶۳ء میں حکومت برطانیہ نے اسکو عوام کے خانہ سے نکال کر "لارڈ" بنا دیا۔

سُہانی، دلکش۔ نمودِ جہاں، دنیا کی پیدائش کی ابتدا۔ تبسم فشاں، زندگی کی کلی تھی، یعنی دنیا میں حیات کا آغاز ہو رہا تھا۔ مہر کو تاج زر مل رہا تھا۔ یعنی آفتاب میں نور اور چمک پیدا ہو رہی تھی۔ سیہ پیرہن شام کو دے رہے تھے۔ یعنی کارکنانِ قضا و قدر دن اور رات کا انتظام قائم کر رہے تھے۔ تابندگی بچھانے کو "کہیں شاخِ ہستی کو لگتے تھے پتے"، اس مصرع میں لفظ "کو" خلافِ محاورہ ہے اسکی جگہ "میں" ہونا چاہئے۔ مطلب یہ ہے کہ کائنات میں مختلف اشیاء پیدا ہو رہی تھیں۔ شعرا عموماً شبنم کو گریاں اور گل کو خنداں باندھتے ہیں۔ خودی تشنہ کام مے بیخودی تھی۔ خودی، انسانی شخصیت یا انفرادی زندگی۔ تشنہ کام، پیاسی۔ مے بیخودی، بیخودی کی شراب، یعنی اجتماعی زندگی۔ مصرع کا مطلب یہ ہے، کہ اُس وقت تک انسان اجتماعی زندگی (قبیلہ یا قوم) سے واقف نہیں ہوا تھا۔ کوئی حور چوٹی کو کھولے کھڑی تھی۔ کالی گھٹ کو حور کی چوٹی سے تشبیہ دی ہے۔ زمین کو تھا دعویٰ کہ میں آسماں ہوں۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ اُس وقت تک کائنات منظم نہیں ہوئی تھی، یا آسمان پیدا نہیں ہوا تھا۔ نیز اُس وقت تک مکاں اور لامکاں میں کوئی امتیاز قائم نہیں ہوا تھا۔ ان دونوں مصرعوں کا انداز یا اسلوبِ بیان بہت اچھوتا ہے۔ نظارگی لغوی معنی دیکھنا۔ مجازی معنی دیکھنے والا۔ مصرع کا مطلب یہ ہے کہ دیکھنے والا محوِ حیرت ہو جائے۔ جبینوں سے نورِ ازل آشکارا، یعنی انکی پیشانی سے مقدس نور ظاہر ہو رہا تھا۔ بیتابیوں کا مبتلا تھا، یعنی مجسّم اضطراب تھا۔ قضا مراد موت۔ نہیں آنکھ کو دید تیری گوارا۔ یعنی تیری صورت بہت خوفناک ہے۔ نورِ مطلق سے خدا مراد ہے۔ شرر سے مراد ہے عشق۔

نوٹ:- بڑی دلکش نظم ہے، اقبالؔ نے اس حقیقت کو کہ عشق پر موت کا قابو نہیں چل سکتا، بالِ جبریل میں یوں بیان کیا ہے:-

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحبِ فروغ
عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اُس پر حرام

نظم بر ص ۵۰

حلِّ لغات اور شرحِ مشکلات | صوفیِ منّشی۔ درویشی، پارسائی۔ اعالی و ادانی۔ اعلیٰ اور ادنیٰ کی جمع ہے۔ مضمر، بمعنی پوشیدہ۔ لبریز مے زہد سے تھی، یعنی اُنکا دل زہد اور تقویٰ سے لبریز تھا۔ دُھن بمعنی لگاوٹ۔ خیالِ ہمہ دانی، یعنی انکو یہ غرور تھا کہ میں بہت بڑا عالم اور خدا رسیدہ ہوں۔ مدت سے رہا کرتے تھے ہمسایہ میرے، یعنی مدت سے میرے ہمسایہ تھے ("ہمسایہ میں رہتے تھے" یہ خلافِ محاورہ ہے)۔ قمریٔ شمشادِ معانی۔ معانی کے اصطلاحی معنی تو علمِ معانی ہیں۔ جو بہت بلند پایہ علم ہے۔ کیونکہ جب تک ایک شخص ادب اور منطق سے خاص قسم کی مناسبت نہ رکھتا ہو وہ اس علم کو کما حقہٗ نہیں سمجھ سکتا۔ یہاں معانی سے فنِ شاعری مراد ہے۔ ترکیب کا مطلب یہ ہے کہ اقبالؔ بہت بلند پایہ شاعر ہے۔ رشکِ کلیم ہمدانی، یعنی کلیم ہمدانی سے بھی بڑھکر ہے۔ کلیمؔ شاہ جہاں کے دربار میں ملک الشعراء تھا۔ ۱۰۶۱ھ میں بمقام سرینگر (کشمیر) وفات پائی۔ تفصیلی حالات آئندہ درج کئے جائینگے۔ تشیّع، مذہب شیعہ کی طرف میلان۔ تفضیلِ علیؓ، حضرت علیؓ کو حضرت صدیق اکبرؓ پر فضیلت دینا۔ خاک اُڑانی، یہاں اس محاورہ سے توہین کرنی مراد ہے۔ حسن فروش کنایہ ہے، شاہدانِ بازاری سے۔ تلاوت اصطلاحی معنی قرآن مجید پڑھنا۔ دل دفترِ حکمت ہے، یعنی بڑا عالم فاضل ہے۔ خفقانی، سودائی۔ منصور کا ثانی، یعنی منصور کی طرح تصوف کے رموز سے واقف ہے۔ نغز بیانی، بلند پایہ اور حقائق سے لبریز گفتگو، ذرّہ ترکیبکانی۔

ہمسائیگی کی بنا پر + قصورِ ہمہ دانی، یعنی آپ کی علمیت میں اس سے کوئی نقص پیدا نہیں ہو سکتا + اشک فشانی، آنسو بہانا + تمسخر۔ ہنسی دلگی +

نوٹ:- اس نظم کی خوبی یہ ہے کہ اس میں اقبالؔ نے واقعہ نگاری کا کمال دکھایا ہے۔ اندازِ بیان میں شوخی اور طنز کی وجہ سے بہت دلکشی پیدا ہوگئی ہے اس نظم میں اُنہوں نے اپنی ابتدائی زندگی کے بعض پہلوؤں کو بے کم و کاست واضح کر دیا ہے۔ آخری شعر میں اُنہوں نے، زندگی کی ایک بڑی حقیقت کو بے نقاب کیا ہے۔ اس میں کیا شک ہے کہ دنیا میں بہت کم لوگ ایسے گذرے ہیں جنہوں نے اپنی حقیقت سے آگاہی حاصل کی ہے۔ یہ شعر صوفیا کے اس مشہور مقولہ سے ماخوذ ہے:- مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ یعنی جس نے اپنے نفس کی معرفت حاصل کرلی، اُس نے اپنے رب (خدا) کی معرفت حاصل کرلی۔

نظم بر ص ۵۳

حلِّ لغات اور شرحِ مشکلات | منزلِ صنعت کے رہ پیما ہیں۔ یعنی افراد ہی سے قوم کی تشکیل ہوتی ہے۔ مطلب اس نظم کا یہ ہے کہ اگر قوم کو جسم فرض کیا جائے تو افراد اسکے اعضا ہیں، اور حکومت اسکا چہرہ ہے اور شاعر اس کی آنکھ ہے، جس طرح آنکھ سارے جسم کی ہمدرد ہوتی ہے، اسی طرح شاعر کے دل میں قوم کے تمام افراد کی محبت جاگزیں ہوتی ہے۔ شاعر کو قوم سے وہی نسبت ہے جو آنکھ کو جسم سے ہوتی ہے۔

لیکن اقبالؔ نے اس نظم میں 'شاعر' سے حقیقی شاعر مراد لی ہے، جس کا دل قوم کی ہمدردی سے لبریز ہوتا ہے، نہ کہ وہ شاعر جو شاعری کو گذر اوقات کا ذریعہ بناتا ہے۔ اور خوشامد اور ضمیر فروشی سے اپنا پیٹ پالتا ہے۔

نظم برصفحہ ۵۴

حلّ لغات اور شرح مشکلات | دل - یہ اس نظم کا عنوان ہے اور اس سے مراد وہ مضغۂ گوشت نہیں ہے جو ہر شخص کے سینہ میں متحرک ہوتا ہے۔ بلکہ وہ لطیفہ نورانی ہے جو مرکزِ عشق ہے۔ اقبال کے یہاں دل سے مراد حقیقتِ عشق یا قوتِ عشق ہے، جو عقل کی مدِمقابل ہے۔

(۱) قصۂ دار و رسن بازی طفلانۂ دل یعنی عشق کی نگاہ میں سولی پر چڑھ جانا (موت گوارا کرلینا) کوئی مشکل کام نہیں ہے بلکہ عاشق اسکو بچوں کا کھیل سمجھتا ہے + التجائے ارنی سرخیٔ افسانۂ دل - یعنی عاشق کی داستانِ حیات کا عنوان یہ ہے کہ وہ خدا سے "درخواست کرتا ہے کہ مجھے اپنا جلوہ دکھادے - یعنی دیدارِ الٰہی کی آرزو اسکی زندگی کا خلاصہ ہے +

(۲) جادۂ ملکِ بقا ہے خطِ پیمانۂ دل - بقا یعنی ہمیشگی کو ملک فرض کرکے اسکے لئے راستہ ثابت کیا اور دل کو پیمانہ (ساغر) فرض کرکے، اسکے لئے خط ثابت کیا۔ خطا شراب کی مقدار کا اندازہ کرنے کے لئے، پیمانہ میں لکیریں بنادیتے ہیں، اس لکیر کو شاعر نے تخیل کی بنا پر راستہ سے تشبیہ دی ہے - بقا، ضد ہے فنا کی - اور عشق کی خاصیت یہ ہے کہ وہ عاشق کو صفتِ بقا عطا کردیتا ہے - شاعر کہتا ہے کہ جب خطِ پیمانہ میں بقا کی شان پائی جاتی ہے - تو جو شراب اس پیمانہ میں ہے اسکے پینے سے بدرجۂ اتم، شانِ بقا پیدا ہوجائیگی - اس شعر میں تجاہلِ عارفانہ کی صنعت پائی جاتی ہے - بظاہر تو سوال کیا ہے، لیکن بہ باطن دوسرے مصرع میں جواب دیدیا ہے کہ "مے" میں شانِ بقا عطا کرنے کی بدرجہا زیادہ طاقت موجود ہے -

(۳) ابرِ رحمت - مراد رحمتِ خداوندی + عشق کی بجلی مراد آتشِ عشق + مزرعِ ہستی زندگی یا ہستی کی کھیتی + اُگا دانۂ دل یعنی دل زندہ ہوگیا - مطلب یہ ہے کہ جب عاشق اپنا تن من اور دھن یہ تینوں چیزیں عشق کی آگ میں فنا کردیتا ہے - تو اسکا دل زندہ ہوجاتا ہے - یا جب عاشق اپنی ہستی کو خاک کردیتا ہے تو اس میں شانِ بقا پیدا ہوجاتی ہے - اس نکتہ کو شاعر نے تعجب کے انداز میں بیان کیا ہے کہ میں حیران ہوں کہ عشق کو کس چیز سے تعبیر کروں - ابرِ رحمت سے یا بجلی سے؟ ابرِ رحمت تو اسلئے نہیں کہہ سکتا کہ ہستی جل گئی، بجلی اسلئے نہیں کہہ سکتا کہ دل سرسبز ہوگیا - یہ وہ شاعرانہ اندازِ بیان ہے جس نے شعر میں اسقدر دلکشی پیدا کردی ہے - اور اقبال بلاشبہ اندازِ بیان پر بڑی قدرت رکھتے ہیں -

(۴) حُسن سے محبوب مراد ہے + گنجِ گرانمایہ - قیمتی خزانہ + ویرانۂ دل نہ کھودا - یعنی شیریں کو اپنے دل میں تلاش نہ کیا + مطلب یہ ہے کہ فرہاد نے غلطی کی جو شیریں کو حاصل کرنے کے لئے پہاڑ کھودنے کی زحمت اٹھائی - اگر وہ اُسے اپنے دل میں تلاش کرتا تو کامیاب ہوجاتا - شیریں سے بدرجہا زیادہ حسین محبوب تو خود اسکے دل میں پوشیدہ تھا، لیکن وہ اس حقیقت سے آگاہ نہ ہوسکا، اسلئے شیریں کے حصول میں سرگرداں رہا -

(۵) مطلب یہ ہے کہ دل چونکہ خدا کا گھر ہے، اسلئے مجھے اس پر کبھی عرش کا دھوکا ہوتا ہے، کبھی کعبہ کا - اس شعر کا اندازِ بیان بہت دلکش ہے -

(۶) دل کسی اور کا دیوانہ ہے - یعنی خدا کا عاشق ہے - مطلب یہ ہے کہ میرا دل تو خدا کا طالب ہے - اور چونکہ اس طلب کی وجہ سے دل بذاتِ خود نہایت قیمتی اور قابلِ قدر ہوگیا ہے اسلئے میں اپنے دل پر عاشق ہوگیا ہوں -

(۷) رشکِ صد سجدہ ہے یعنی سیکڑوں سجدوں سے بہتر ہے + لغزشِ مستانۂ دل - دل کی وہ لغزش جو بحالتِ مستی، اُس سے سرزد ہوجاتی ہے - مطلب یہ ہے کہ عاشقِ صادق سے اگر بحالتِ مستی کوئی غلطی بھی سرزد ہوجائے تو وہ عشق کی نگاہ میں نیکی سے بڑھکر ہے -

(۸) خاک کے ڈھیر سے انسان مراد ہے - مطلب یہ ہے کہ جو شخص عشقِ الٰہی میں فنا ہوجاتا ہے، اس میں یہ تاثیر پیدا ہوجاتی ہے کہ وہ ان لوگوں کو، جو اسکی صحبت میں بیٹھتے ہیں، خدارسیدہ بنادیتا ہے -

(۹) مطلب یہ ہے کہ دل کی شان ساری دنیا سے نرالی ہے - انسان، تو دام میں پھنسکر گرفتار ہوجاتا ہے، لیکن دل اگر دامِ عشق میں گرفتار ہوجائے تو (تمام دنیاوی قیود سے) رہا ہوجاتا ہے - دل کی حقیقت یہ ہے کہ اگر وہ دنیا کی طرف مائل ہو، تو تصوف کی اصطلاح میں اس میلان کو گرفتاری سے تعبیر کرتے ہیں اور اس گرفتاری سے رہائی کی صورت یہ ہے کہ دل اللہ کی محبت میں فنا ہوجائے - اسی طرح اگر کسی درخت یا انسان پر بجلی گر پڑے تو وہ جل جاتا ہے، لیکن اگر دل پر (عشقِ الٰہی کی) بجلی گر پڑے تو سرسبز ہوجاتا ہے -

خلاصۂ کلام یہ کہ انسان کا دل عالمِ مادی سے تعلق نہیں رکھتا اسلئے مادیات کے قوانین اس پر عائد نہیں ہوسکتے -

---

نظم برصفحہ ۵۵

حلّ لغات اور شرح مشکلات | دلِ بیتاب سے یہاں موج کا تقاضائے ذات مراد ہے + عینِ ہستی - یعنی میری ہستی کی حقیقت + صورتِ سیماب - پارے کی مانند + پایاب - گہرے پانی کی ضد ہے + حلقۂ گرداب، یعنی بھنور + توسن یعنی گھوڑا + خارِ ماہی یعنی مچھلی کی ہڈی + جذبِ مہ کامل، جب چودھویں کا چاند سمندر پر چمکتا ہے تو قانونِ قدرت کے مطابق پانی میں طلاطم پیدا ہوجاتا ہے - اور موجیں بہت اونچی ہوجاتی ہیں + ساحل سے سر پٹکنا یعنی ساحل سے ٹکرانا + محبت ہے مجھے منزل سے - یعنی ہر موج ساحل تک ضرور پہونچتی ہے + پوچھے کوئی میرے دل سے، یعنی تڑپنا موج کی خاصیت ہے + زحمتِ تنگیٔ دریا - وہ کلفت جو دریا کی تنگی سے پیدا ہوتی ہے + گریزاں - بھاگنے والا -

اس نظم میں اقبال نے موج کی کیفیت بیان کی ہے، کہ حرکت اور روانی اسکی ذات کا خاصہ ہے - اس حرکت کو شاعر نے اضطراب سے تعبیر کیا ہے جس طرح سیماب کو ایک لمحہ کے لئے قرار نصیب نہیں ہوتا - اسی طرح موج بھی ہروقت متحرک رہتی ہے - دریا میں کوئی شئے گرداب ہو یا مچھلی موج کی روانی کو نہیں روک سکتی - آخری شعر میں حسنِ تعلیل ہے - یعنی موج کی تڑپ کا باعث یہ ہے کہ وہ سمندر کی وسعت کی طالب ہے، دریا کی تنگی سے پریشان رہتی ہے -

---

نظم برصفحہ ۵۶

حلّ لغات اور شرح مشکلات | اے بزمِ جہاں - اے اہلِ دنیا + آباد ویرانہ اس ترکیب میں صنعتِ تضاد پائی جاتی ہے - کیونکہ آباد ضد ہے ویرانہ کی - اقبال نے دنیا کو آباد ویرانے سے اسلئے تعبیر کیا ہے کہ بظاہر آباد ہے لیکن غور سے دیکھو تو اپنا یہاں کوئی نہیں، سب مطلب کے یار ہیں - دراصل کوئی کسی کا نہیں ہے - اسلئے شاعر کی نگاہ میں یہ آباد دنیا دراصل ویرانہ ہے + درخورِ محفل نہیں - لوگوں کی محفلوں میں شریک ہونے کے لائق نہیں ہوں - کیونکہ افسردہ ہوں، اور "افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را" + دربارِ سلطاں قید ہے، بادشاہوں کا اور نوابوں کا دربار بظاہر بہت دلکش ہوتا ہے - لیکن دراصل قیدخانہ ہے - امیر وزیر، درباری اور مصاحب، جبتک ضمیرفروشی اور خوشامد نکریں، ترقی، انعام، اعزاز، اور اکرام کوئی چیز حاصل نہیں کرسکتے - بادشاہوں اور نوابوں کے دربار میں کوئی شخص

اپنی مرضی سے کوئی کام تو درکنار، بات بھی نہیں کرسکتا۔ جیل خانوں میں تو صرف جسم قید میں ہوتا ہے، لیکن درباروں میں تو جسم اور روح دونوں بادشاہوں کے غلام ہوتے ہیں۔ میری رائے میں بادشاہوں اور نوابوں کی قربت اور مصاحبت سے بڑھکر دنیا میں کوئی لعنت نہیں ہے۔ زنجیرِ طلائی کا اسیر۔ بادشاہ اور نواب سونے چاندی کے زور سے یعنی زرپاشی کی بدولت، شریفوں کو اپنا غلام بناتے ہیں + خود آرا۔ بمعنی خود پسند اور متکبر اور اپنی آرائش میں مشغول رہنے والا + موج بحر کی صفت چونکہ موجوں کو کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی کسی جگہ قرار نہیں ہوتا، اسلئے شاعر ہمیشہ موج کو بیتاب اور مضطرب سے تعبیر کیا کرتے ہیں۔ شبستاں بمعنی خوابگاہ۔ وہ کمرہ جس میں دولتمند رات کے وقت بیٹھتے یا آرام کرتے ہیں۔ عموماً بہت آراستہ پیراستہ ہوتا ہے اور لوازم عیش موجود ہوتے ہیں + ہنگامۂ عشرت بمعنی عیش و نشاط ... ظلمت میں روشنی کی جستجو کرتا رہا۔ یعنی اس دنیا میں سکون کی تلاش کرتا رہا + خاک میں نظارۂ گل ڈھونڈا۔ اس مکار دنیا میں شرافت کی تلاش کرتا رہا + وہ یوسف ہاتھ نہ آیا۔ یعنی اس دنیا میں (جسکے حصول کے لئے ہر شخص اپنا دین و ایمان بیچنے کے لئے تلا ہوا ہے) صداقت، دیانت اور وفا کہیں نہیں پائی جاتی۔

پہلے بند کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ دنیا شریف، مخلص اور دیانت دار آدمیوں کے رہنے کی جگہ نہیں ہے۔ اسکے حصول کی صورت مکر و فریب کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ چونکہ شریف آدمی نہ خوشامد کرسکتا ہے، نہ ضمیر فروشی، نہ مکاری نہ بے ایمانی اسلئے اسکے سامنے صرف ایک ہی راستہ ہے، اور وہ یہ کہ سکوتِ دامن کوہسار میں گھر بنالے۔ اور انسانوں کے بجائے نرگس، گل لالہ اور بلبل کی ہمسائیگی اختیار کرلے۔ چنانچہ اقبال نے دوسرے بند میں اسی زندگی کی تصویر کھینچی ہے۔
سکوتِ دامن کوہسار۔ پہاڑی کے دامن کی خاموشی اور تنہائی +

آہ! یہ لذت کہاں موسیقیِ گفتار میں۔ یعنی جنگل کی خاموش فضا، شہروں کی ہنگامہ پرور محفلوں سے زیادہ دلکش ہوتی ہے + نرگسِ شہلا، سرخ رنگ کی نرگس جو واقعی بہت حسین ہوتی ہے، اور پہلے زمانہ میں شاعر اُسے معشوقہ کی نشیلی آنکھوں سے تشبیہ دیا کرتے تھے۔ (اب نرگس اور صنوبر کا تذکرہ رجعت پسندی کی دلیل ہے)

اس بند کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں ہر شخص کو ہنگامہ اور جلسے، محفلیں اور قہقہے پسند ہیں۔ لیکن شاعر کو خلوت اور خاموشی پسند آتی ہے۔ جہاں کوئی انسان نہو۔ صرف فطرت کی گلکاریاں ہوں، نرگس اسکی ہمنشیں ہو، گل! اسکا رفیق ہو اور بلبل اسکی ہمسایہ ہو۔ جب نیند آئے تو وہ سبزہ زار پہ سوجائے، اور صبح کو کوئل بولے تو بیدار ہوجائے۔

پیامی بزمِ قدرت کا ہوں میں۔ یعنی میں مظاہر فطرت کی ترجمانی کرتا ہوں کائنات میں جس قدر اور جہاں کہیں فطری حسن پایا جاتا ہے، شاعر اُسکو دیکھتا ہے، اُس سے متاثر ہوتا ہے، اور اپنے تاثرات کو شعر کے لباس میں دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ بالفاظِ دگر، شاعر، فطرت کا پیغام رساں ہے + چمن کی خاموشی میں گوش برآواز ہوں، یعنی شاعر صحرا کی خاموش فضا میں بڑے انہماک کے ساتھ فطرت کے حسن و جمال معنوی کا مطالعہ و مشاہدہ کرتا رہتا ہے + نازاں ہوں اپنے گھر میں۔ یعنی میں گوشۂ تنہائی کو بادشاہوں کے محلات پر ترجیح دیتا ہوں + دارا۔ ایران کا نامور بادشاہ، جسے سکندر رومی نے ۳۲۶ ق م میں آربیلا کی جنگ میں شکست فاش دی تھی + خندہ زن ہوں، یعنی دارا اور سکندر کے تخت شاہی کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہوں + جادو کا اثر یعنی جب انسان مظاہر فطرت پر غور کرتا ہے تو اسکے دل کی گہرائی میں یہ یقین پیدا ہوتا ہے کہ یہ کائنات خودبخود موجود نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ اسے کسی علیم و حکیم اور قادر مطلق ہستی نے پیدا کیا ہے

آخری شعر اس ساری نظم کا حاصل ہے۔ اور اسکا مطلب یہ ہے کہ رازِ زندگی، فلسفہ سے معلوم نہیں ہوسکتا بلکہ گل کی پتی میں نظر آتا ہے رازِ ہست و بود، یعنی اگر کسی شخص کے دل میں رازِ کائنات کے معلوم کرنے کا شوق ہو تو اسے لازم ہے کہ وہ فلسفہ کے بجائے فطرت کا مطالعہ کرے۔

نظم بر صفحہ ۶

حلّ لغات اور شرح مشکلات | اے نووارد اقلیم غم۔ چھوٹے بچہ کو اس رنج وغم سے لبریز دنیا میں نووارد کہنا، اقبال کی صداقت پسندی کی دلیل ہے۔ تیرا آئینہ تھا آزاد غبار آرزو۔ یعنی تو جبتک رحم مادر میں تھا، ہر قسم کی آرزو اور خواہش سے پاک تھا، لیکن دنیا میں آتے ہی تیرے اندر آرزوؤں اور تمناؤں کا ایک طوفان برپا ہوگیا۔ اور اب یہ آرزو تیری ہر حرکت سے ظاہر ہوتی ہے + آزادِ تمیزِ امتیاز۔ جس طرح فطرت، کافر اور مومن، کالے اور گورے میں کوئی تمیز نہیں کرتی، اسی طرح چھوٹے بچے بھی ان امتیازات سے آشنا نہیں ہوتے۔ اس حقیقت کو اقبال نے اس طرح بیان کیا ہے کہ شاید تو فطرت کے طریقِ عمل سے واقف ہے، اسی لئے کسی قسم کا امتیاز پسند نہیں کرتا + ہم آہنگ۔ ساتھی، متفق، ہمخیال + تلوّن آشنا۔ وہ شخص جسے ایک حالت پر قرار نہو، جو مستقل مزاج نہو۔ تلوّن کے لغوی معنی ہیں رنگ بدلنا، مجازی معنی ہیں مزاج میں استقلال نہونا + گاہ بمعنی کبھی، کسی وقت +

اس نظم کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان بھی طفل شیر خوار کی طرح متلوّن المزاج ہوتا ہے۔ عام طور سے بچوں کو نادان کہتے ہیں۔ لیکن غور سے دیکھو تو حضرت انسان بھی نادانی میں بچوں سے کم نہیں ہے۔ وہ بھی بچوں کی طرح عارضی لذت کا شیدائی،

اور حسن ظاہری کا تمنائی ہوتا ہے۔ نیز عارضی اور فانی چیزوں کے حصول میں حقیقت سے غافل ہوجاتا ہے۔

نظم بر صفحہ ۶۲

حلّ لغات اور شرح مشکلات | نہیں منت کشِ تابِ شنیدن۔ یعنی میری داستان اسقدر درد انگیز ہے کہ کوئی شخص اُسکے سننے کی تاب نہیں لاسکتا + دستورِ زباں بندی۔ یعنی محفل میں بات کرنے کا حکم نہیں ہے + ورق اس لفظ کے دو معنی ہیں: داستان کی رعایت سے اسکے معنی ہیں کتاب کے اوراق، اور پھول کی رعایت سے اسکے معنی ہیں پھول کی پتیاں۔ لالہ کے سینہ میں داغ ہے۔ نرگس کی آنکھ میں آنسو ہیں۔ اور گل کا سینہ چاک ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ یہ دراصل میری ہی حالتِ زار کا نقشہ ہے جو باغ میں نظر آتا ہے + ریاض بمعنی باغ + میں حرفِ زیرِ لب، شرمندۂ گوشِ سماعت ہوں۔ یعنی میری حالت اُس بات کی سی ہے، جو منہ سے نکل سکے اور نہ کوئی اُسے سُن سکے۔ کنایہ ہے عاشق کی بے بسی سے، کہ وہ معشوق کے سامنے اپنا دردِ دل بیان نہیں کرسکتا + کچھ نہیں کھلتا، یعنی یہ نہیں معلوم ہوسکتا کہ میں کیا ہوں + میری ہستی قدرت کا مقصد ہے، یعنی فطرت نے یہ کائنات میرے لئے پیدا کی ہے۔ اگر میرا وجود نہو تو یہ کائنات بے مقصد ہوجائیگی + میں وہ ظلمت ہوں۔ یعنی بظاہر میں خاکی ہوں، اور خاک میں ظلمت ہوتی ہے لیکن میری حقیقت خاکی نہیں ہے، بلکہ نوری ہے + میں کہاں ہوں۔ یہاں "میں" سے ذاتِ شاعر مراد نہیں ہے بلکہ "انسان" مراد ہے۔ اور اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ دراصل انسان کا مرتبہ بہت بلند ہے + کس کی دولت ہوں۔ یعنی میں اس دنیا میں خدا کا نائب ہوں + نظر میری نہیں ممنونِ سیرِ عرصۂ ہستی۔ اس شعر میں تصوف کا رنگ ہے

یعنی انسان عالم صغیر ہے۔ وہ اگر اپنی حقیقت سے آگاہ ہو جائے تو اُسے کائنات کی سیر کرنے کی حاجت نہیں رہیگی۔ کیونکہ ساری کائنات خود اسکے اندر پوشیدہ ہے + ولایت کے دو معنیٰ ہیں ایک تو ملک یا اقلیم اور دوسرے معنی، جب یہ لفظ تصوّف میں استعمال ہو، اُس بلند روحانی مقام کے ہیں جو سالک کو ریاضت اور مجاہدہ کی بدولت حاصل ہوتا ہے + صہبا بمعنی شراب + میخانۂ ہستی یعنی کائنات + ہر شئے کی حقیقت ہوں، یعنی کائنات کی ہر شئے میرے وجود سے قیمت پاتی ہے۔ اگر میں نہوں تو آفتاب ماہتاب ستارے، سونا، چاندی، دریا، پہاڑ، باغ صحرا، محلات عمارات، کاغذ قلم سب بیکار ہیں + رنگین بیانوں سے شعرا مراد ہیں + بام عرش کے طائروں سے فرشتے مراد ہیں + جنونِ فتنہ ساماں۔ اس ترکیب میں تغزل کا رنگ ہے، مراد ہے عشق حقیقی + آئینۂ دل قضا کا رازداں ہے۔ یعنی جو شخص عشق حقیقی میں فنا ہو جاتا ہے وہ قضا و قدر کے اسرار سے واقف ہو جاتا ہے + نظارہ سے مراد ہندو مسلم افتراق ہے۔ جسکو دیکھکر شاعر کا دل خون ہو گیا + کلکِ ازل کلک بمعنی قلم۔ کلک ازل سے تقدیرِ الٰہی یا مشیت ایزدی مراد ہے + گلچیں سے بُرطانیہ اور باغبانوں سے ہندو اور مسلمان مراد ہیں + عنادل، عندلیب کی جمع ہے مراد ہے ہندو مسلمان + وظیفہ۔ کثیر المعانی لفظ ہے۔ لغوی معنیٰ ہیں وہ بات یا کام جسے پابندی کے ساتھ بار بار کیا جائے۔ یہاں اس سے مراد ہے کوئی دعا جو بار بار پڑھی جاتی ہے۔ یہی اسکے عرفی معنیٰ ہیں + اسلوب بمعنی طور طریقہ یا طرز + ہویدا بمعنی ظاہر + لہو رونا یعنی شدت کے ساتھ رونا + سوزِ نہاں سے مراد ہے عشق کی آگ + بکھرے ہوئے دانوں سے ہندو مسلمان مراد ہیں + سینہ کاوی۔ لغوی معنی سینہ کھودنا مراد ہے دشواریوں میں زندگی بسر کرنا یا مصائب برداشت کرنا + چشم بینا سے وہ انسان مراد ہے جو حقیقت شناس ہو۔ یہ مجازِ مرسل کی عمدہ مثال ہے + زمانہ کی

طبیعت کا تقاضا، یعنی عصر حاضر کا اقتضاء + دل بستۂ محفل، یعنی محفل کا گرویدہ + دیکھی نہ اس آئینہ میں اپنی ادا۔ یعنی تم نے اپنی حقیقت پر غور نہیں کیا + تعصب سے مراد ہے غیروں کو بُرا سمجھنا + نالۂ بیدادِ سوزِ زندگی ہو جا۔ یعنی اُن طاقتوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر جو زندگی کے مقاصد کی تکمیل میں حارج ہوں + سپند آسا۔ اسپند کے دانہ کی طرح۔ یعنی تو نے اپنے نالہ کو اسپند کی طرح اپنے دل میں بند کر رکھا ہے۔ اسپند کے دانہ کو جب آگ میں ڈالتے ہیں تو وہ چٹختا ہے اور اُس سے آواز پیدا ہوتی ہے۔ کفِ آئینہ پر حنا باندھنا۔ یہ محاورہ ہے مطلب اسکا یہ ہے کہ جس طرح آئینہ کو رنگ حنا سے کوئی رابطہ نہیں ہے، اسی طرح دل کی صفائی کو رنگ تعلق سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ دنیا والوں سے تعلقات میں خوبی پیدا کرنے سے دل میں صفائی پیدا نہیں ہو سکتی۔ چونکہ آئینہ پر حنا کا رنگ نہیں چڑھ سکتا۔ اسلئے اس محاورہ کا مطلب بے سود کام کرنا بھی ہو گیا + کج بینی۔ غلط بینی یا طریق کار کی غلطی، مراد احمقانہ طرز عمل + سطر قرآن سے مراد قرآن مجید کی بتائی ہوئی صحیح تعلیم یا صراطِ مستقیم ہے۔ سطر بمعنی مسطور یا احکام قرآن + چلیپا بمعنی صلیب مراد کج یا خمیدہ یا راہ راست سے منحرف۔ مثلاً زلفِ چلیپا، بمعنی زلفِ خمدار + بُتِ پندار۔ یعنی غرور کا بت۔ مراد ہے غرور یا خود بینی جس میں ہر تعلیمیافتہ شخص مبتلا ہے۔ اور اس سے نجات کی صورت صحبتِ مرشد کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے + یوسف سے مراد صداقت ہے۔ یعنی وہ اخلاقی تعلیمات جو تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ مثلاً جھوٹ بولنا، چوری کرنا، فریب دینا، زنا کرنا، رشوت لینا، بلیک مارکیٹ کرنا، یتیم کا مال کھانا، غریبوں کو ستانا، ہر مذہب میں ممنوع ہے + مطلق، منطق کی اصطلاح ہے۔ مقید کی ضد ہے۔ مطلق وہ جو تمام قیود و حدود سے بالاتر ہو، مثلاً اللہ کی ذات مطلق ہے۔

چنانچہ خدا کو "ذات مطلق" سے تعبیر کرتے ہیں۔ کیونکہ ہم اُس پر قیود وارد نہیں کر سکتے قادر مطلق میں بھی یہی تصور پوشیدہ ہے۔ مطلق کو مقید کر دیا یعنی مسلمانوں نے رحمت الٰہی کے نزول کو صرف مسلمانوں کے ساتھ مختص کر دیا۔ اقبالؔ نے اسی اختصاص کو قید سے تعبیر کیا ہے۔ کیونکہ اللہ کی رحمت تو عام ہے۔ وہ رب العالمین ہے اسلئے سب کی پرورش کرتا ہے + بوالہوس یا ابوالہوس لغوی معنی ہوس کا باپ، مراد ہے وہ شخص جو سراپا ہوس کا بندہ ہو۔ اور ۹۹ ٪ فیصدی افراد، ہوس ہی کے بندے ہوتے ہیں۔ اللہ کے بندے تو شاذ و نادر ہی نظر آتے ہیں + جم، جمشید کا مخفف ہے جو ایران قدیم کا مشہور بادشاہ گذرا ہے۔ حکمانے اسکے لئے ایک جام بنایا تھا جس میں سارے جہان کا حال نظر آتا تھا + فرقہ آرائی۔ یعنی مختلف گروہوں میں بٹ جانا اور ہر گروہ کا اپنے سوا دوسروں کو بُرا سمجھنا۔ جیسے مسلمانوں کے مختلف فرقے ایک دوسرے کو بُرا سمجھتے ہیں۔ اسکا لازمی نتیجہ تعصب ہے۔ اور اقبالؔ کی رائے میں کسی قوم کو تباہ کرنے کے لئے فرقہ بندی اور تعصب یہ دو لعنتیں بالکل کافی ہیں (ماشاء اللہ ہمارے پنجاب میں فرقہ بندی اور تعصب کے علاوہ تیسری لعنت بھی موجود ہے یعنی ذات پات کا امتیاز) اسی لئے اقبالؔ نے یہ شعر لکھا تھا:۔

فرقہ بندی ہے کہیں، اور کہیں ذاتیں ہیں

کیا زمانہ میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں ؟

جنت سے نکلواتا ہے آدم کو۔ چونکہ اقبالؔ نے فرقہ بندی کو شجر سے تشبیہہ دی ہے اسلئے لفظ شجر کی رعایت سے یہ ترکیب لائے ہیں کیونکہ "شجر" ہی کے پاس جانے کی بدولت آدمؑ کو جنت سے نکلنا پڑا تھا۔ اس ترکیب نے شعر میں بہت دلکشی پیدا کر دی ہے + ریاض۔ روضہ کی جمع ہے یعنی باغات۔ یہاں اقبالؔ نے اس لفظ کو شجر کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ اقبالؔ نظم کو مؤنث باندھا ہے لیکن دلی والے اسکو مذکر قرار دیتے ہیں + مجبورِ تیغ آرزو یعنی اگر انسان روحانی اور اخلاقی

اعتبار سے ترقی کرنا چاہتا ہے تو اسے اپنے دل میں "آرزو" یا بلند ارادہ یا مقصد پیدا کرنا چاہئے۔ یہ نکتہ اقبالؔ کے فلسفہ میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اسرارِ خودی میں اسکو بڑی وضاحت کے ساتھ لکھا ہے۔ میں صرف ایک شعر اس جگہ نقل کرتا ہوں:۔

ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم   از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

یعنی انسان کی زندگی تخلیق مقاصد پر موقوف ہے۔ جس کے دل میں آرزو نہیں وہ شخص مردوں کی طرح ہے۔ آزادِ احسانِ رفو۔ یعنی جرّاح کا احسان گوارا نہ کرنا + شراب بیخودی سے مراد یہ ہے کہ جب میں نے اپنی انفرادیت کو ملّت میں گم کر دیا تو مجھ میں آسمان تک اُڑنے کی طاقت پیدا ہو گئی + شکستِ رنگ سے مراد یہ ہے کہ تمام ظاہری امتیازات سے کنارہ کشی کی بدولت میرے اندر یہ صفت پیدا ہو گئی کہ میں نے بنی آدم کے دلوں میں مثل بو، گھر بنا لیا ہے۔ یعنی جب میں ہر شخص کو اپنا بھائی سمجھتا ہوں، تو لامحالہ ہر شخص مجھ سے محبت کرتا ہے + اسیر امتیازِ ما و تو۔ یعنی اپنی قوم یا جماعت کو اپنا عزیز اور دوسری قوموں کو غیر یا دشمن سمجھنا + ساغر سے مراد خود ذات حباب ہے۔ حباب یعنی بلبلہ کی ساخت ایسی ہے کہ وہ ساغرِ سرنگوں (اوندھا پیالہ) معلوم ہوتا ہے۔ شاعر نے اس جگہ حسن تعلیل سے کام لیا ہے۔ یعنی اسکی ہیئت کی علت یہ بتائی ہے کہ، حباب چونکہ مستغنی (بے نیاز) ہے، اسلئے عین دریا میں رہکر بھی دریا سے طالبِ آب نہیں ہوتا + او بیگانہ خو! وہ ہندو اور مسلمان مخاطب ہیں جن کے دل، تعصب سے لبریز ہیں + بخت خفتہ۔ سویا ہوا نصیبا۔ مطلب یہ ہے کہ جب کسی قوم کے افراد میں محبت کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے تو قوم ترقی اور سربلندی سے ہمکنار ہو جاتی ہے۔ دنیا کی کوئی حکومت یا طاقت اُس قوم کو غلام نہیں بنا سکتی، جس کے افراد میں باہمی

محبت کا رنگ پایا جاتا ہو + علاجِ گردشِ چرخِ کہن۔ یعنی حوادث ومصائبِ روزگار پر غالب آنے کی طاقت + دل کے جلانے سے محبت کرنا مراد ہے + سراپا نور ہو جانا، یعنی مادی یا سفلی خواہشات سے بالاتر ہو جانا۔ روحانیت کے بلند مقام پر فائز ہو جانا + بیستون، ایران میں ایک پہاڑ کا نام ہے بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ شیریں کا محل اسی پہاڑ کے دامن میں واقع تھا اور فرہاد نے اسی کو کھود کر نہر نکالی تھی + تمیزِ ملت وآئین سے مذہبی اختلافات مراد ہیں۔ اس زمانہ میں اقبال یہ سمجھتے تھے کہ اپنے اپنے مذہب یا دین پر قائم رہ کر بھی ہندو اور مسلمان دونوں ایک قوم بن سکتے ہیں۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد ان پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ ہندو کی لغت میں قوم سے ہندو قوم مراد ہے یعنی ہندو اگر شوجی کے لنگم کی پوجا کرے تو عین قوم پرستی ہے، لیکن مسلمان اگر گائے ذبح کرے تو یہ سراسر فرقہ پرستی ہے۔ طول داستانِ درد سکوت آموز ہے۔ یعنی میرے غم کی داستان بہت طویل ہے اسلئے خاموشی بہتر ہے +

نظم پر تبصرہ | یہ دلکش نظم اقبال نے سنہ ۱۹۰۵ء کے آغاز میں لکھی تھی جب ان کی عمر ۳۰ سال کے قریب تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظم میں بھی جوانی کا رنگ نمایاں ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب اقبال پر وطن دوستی کا رنگ غالب تھا اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ ہندوؤں میں اسقدر رواداری اور فراخدلی موجود ہے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ اتحاد کر سکتے ہیں۔ انکا یہ گمان اس شعر سے ہویدا ہے:۔

پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو
جو مشکل ہے تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑوں گا

لیکن واقعات مابعد خصوصاً شدھی اور سنگھٹن کی تحریکوں نے جو ۱۹۲۲ء کے آخر میں رونما ہوئی تھیں، اور منشی رام المعروف بہ شردھانند کی منتقمہ کوششوں سے قائم ہوئی تھیں، تمام سمجھدار مسلمانوں پر یہ حقیقت منکشف کر دی تھی کہ بھیڑیا بکری کا دوست ہو سکتا ہے، لیکن ہندو قوم، مسلمان قوم کی دوست نہیں ہو سکتی نیز یہ ممکن ہے کہ ریت میں سے تیل نکل آئے لیکن یہ ممکن نہیں کہ گاندھی اور پٹیل مسلمانوں سے انصاف کر سکیں۔ چنانچہ جو حقیقت، اقبال پر سنہ ۱۹۱۲ء میں منکشف ہو گئی تھی، وہ مولانا محمد علی مرحوم پر سنہ ۱۹۲۶ء میں۔ اور قائد اعظم مرحوم پر سنہ ۱۹۳۶ء میں واضح ہوئی۔

باز آمدم بر سر مطلب۔ اس نظم میں اقبال ایک وطن پرور (نیشنلسٹ) کی شکل میں قوم کے سامنے آتے ہیں، اور جو رنگ ہمارا نیا شوالہ اور ترانۂ ہندی میں پایا جاتا ہے وہی رنگ پوری شدت کے ساتھ اس نظم میں نظر آتا ہے۔ انہوں نے دل کھول کر اہلِ وطن کی نفاق انگیز روش پر نوحہ خوانی کی ہے۔ اور انہیں صاف لفظوں میں متنبہ کیا ہے کہ اگر تم نے آنے والی مصیبت کا اندازہ کر کے آپس میں اتحاد نہ کیا تو تم مٹ جاؤ گے اور ع

تمہاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں

بدقسمت وطن کی حالت زار انہیں اسدرجہ متاثر کرتی ہے کہ وہ ہر وقت اسکے تاریک مستقبل پر آنسو بہانا چاہتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نظم میں ایک سچے محب وطن کی مضطرب روح آہ وفریاد میں مصروف نظر آتی ہے۔ اور جو اشعار اسکے دل کی گہرائیوں سے نکلے ہیں، وہ ہر محب وطن کو متاثر کر دینے کے لئے کافی ہیں۔ جس بند کا پہلا شعر یہ ہے:۔

رُلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھکو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

یہ پورا بند اقبال کے وطن پرورانہ جذبات کا بہترین مرقع ہے۔

اس نظم میں آٹھ بند ہیں۔ ہم ہر بند کا مطلب جداگانہ لکھیں گے۔

پہلا بند | اس بند میں تمہید کا رنگ ہے۔ کہتے ہیں کہ میری داستان اس قدر دردناک ہے کہ بہت کم لوگ اسکے سننے کی تاب لا سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے خموشی کو اپنا شیوہ بنا لیا ہے۔ قوم کے افراد اسقدر بےحس ہو گئے ہیں کہ وہ میری فریاد سننا نہیں چاہتے۔ یہی وجہ ہے کہ میری زبان بات کرنے کو ترستی ہے یعنی مطلب یہ کہ کوئی سننے والا نہیں ہے۔ لالہ کے داغِ جگر سے، نرگس کی اشک فشاں آنکھوں سے، اور گل کی سینہ چاکی سے، میرے سوزِ دروں اور بیتابیِ دل کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ اور قمریوں، طوطیوں، اور بلبلوں کے نغموں میں یہ سوز وگداز میری ہی طرزِ فغاں کی تقلید سے پیدا ہوا ہے۔ میری داستان اسقدر درد انگیز ہے کہ اگر شمع کو سناؤں تو وہ بھی رونے لگے۔

اے خدا! ان دردیں حالات اس دنیا میں جینے کا کیا فائدہ ہے، نہ زندگی میرے اختیار میں ہے نہ موت۔ اگر زندگی اختیار میں ہوتی تو میں ہمیشگی کی صفت پیدا کر لیتا۔ اور اگر موت اختیار میں ہوتی تو ابھی مر جاتا کیونکہ اب جینے میں کوئی لطف باقی نہیں ہے + میری گریہ وزاری اور میری بربادی دراصل ساری کائنات کی بربادی ہے۔ کیونکہ انسان اشرف المخلوقات ہے، جب وہ فنا ہو گیا تو یہ سمجھو کہ ساری کائنات فنا ہو گئی ؎

دریں حسرت سرا عمریست افسونِ جرس دارم
ز فیضِ دل تپیدن ہا خروشِ بے نفس دارم

اقبال نے اس شعر کو ایک باکمال آرٹسٹ کی طرح، پہلے بند کا آخری شعر بنایا ہے، کیونکہ اس شعر میں اس بند کی روح سمٹ کر آگئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ شعر ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کسی کاریگر نے انگوٹھی میں نگینہ جڑ دیا ہے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ اس دنیا میں ایک مدت دراز سے میری کیفیت وہی ہے جو جرس کی ہے۔ یعنی وہ بظاہر خاموش ہے، لیکن اسکے اندر شور پوشیدہ ہے۔ اسی طرح میں بظاہر خاموش ہوں، لیکن بقول غالب ؎

پُر ہوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجہ
اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

دوسرے مصرع کا مطلب یہ ہے کہ عشق سے تپش دل پیدا ہوئی اور اس تپش دل کا نتیجہ یہ نکلا کہ میری شخصیت خروش بے نفس کا خزانہ بن گئی۔ یعنی میرے سینہ میں آہ وفریاد کا ایک طوفان پوشیدہ ہے۔ لیکن بظاہر میں خاموش ہوں۔

دوسرا بند | دوسرے بند میں شخصی رنگ پایا جاتا ہے۔ اس میں شاعر نے اپنی شخصیت اور اپنے مقام کو واضح کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ مجھے دنیا کی خوشیوں سے کوئی حصہ نہیں ملا۔ خموشی بھی میری محرومی پر روتی ہے۔ اسی طرح گویائی بھی میری بدنصیبی پر ماتم کرتی ہے کہ کوئی شخص میری داستان غم سننے کو تیار نہیں ہے میں بہت پریشان ہوں لیکن اس عقدہ کو حل نہیں کر سکتا کہ میں کون ہوں؟ سکندر (فاتح کائنات یا سردار عالم) ہوں یا آئینہ (کسی دوسری ہستی کا خادم) ہوں یا گردِ کدورت (محض بیکار شئے) ہوں؟ یہ سب کچھ ہے لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ میں محور موجودات اور مرکز کائنات ہوں۔ میری ہستی، قدرت کا مقصد ہے، اگر میں نہ ہوں تو یہ ساری فطرت بیکار ہو جائیگی۔ یہ سب کچھ میرے ہی لئے پیدا کیا گیا ہے۔ بظاہر ظلمت (مشت خاک) ہوں، لیکن میری حقیقت خاکی نہیں ہے بلکہ نوری ہے + میری مثال اس خزانہ کی سی ہے جو کسی صحرا میں پوشیدہ ہو۔ بلا شبہ دنیا میں بہت کم لوگ انسان کے حقیقی مقام سے آگاہ ہیں + اگر کوئی شخص غور سے دیکھے تو انسان "عالم صغیر" ہے۔ جو کچھ ساری کائنات میں ہے

وہ سب انسان میں بھی موجود ہے۔ اور جو شخص اس حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے کہ سب کچھ اندر ہی موجود ہے وہ پھر باہر کی اشیاء کو دیکھنے سے بے نیاز ہو جاتا ہے

"میں وہ چھوٹی سی دنیا ہوں کہ آپ اپنی ولایت ہوں" یہ مصرع اسقدر بلیغ ہے کہ شرح سے بالاتر ہے۔ اگر انسان اپنے دل کی سیر کرے تو اسے اسکے اندر ساری کائنات کا جلوہ نظر آئیگا۔ اسلئے وہ اس خارجی دنیا کی سیر سے بے نیاز ہو جائیگا + اگر اس کائنات کو میخانہ فرض کیا جائے تو انسان، نہ تو شراب ہے، نہ ساقی ہے نہ مستی ہے نہ پیمانہ ہے، بلکہ اس میخانہ میں جس قدر اشیا نظر آتی ہیں انسان اُن سب اشیاء کی حقیقت ہے۔ یعنی سب کچھ وہی ہے، سب کچھ اسی کی بدولت ظہور میں آیا ہے، اگر وہ نہ ہو تو پھر کسی شئے کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے کوئی مصرف نہیں ہے۔ کوئی مقصد نہیں ہے + میں اپنے دل کے آئینہ میں ساری کائنات کا نظارہ دیکھ سکتا ہوں، یعنی انسان کا دل وہ آئینہ ہے جس میں ساری کائنات منعکس ہے اور یہی وجہ ہے کہ میں جو دیکھتا ہوں وہی بے کم و کاست بیان کرتا ہوں۔

نوٹ:- اس بند کے چار اشعار میں اقبال نے تصوف کے حقائق و معارف بیان کئے ہیں، اور اگر کوئی شخص ان اشعار کو:

یہ سب کچھ ہے مگر ہستی مری مقصد ہے قدرت کا
سراپا نور ہو جس کی حقیقت میں وہ ظلمت ہوں،

سے لیکر، "میں اس میخانۂ ہستی میں ہر شئے کی حقیقت ہوں" تک غور سے پڑھیگا تو اُسے اقبال کے فلسفۂ خودی کے ابتدائی نقوش بھی نظر آ سکتے ہیں افسوس ہے کہ میں اس مختصر شرح میں ان باتوں کی تفصیل بیان نہیں کر سکتا۔ بس اسقدر کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ یہ شعر:

نہ صہبا ہوں نہ ساقی ہوں نہ مستی ہوں نہ پیمانہ
میں اس میخانۂ ہستی میں ہر شئے کی حقیقت ہوں

مرشد رومی کے اس شعر سے ماخوذ ہے:-

قالب از ما ہست شد نے ما ازو
بادہ از ما مست شد نے ما ازو

یعنی شراب کی وجہ سے ہمارے اندر مستی پیدا نہیں ہوئی بلکہ ہماری وجہ سے شراب میں مستی پیدا ہوئی ہے۔

تیسرا بند | اس بند میں اقبال نے اہل وطن کو متنبہ کیا ہے کہ اگر وہ عصر حاضر کے تقاضوں سے بیخبر رہے تو مصائب کا نزول یقینی ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ خدا نے مجھکو شعرا کی صف میں وہ مقام بلند عطا کیا ہے کہ میں فرشتوں کا ہمزبان ہوں اور میرا دل قضاء قدر کے اسرار کا آئینہ بنگیا ہے۔ اسکے بعد ہندستان سے خطاب کرتے ہیں کہ تیرے باشندوں کا طرز عمل، مصلحت وقت کے اسقدر خلاف ہے کہ میں آئندہ مصائب کا تصور کر کے لرزہ بر اندام ہو جاتا ہوں اور بے اختیار میری آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے ہیں۔ اگر باغبان (ہندو مسلمان) اسی طرح آپس میں لڑتے رہے تو گلچیں (انگریز) اس باغ کو ضرور تاراج کر دے گا۔ اسکے بعد اہل وطن سے خطاب کرتے ہیں کہ دشمن تمہیں برباد کرنے کی فکر میں لگا ہوا ہے، اسلئے عہد کہن کی داستانوں کو چھوڑ کر، مستقبل کی فکر کرو۔ عہد کہن کی داستانوں سے مسلمان بادشاہوں کے فرضی مظالم کی وہ داستانیں مراد ہیں جو ہندو مورخین نے، دیدہ و دانستہ اپنی تصانیف میں درج کی ہیں، تاکہ ہندوؤں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا ہوں۔

اے اہل وطن! ان لوگوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرو جو ہندستان کی مختلف اقوام میں منافرت پیدا کر رہے ہیں۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو یقیناً مٹ جاؤ گے کیونکہ آئینِ قدرت یہی ہے کہ خدا اُسی شخص کی مدد کرتا ہے جو امن و امان قائم کرنے کے لئے جد و جہد کرتا ہے۔

چوتھا بند | اس بند میں اقبال نے یہ بات بیان کی ہے کہ کوئی سُنے یا نہ سُنے میں اپنی سی کوشش ضرور کرونگا۔ میں اپنا دردِ دل اہل وطن کو ضرور سناؤنگا میں اس ملک سے نفرت اور عداوت کی ظلمت کو ضرور دور کرونگا۔ اور اپنی ساری قوتوں کو، اہل وطن کے بیدار کرنے میں صرف کر دونگا۔ بیشک، منتشر افراد کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا بہت مشکل کام ہے۔ لیکن میں کوشش کرونگا، کہ یہ مشکل آسان ہو جائے۔ اور اقوام ہند میں اتحاد پیدا ہو جائے۔ میں سب کو وطن کی محبت کا سبق پڑھاؤنگا، اور جو حقیقت مجھ پر منکشف ہو گئی ہے، کہ اتحاد ہی سے ہم کامیاب ہو سکتے ہیں، اسکو سب لوگوں پر ظاہر کر دونگا۔

پانچواں بند | اس بند میں اقبال نے اقوام ہند کو یہ تلقین کی ہے کہ اپنے زاویۂ نگاہ میں وسعت اور خیالات میں بلندی پیدا کریں اور تعصب کو اپنے دل سے بالکل نکال دیں۔ کہتے ہیں کہ اے مخاطب! مجھے افسوس ہے کہ تو نے اپنے خیالات میں رفعت پیدا نہیں کی، ساری عمر پست خیالات میں بسر کر دی تو نے اپنی جماعت کے تنگ حلقہ میں زندگی بسر کی۔ دیگر ممالک اور دیگر اقوام کے طرز عمل کا مطالعہ نہیں کیا، اور نہ تو نے کبھی اپنی حقیقت پر غور کیا کہ خدا نے تجھکو بلند مقاصد کے حصول کے لئے پیدا کیا ہے۔ اگر تو دنیا میں عزت کی زندگی بسر کرنی چاہتا ہے تو تعصب کو اپنے دل سے نکال دے، تو جن لوگوں کو بُرا سمجھتا ہے وہ لوگ در اصل تیرے بھائی ہیں۔ تو دنیاوی تعلقات کی درستی میں مشغول ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ اس طریقہ سے تجھے صفائی قلب حاصل ہو جائیگی، یہ تیری غلط فہمی ہے۔ تیرا یہ فعل ایسا ہی بے سود ہے جیسے کوئی شخص آئینہ پر مہندی لگا کر اُسے رنگین کرنے کی کوشش کرے۔ تو نے قرآنی تعلیمات سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کیا، بلکہ اُن کی غلط تعبیر کی۔ اور اس طرح حقیقت سے دور ہو گیا۔ تیرا یہ طرز عمل، تیری کج بینی اور غلط فہمی کی دلیل ہے۔ جس پر زمین اور آسمان دونوں ماتم کر رہے ہیں۔ تو زبان سے توحید کا دعویٰ کرتا ہے لیکن تو قرآن کے بجائے اپنے نفس کی اطاعت کر رہا ہے۔ اسلئے اس زبانی دعوے سے تجھے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا + تو صرف اپنی جماعت سے محبت کرتا ہے، یعنی تو نے محبت کو جو ایک عالمگیر (مطلق) حقیقت ہے اُسے صرف اپنی قوم کے افراد میں مقید کر دیا + تو منبر پر بیٹھکر اگر وعظ و نصیحت کرتا ہے تو اس میں اپنی قوم کو، ساری دنیا سے محبت کرنے کی تلقین نہیں کرتا، بلکہ تیری نصیحت میں بھی افسانہ کا رنگ پایا جاتا ہے۔

چھٹا بند | اس بند میں اقبال نے پانچویں بند کے خیالات کی مزید وضاحت کی ہے۔ کہتے ہیں اے مخاطب! اپنی نگاہ کے اندر وسعت پیدا کر، یعنی پروانہ کا رنگ پیدا کر، وہ کسی خاص شمع سے محبت نہیں کرتا، بلکہ روشنی سے محبت کرتا ہے۔ خواہ وہ روشنی دیر میں ہو یا حرم میں۔ اسی خیال کو ایک شاعر نے یوں ادا کیا ہے:- ع پروانہ، چراغِ حرم و دیر نداند،

یعنی تو اپنی آنکھ میں ایسی صلاحیت پیدا کر کہ وہ ہر شئے میں خدا کا جلوہ دیکھ سکے۔ اگر ایک انسان پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے کہ کافر بھی اللہ ہی کی مخلوق ہے تو وہ اُس پر بھی مہربانی کریگا۔ جس طرح پروانہ ہر شمع سے محبت کرتا ہے، اسی طرح شبنم ہر پھول کو (خواہ وہ ہندو کے باغ میں ہو یا مسلمان کے) فیض پہنچاتی ہے۔

اے مخاطب! اللہ نے انسان کو آنکھیں صرف مختلف اشیاء کو دیکھنے کیلئے
نہیں دی ہیں، بلکہ مقصد باری تعالےٰ یہ ہے کہ انسان ان کے ذریعہ سے ہر شئے
میں خدا کا جلوہ دیکھے۔ اگر کوئی شخص اپنی حقیقت سے آگاہ نہ ہو سکے۔ یعنی اپنے
آپ کو نہ دیکھ سکے تو اگر اُس نے ساری کائنات کو دیکھ لیا تو بھی کچھ فائدہ نہیں
ہو سکتا۔ جس طرح جمشید نے اپنی ساری توجہ جام پر مبذول کی، لیکن اسکے ذریعہ
سے وہ اپنی حقیقت سے آگاہ نہ ہو سکا۔ یاد رکھو، فرقہ بندی وہ ناپاک درخت
ہے جس کا پھل تعصب ہے۔ یعنی فرقہ بندی سے انسان کے اندر تعصب کا رنگ
پیدا ہو جاتا ہے۔ اور یہ تعصب جس شخص میں پیدا ہو جائے وہ اس دنیا میں کسی
قسم کی ترقی نہیں کر سکتا۔ اسی پر قوم کو قیاس کر سکتے ہو +

جب تک تمہارے اندر بلندی کی آرزو پیدا نہو گی تم بلندی حاصل نکر سکو گے
چنانچہ دیکھ لو، برگ گل میں رفعت کی تمنا نہیں ہے اسلئے وہ آفتاب کی طاقتِ جذب
سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتا۔ اسکے مقابلہ میں، شبنم اوپر جانا چاہتی ہے اسلئے
جذبِ آفتاب سے فائدہ حاصل کر لیتی ہے۔ اور اوپر چلی جاتی ہے۔ جو لوگ شیوۂ
محبت اختیار کر لیتے ہیں وہ اس راہ میں دُکھ بھی اُٹھاتے ہیں لیکن وہ کسی سے
اپنے دُکھ کا مداوا (علاج) طلب نہیں کرتے کیونکہ محبت اگر زخم لگاتی ہے تو مرہم
بھی خود ہی مہیا کر دیتی ہے۔ یعنی اگر اہلِ محبت کو، دوسروں کے ساتھ ہمدردی کرنے
کے سلسلہ میں کوئی تکلیف لاحق ہوتی ہے تو یہ احساس، کہ ہم نے دوسروں کو فائدہ
پہنچایا، انکی تکالیف کا مداوا (ازالہ) کر دیتا ہے + محبت میں یہ خاصیت ہے کہ
دل میں خدا کا نور پیدا ہو جاتا ہے۔ بظاہر محبت بہت معمولی چیز ہے۔ لیکن اسکی بدولت
انسان، خدا کا جلوہ دیکھ سکتا ہے۔

ساتواں بند | اس بند میں اقبال نے اس بات کی تلقین کی ہے، کہ دوسروں

کے ساتھ مہربانی کا برتاؤ کرو، لیکن کسی سے معاوضہ یا صلہ کی تمنا مت کرو محبت
کرو، لیکن اسکا اجر، صرف اللہ سے طلب کرو۔ اگر تم دوسروں سے محبت کرو گے
تو تمہاری تمام تکالیف دور ہو جائینگی۔ اگر اس سلسلہ میں تمہیں کوئی تکلیف پہنچے
تو دوسروں سے شکایت مت کرو۔ کہتے ہیں کہ جب میں نے اپنی ہستی کو، جماعت کی
ہستی میں فنا کر دیا۔ یعنی شراب بےخودی پی لی تو میری پرواز فلک تک ہو گئی یعنی میرا
مرتبہ بہت بلند ہو گیا۔ میں نے اپنے آپ کو قوم، ذات، قبیلہ اور خاندان کے
رنگ سے پاک کر لیا۔ اور اسکا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر شخص کے دل میں میری عزت قائم ہو گئی
بُو سے مراد خوشبو ہے اور خوشبو کا کوئی رنگ نہیں ہوتا۔ اسکے باوجود وہ ہر پھول
میں پوشیدہ ہوتی ہے + میں ہر وقت وطن کی مصیبتوں پر روتا رہتا ہوں،
آنسوؤں کو وضو کے پانی سے تعبیر کیا ہے۔ اور عبادت کی رعایت سے وضو
کا لفظ لائے ہیں۔ ان خوبیوں کی وجہ سے مصرع میں بہت دلکشی پیدا ہو گئی ہے
چونکہ فرقہ بندی کی بنا پر ملک میں باعزت زندگی دشوار ہو گئی ہے اسلئے اس
ملک میں رہنے کو جی نہیں چاہتا۔ چمن سے وطن مراد ہے۔

اے مخاطب! اگر تو غور سے دیکھے تو صرف باہمی محبت وہ طاقت ہے،
جسکی بدولت قوم کو آزادی نصیب ہو سکتی ہے۔ یعنی محبت انسان کو آزاد کر دیتی
ہے۔ اور جو قوم آپس میں برسرِ پیکار رہتی ہے۔ وہ ہمیشہ غلامی میں مبتلا رہتی ہے
افراد قوم کو لازم ہے کہ اپنے اندر بے نیازی کی شان پیدا کریں۔ بلبلہ سے سبق لو
کہ وہ چونکہ شانِ بے نیازی رکھتا ہے اسلئے دریا میں رہکر بھی محتاجِ آب نہیں ہوتا

اے مخاطب! اگر تجھے دنیا میں عزت کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی آرزو
ہے تو اپنی قوم سے بے پروائی اختیار مت کر۔ بلکہ سب سے محبت کر۔

نوعِ انسان کی محبت، ایسی شراب ہے کہ آدمی ساغر اور صراحی کے بغیر ہی

مست رہتا ہے۔ دنیا کی تاریخ کا مطالعہ کرو۔ یہ حقیقت واضح ہو جائیگی کہ جن قوموں
نے دنیا میں ترقی کی ہے ان کے افراد کے دل میں ایک دوسرے کے لئے محبت کا جذبہ
کارفرما رہا ہے۔

آٹھواں بند | اس بند میں اقبال نے محبت کی حقیقت اور اسکا فلسفہ بیان
کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ محبت مجموعۂ اضداد ہے۔ اسکے رموز و نکات فہم انسانی سے
بالاتر ہیں۔ اگر کوئی شخص قوم کی محبت میں ترک وطن کر دیتا ہے تو پردیس میں
بھی اسکو وطن کا لطف حاصل ہو سکتا ہے۔ اور قفس میں رہ کر بھی اسکو چمن کی
زندگی نصیب ہو سکتی ہے۔ جو لوگ اپنے وطن کی محبت کے سلسلہ میں قید و بند
کی سختیاں گوارا کرتے ہیں، انھیں وہ تمام تکالیف، راحت معلوم ہوتی ہیں۔

عام طور سے لوگ، محبت کو مرض قرار دیتے ہیں۔ لیکن یہ مرض ایسا ہے کہ
قوم کے تمام امراض کا مداوا کر دیتا ہے۔ اسکی بدولت گردش چرخ کہن۔ یعنی تمام
مصیبتوں کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص محبت کی آگ میں اپنے دل کو جلائے
تو اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ اسکا دل سراپا نور ہو جائیگا۔ جس شخص کا دل محبت کی آگ
میں جل جاتا ہے تو وہ شمع انجمن بن جاتا ہے۔ یعنی ایک دنیا پروانوں کی طرح اُس پر
نثار ہونے کو تیار ہو جاتی ہے۔

اے مخاطب! یہ ساری کائنات مظہرِ خدا ہے، ہر شئے میں اُسی کا حسن نظر
آتا ہے۔ شیریں میں بھی اُسی کا جلوہ ہے اور فرہاد میں بھی اُسی کا۔ یاد رکھو!
جن قوموں کے افراد نے آپس میں نفرت کا بازار گرم کیا ہے، وہ قومیں صفحہ ہستی
سے نابود ہو گئی ہیں۔ کاش میرے اہل وطن اس نکتہ سے سبق حاصل کریں۔ یہ
داستان بہت طویل ہے۔ اسلئے میں سکوت اختیار کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔
ورنہ اگر چاہوں تو اس موضوع پر بہت کچھ لکھ سکتا ہوں۔ اس نظم کو اقبال نے

نظیری کے اس شعر پر ختم کیا ہے۔

نمی گردید کوتہ رشتۂ معنی، رہا کردم
حکایت بود بے پایاں بخاموشی ادا کردم

یعنی میری داستان درد چونکہ بہت طویل تھی، اسقدر طویل کہ اسکی کوئی انتہا
ہی نظر نہیں آتی، اسلئے میں نے خاموشی اختیار کرنی مناسب سمجھی۔

نظم بر صـ ۴۷

حلِ لغات اور شرحِ مشکلات | اے مکان۔ مراد ہے ہندستان + مکین،
مراد ہے ڈاکٹر آرنلڈ + ضیائے روز فرقت۔ یعنی فراق کے دن کی روشنی + کشتۂ
عزلت ہوں یعنی تنہائی پسند ہوں + ایامِ سلف۔ گذرا ہوا زمانہ + دل کا ذرّہ،
دل مراد ہے + خورشید آشنا ہونے کو تھا۔ یعنی میرا دل علم کے نور سے منور ہونے
کو تھا + ٹوٹا ہوا آئینہ عالم نما ہونے کو تھا۔ اس سے بھی یہی مراد ہے کہ میں علم
وحکمت میں ترقی کرنے والا ہی تھا۔ یا میرا سینہ معلومات کا خزانہ بننے ہی کو
تھا (کہ اُستاد سے جدائی ہو گئی) + ذروہ یعنی پہاڑ کی چوٹی + کلیم ذروۂ سینائے
علم۔ علم کے پہاڑ کی چوٹی کا کلیم (کوہ سینا کی رعایت سے کلیم کا لفظ لائے ہیں)
مراد ہے بہت بڑا عالم + موجِ نفس، مراد ہے سانس یعنی شخصیت + بادِ نشاط
افزائے علم۔ وہ ہوا جو علم کی مسرت میں اضافہ کر دے۔ یعنی تیری صحبت میں
رہکر انسان اپنے علم میں اضافہ کر سکتا ہے + رہ پیمائی صحرائے علم۔ علم کے جنگل
میں پیدل چلنا مراد ہے علم حاصل کرنا + سودائے علم، یعنی تیری وجہ سے مجھے بھی
علم حاصل کرنے کا شوق پیدا ہو گیا تھا + عقدۂ تقدیر۔ تقدیر کی گرہ یعنی رکاوٹ
دور ہو جائیگی + پنجاب کی زنجیر سے گورنمنٹ کالج کی ملازمت مراد ہے + گردیدہ

تقریر یعنی تقریر (لیکچر) سننے کا عادی یا شائق۔

تبصرہ | یہ نظم اقبال نے اپنے اُستاد ڈاکٹر سر ٹی ڈبلیو آرنلڈ سی آئی ای، ایم اے۔ ڈی لٹ۔ آنجہانی کی یاد میں ۱۹۰۴ء میں لکھی تھی۔ جس طرح شمس العلماء مولانا سید میر حسن صاحب قبلہ مرحوم نے انکے اندر فارسی ادب اور شعر و سخن کا ذوق پیدا کیا تھا، اُسی طرح ڈاکٹر آرنلڈ نے اُن کو فلسفہ اور حکمت کا شیدائی بنادیا۔ حضرت علامہ نے اپنے اُستاد کو "کلیم ذرّوہ سینائے علم" کے شاندار لقب سے یاد کیا ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ آرنلڈ بجا طور پر اس لقب کا مستحق تھا۔ افسوس ہے کہ میں اس مختصر تبصرہ میں ڈاکٹر آرنلڈ کے کمالاتِ علمی کی تفصیل بیان نہیں کر سکتا۔ صرف چند واقعات بیان کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

ڈاکٹر آرنلڈ ۱۸۸۸ء کے قریب علی گڑھ کالج میں فلسفہ کے پروفیسر مقرر ہو کر آئے تھے۔ چونکہ وہ عربی کا بھی ذوق رکھتے تھے اسلئے اُنہوں نے مولانا شبلی نعمانی مرحوم سے جو اُس زمانہ میں وہاں فارسی اور عربی کے پروفیسر تھے، عربی اور کی بعض اونچی کتابیں پڑھی تھیں اور مولانا نے اُن سے فرنچ سیکھی تھی۔ ۱۸۹۶ء میں اُنہوں نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "پریچنگ آف اسلام" شائع کی جسکو اُنہوں نے بیس سال کی مدت میں پایۂ تکمیل کو پہونچایا تھا۔ اور اس میں تاریخی شواہد کی بنا پر یہ ثابت کیا تھا کہ اسلام دنیا میں تلوار کے زور سے نہیں بلکہ اپنی ذاتی خوبیوں کی بدولت، پھیلا ہے۔ انگریزی ادب ہی نہیں بلکہ سارے مغربی ادب میں یہ اپنی نوعیت کی واحد کتاب ہے۔ اس موضوع پر دوسری کتاب نہ اس سے پہلے کسی نے لکھی نہ بعد میں۔ جب سر سید مرحوم نے اس کتاب کو دیکھا تو کہا کہ یہ کام ہمیں کرنا چاہئے تھا جو ایک غیر مسلم نے کیا ہے۔ اور اُسی وقت مسٹر عنایت اللہ صاحب دہلوی کو، جنہوں نے اسی زمانہ میں بی اے کیا تھا، اس

کتاب کے ترجمہ پر مامور کر دیا۔ چنانچہ ۱۸۹۶ء میں اسکا ترجمہ "دعوتِ اسلام" کے نام سے شائع ہوا تھا۔

غالباً ۱۸۹۷ء میں ڈاکٹر آرنلڈ، علی گڑھ سے لاہور آئے۔ اور یہاں حضرت علامہ کو انکی شاگردی کا فخر حاصل ہوا۔ ۱۹۰۱ء میں ڈاکٹر آرنلڈ نے تفسیر کبیر کی ضخیم آٹھ جلدوں کا مطالعہ کرنے کے بعد وہ اقتباسات ایک کتاب کی صورت میں جمع کئے، جو امام رازی نے معتزلی حکما کی تفاسیر سے اپنی تفسیر میں جا بجا درج کئے ہیں۔ ۱۹۰۴ء کے شروع میں ڈاکٹر آرنلڈ ولایت واپس چلے گئے۔ اور انڈیا آفس میں لائبریرین مقرر ہو گئے۔ ۱۹۲۱ء میں لندن یونیورسٹی کے اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز میں عربی کے پروفیسر مقرر ہو گئے۔ اور ۱۹۳۰ء میں وفات پائی۔

نظم کا مطلب | افسوس ڈاکٹر آرنلڈ کو ہندستان کی سرزمین پسند نہ آئی اسلئے وہ انگلستان واپس چلے گئے۔ اور انکے جانیکے بعد دنیا میری آنکھوں میں اندھیرا ہو گئی۔ اُستاد کے فراق میں مجھکو روز روشن بھی رات کی طرح "تاریک نظر" آتا ہے۔ جب سے میری نظر اسکو رخصت کرنے کے بعد، اسکے دیدار سے محروم ہوئی ہے، بجھی ہوئی شمع کی طرح، میری آنکھ کے پردوں میں سو گئی ہے۔ یعنی محبوب کو رخصت کرنے کے بعد میری آنکھ بے نور ہو گئی ہے۔

جب سے وہ محبوب مجھ سے رخصت ہوا ہے، میں نے گوشۂ تنہائی اختیار کر لیا ہے۔ کسی سے ملنے کو جی نہیں ہوتا۔ بلکہ جب دل میں خفقانی کیفیت پیدا ہوتی ہے تو جنگل کی طرف چلا جاتا ہوں۔ پھر جب گذرے ہوئے زمانہ کی یاد مجھے ستاتی ہے تو اس مکان کی طرف واپس آتا ہوں، جہاں وہ محبوب رہتا تھا۔ اسکے مکان کے در و دیوار تو وہی ہیں لیکن میں اپنے آپ کو

اجنبی سا محسوس کرتا ہوں۔ یعنی جب محبوب کو وہاں نہیں پاتا تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاید میں کسی اجنبی مقام پر آ گیا ہوں۔

جب میرے اندر اپنے اُستاد سے فیض حاصل کرنے کی صلاحیت پیدا ہوئی تو ہم دونوں میں جدائی ہو گئی۔ اگر وہ کچھ دن اور یہاں قیام کرتے تو خدا معلوم میں کس قدر علم اُن سے حاصل کرتا۔

ابرِ رحمت نے میرے گلزار سے کنارہ کر لیا۔ اور دور چلا گیا۔ بس میرے باغ کی کلیوں کو کچھ سیراب کیا اور اسکے بعد مجھ سے جُدا ہو گیا۔

اے علم کے سمندر! تو مجھے پیاسا چھوڑ کر کہاں چلا گیا؟ تیری شخصیت میرے حق میں افزائشِ علم کا موجب تھی اور تیرے ہی دم سے میرے دل میں حصولِ علم کا جذبہ موجزن تھا۔ تیرے جانے کے بعد میرا ذوقِ علمی سرد ہو گیا۔

اب لیلیٰ اور اُسکے حسن و جمال کا کہیں چرچا ہی سُننے میں نہیں آتا اسلئے اب مجنوں کے اندر ذوقِ بادیہ پیمائی پیدا ہو تو کیسے ہو؟

لیکن مجھے یقین ہے کہ فراقِ محبوب کی شدت، میری دشواریوں کو آسان کر دیگی۔ یعنی میں اُس کی ملاقات کے لئے ضرور پنجاب سے انگلستان جاؤں گا۔ بیشک اُسکی تصویر میرے پاس ہے۔ لیکن میں تو اسکی گفتگو کا طالب ہوں، اسلئے تصویر سے مجھکو تسلی نہیں ہو سکتی۔ سچ کہا ہے کسی شاعر نے کہ تصویر مونہہ سے کچھ نہیں بول سکتی۔ اسکی گفتگو تو اسکی خاموشی سے عبارت ہے۔

نظم نمبر ۷۶

حل لغات اور شرح مشکلات | میرے ویرانے سے، یعنی اس دنیا سے + ہے گر دریائے دل تیری کشش سے موجزن - بہت بلیغ مصرع ہے مطلب

یہ ہے کہ اگرچہ چاند، اس دنیا سے بہت دور ہے اسکے باوجود دل میں اسکی محبت موجزن ہے۔ اس میں خوبی یہ ہے کہ دل کو "دریا" قرار دیا ہے اور چاند کی وجہ سے دریا (سمندر) کی موجوں میں تلاطم برپا ہوتا ہے + زرد رو، بمعنی پیلا۔ اس مصرع میں حسن تعلیل ہے۔ شاعر نے رنجِ رہ منزل کو چاند کے چہرہ پر زردی کا سبب قرار دیا ہے + آفرینش بمعنی پیدائش + سیہ روزی بمعنی بدبختی۔ سوزِ اشتیاقِ دید - دیدار کی خواہش کی آگ + داغِ منتِ خورشید۔ چاند، آفتاب کا ممنونِ احسان ہے۔ کیونکہ اپنی روشنی اُس سے حاصل کرتا ہے + فروزاں بمعنی روشن + سوزاں بمعنی جلتا ہوا + طلب خو بمعنی حاجتمند یا وہ شخص جسکو مانگنے کی حاجت ہو + حُسنِ ازل سے خدا کی ذات مراد ہے + ماہِ مبیں بمعنی سب کو نظر آنے والا۔ یعنی روشن چاند + ذوقِ آگہی یعنی شعورِ ذاتی یا احساسِ خودی +

مطلب | اقبال نے اس نظم میں، انسان اور چاند دونوں میں مماثلت ثابت کی ہے۔ اسکے بعد یہ بتایا ہے کہ ایک امر میں یہ دونوں مختلف ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ انسان کو شعورِ ذات حاصل ہے لیکن چاند اس نعمتِ عظمیٰ سے محروم ہے۔ کہتے ہیں کہ اے چاند! اگرچہ پیدائش کے لحاظ سے تو نوری ہے اور میں خاکی ہوں، لیکن اسکے باوجود میں تیرا ہم نصیب ہوں۔ مثلاً ہم دونوں کے دل میں سوز ہے۔ دونوں قوانینِ فطرت کے پابند ہیں، دونوں سرگرداں ہیں، دونوں مسافر ہیں، دونوں خاموش ہیں، دونوں محتاج ہیں، دونوں تنہا ہیں۔ آفتاب کی موجودگی میں تیری ہستی مٹ جاتی ہے۔ تو حسنِ ازل کے سامنے میری بھی کوئی حقیقت باقی نہیں رہتی۔ لیکن اسقدر مماثلت کے باوجود مجھ میں اور تجھ میں ایک فرق بھی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ مجھے شعورِ ذاتی حاصل ہے۔ اسلئے میں اپنی ہستی کے مقصد سے آگاہ ہوں۔ اور تجھکو یہ دولت

حاصل نہیں ہے۔ اسلئے تو اپنے وجود کی غایت سے واقف نہیں ہے۔

نظم برصفحہ ۷۸

حلّ لغات اور شرح مشکلات | اُمیدؔ کا ستارا چمک اُٹھا۔ یعنی نصیبہ نے یاوری کی، یا تیری خوش نصیبی تجھے حبشؔ سے حجازؔ میں لے آئی + اسی سے ترے غمکدہ کی آبادی ہوئی۔ یعنی حجاز میں آکر تجھے دولت اسلام نصیب ہوئی + غلامی کے صدقے ہزار آزادی، یعنی اگر تو حبش میں آزاد رہتا تو یہ نعمت تجھے حاصل نہوتی + وہ آستاں، کنایہ ہے سرکار دوعالم صلعم کے شرف صحبت سے + کسی کے شوق میں تو نے مزے ستم کے لئے۔ یعنی آنحضرت صلعم کی محبت میں تو نے اپنے کافر آقا کے ظلم وستم برداشت کئے + صورتِ سلمانؓ۔ حضرت سلمان فارسی کی طرح۔ ایرانی النسل ہیں، صحابی ہیں، اور یہ بھی سرکار دوعالمؐ کے عشق میں بہت اونچا مقام رکھتے ہیں۔ جب اُن سے کسی نے پوچھا کہ تمہارا نسب کیا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا۔ سلمانؓ ابن اسلام + نظر تھی صورت سلمانؓ ادا شناس تری۔ یعنی تو حضرت سلمانؓ کی طرح، آنحضرت صلعم کا سچا عاشق تھا + اویس طاقتِ دیدار کو ترستا تھا۔ اس مصرع میں تلمیح ہے حضرت اویس قرنیؓ کے سوانح حیات کی طرف۔ یہ بھی حضور انور کے سچے عاشقوں میں بہت ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ چونکہ انکی والدہ بہت ضعیف تھیں، اسلئے آنحضرت صلعم نے اُن کو یہ حکم دیا کہ تم میری ملاقات کے لئے مت آؤ، بلکہ اپنی ماں کی خدمت کرو۔ اسی میں میری خوشنودی مضمر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کو حضور انور صلعم کے دیدار کی مسرت حاصل نہو سکی + تری نظر کو رہی دید میں بھی حسرتِ دید۔ یہ ایک شاعرانہ انداز بیان ہے۔ اس حقیقت کے اظہار کے لئے کہ حضرت بلالؓ حضور انور صلعم کے سچے عاشقوں میں سے تھے اور

ان کو حضور سے اسدرجہ محبت تھی کہ مسلسل دیکھتے رہنے کے باوجود، اُن کے دل کو سیری نہیں ہوتی تھی + خنک دلے کہ تپید و دمے نیاسائید۔ یعنی ان کا دل لائق ہزار تحسین ہے کہ عشق رسولؐ میں ساری عمر بیتاب رہا + کہ خندہ زن تری ظلمت تھی دستِ موسیٰؑ پر۔ اس مصرع میں تلمیح بھی ہے۔ اور انداز بیان بھی ہے۔ دستِ موسیٰؑ سے اس معجزہ کی طرف اشارہ ہے جو اللہ نے ان کو عطا فرمایا تھا۔ وَنَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ (۷: ۱۰۸) اور جب حضرت موسیٰؑ نے اپنا ہاتھ (اپنی بغل میں سے) نکالا تو وہ دیکھنے والوں کو بالکل سفید نظر آیا۔ پس دستِ موسیٰؑ سے سفیدی مراد ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ سرکار دوعالم صلعم کے عشق کی بدولت تیری شخصیت اسقدر دلکش ہوگئی کہ اگرچہ تو سیاہ فام تھا۔ لیکن مومنوں کی نظر میں تیری سیاہ رنگت، حضرت موسیٰؑ کے ہاتھ کی سفیدی سے بھی زیادہ سفید معلوم ہوتی تھی۔ یہ شعر مضمون آفرینی کی بہت دلکش مثال ہے + چہ برقِ جلوہ بخاشاکِ حاصلِ تو زدند۔ یعنی کارکنانِ قضا وقدر نے، شعلہ سے تپش لیکر تیرے دل میں بھردی۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ محبت کی بجلی نے تیرے وجود کو یکسر جلا کر خاک کردیا۔ مطلب یہ ہے کہ تو عشق کی بدولت فنا فی الرسولؐ ہوگیا + ادائے دید سراپا نیاز تھی تیری۔ یعنی تیرے دیکھنے میں نیاز کا رنگ جھلکتا تھا + اذان ازل سے ترے عشق کا ترانہ بنی۔ یعنی عشق کی بدولت تیری آوازِ اذاں میں عجیب سوز وگداز کا رنگ پیدا ہوگیا تھا + یثرب۔ مدینۃ النبیؐ کا اصلی نام ہے + خوشا وہ دور۔ یعنی وہ زمانہ کتنا مبارک تھا جب مسلمان حضور صلعم کے دیدار سے مشرف ہوتے تھے +

تبصرہ | اس نظم میں اقبالؔ نے سیدنا حضرت بلالؓ کی شخصیت کے اس پہلو کو نمایاں کیا ہے جسکی بدولت ان کو زندگی میں حضرت فاروق اعظمؓ کی زبان مبارک سے "سیّدنا" کا لقب حاصل ہوا، اور موت کے بعد، حیات جاوید نصیب ہوگئی۔ وہ پہلو کیا تھا؟ محض عشقِ رسول صلعم۔ محبت رسول صلعم نے حضرت بلالؓ کو ابدی زندگی عطا کردی۔ اور اقبالؔ نے اس نظم میں عجیب والہانہ انداز سے اسی حقیقت کو واضح کیا ہے۔ حضرت بلالؓ حبشی تھے، غلام تھے، مفلس تھے، بے یار ومددگار تھے لیکن ایک عشق رسول صلعم نے اُن کو مسلمانوں کا سردار بنادیا۔ اقبالؔ نے اس نظم میں ان کی عاشقانہ زندگی کی ایسی دلکش تصویر کھینچی ہے کہ الفاظ کے ذریعہ سے اسکا حُسن ظاہر نہیں ہو سکتا۔ صرف ذوق سلیم، دل ہی دل میں لذت اندوز ہو سکتا ہے۔

اس نظم کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ عشقِ رسول صلعم کی چنگاری شروع ہی سے اقبالؔ کے دل میں پوشیدہ تھی۔ اور میرا عقیدہ ہے کہ اسی کی بدولت وہ خود اور اُنکا کلام، دونوں زندہ جاوید ہوگئے۔

نظم برصفحہ ۸۰

تمہید | یہ نظم، اقبالؔ کی جدّتِ فکر کی بڑی عمدہ مثال ہے۔ اس قسم کی نظموں کے لئے تین باتیں شرط ہیں۔ پہلی یہ کہ شاعر کا علمی پایہ بہت بلند ہو۔ دوسری یہ کہ طبیعت میں جدّت طرازی کا مادہ ہو۔ تیسری یہ کہ کلام پر قدرت حاصل ہو۔

چونکہ یہ نظم از اوّل تا آخر تلمیحات سے معمور ہے۔ اسلئے میں ہر شعر کا مطلب جُداگانہ درج کرتا ہوں۔ اس نظم میں جیسا کہ اسکے عنوان ہی سے ظاہر ہے، اقبالؔ نے آدم کی سرگذشت از ابتدا تا ایندم، بڑے دلکش پیرائے میں بیان کی ہے۔

پہلا شعر:۔ غربت بمعنی وطن سے دوری + پیمان اولین میں اشارہ ہے، اُس پیمان کی طرف جو انسان نے دنیا میں آنے سے قبل، عالم ارواح میں اللہ سے باندھا تھا۔ یعنی جب اللہ نے بنی آدم کی ارواح کو پیدا کیا تو اُن سے دریافت کیا "اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ؟ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ تو اُنہوں نے یکزبان ہوکر کہا: "بَلٰى" ہاں + مطلب یہ ہے کہ انسان نے دنیا میں آکر اس پیمان کو بھلادیا۔ اور بنی آدم کی اکثریت شرک میں مبتلا ہوگئی۔ حالانکہ خدا سے وعدہ کیا تھا کہ ہم تیرے سوا کسی کو اپنا معبود نہیں بنائینگے +

دوسرا شعر:۔ جب آدم اور حوّا کے اندر، شعور ذاتی پیدا ہوا تو انکا دل جنت سے اُچاٹ ہوگیا۔ اس شعر میں اشارہ ہے، ان دونوں کے جنت سے اخراج کی طرف۔

تیسرا شعر:۔ دنیا میں آکر انسان کے اندر ذاتی شعور کی بنا پر تحقیق وتلاش کا جذبہ پیدا ہوگیا۔ اور اس سلسلہ میں اُس نے، اپنے تخیلات کی بلندی کا ثبوت دینا شروع کیا۔

چوتھا شعر:۔ چونکہ انسان فطری طور پر، تبدیلی اور انقلاب کا آرزومند ہے اسلئے اُسے ایک حالت میں زندگی بسر کرنا، پسند نہ آیا، یعنی انسان پر انقلابات آنے شروع ہوگئے۔

پانچواں شعر:۔ اس شعر میں حضرت ابراہیمؑ کی طرف اشارہ ہے کہ اُنہوں نے، اللہ کی عبادت کے لئے خانہ کعبہ تعمیر کیا۔ یہ پہلا گھر تھا جو بتوں کی نجاست سے پاک تھا لیکن بعد ازاں ان کی اولاد نے کعبہ کو بتخانہ بنادیا +

چھٹا شعر:۔ اس شعر میں حضرت موسیٰؑ کی طرف اشارہ ہے۔ کہ وہ اللہ سے ہمکلامی کی آرزو میں کوہ طور پر تشریف لے گئے۔ اور اللہ نے انہیں "یدبیضا" کا معجزہ عنایت فرمایا۔ "نورِ ازل، زیر آستیں" میں اسی معجزہ کی طرف اشارہ ہے۔

ساتواں شعر:۔ اس شعر میں حضرت عیسیٰؑ کی زندگی کی طرف اشارہ ہے یعنی یہودیوں نے انہیں، اپنی دانست میں مصلوب کردیا، لیکن اللہ نے انہیں، اس

ذلت سے بچا کر، آسمان پر پہنچا دیا۔

آٹھواں شعر:۔ اس شعر میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کی طرف اشارہ ہے کہ آنحضرتؐ نے قبل نبوت، کئی سال تک غار حرا میں خلوت اختیار فرمائی۔ اور یہیں آپؐ کو نبوت سے سرفراز کیا گیا۔ جام آخریں سے قرآن مجید مراد ہے +

نواں شعر:۔ پہلے مصرع میں شری کرشن کی زندگی کی طرف اشارہ ہے۔ کہ اُنھوں نے اہل ہند کو توحید کا پیغام سُنایا۔ سرودِ ربانی میں انکی بانسری کی طرف اشارہ ہے۔ دوسرے مصرع میں افلاطون الٰہی کی طرف اشارہ ہے۔ جس نے اہلِ یونان کو توحید الٰہی کا درس دیا۔

دسواں شعر:۔ اس شعر میں گوتم بُدھ کی طرف اشارہ ہے، جس نے اہلِ ہند کو بُت پرستی ترک کرنے کی تلقین کی تھی۔ لیکن جب ہندوؤں نے تلوار کے زور سے اسکے مذہب کا ہندوستان میں خاتمہ کر دیا، تو اسکے پیرو ہندوؤں کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر چین میں چلے گئے۔

نوٹ:۔ اقبالؔ نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ بُدھ دھرم کی تاریخ دو مصرعوں میں بیان کر دی ہے۔

گیارہواں شعر:۔ اس شعر میں مشہور فلسفی دیمقراطیس کی طرف اشارہ ہے جس نے چوتھی صدی قبل مسیح میں تعلیم دی تھی کہ اس کائنات کا کوئی خالق نہیں ہے۔ یہ دنیا، محض، ذراتِ مادّی کی ترکیب کا نتیجہ ہے۔ چونکہ مادہ کے علاوہ اور کوئی شئے موجود نہیں اسلئے انسان میں روح بھی نہیں ہے۔ مرنے کے بعد ہمیشہ کے لئے فنا ہو جاتا ہے۔ خدا اور روح، دونوں کا انکار، اہلِ دین کی تعلیمات کے سراسر خلاف ہے۔

بارہواں شعر:۔ اس شعر میں اُس آویزش کی طرف اشارہ ہے جو ازمنۂ وسطیٰ میں، یورپ میں رومن کیتھولک کلیسا (مسیحیت) اور حکما و فلاسفہ کے درمیان پیدا ہو گئی تھی۔ کلیسا کی تعلیم یہ تھی کہ حق وہ ہے جو کلیسا پیش کرے۔ اسکے خلاف حکما یہ کہتے تھے کہ حق وہ ہے جو عقل سے ثابت ہو سکے۔ حکما، کا خاتمہ کرنے کے لئے کلیسا نے محکمۂ احتساب قائم کیا اور کئی سو سال تک اُن کے قتل کا سلسلہ جاری رہا۔ بالآخر کلیسا کو شکست ہوئی۔ اور یورپ میں عقلیت کا بازار گرم ہو گیا۔

تیرہواں شعر:۔ اس شعر میں مشہور اطالوی عالم ہیئت گلیلیو کی طرف اشارہ ہے (ولادت ۱۵۶۴ء وفات ۱۶۴۲ء) جس نے اجرام فلکی کی تحقیقات میں اپنی ساری عمر بسر کر دی۔

چودہواں شعر:۔ اس شعر میں کاپرنیکس (۱۴۷۳ء تا ۱۵۴۳ء) کی طرف اشارہ ہے۔ جس نے کلیسا کی مخالفت کے باوجود، اپنا یہ نظریہ دنیا کے سامنے پیش کیا کہ آفتاب ساکن ہے۔ اور زمین اسکے گرد گھومتی ہے۔ کلیسا نے اس تعلیم کی بنا پر اُسے کافر قرار دیا۔ اور قتل کی دھمکی دی۔ لیکن اُس نے اسکی مطلق پرواہ نہیں کی۔ یہ حکیم موجودہ علم ہیئت کا بانی ہے۔ اسکے بعد کیپلر، کاپرنیکس، گلیلیو اور نیوٹن نے اسکے نظریہ کی حمایت کی۔

پندرہواں شعر:۔ اس شعر میں نیوٹن (۱۶۴۲ء تا ۱۷۲۷ء) کی طرف اشارہ ہے۔ جس نے کائنات میں کشش ثقل کا قانون دریافت کیا + ہویدا کیا یعنی ظاہر کیا + عقل کی دوربین لگا کر یعنی عقل کی مدد سے +

سولہواں شعر:۔ اس شعر کے پہلے مصرع میں ڈاکٹر رونٹگن RONTGEN اور ڈاکٹر فریڈے (FARADAY) کی ایجادات کی طرف اشارہ ہے۔ اوّل الذکر نے ۱۸۹۵ء میں اتفاقی طور پر، ان شعاعوں کو دریافت کیا تھا، جبکہ وہ مختلف قسم کے برقی تجربے کر رہا تھا۔ چونکہ وہ اُسوقت تک انکی ماہیت سے ناواقف تھا، اسلئے اُس نے انکا نام X ایکس ریز (شعاع غیر معلوم) رکھا۔ آجکل اِن شعاعوں کے ذریعہ سے جسم کے اندرونی اعضا کا فوٹو لیا جاتا ہے + آخرالذکر نے بجلی (جس سے مختلف کام لئے جاتے ہیں اور بلب روشن ہوتے ہیں) کے سلسلہ میں بہت مفید تحقیقات کیں + دوسرے مصرع کا مطلب یہ ہے کہ اس قسم کی مفید تحقیقات کی بدولت یہ دنیا، جنت کی طرح آسائشوں سے معمور ہو گئی۔

سترہواں شعر:۔ لیکن ان تمام حیرت انگیز ایجادات کے باوجود، انسان ہستی کی حقیقت سے آگاہ نہ ہو سکا + خرد سے جہاں کو تہ نگیں کیا۔ یعنی تمام دنیا اپنے تصرّف میں لے آیا۔ یا عقل کی بدولت میں نے قوائے فطرت کو مسخر کر لیا۔ لیکن یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اس کائنات کا بنانے والا کون ہے؟ اسی بات کو اقبالؔ نے ضرب کلیم میں یوں بیان کیا ہے:۔

جسنے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

اٹھارہواں شعر:۔ لیکن جب میری مظاہر پرست (ظاہر بیں) آنکھ روشن ہو گئی، تو مجھے معلوم ہوا کہ میرا اور اس کائنات کا خالق تو میرے دل ہی میں موجود ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ انسان اس حقیقت سے کیسے آگاہ ہو سکتا ہے؟ اسکا جواب یہ ہے کہ عشق کی بدولت۔ خلاصہ اس نظم کا یہ ہے کہ دنیا کے حاصل کرنے کا طریقہ عقل ہے، اور خدا کے حاصل کرنے کا طریقہ عشق ہے۔

نظم بر صفحہ ۸۲

حلّ لغات اور شرح مشکلات | غربت۔ پردیس + پربت۔ پہاڑ۔ مراد ہمالیہ + سنتری۔ بمعنی پاسبان + رشکِ جناں۔ جنت کی طرح حسین اور دلکش + گنگا، یہ ہندوؤں کا مقدس ترین دریا ہے + بَیر بمعنی دشمنی + دورِ زماں۔ زمانہ کی گردش۔ پہلے زمانہ میں لوگوں کا عقیدہ یہ تھا کہ دنیا میں جس قدر واقعات رونما ہوتے ہیں، سب کا باعث گردش زماں ہی ہے۔ ہندو قوم ابتک، اسی عقیدہ پر قائم ہے۔

تبصرہ | یہ ترانہ اقبالؔ نے ۱۹۰۴ء میں لکھا تھا اور ۱۰ اگست ۱۹۰۴ء کو کانپور (یوپی) کے مشہور اُردو رسالہ زمانہ کے اڈیٹر منشی دیانرائن نگم، کو اشاعت کے لئے بھیجا تھا۔ اس میں آخری مصرع یوں لکھا تھا: "معلوم ہے ہمیں کو دردِ نہاں ہمارا" لیکن بعد میں اُنہوں نے اس میں تھوڑی سی تبدیلی کر کے، یوں کر دیا۔ "معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا" اور اس میں شک نہیں کہ لفظ "کسی" نے مصرع میں سوز و گداز کی کیفیت میں اضافہ کر دیا ہے۔

یہ وہ زمانہ ہے جبؒ ایک مخلص قوم پرور تھے، لیکن بعد میں اُنکو معلوم ہوا کہ ہندوؤں کے نزدیک قوم پرست وہ ہے جو

(۱) اہنسا پر ایمان لائے (۲) گائے کی پوجا کرے (۳) اُردو سے نفرت کرے اور (۴) اسلام اور کفر میں کوئی امتیاز نہ کرے۔ اسلئے موصوف اس قوم پرستی سے بیزار ہو کر "غبار رہِ حجاز" ہو گئے۔ اور ہندوستان کے بجائے اُنہوں نے سارے جہان کو اپنا وطن بنا لیا۔

نوٹ:۔ قوم پرستی کے یہ تمام اصول رسوائے عالم واردھا اسکیم سے ماخوذ ہیں۔ جسکو ہندوؤں کے لیڈر مسٹر گاندھی کی ہدایات باطنی کے مطابق، ڈاکٹر ذاکر حسین خانصاحب نے مدوّن کیا تھا۔ یہ بھی مسٹر موصوف کے روحانی کمالات کا ایک کرشمہ تھا کہ وہ ہمیشہ اپنی مسلم کش تجاویز (اسکیمیں) مسلمانوں ہی کے

ہاتھوں سے مرتب کراتے تھے۔ جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ یہ نایاک دار دھا اسکیم ، ڈاکٹر صاحب موصوف نے مرتب کی تھی تو بے ساختہ یہ شعر زبان پر آجاتا ہے :-

ایں سعادت بزورِ بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

نظم نمبر ۸۳

حلّ لغات اور شرح مشکلات | کاشانہ - مکان ، کمرہ ، آشیانہ + کاشانۂ چمن - یعنی چمن + سفیر بمعنی ایلچی + تکمہ - پہلے زمانہ میں بٹن کا کام تکمہ سے لیتے تھے + حسنِ قدیم سے خدا مراد ہے + رنگین نوا - خوش آواز + گل کو زبان دیکر تعلیم خامشی دی - یعنی زبان (پتی) کے باوجود گل خاموش رہتا ہے ۔ شعراء گلاب کی پتیوں کو زبان سے تشبیہہ دیا کرتے ہیں + پری سے شفق مراد ہے + بانکی سے دلکش یا حسین مراد ہے + لال جوڑا کہ یہ ہے سورج کی روشنی سے + حسنِ ازل سے خدا مراد ہے + کثرت تصوف کی اصطلاح ہے ۔ اور وحدت کی ضد ہے - کثرت سے وہ بیشمار مخلوقات مراد ہیں جو کائنات میں نظر آتی ہیں + وحدت سے ذات خداوندی مراد ہے۔ یہ وحدت اس کائنات کی کثرت میں پوشیدہ ہوگئی ہے + اگر غور سے دیکھو اور دیکھنے کے لئے دل کی آنکھیں شرط ہیں، تو وہی ایک ذات ہے جو مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہے۔ کہیں وہ سخن ہے ۔ کہیں وہ چمک ہے، کہیں وہ چاندنی ہے، کہیں وہ کسک ہے، کہیں وہ نغمہ ہے، کہیں وہ مہک ہے ، وہی ذات واحد ہے جو مختلف شکلوں میں نظر آ رہی ہے +

تبصرہ | یہ پوری نظم اقبال کے تخیل کی بلندی پر شاہد ہے۔ اسکے پہلے بند میں لفظی خوبیاں (استعارات اور تشبیہات) پائی جاتی ہیں۔ اور تیسرے بند میں معنی کی خوبیاں (تصوف کی تعلیمات) نظر آتی ہیں۔ یہ نظم چونکہ میرے مذاق کے

مطابق ہے اسلئے میری نگاہ میں بہت اہم ہے۔ اس میں بنیادی خیال یہ ہے کہ کائنات کی ہر شئے میں خدا کا جلوہ پوشیدہ ہے - دراصل تو نظر آتا ہے ۔لیکن میں نے لفظ پوشیدہ اسلئے استعمال کیا ہے کہ بجلی کی روشنی نے ہماری نگاہوں کو اسقدر خیرہ کر دیا ہے کہ " فلمی ستاروں " کے علاوہ اب کسی کو کچھ نظر نہیں آتا ۔ واضح ہو کہ یہ بنیادی خیال تصوف کی روح ہے ۔ اسکی تعلیمات کا بس خلاصہ یہی ہے کہ کائنات میں اسکے سوا کسی کا وجود حقیقی نہیں ہے ۔ اور ہر شئے میں اُسی کا جلوہ ہے۔ یہ ساری کائنات اسکی صفات کا مظہر ہے ۔ع بر چہ بینی بدانکہ مظہر اوست ۔

مطلب | چمن میں جگنو چمک رہا ہے یا پھولوں کی محفل میں شمع جل رہی ہے؟ یا آسمان سے کوئی ستارہ باغ میں آگیا ہے ؟ یا چاند کی کرن میں زندگی پیدا ہوگئی ہے ؟ یا رات کی سلطنت میں دن کا ایلچی آیا ہے ؟ یا مہتاب کی قبا سے کوئی تکمہ گر پڑا ہے ؟ یا سورج کے پیرہن میں کوئی ذرہ چمک رہا ہے ؟ یا یہ خدا کے حسن کی ایک جھلک تھی - جسے قدرتِ خداوندی عالم بالا کی خلوت سے دنیا کی انجمن میں لے آئی ؟ یہ جگنو ، چھوٹا سا چاند ہے۔ اس میں روشنی بھی ہے تاریکی بھی ۔جب وہ اپنی دُم کو اپنے بازوؤں سے چھپا لیتا ہے تو تاریکی ہو جاتی ہے، اور جب اُڑتا ہے تو اسکی دُم چمکنے لگتی ہے ۔یوں دیکھنے میں تو پروانہ اور جگنو دونوں پتنگے ہی ہیں ، لیکن کیا خدا کی قدرت ہے کہ پروانہ روشنی کا طالب ہے اور جگنو خود روشنی ہے ۔

اللہ نے ہر چیز میں کوئی نہ کوئی دلکشی یا خوبی یا خاصیت رکھدی ہے ۔مثلاً پروانہ کو چراغ کا سودا ہے ۔ جگنو مجسم چراغ ہے ۔ بلبل ، مینا ، قمری ، کوئل یہ اگرچہ بے زبان ہیں ، لیکن انکی آواز نہایت سُریلی اور دلکش ہے ۔ گل کے پاس بہت سی زبانیں ہیں لیکن وہ خاموش ہے ۔ شفق کو دیکھئے ، کتنی خوبصورت ہوتی

ہے ۔لیکن اسکی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے ۔شفق کی طرح ، سحر کو بھی قدرت نے حسین بنایا ہے ۔ اسی طرح کائنات میں ہر شئے اپنی جداگانہ خاصیت رکھتی ہے ہوا چلتی رہتی ہے، پانی بہتا رہتا ہے ، موجیں اُٹھتی رہتی ہیں ۔جب ہماری رات ہوتی ہے تو جگنو کا دن ہوتا ہے ۔

حقیقتِ حال یہ ہے کہ دنیا کی ہر شئے میں خدا کا جلوہ نظر آتا ہے ۔ بالفاظ واضح تر خدا کی صفات کا جلوہ مختلف چیزوں میں ، مختلف شکلوں میں دکھائی دیتا ہے ۔ جو شئے ، انسان میں گویائی ہے ، وہی شئے غنچہ میں چٹک ہے ۔ چاند کی چاندنی میں ، اُس کی قدرت کا جو کرشمہ نظر آتا ہے ، وہی کرشمہ ، شاعر کے دل میں کسک بن کر ظاہر ہوتا ہے ۔ دراصل یہ ہم نے مختلف اشیاء کے لئے مختلف الفاظ وضع کرلئے ہیں ۔ ورنہ بلبل کے نغمہ میں اور پھول کی خوشبو میں کوئی بنیادی اختلاف نہیں ہے ۔ بلبل کے نغمہ میں بھی وہی پوشیدہ ہے ۔ اور پھول کی خوشبو میں بھی وہی مخفی ہے ۔ ع ایں وحدت ہست لیک بہ تکرار آمدہ

وحدتِ ذاتِ باری ، اس دنیا کی کثرت (مخلوقات) میں مخفی ہوگئی ہے ، ورنہ وہی ایک ذات ہے جو جگنو میں چمک رہی ہے اور پھول میں مہک رہی ہے ۔ جب حقیقت یہ ہے کہ اُس ذات واحد کے علاوہ اور کسی کا وجود نہیں تو پھر مظاہر فطرت کا اختلاف ، باہمی ہنگاموں کا سبب نہیں ہونا چاہئے ۔ یعنی انسانوں کو ایک دوسرے سے نفرت یا دشمنی کرنی زیبا نہیں ہے ۔ کیونکہ ہر انسان میں اُسی کا جلوہ پوشیدہ ہے ۔

اس نظم کا آخری شعر بہت غور طلب ہے ۔ یعنی جب ہر شئے میں خاموشیٔ ازل (اسماء و صفات خداوندی کا جلوہ) پنہاں ہے ۔ تو پھر بظاہر اس کائنات میں جو اختلاف نظر آتا ہے ، یہ منافرت کا سبب نہیں بن سکتا ۔ یعنی ہمیں ہر شخص

سے محبت کا برتاؤ کرنا چاہئے ۔

نوٹ :- اگر دنیا والے اس اصول پر کاربند ہو جائیں تو یہ دنیا جنت کا نمونہ بنجائے ۔

نظم نمبر ۸۵

حلّ لغات اور شرح مشکلات | صبح کا ستارہ - ایک خاص ستارہ ہے ، جو پچھلی رات کو طلوع ہوتا ہے ۔ اور بہت روشن ہوتا ہے + صبوحی پینا ، صبوحی اُس شراب کو کہتے ہیں ، جو صبح کے وقت پیتے ہیں + قعرِ دریا - دریا کی گہرائی یا تلی + زیبِ گلو - گلے کا زیور + خاتم - انگوٹھی + گہرہائے گرانمایہ - قیمتی جواہرات + سرِ مژگاں پلک کی نوک + مستور - پوشیدہ + میدانِ وغا - میدان جنگ + شکیبائی - صبر + عارضِ گلگوں - سرخ رخسار +

مطلب | یہ نظم اقبال کی قوت تخیل کا کرشمہ ہے ۔مقصد اس نظم سے یہ ہے کہ اگر کسی کو حیاتِ ابدی کی آرزو ہو تو اپنے اندر عشق کا سوز پیدا کرلے ۔ اس حقیقت کو انہوں نے صبح کے ستارے کی زبان سے ادا کیا ہے ۔

صبح کا ستارہ کہتا ہے کہ میں اپنی موجودہ طرز حیات سے مطمئن نہیں ہوں ، ہر روز سحر کے وقت ، طلوع آفتاب سے پہلے نمودار ہوتا ہوں ۔ لیکن جب صبح ہو جاتی ہے تو میں فنا ہو جاتا ہوں ۔ اگر مجھے اختیار حاصل ہوتا ۔ تو میں اختر کے بجائے گوہر بنجاتا ۔ اور مجھ سے کسی بیگم کے تاج کی زینت ہوتی ۔ دیکھ لو ۔ گوہر ، بادشاہوں کی انگوٹھی میں جگہ پاتا ہے ۔ لیکن گوہر کو بھی فنا سے مفر نہیں ہے اور میں وہ زندگی چاہتا ہوں جسے فنا نہ ہو ۔ اسلئے کیا اچھا ہو اگر میں اس بیوی کی آنکھ کا آنسو بنجاؤں جسکا شوہر حُبِ وطن سے مجبور ہو کر میدان جنگ میں جا رہا ہو ۔ اور وہ بادیدۂ نم ، اُسے رخصت کر رہی ہو ۔ وہ باوفا بیوی بہت غمگین ہو ۔ لیکن چپ ہو ، اور شوہر کی

خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے اسکی جدائی پر صبر کرے۔ شوہر کو رخصت کرتے وقت، اسکے سرخ رخسار، فرطِ غم سے زرد ہو جائیں۔ اور یہ زردی اسکے حسن کو دوبالا کر دے۔ وہ لاکھ ضبط کرے لیکن آنسو اسکی آنکھوں سے ٹپکنے لگیں اور اس طرح میں اسکی آنکھ سے ٹپک کر خاک میں مل جاؤں۔ اور خاک میں مل کے ابدی زندگی حاصل کرلوں۔ چونکہ یہ آنسو، سچی محبت کی بنا پر اسکی آنکھوں سے نکلیں گے، اسلئے اسکی محبت، ان آنسوؤں کو زندہ جاوید بنا دیگی۔

نظم بر صفحہ ۸۷

حلّ لغات اور شرح مشکلات | چشتیؒ۔ سلطان الہند خواجۂ غریب نواز حضرت معین الدین حسن سنجری اجمیری۔ جنہوں نے ہندستان نے اسلام کی شمع روشن کی۔ ۶۳۳ھ میں سلطان شمس الدین التمش کے عہد میں وفات پائی۔ حضرت کا آستانۂ مبارک، تمام سلاطین ہند کا مرجع رہا ہے۔

من بداماں معین الدین حسن دستے زدم
سیّد من، خواجۂ من، خضرِ من، مولائے من

نانک، جنہوں نے بتائید ایزدی، اسلام قبول کیا۔ اور پنجاب میں توحید اور مساوات کا درس دیا جنکے مسلمان ہونے کا ثبوت آج بھی اُن کے اُس کُرتے سے مل سکتا ہے۔ جس پر سورۂ فاتحہ اور کلمۂ طیبہ لکھا ہوا ہے۔ لیکن انکے پیرو، غلطی سے اُن کو غیر مسلم سمجھتے ہیں + تاتاریوں سے ترکان تیموری مراد ہیں۔ جنہوں نے ۱۵۲۶ء سے ۱۸۵۷ء تک حکومت کی + حجازیوں سے وہ عربی فاتحین مراد ہیں جنہوں نے ۷۱۲ء میں سندھ فتح کیا تھا + یونانیوں کو جس نے حیراں کر دیا، اشارہ ہے ہندو فلسفہ کی طرف۔ واضح ہو کہ قدیم زمانہ میں ہندو قوم فلسفہ میں

اہلِ یونان سے بھی بڑھی ہوئی تھی + فارس کے ستاروں سے وہ حکما اور شعراء مراد ہیں جو مسلمانوں کی حکومت کے زمانہ میں، فارس سے آکر یہاں آباد ہو گئے تھے + وحدت کی ئے سے حضرت کرشن کی تعلیم کی طرف اشارہ ہے + میر عربؐ کو آئی ٹھنڈی ہوا۔ اس میں آنحضرت صلعم کی حدیث کی طرف اشارہ ہے کہ آپؐ نے ایک مرتبہ یہ فرمایا تھا کہ مجھے ہندستان سے توحید کی خوشبو آتی ہے + بندۂ کلیم جس کے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ قدیم زمانہ میں یہاں کے باشندوں نے عرفانِ الٰہی حاصل کیا تھا + نوح نبی کا آکر ٹھہرا جہاں سفینہ۔ اس مصرع میں اقبالؔ نے اس روایت کو نظم کر دیا ہے جو قدیم زمانہ میں یہاں مشہور تھی کہ حضرت نوح کا سفینہ، ہندستان کے کسی پہاڑ کی چوٹی پر آکر ٹھہرا تھا۔ یہ روایت صحیح نہیں ہے۔

تبصرہ | یہ نظم اقبالؔ نے اُس زمانہ میں لکھی تھی جب ان پر وطن پروری (نیشنلزم) کا رنگ غالب تھا۔ چونکہ نظم آسان ہے اسلئے مطلب لکھنے کی ضرورت نہیں۔

نظم بر صفحہ ۸۸

حلّ لغات اور شرح مشکلات | صنم کدہ۔ بتخانہ + بُت پرانے ہو گئے۔ یعنی بیکار ہو گئے۔ انکی پوجا سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا + جنگ وجدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ واعظ نے خدا کے عطا کردہ مذہب کی غلط تفسیر کر کے جنگ وجدل کا شیوہ اختیار کر لیا۔ یہ شعر مجازِ مرسل کی بہترین مثال ہے مجازِ مرسل وہ صنعت ہے جس میں الفاظ کچھ ہوتے ہیں، مراد کچھ ہوتی ہے۔ مثلاً "خدا تخت کو سلامت رکھے"۔ اس سے مراد ہے مالک تخت کی سلامتی + خاکِ وطن کا مجھکو ہر ذرہ دیوتا ہے۔ یعنی اے برہمن! بتوں کی بجائے وطن کی پرستش کر۔ واضح ہو کہ یہ نظم اقبالؔ نے اُسی وطن پرستی کے دور میں لکھی تھی جسکی تفصیل قبل

قبل ازیں سپردِ قلم کر چکا ہوں + نقش دوئی۔ یہ تصوّف کی اصطلاح ہے یعنی کائنات میں ۲ دو ہستیوں کو (خدا کے علاوہ دوسری ہستی کو) موجود یقین کرنا۔ یہاں اس سے مراد ہے ہندو اور مسلمان کو ۲ دو یعنی دو قومیں تصوّر کرنا۔ واضح ہو کہ یہ اُس زمانہ کی باتیں ہیں جب اقبالؔ پر، ہنود کے عزائم مخفیہ، آشکارا نہیں ہوئے تھے اور وہ کمال ڈپلومیسی سے کام لیکر ہندو مسلم اتحاد کی تلقین کر رہے تھے۔ یہ حقیقت کہ ہندو کی نظر میں، مسلمان ایک ناپاک اور جداگانہ قوم ہیں، ستمبر ۱۹۴۷ء میں واضح ہوئی، جب دلی کے کانگرسی مسلمانوں نے ہندوؤں سے کہا کہ "ہمیں کیوں قتل کرتے ہو، ہمتو کانگرسی ہیں"۔ تو انہوں نے انتہائی شریفانہ لہجہ میں یہ جواب دیا "مگر مسلمان تو ہو"۔ نیا شوالہ۔ اس سے مراد ہے مسلکِ وطن پرستی۔ شاعر کا مطلب یہ ہے کہ بت پرستی کے بجائے وطن پرستی اختیار کر لو + تیرتھ۔ مقدس مقام یا زیارت گاہ + میٹھے منتر سے ہندو مسلم اتحاد کا وہ نعرہ مراد ہے جسکی لغویت پر ہندوؤں کا طرزِ عمل شاہد ہے + شکتی۔ طاقت + شانتی۔ اطمینان + بھگت۔ عاشق + دھرتی۔ زمین + باشی۔ رہنے والے + مکتی نجات + پریت۔ محبت +

تبصرہ | اس نظم کی معنویت تو مدتوں سے ختم ہو چکی ہے۔ ہاں شاعری کے اعتبار سے یہ نظم اقبالؔ کے دورِ وطن پرستی کا بہترین نمونہ ہے۔ کیونکہ اسکا انداز بیان بہت مؤثر اور دلکش ہے۔ شاعر نے وطن کی عظمت کا نقش دلوں پر قائم کرنے کیلئے اپنی تمام شاعرانہ قوتوں کو صرف کر دیا ہے۔ اکثر ناقدین اقبالؔ کا یہ خیال ہے کہ ہندو مسلم اتحاد پر (جسکا وجود نہ تھا، نہ ہے، نہ ہوگا) یہ اردو میں بہترین نظم ہے۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ مسلمانوں نے یہ سمجھے بغیر ہی ہندو مسلم اتحاد کا راگ الاپنا شروع کر دیا کہ ہندو تو مسلمان کا دشمن ہے۔ اور دشمن اتحاد نہیں کر سکتا۔ تو ہندو کس طرح متحد ہو سکتا ہے؟ ذیل میں ثبوت پیش کرتا ہوں۔

۱۹۲۰ء میں الہ آباد کے ایک کشمیری پنڈت کی لڑکی نے لکھنؤ میں مولانا عبد الباری فرنگی محلی مرحوم کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تو گاندھی نے کہا کہ یہ بات ہندو مسلم اتحاد کے منافی ہے، اسلئے مسلمانوں نے اُس نو مسلمہ کو پھر کفر کی آغوش میں واپس کر دیا۔

۱۹۴۲ء میں ایک مسلمان لڑکی نے احمد آباد میں ہندو مذہب قبول کر کے سیٹھ شنکر لعل کے بیٹے سے شادی کر لی۔ تو اسی ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار گاندھی نے، دونوں کو اس مبارک فعل پر "آشیرباد" دی۔ اور کہا کہ اس قسم کی شادیاں ہندو مسلم اتحاد کے لئے بہت مفید ثابت ہونگی"۔ اب ناظرین خود غور کر لیں کہ جب ہندوؤں کے "مہاتما" کی اسلام دشمنی کا یہ عالم تھا تو چھوٹی آتماؤں کی اسلام دشمنی کا کیا عالم ہوگا۔ ہندو لڑکی مسلمان ہو جائے تو ہندو مسلم اتحاد باطل ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر مسلمان لڑکی ہندو ہو جائے تو ہندو مسلم اتحاد مضبوط ہو جاتا ہے۔ یہ وہ منطق ہے جسے صرف بھارت کے موجودہ وزیر تعلیم[1] ہی سمجھ سکتے ہیں۔

نظم بر صفحہ ۸۹

حلّ لغات اور شرح مشکلات | عظمتِ غالبؔ ایک مدت سے پیوندِ زمیں ہے یعنی غالبؔ کی وفات کو مدت گذر چکی ہے۔ پیوندِ زمیں کنایہ ہے۔ فوت ہو جانے سے + شہرِ خموشاں کا مکیں ہے۔ یعنی میر مہدی مجروحؔ بھی انتقال کر چکا + توڑ ڈالی موت نے غربت میں مینائے امیرؔ۔ موت نے امیرؔ مینائی کی زندگی کا پردیس میں خاتمہ کر دیا۔ مینائے امیرؔ میں بڑی خوبی ہے۔ کیونکہ امیر حضرت شاہ مینا کی اولاد میں ہونے کی وجہ سے مینائی مشہور تھے + چشم محفل میں ہے ابتک کیفِ صہبائے امیرؔ۔ لیکن شاعری کے قدردانوں کی نگاہ میں، امیرؔ مینائی کا کلام ابتک

[1] جناب ابوالکلام صاحب آزاد

نہایت وقیع اور دلکش ہے + بلبل دلی۔ کنایہ ہے داغ سے + اُس چمن سے عالم آخر مراد ہے + آخری شاعر سے مراد یہ ہے کہ آئندہ اس پایہ کے شاعر کی پیدائش کی توقع نہیں ہے + بانکپن سے شعر کی دلکشی مراد ہے۔ واضح ہو کہ بعض اشعار میں بانکپن پایاجاتا ہے۔ لیکن یہ صفت بذریعہ الفاظ نہیں سمجھائی جاسکتی۔ اسکے لئے اُس شاعر کے کلام کا مطالعہ لازمی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ داغ کا کلام پڑھنے والے کے دل میں اسی طرح کھُب جاتا ہے جس طرح کسی حسینہ کا حسن وجمال + کافور پیری۔ کنایہ ہے بالوں کی سفیدی سے + کافور پیری میں جوانی کی آگ نہاں تھی یعنی بڑھاپے کے باوجود اسکے کلام میں جوانوں کی سی شوخی تھی + تھی زبان داغ پر جو آرزو ہر دل میں ہے۔ یعنی داغ نے تمام دنیا کے عاشقوں کے جذبات اور واردات کی ترجمانی کی ہے اور یہی معیار کمال شاعری ہے + یہ لیلیٰ وہاں بے پردہ ہے۔ شاعر نے واردات عاشقی کو لیلیٰ قرار دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ داغ نے جذبات عاشقی کو واضح طور پر اپنی شاعری میں بیان کر دیا ہے + یاں محمل میں ہے۔ کنایہ ہے دل عاشق سے۔ یعنی جو بات عاشقوں کے دل میں پوشیدہ ہے وہ داغ کے کلام میں نمایاں ہے +

اب صبا سے کون پوچھے گا سکوتِ گل کا راز؟ یہ مصرع بلاغت کی تصویر ہے۔ اور میں لکھ چکا ہوں کہ اقبال کی شاعری بلاغت کی کان ہے۔ اس قسم کے مصرعوں یا شعروں کی لفظوں کے ذریعہ سے تشریح نہیں ہوسکتی۔ نیز "کون پوچھے گا؟" اس استفہام نے مصرع میں غضب کی تاثیر پیدا کر دی ہے۔ اور جس مصرع میں بلاغت

نوٹ :- (۱) میر مہدی مجروح، مرزا غالب کے عزیز ترین شاگرد تھے۔ سنہ ۱۹۰۲ء میں بمقام رامپور وفات پائی۔ (۲) امیر مینائی مرحوم، داغ کے ہمعصر اور شاعری میں اُن کے مدمقابل تھے۔ لیکن علم وفضل اور تقویٰ وطہارت کے لحاظ سے تمام شعرا پر فضیلت رکھتے تھے۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں بمقام حیدرآباد رحلت فرمائی +

اور تاثیر، دونوں جمع ہوجائیں، اسکی دلکشی کا کیا ٹھکانا!

مطلب یہ ہے کہ شاعر اپنی قوت تخئیل کی بدولت، بے زبان اور بے جان چیزوں کو گویا بناکر، اُن سے ہمکلام ہوجاتا ہے۔ اور اس طرح فطرت کے بہت سے رازہائے سربستہ سے آگاہی حاصل کرلیتا ہے۔ مثال کے طور پر بانگ درا ہی کی نظموں کو لے لیجئے۔ اقبال نے چاند، ستارہ، گل رنگیں، اور آفتاب سے گفتگو کی ہے، اُنکے جذبات کی عکاسی کی ہے۔ اسی طرح داغ نے اپنی شاعری میں صبا سے سکوتِ گل کا سبب دریافت کیا ہے۔ اور چمن میں جاکر بلبل سے اسکے نالہ کی وجہ معلوم کی ہے۔ جو شے شاعر کو "تُک بند" سے متمیز کرتی ہے وہ یہی قوتِ تخئیل تو ہے

"تھی حقیقت سے نہ غفلت، فکر کی پرواز میں"۔ لیکن تخئیل، کبھی کبھی شاعر کے اندر بے راہ روی (حقیقت سے دوری) بھی پیدا کر دیتی ہے۔ جب یہ قوت اعتدال سے متجاوز ہوجاتی ہے تو کلام یا مہمل بنجاتا ہے یا چیستان۔ اسلئے اقبال کہتے ہیں کہ تخئیل کی کرشمہ سازیوں کے باوجود، داغ کا کلام حقیقت اور صداقت اور واقعیت سے دور نہیں ہے۔ یعنی یہ سچ ہے کہ داغ اپنے کلام میں آسمان سے تارے توڑ کر لایا ہے لیکن اسکے باوجود، اس کی شاعری، اُصولِ فن کی بھی پابند رہی۔ اور اغلاق وابہام کے عیوب سے بھی پاک رہی۔

یہ مطلب ہے اس مصرع کا "آنکھ طائر کی نشیمن پر رہی، پرواز میں"۔ اس شعر میں اقبال نے کتنا دلکش تلازمہ باندھا ہے: طائر، نشیمن، پرواز سبکو ایک مصرع میں جمع کر دیا۔ طائر سے شاعر، نشیمن سے شاعری کے اُصول، اور پرواز سے فکرِ سخن مراد ہے۔ مضمون کی باریکیاں۔ نازک خیالیاں + فکر نکتہ آرا ایسی فکر (قوت مفکرہ) جو نکتے سجھائے یعنی پیدا کرے +

نوٹ :- پاکستان کے اکثر نوجوان انشاپرداز نقطہ کی جگہ نکتہ کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ حالانکہ ان دونوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ مثلاً انکی مراد ہوتی ہے "نقطۂ نگاہ" لیکن لکھتے ہیں "نکتۂ نگاہ" وہ لوگ لکھتے وقت اتنا نہیں سوچتے کہ نکتہ کا تعلق عقل سے ہے نہ کہ نگاہ سے۔ اسی طرح تخیّل اور تخئیل میں بہت فرق ہے۔

فلک پیمائیاں۔ خیال کی بلندی۔ پرواز تخیل + تلخی دوراں۔ مراد ہے انقلابات عالم یا زمانہ کی سختیاں + تخیل کی نئی دنیا سے نئے نئے مضامین مراد ہیں + بلبل شیراز۔ کنایہ ہے حافظ کے رنگ میں لکھنے والے سے + ساحر۔ کنایہ ہے نہایت مقبول شاعر سے جیسے جگر مرادآبادی + صاحب اعجاز کنایہ ہے بہت بلند پایہ شاعر سے، جسکا تتبع دوسروں کے لئے دشوار ہو۔ جیسے اکبر الہ آبادی + آذر۔ حضرت ابراہیمؑ کے باپ کا نام ہے۔ مراد ہے شاعر۔ تفسیریں لکھی جائینگی۔ یعنی بہت سے دواوین مرتب ہونگے۔

نوٹ :- اقبال نے ۱۹۰۵ء میں یہ مصرع محض شاعرانہ رنگ میں لکھا تھا لیکن آج ۱۹۵۱ء میں حقیقت بن کر ہمارے سامنے آگیا ہے۔ آج ہمارے محبوب پاکستان میں کوئی مہینہ خالی نہیں جاتا جب کسی شاعر کا مجموعۂ کلام شائع نہوتا ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک میں شاعروں اور فنکاروں کی بارش ہو رہی ہے + اٹھ گیا ناوک فگن۔ تیر مارنے والا (داغ) دنیا سے رخصت ہوگیا + مارے گا دل پر تیر کون؟ کنایہ ہے داغ کی شاعری سے جس کا ہر شعر آج بھی اپنی جگہ قیامت ہے۔ اس مصرع کی صداقت کا ثبوت یہ ہے کہ داغ کے انتقال کو ۴۸ سال ہوچکے ہیں، لیکن ابھی تک ہندستان میں اسکا جواب پیدا نہیں ہوسکا ہے۔ جگر مرادآبادی، فراق گورکھپوری اور حسرت موہانی ان تین شعرا کے کلام میں اسکا رنگ ضرور جھلکتا ہے۔ "مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی" + بیت الحرام مذہب اہل سخن۔ کنایہ ہے دلی سے، جس میں بہت سے باکمال شعرا پیدا ہوئے یا پروان چڑھے

یا سکونت پذیر ہوگئے + دکن کی خاک میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ حضرت داغ کا انتقال حیدرآباد (دکن) میں ہوا تھا + حالی۔ شمس العلما خواجہ الطاف حسین صاحب حالی پانی پتی مرحوم، جو غالب کے شاگرد تھے۔ تفصیلی حالات آئندہ لکھونگا + آرزو کو خون رلواتی ہے بیداد اجل یعنی موت اس قدر ظالم ہے کہ انسان کی بہت سی آرزوئیں دل کی دل ہی میں رہ جاتی ہیں۔ یہ مصرع بھی مجاز مرسل کی بہت عمدہ مثال ہے + مارتا ہے تیر تاریکی میں۔ اس مصرع میں اقبال نے وہ خیال نظم کر دیا ہے جو عام طور سے دنیا میں رائج ہے۔ کہ بعض آدمیوں کو "بے وقت" موت آجاتی ہے۔ یا موت، اپنا تیر تاریکی میں چلاتی ہے۔ اور اس طرح اندھا دھند لوگوں کو فنا کر دیتی ہے۔ جن کے مرنے کے دن ہوتے ہیں وہ بچ رہتے ہیں، اور جن کے جینے کے دن ہوتے ہیں وہ لقمۂ اجل بنجاتے ہیں۔ تاریکی میں تیر چلانا محاورہ ہے جس کا مطلب ہے اندھا دھند مارنا۔ یہ تصور سراسر غیر اسلامی ہے۔ اسلام کی رو سے کسی کا یہ کہنا کہ "زید کی بے وقت موت پر مجھے بہت افسوس ہے" صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ بے وقت تو کوئی مر ہی نہیں سکتا +

تبصرہ | اکثر نقادانِ فن کا یہ فیصلہ ہے کہ داغ کی شاعری پر اس سے بہتر تنقید نہیں ہوسکتی۔ موصوف کی شاعری کے عناصر ترکیبی حسب ذیل ہیں۔

(۱) بانکپن مثلاً :- پڑا افلاک کو کبھی دل جلوں سے کام نہیں،
جلاکے خاک نہ کردوں، تو داغ نام نہیں،

(۲) شوخی اللہ رے حجاب بدگمانی تیری
بھیجی ہے مجھے نصف بدن کی تصویر

نوٹ :- حجاب، موجودہ زمانہ کی اصطلاح میں، آج سے نصف صدی پہلے کلکتہ کی مشہور "آرٹسٹ" تھی۔ رقص وسرود اور نغمہ وطاؤس کے علاوہ شعر بھی

کہتی تھی۔ داغ کی شاگرد تھی۔ سنہ ۱۸۸۳ء میں اُس نے اپنا بسٹ (Bust) اُستاد کو بھیجا تھا۔ اُس پر موصوف نے ایک رباعی لکھکر اُسے بھیجی تھی جسکا دوسرا شعر میں نے شوخی کی مثال میں لکھا ہے۔

(۳) جذبات نگاری، یعنی وارداتِ عشق کی تصویر کشی۔ مثلاً ؎

بُتانِ ماہوش اُجڑی ہوئی منزل میں رہتے ہیں
جسے برباد کرتے ہیں اُسی کے دل میں رہتے ہیں

(۴) دلکشی اور جاذبیت۔ مثلاً ؎

باغباں کلیاں ہوں ہلکے رنگ کی بھیجنا ہیں ایک کمسن کے لئے

حقیقت یہ ہے کہ ان چار خوبیوں کے لحاظ سے، جنکی طرف اقبال نے اپنی نظم میں نہایت بلیغ انداز میں اشارے کئے ہیں، داغ کا کلام اپنی جگہ بے مثل ہے چونکہ صفت دلکشی خود کئی صفات کا مجموعہ ہے۔ مثلاً جب تک زبان پر قدرت نہو، اندازِ بیان میں سلاست نہو، شوخی اور بانکپن نہو، روزمرہ اور محاورہ کی چاشنی نہو جذبات نگاری اور محاکات کی افراط نہو، رموز عاشقی کا بے پردہ اظہار نہو، معشوق سے چھیڑ چھاڑ نہو، بندش کی چستی نہو، الفاظ کا صحیح انتخاب نہو، رمز و کنایہ نہو، شعر میں دلکشی پیدا نہیں ہوسکتی۔ مثلاً یہ شعر:

نہ ہم سمجھے نہ تم آئے کہیں سے
پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے

اسلئے اسقدر دلکش ہے کہ اس میں بہت سی شاعرانہ خوبیاں بیک وقت جمع ہوگئی ہیں۔ افسوس ہے کہ میں بخوفِ طوالت اپنی اس شرح میں داغ کے محاسنِ کلام بیان نہیں کرسکتا۔ صرف انکی مختصر لائف لکھنے پر اکتفا کرتا ہوں:

نواب مرزا خاں داغ دہلوی، نواب شمس الدین خاں کے فرزند تھے۔ جو نواب لوہارو کے چھوٹے بھائی تھے۔ داغ کی ولادت سنہ ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء میں ہوئی۔ جب وہ چھ سال کے تھے تو یتیم ہوگئے۔ بزرگوں کے مشورہ سے داغ کی والدہ محترمہ نے مرزا فتح الملک الملقب بہ مرزا فخرو، ولیعہد بہادر شاہ ثانی سے عقد ثانی کرلیا۔ اسلئے داغ کی پرورش شاہی خاندان میں ہوئی۔ اور وہیں ان میں زبان پر وہ قدرت حاصل ہوئی جس نے اُن کے کلام کو غیر فانی بنادیا۔

اقبال نے بالکل سچ لکھا ہے ع اُٹھ گیا ناوک فگن مارےگا دل پر تیر کون؟ چونکہ شاعری، شاعری ہے نہ کہ فلسفہ یا منطق کے مسائل کو نظم کرنا۔ اسلئے "ناوک فگنی" میں بلاشبہ اس زمانہ کا کوئی شاعر، داغ کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ مثلاً، داغ کے اس معمولی سے شعر کا جواب اکثر دیوانوں میں نہیں نکل سکتا:-

لپٹ جاتے ہیں وہ بجلی کے ڈر سے
الٰہی! یہ گھٹا دو دن تو برسے

سنہ ۱۲۷۲ھ میں مرزا فخرو کا انتقال ہوگیا۔ اور سنہ ۱۲۷۴ھ / ۱۸۵۷ء میں لال قلعہ کا سہاگ اُجڑ گیا۔ جب داغ کے ہوش و حواس درست ہوئے تو تلاش معاش کی خاطر وطن کو خیرباد کہکر نکلے۔ کچھ عرصہ رامپور رہے۔ پھر وہاں سے دل اچاٹ ہوگیا۔ تو اِدھر اُدھر قسمت آزمائی کرتے رہے۔ جب پریشانی حد سے گزر گئی تو اجمیر کا رُخ کیا اور کسی کے آستانہ پر حاضر ہوکر، غلام گردش کے ستون سے لگ کر، نظم کے پردہ میں حالِ دل بیان کیا۔ سُننے والوں کا بیان ہے کہ جب داغ اپنی نظم پڑھ رہے تھے تو در و دیوار پر وجد کا عالم طاری تھا۔ خود بھی اشکبار تھے اور سامعین بھی بیقرار تھے۔ میں بخوف طوالت صرف ایک مصرع اس جگہ درج کرتا ہوں:- ع

کہ میں غریب ہوں، خواجہ مرا غریب نواز

دوسرے دن اجمیر ہی میں حیدرآباد دکن سے طلبی کا پروانہ ملا اور مدتوں کی آوارہ گردی کے بعد، کامیابی اور شادمانی کا دور شروع ہوا، جو تاوم وفات قائم رہا۔ میر محبوب علی خاں نظام دکن نے اپنا اُستاد بنایا۔ رامپور میں ۲۵ روپئے ماہوار ملتے تھے۔ یہاں پندرہ سو روپئے ماہوار مقرر ہوئے۔ جو شاگرد پچاس لاکھ روپئے کا ایک الماس خرید سکتا ہو۔ اگر اُس نے اپنے اُستاد کو مالامال کردیا ہو تو کیا تعجب ہے۔ سنہ ۱۹۰۵ء میں وفات پائی۔

نظم نمبر ۹۲

حلِ لغات اور شرحِ مشکلات | سیاہ پوش ہوا۔ کالی گھٹا کی رعایت سے سیاہ پوش کہا ہے + سرن۔ ایبٹ آباد کے مشرق میں پہاڑ کی چوٹی کا نام ہے جو ۷۴۴۳ فٹ بلند ہے + نہاں۔ پوشیدہ + رُخِ مہر۔ یعنی آفتاب + زیرِ دامنِ ابر۔ یعنی بادلوں میں + سوارِ توسنِ ابر یعنی بادلوں کے گھوڑے پر سوار ہوکر + میکدۂ بیخر دوش۔ چونکہ شراب نوشوں کی رائے میں کالی گھٹا، دعوتِ مے نوشی دیتی ہے اسلئے گھٹا کو خاموش شراب خانہ سے تعبیر کرنے میں بڑا معنوی لطف پیدا ہوگیا ہے + نشاطِ مدام۔ دائمی خوشی + قبائے گل میں گہر ٹانکنے کو آئی ہے۔ بہت دلکش انداز بیان ہے۔ شاعر نے مینہہ کی بوندوں کو گہر سے تعبیر کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ گلاب کے پھولوں پر سفید بوندیں ایسی معلوم ہوتی ہیں جیسے سُرخ قبا میں موتی لگے ہوئے ہوں + ہوا کے زور سے اُبھرا۔ اس مصرع میں اقبال نے گھٹا کے اُٹھنے اور گھر کر آنے اور پھر برسنے کی تصویر کھینچ دی ہے + کہسار کے نہال۔ کوہستانی درخت +

نوٹ:- اقبال سنہ ۱۹۰۴ء میں بغرض تفریح ایبٹ آباد گئے تھے۔ اور یہ نظم

اُنہوں نے اس جگہ بیٹھکر لکھی تھی، جہاں اب میونسپل کمیٹی کا باغ ہے۔ سرن کی چوٹی اس باغ کے عین مقابل نظر آتی ہے۔

نظم نمبر ۹۳

حلِ لغات اور شرحِ مشکلات | سرِ شام۔ شام کے وقت + مرغ نغمہ پیرا۔ گانے والا پرند مثلاً بلبل + نوا ریز۔ آواز یا موسیقی برسانے والا + منقار ہوس تیز کرنا، کنایہ ہے کہا جانے سے + پتنگوں کا طور ہوں۔ یعنی تمام کیڑوں میں میرا وجود، خدا کی قدرت کا کرشمہ ہے + میرے اندر خدا کا جلوہ نظر آتا ہے + بہشتِ گوش یعنی دلکش ہے + فردوسِ نظر۔ یعنی آنکھوں کو بھلی معلوم ہوتی ہے + ضیاء۔ روشنی + منقار۔ چونچ + مخالف ساز کا ہوتا نہیں سوز۔ واضح ہو کہ اقبال کے کلام میں یہ دو لفظ۔ سوز و ساز، بکثرت مستعمل ہیں۔ سوز، سوختن (جلنا) کا اور ساز، ساختن (بنانا یا ہم آہنگ کرنا) کا حاصل مصدر ہے۔ سوز، رنج و کلفت اور ساز، خوشی اور راحت کا مظہر ہے۔ سوز و ساز یہ کثیر المعانی لفظ ہیں۔ جگنو کی زندگی میں سوز کا اور مرغ نغمہ ریز کی زندگی میں ساز کا رنگ پایا جاتا ہے۔

جگنو نے اُس گانے والی چڑیا سے کہا کہ اے چڑیا! جس خدا نے تجھے موسیقی عطا فرمائی ہے۔ اُس نے مجھکو یہ چمک دمک عنایت کی ہے۔ میرے اندر سوز ہے، تیرے اندر ساز ہے۔ میں جل رہا ہوں (رنج و غم) تو گا رہا ہے (مسرت) یاد رکھ! سوز ساز کا مخالف نہیں ہوتا۔ بلکہ دوست اور رفیق ہوتا ہے۔ انہی دو چیزوں (حیاتِ انسانی کے دو پہلوؤں) سے یہ کائنات قائم ہے۔ سوز و ساز زندگی کی دو ایسی شاخیں ہیں جو ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتیں۔ یہ دنیا سوز و ساز

گی بدولت اسقدر دلکش ہے۔ اگر محض سوز ہوتا تو ہر شخص جینے سے تنگ آجاتا۔ اور اگر محض ساز ہوتا تو ترقی کا جذبہ پیدا نہوتا۔ سوز و ساز میں ایک مستقل ہم آہنگی ہے۔ مطابقت ہے۔ اور اسی مطابقت سے یہ دنیا اسقدر دلکش ہے۔

اقبال نے اس نظم میں اسی حقیقت کو واضح کیا ہے کہ سوز اور ساز، دونوں اپنی اپنی جگہ بہت ضروری ہیں۔ ان دونوں کی ہم آہنگی ہی سے دنیا میں دلکشی اور انسان میں ترقی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

نظم بر صـ ۹۴

حل لغات اور شرح مشکلات | طفلک پروانہ خو۔ وہ چھوٹا بچہ جس میں پروانہ کی سی عادت پائی جائے + خاک تیرہ کا فانوس۔ کنایہ ہے جسم خاکی سے + نور تیرا چھپ گیا زیر نقاب آگہی۔ یہ بہت بلیغ مصرع ہے۔ نور سے حقیقتِ انسانی مراد ہے۔ یعنی انسان اپنی اصل کے لحاظ سے مادی نہیں بلکہ نورانی ہے، اسکی روح ذرات مادی کی ترکیب کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ ایک جوہر نورانی ہے نقاب آگہی۔ آگہی سے مراد ہے شعور ذاتی۔ اس شعور ذاتی کی بدولت انسان مادی دنیا سے تعلقات پیدا کرتا ہے۔ اور رفتہ رفتہ ان تعلقات میں اُسے اسقدر انہماک ہوجاتا ہے کہ وہ اپنی حقیقت سے غافل ہوجاتا ہے۔ یعنی اُسے یہ نہیں یاد رہتا کہ مجھے اس دنیا میں خدا کے لئے جینا ہے اور انجام کار اُسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے (اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ) ان مطالب کو مد نظر رکھکر مصرع کا مطلب سمجھ میں آسکتا ہے کہ انفرادی شعور، انسان کو اپنی حقیقت سے غافل کر دیتا ہے۔ دوسرا مصرع پہلے مصرع کی مزید تشریح ہے کہ شعور کا حجاب دیدۂ بینا کے حق میں غبار بن جاتا ہے + دریائے بے پایان حسن۔ قدرت

حسن کا غیر محدود سمندر ہے + ہر قطرہ میں ہے طوفان جسن۔ یعنی ہر شئے میں خدا کی قدرت نظر آتی ہے + ضو گستری بمعنی نورپاشی۔ روشنی پھیلانا + شفق کی گلفروشی، مراد ہے اسکی سُرخی + ساکنانِ صحن گلشن سے طیور گلشن اور الحان مراد ہیں + گم گشتہ شئے کی ہے ہوس۔ کسی کھوئی ہوئی چیز کی تلاش ہے۔ گم گشتہ شئے سے حسنِ مطلق مراد ہے۔ یعنی ذاتِ خداوندی + ماہی بے آب۔ کنایہ ہے، بیقراری اور اضطراب سے +

تبصرہ | اس دلکش اور بلیغ نظم میں اقبال نے بچہ اور شمع کے پردہ میں اپنی جستجو اور تلاش کے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ خلاصہ یا بنیادی تصور اس نظم کا یہ ہے کہ روحِ انسانی، حسنِ مطلق کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ یہ کائنات سراپا حسن و جمال ہے۔ ہر شئے میں حسن موجود ہے۔ اور یہ حسن و جمال، کسی ایسی ذات کا پرتو ہے جو منبعِ حسن ہے۔ یعنی حسن مطلق ہے۔ پس انسانی روح فطری طور پر اُسی حسن مطلق کو حاصل کرنا چاہتی ہے۔ یہ تصور اقبال کے نظام افکار میں بنیادی مرتبہ رکھتا ہے۔ اور اس نکتہ کو انہوں نے اپنی تمام تصانیف میں مختلف طریقوں سے بیان کیا ہے۔ مثلاً زبور عجم میں لکھتے ہیں ؎

گرفتم اینکہ جہاں خاک وما کفِ خاکیم
بہ ذرّہ ذرّۂ ما دردِ جستجو ز کجاست

یعنی ہمنے مان لیا کہ یہ دنیا بھی مادی ہے، اور ہم بھی مادی ہیں لیکن ہمارے اندر کسی کو تلاش کا جذبہ کہاں سے آگیا؟

نظم کا مطلب | اقبال چھوٹے بچے سے خطاب کرتے ہیں کہ تو شمع کو حیران ہو کر، گھڑیوں کیوں دیکھتا رہتا ہے؟ کیا تو روشنی کو اپنی آغوش میں لینا چاہتا ہے؟ تیرے اس انداز سے مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تو دنیا میں آنے سے پہلے اس

چیز کو دیکھ چکا ہے۔ لیکن میں تجھے بتانا چاہتا ہوں کہ شمع تو نار ہے اور تو نور ہے۔ خدا نے اُسے عریاں کرکے دنیا میں بھیجا ہے اور تجھکو یعنی تیرے نور کو جسم خاکی میں پوشیدہ کر دیا ہے۔ چونکہ تیرے اندر ذاتی شعور بھی ہے۔ اسلئے اُسنے تجھے اپنی حقیقت سے غافل کر دیا۔ پس میں کہہ سکتا ہوں کہ انسان کی زندگی، فراموشی، خواب، غفلت، سرمستی اور بے ہوشی سے عبارت ہے۔ کیونکہ مادی اور دنیاوی تعلقات میں شدید انہماک کی بدولت وہ اپنی اصلیت سے غافل ہوگیا ہے۔ اسکا فرض منصبی یہ ہے کہ وہ اپنے رب کی معرفت حاصل کرے۔ اور معرفت کے حصول کی شرط اطاعت ہے۔ لیکن انسان، دنیا میں مستغرق ہوکر اپنے فرض کو بھلا دیتا ہے۔ اور کائنات میں خدا کو تلاش کرنے کے بجائے، زن زر اور زمین کی جستجو کرتا رہتا ہے۔

اسکے بعد شاعر ہمیں اس حقیقت سے آگاہ کرتا ہے کہ اگر انسان، اس کائنات کا بغور مطالعہ کرے تو اسے ہر شئے میں حسن کی جھلک نظر آئیگی۔ محفل قدرت یعنی یہ کائنات، دراصل حسن و جمال کا ایک سمندر ہے (اقبال نے اس بند میں عورت کے حسن کا ذکر اسلئے نہیں کیا کہ وہ ہر شخص کو نظر آتا ہے) مثلاً کوہستان کی ہیبتناک خاموشی، آفتاب کی نورپاشی، رات کی سیاہی، صبح کی روشنی، شفق کی سرخی، آثار قدیمہ یعنی پرانے کھنڈر، بچہ کی کوشش گفتگو، پھول کی مہک، غنچہ کی چٹک، بلبل کی چہک، کہسار کی ندی، سورج کی کرن، ماہ کامل کی چاندنی، شبنم کی روانی غرضکہ ہر شئے سے حسن کی شعاعیں پھوٹ پڑتی ہیں۔

آخر میں شاعر یہ نکتہ بیان کرتا ہے کہ اگر یہ کائنات حسین ہے تو اسکی وجہ یہ ہے کہ اسکا بنانے والا منبعِ حسن ہے، حسن مطلق ہے، سراپا حسن ہے۔ اسی لئے روح انسانی اس ذات پاک کی تلاش میں مضطرب ہے۔ روح انسانی ان

حسین مناظر سے مطمئن نہیں ہوتی، بلکہ وہ ان کے سرچشمہ سے ملنا چاہتی ہے۔

نظم بر صـ ۹۶

حلّ لغات اور شرح مشکلات | سکوتِ شام۔ شام کے وقت فضا میں خاموشی پیدا ہوجاتی ہے شور و غل کے بند ہوجانے سے + محوِ سرود ہے۔ گانے میں محو ہے۔ شاعر نے دریا کے بہنے کو نغمہ سرائی سے تعبیر کیا ہے + یہ زیر و بم سجدہ کا پیام ہے یعنی دریا کی روانی کو دیکھکر میرے دل میں خدا کی ہستی کا یقین پیدا ہوگیا، اسلئے اسکے حضور میں سر جھکانے کو جی چاہتا ہے + زیر و بم موسیقی کی اصطلاح ہے۔ زیر، نیچی آواز یا نیچے سروں کو کہتے ہیں۔ اور بم اونچے سروں کو + جہاں تمام سواد حرام ہوگیا۔ یعنی مجھے ساری دنیا مسجد نظر آنے لگی۔ یعنی ساری دنیا میں خدا کی ہستی جلوہ گر نظر آنے لگی + خبر نہیں مجھے ...... یعنی مجھ پر ایک عالم محویت طاری ہے + شراب سُرخ کنایہ ہے شفق سے جو سُرخ ہوتی ہے + لئے ہے پیر فلک۔ یعنی جب میں شفق کو دیکھتا ہوں تو یہ محسوس ہوتا ہے گویا کوئی بوڑھا آدمی، اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں سرخ شراب کا پیالہ لئے ہوئے ہے۔ پیر فلک کی رعایت سے "رعشہ دار" کی ترکیب لائے ہیں۔ یہ مصرع استعارہ بالکنایہ کی نہایت دلکش مثال ہے۔ عدم کو قافلۂ روز تیز گام چلا۔ تیز گام۔ تیزی سے قدم اُٹھانے والا۔ یعنی دن ختم ہوا چاہتا ہے + عظمت فزائے تنہائی۔ تنہائی کی شان بڑھانے والے۔ صفت ہے مقبرۂ جہانگیر کے میناروں کی + خوابگہِ شہسوارِ جغتائی، یعنی مقبرۂ جہانگیر + محل بمعنی مقام یا جگہ + "فسانۂ ستم انقلاب ہے یہ محل"۔ اس مصرع میں اقبال نے رمز و ایما سے کام لیکر ہندی مسلمانوں کی داستان قلمبند کر دی ہے۔ یعنی یہ کنارِ راوی، اور یہ مقبرۂ جہانگیر، دراصل

مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کے نشانات ہیں + زمانہ سلف بمعنی گذرا ہوا زمانہ یا ازمنۂ سابقہ + سرودِ خموش - ایسا نغمہ جسکو دل کے کان سن سکیں + انجمن بے خروش سے درخول کی کثرت مراد ہے - لیکن اس انجمن کی خصوصیت یہ ہے کہ اسکے افراد گفتگو نہیں کرتے بسرودِ خموش اور انجمن بے خروش، شاعر کی قوت تخئیل کی کرشمہ سازیاں ہیں - سفینہ بمعنی کشتی + گرمِ ستیز ہے - ملاح موجوں سے جنگ کر رہا ہے - ستیز بمعنی لڑائی + سبک روی - تیز روی + جہازِ زندگیٔ آدمی - یعنی انسان کی زندگی بھی اسی طرح تیزی کے ساتھ مسافت مرحلے کرتی چلی جاتی ہے + ابد کے بحر سے زمانہ مراد ہے - جسکو اقبالؔ نے سمندر سے تشبیہ دی ہے + جس طرح کشتی دور جاکر نگاہ سے چھپ جاتی ہے لیکن فنا نہیں ہوتی - اسی طرح انسان بھی نظر سے چھپتا ہے - لیکن فنا نہیں ہوتا - یعنی انسان کی روح ابدی ہے -

تبصرہ | اس نظم کا انداز ورڈسورتھ اور برا ؤننگ کی شاعری سے بہت مشابہ ہے - یوں تو یہ نظم آسان ہے لیکن اس میں معنوی خوبیاں بہت پائی جاتی ہیں - مثلاً پوری نظم شاعرانہ مصوری کی بہت دلکش مثال ہے - (۲) استعارات اور تشبیہات رمز اور کنایہ اور ایمائی اثر آفرینی کے نادر نمونے اس میں موجود ہیں - (۳) یہ رنگ بالِ جبریل میں اپنے کمال کو پہونچ گیا ہے - (دیکھو مسجد قرطبہ) (۴) میناروں کی طرف اشارہ کرکے اقبالؔ نے ہمارے ذہن کو مسلمانوں کی عظمتِ ماضیہ کی طرف بڑی خوبصورتی کے ساتھ منتقل کر دیا - میناروں کے ساتھ مسلمانوں کے عروج کا نقشہ بھی ہماری نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے - اور انسان کی توجہ میناروں کی بجائے گذشتہ زمانہ کی تاریخ پر مبذول ہوجاتی ہے - اسکا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان کو خبر نہیں رہتی کہ وہ کہاں کھڑا ہوا ہے (۵) آخری بند میں اقبالؔ نے کشتی کی روانی سے، انسانی عمر کی روانی کی طرف اشارہ کیا ہے اور ایک زبردست اخلاقی سبق اپنے ناظرین کو پڑھایا ہے - کہ انسان ایک حقیقتِ ابدی ہے - موت، انسان کو ہماری نظروں سے پوشیدہ

کر دیتی ہے - لیکن فنا نہیں کرتی - نیز دنیا کی کوئی طاقت حتیٰ کہ موت بھی، انسان کو شکست نہیں دے سکتی - انسان کا انجام شکست یا فنا نہیں ہے - جیسا کہ بعض "ترقی پسند" سمجھتے ہیں، بلکہ اگر وہ گرتا ہے تو پھر ابھرنے کے لئے - پس انسان کو موت سے گھبرانا نہیں چاہئے - خلاصہ کلام یہ ہے کہ یہ نظم ہمارے لئے اُمید اور رجائیت کا پیغام ہے -

نظم بر صفحہ ۹۷

حلِ لغات اور شرح مشکلات | جناب بمعنی درگاہ + ستارے عشق کے تیری کشش سے ہیں قائم - سبحان اللہ! کیا بلیغ مصرع ہے - یعنی تیری شخصیت مرکز عشق الٰہی ہے - اگر تو نہ ہوتا تو، نظام عاشقی تہ و بالا ہوجاتا - تیرے دم سے عشق الٰہی کا سلسلہ قائم ہے + نظامِ مہر کی صورت نظام ہے تیرا، کس قدر بلیغ مصرع ہے لفظ "نظام" میں صنعتِ ایہام ہے - کیونکہ حضرت اقدسؒ کا نام بھی نظام الدینؒ ہے - (۱) آپ کی ذات سے عاشقی کا نظام قائم ہے - (۲) آپ نے ہندوستان میں تبلیغ اسلام کے لئے جو نظام قائم کیا تھا اسکی طرف بھی ضمناً اشارہ ہے (۳) عاشقانِ الٰہی کی جماعت میں آپ کا وہی مرتبہ ہے جو آفتاب کا نظام شمسی میں ہے + لحد سے مزار مبارک مراد ہے - "زندگی دل کی" یعنی بزرگانِ دین اور عاشقانِ رسولؐ کے مزارات کی زیارت سے دل زندہ ہوجاتا ہے -

واضح ہو کہ اقبالؔ نے اس نظم میں جس قسم کے خیالات ظاہر کئے ہیں وہ نیچری معتزلی، عقل پرست، ظاہر بیں، فلسفی، نجدی، اور وہابی ٹائپ کے مسلمانوں کی سمجھ میں نہیں آ سکتے - مثلاً ایک نیچری یا وہابی ٹائپ کا مسلمان یہ سوال کرسکتا ہے کہ صاحب! قبروں کی زیارت سے "دل" کس طرح زندہ ہو سکتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ صاحب!

(۱) انسان، مع الجسد العنصری (اس مادی جسم کے ساتھ) آسمان پر کیسے جا سکتا ہے؟ (آنحضرت صلعم)
(۲) انسان، مردہ کو کس طرح زندہ کر سکتا ہے؟ (حضرت عیسیٰؑ)
(۳) انسان، فرشتوں سے کس طرح ہمکلام ہو سکتا ہے؟ (انبیاء)
(۴) انسان، دریائے نیل کو خط کس طرح لکھ سکتا ہے؟ (فاروق اعظمؓ)
(۵) انسان، خدا سے کس طرح ہمکلام ہو سکتا ہے؟ (حضرت موسیٰؑ)
(۶) تکلم بغیر واسطہ، خلاف عقل ہے، پس قرآن کس طرح کلام الٰہی ہو سکتا ہے؟ یعنی زبان کے بغیر، خدا نے اپنا کلام، جبرئیل کو کیسے سُنا دیا؟
(۷) نفس ناطقہ، جسم میں کسی جگہ نہیں ہے، تو وہ مدبرِ جسم کیسے ہے؟
(۸) سارے عقل پرست مسلمانوں کو چیلنج ہے کہ وہ مل کر اس سوال کا جواب دیں کہ خدا قدیم ہے اور روح حادث ہے، تو قدیم سے حادث کا صدور کس طرح ہو سکا؟ یہ تو عقل کے خلاف ہے کہ واحد سے کثرت یا قدیم سے حادث، سرزد یا صادر ہو سکے - پس حادث روح، قدیم خدا سے کیسے سرزد ہوئی؟ بالفاظِ دگر ربطِ حادث بالقدیم کی عقلی توجیہہ پیش کریں -
(۹) نیچری اور عقل پرست مسلمان مجھے بتائیں کہ خدا کی ذات کا اسکی صفات سے کیا علاقہ ہے؟ اگر صفات عینِ ذات ہیں تو قرآن، خدا کو سمیع کیوں کہتا ہے؟ سمع کہنا چاہئے تھا، اور اگر غیرِ ذات ہیں تو تعددِ قدما لازم آگیا -
(۱۰) اللہ متشخص ہے یا غیر متشخص؟ اگر وہ متشخص ہے تو محدود ہوگیا - اور اگر غیر متشخص ہے تو وہ قرآن میں اپنے لئے "میں" اور "ہم" کا لفظ کیوں استعمال کرتا ہے؟

جب عقل پرست مسلمان، میرے ان دس سوالات کا یا ان میں سے نصف ہی کا جواب دیدینگے تو میں بھی اُن کو بتا دونگا کہ یا سمجھا دونگا کہ بزرگانِ دین کی

قبروں کی زیارت سے "دل" کیسے زندہ ہوجاتا ہے -

حقیقت یہ ہے کہ اگر ایک مسلمان، یہ کہتا ہے کہ: بزرگانِ دین کی قبور کی زیارت سے دل کا زندہ ہوجانا، عقل کے خلاف ہے تو وہ نادانستہ طور پر ایسی مصیبت مول لے لیتا ہے جس سے قیامت تک مفر نہیں ہے - یعنی ہم اُس سے یہ کہتے ہیں کہ بندۂ خدا! اگر یہ اُصول صحیح ہے کہ جو بات عقل میں نہ آئے، یا عقل کے خلاف ہو اُسے قبول نہیں کرنا چاہئے - تو خدا بھی تو عقل میں نہیں آتا، بلکہ اُسکا وجود ہی عقل کے خلاف ہے - اسلئے عقل پرست مسلمان اگر واقعی مخلص ہے تو اُسے سب سے پہلے خدا کا انکار کرنا چاہئے - انکے بعد ملائکہ کا، اسکے بعد وحی کا، اسکے بعد روح کا، اور اسکے بعد حیات بعد الموت کا، کیونکہ یہ ساری باتیں عقل کے خلاف ہیں -

نہاں ہے تیری محبت میں رنگ محبوبی - یعنی تو نے ایسے خلوص کے ساتھ اللہ کی محبت اختیار کی کہ اللہ نے تجھے اپنا "محبوب" بنا لیا - یہ اشارہ ہے حضرت کے لقب "محبوب الٰہی" کی طرف - واضح ہو کہ یہ لقب تفسیر ہے اس آیت مبارکہ کی "اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ" اے مسلمانو! اگر تم اللہ سے محبت کرنا چاہتے ہو تو اسکی بہترین صورت یہ ہے کہ میری (رسولؐ) کی اتباع کرو - اس اتباع کا ثمرہ یہ ملیگا کہ خود اللہ تمہیں اپنا محبوب بنالے گا" اس آیت سے معلوم ہوا کہ "محبوب الٰہی بننے کا طریقہ "عقل" نہیں ہے، بلکہ "عشق" ہے - اور حضرت محبوب الٰہی سلطان نظام الدین اولیاءؒ نے عشق ہی کا طریقہ اختیار کیا تھا جو انسان کو اللہ سے ملا دیتا ہے - ع

اگرسیاہ دلم داغِ لالہ زار توام

اگر میں گنہ گار اور خطا کار ہوں تو بھی آپ ہی کا غلام ہوں، اور اگر نیک نہاد

اور نکو کار رہوں تو بھی آپ ہی کا پروردہ ہوں۔
نکہتِ گل۔ پھول کی خوشبو + ہوا ہے صبر کا منظور امتحاں مجھکو۔ یہ کس قدر دلکش اسلوب بیان ہے! مطلب یہ ہے کہ میں کئی سال تک اپنے والدین سے دور، ممالک غیر میں زندگی بسر کروں گا۔ اور اسکے لئے بہت صبر کی ضرورت ہے + نگارخانہ۔ تصویر کدہ + درختِ صحرا ہوں۔ یعنی کسی دولتمند باپ کا فرزند نہیں ہوں + فلک نشیں صفت مہر ہوں۔ یعنی آپ میرے حق میں اللہ سے یہ دعا کیجئے کہ میں آفتاب کی طرح منور، مشہور اور اونچا ہو جاؤں + نردباں۔ سیڑھی + سمجھے منزل مقصود کارواں مجھکو۔ یعنی قوم کے افراد مجھے اپنی منزل مقصود سمجھنے لگیں۔ یہ بڑا بلیغ مصرع ہے۔ اور عجیب بات ہے کہ جو دعا اس فقرہ میں مضمر ہے وہ بجنسہٖ قبول ہو گئی۔ آج ہر پاکستانی اقبالؔ کو اپنی "منزل مقصود" ہی سمجھتا ہے۔ الاماشاءاللہ + تری جناب سے ایسی ملے فغاں مجھکو۔ بڑا بلیغ مصرع ہے۔ یعنی آپ دعا کریں کہ اللہ میرے کلام میں ایسی تاثیر پیدا کر دے کہ پڑھنے والوں کا دل پگھل جائے + آشیاں۔ کنایہ ہے وطن مالوف سے + پھر آ رکھوں" یہ ترکیب غیر فصیح ہے۔ مطلب ہے۔ پھر واپس آ کر رکھوں + ساری بانگ درا میں اگر ایک جملہ غیر فصیح ہو تو اس سے شاعر کی قدرتِ کلام پر حرف نہیں آ سکتا۔ غالبؔ کے کلام میں بھی ایک جگہ ایک غیر فصیح ترکیب موجود ہے۔ ع۔ بھئوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہئیے۔" بھئوں پاس" یہ ترکیب غیر فصیح ہے۔ اور کانوں کو نہایت گراں گذرتی ہے۔ شمع بارگہ خاندانِ مرتضوی۔ مراد ہے شمس العلما مولانا میر حسن صاحب سیالکوٹی مرحوم و مغفور۔ جس کے نفس سے میری کلی کھلی یعنی جس کے فیض صحبت نے مجھے انسان بنا دیا۔ نفس سے مراد ہے تربیت + مُروّت۔ یہ کثیر المعانی لفظ ہے اور بہت سی عمدہ خوبیوں کا جامع ہے۔ مراد ہے نوازش یا احسانِ عظیم + نکتہ داں مراد ہے سخن فہم اور رطباع + یوسف ثانی۔ کنایہ ہے بڑے بھائی شیخ عطا محمد سے،

جنہوں نے علامہ مرحوم کی اعلیٰ تعلیم کا خرچ برداشت کیا، اور اُن کو اپنی اولاد سے زیادہ سمجھا، چنانچہ اقبالؔ نے خود اگلے شعر میں اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے ع ہوئے عیش میں پالا کیا جواں مجھکو، جلا کے جسکی محبت نے دفتر من و تو۔ یعنی میرے بڑے بھائی نے مجھ سے اس طرح محبت کی کہ غیریت کا احساس مٹ گیا۔ یعنی اُنہوں نے مجھپر اس طرح اپنا روپیہ صرف کیا، جس طرح کوئی اپنی ذات پر صرف کرتا۔ اُنہوں نے اپنی ذات اور مجھ میں کوئی مغائرت نہیں سمجھی۔ یہ معنیٰ ہیں اس ترکیب کے کہ "من و تو کا دفتر جلا دیا" + سیاہِ دہر۔ مراد ہے دنیا + خنداں۔ مراد ہے خوش و خرّم + عزیز تر از جاں۔ وہ جانِ جاں مجھکو۔ ادبی اعتبار سے بہت حسین مصرع ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں بھی اُسے اپنی جان کی برابر سمجھتا ہوں +

نوٹ :۔ یہ مبالغہ نہیں ہے۔ میں بھی اپنے ذاتی مشاہدہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ علامہ اقبالؔ کو اللہ نے بہت احسان مند دل دیا تھا۔ اگر کوئی شخص ان کے ساتھ ذرا سی مہربانی بھی کر دیتا تھا تو وہ اُسے ہمیشہ یاد رکھتے تھے۔

تبصرہ ۵ | علامہ اقبالؔ یکم ستمبر ۱۹۰۵ء کو لاہور سے روانہ ہوئے اور ۲ ستمبر کو حضرت محبوب الٰہیؒ کے آستانہ عالیہ پر حاضر ہو کر یہ دلآویز نظم، بڑے ادب، اور بڑی عقیدت کے ساتھ، حضرت اقدسؒ کے حضور میں پڑھکر سُنائی۔ اقبالؔ کی کتنی خوش نصیبی ہے کہ حضرت کے وسیلہ سے اللہ نے اقبالؔ کی سب دعائیں قبول کر لیں۔ اقبالؔ اس عہد کے مسلمانوں سے اسقدر آگے ہے کہ جو لوگ "مفکر" اور "متکلم" کے لقب سے مشہور ہیں وہ اسکے کلام کو سمجھ بھی نہیں سکتے۔

اقبالؔ کو بدو شعور سے، بزرگان دین کے ساتھ ایک غیر معمولی عقیدت تھی۔ جو آخر وقت تک قائم رہی۔ اور مجھے اقبالؔ سے جو اسقدر محبت ہے اسکا سبب صرف یہ ہے کہ انہیں بزرگان دین سے عقیدت تھی۔ ورنہ شاعری کے لحاظ سے غالبؔ تو

بیدلؔ اُن سے بڑھے ہوئے ہیں۔ جس بات نے مجھے اقبالؔ کا گرویدہ بنا دیا وہ یہ ہے کہ اُس نے مجھے عشق رسولؐ کی اہمیت اور قدر و قیمت سے آگاہ کر دیا۔ یہ بات نہ شمس بازغہ سے حاصل ہوئی، نہ صدرا سے نہ میبذی سے اور نہ شرح ہدایۃ الحکمۃ سے۔

حضرت محبوب الٰہی سے سیدی و مولائی حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الحق والدین اولیا محبوب الٰہی مراد ہیں، جن کی زندگی سے اقبالؔ کو آئیڈیل مومن کا تصور حاصل ہو سکا۔ مرحوم نے ساری عمر مسلمانوں کو یہی پیغام دیا کہ اپنے اندر شانِ فقر پیدا کرو۔ اور حضرت محبوب الٰہی شان فقر کے بہترین مظہر ہیں۔ لیکن ان میں یہ شان، مرشد کی صحبت میں بیٹھنے اور عشق رسولؐ اختیار کرنے سے پیدا ہوئی تھی۔ اسلئے اقبالؔ ہمیں بھی ان دونوں کو اختیار کرنے کی تلقین کی ہے۔ عجیب بات ہے کہ اس ملک کے مدعیانِ اصلاح، نیچری، معتزلی، عقل پرست، اہل قرآن، اہل حدیث، پیروانِ باطل، نجدی اور وہابی۔ "یہ سب اسلامی جماعتیں" انہی دو باتوں کی منکر ہیں لیکن اقبالؔ علیٰ رؤس الاشہاد یہ تلقین کرتے ہیں کہ :۔

طبع مسلم از محبت قاہر است ؛ مسلم ار عاشق نباشد کافر است

یعنی جو مسلمان عاشقِ رسولؐ نہ ہو وہ کافر ہے۔ یعنی مسلمان بننے کے لئے عشق رسولؐ شرط ہے اور یہ دولت سرمدی، موقوف ہے صحبت مرشد پر۔ اسی لئے اقبالؔ نے لکھا ہے

صحبت از علم کتابی خوشتر است
صحبتِ مردانِ حُر، آدم گر است

آخر میں اپنے مرشد کے مختصر سوانح حیات درج کر کے اس کتاب کو اپنی نگاہ میں قیمتی بنانا چاہتا ہوں۔ حضرت موصوف ۶۳۴ھ ؍ ۱۲۳۶ء میں بمقام بدایون (یوپی) پیدا ہوئے۔ والدین نے آپ کا نام محمد رکھا۔ آپ حسینی سید ہیں۔ جب بدایون میں حضرت کی دستار بندی ہوئی، تو بعض بزرگوں نے یہ پیشگوئی کی کہ اس لڑکے کا

سر کسی انسان کے آگے نہیں جھکے گا۔ مزید تعلیم کے لئے دہلی تشریف لے گئے۔ یہاں شیخ العالم حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ کے چھوٹے بھائی سے مل کر، دل میں اجودھن (پاک پٹن) کی لگن پیدا ہو گئی۔ اور ایک دن نماز فجر کے بعد پیادہ پا دلّی سے چل کھڑے ہوئے۔ جب اجودھن پہونچے تو فوراً حضرت کی زیارت کے لئے مسجد میں حاضر ہوئے محبوب نے عاشق کو دیکھکر فوراً اپنا دل نچھاور کر دیا۔ یعنی حضرت باوا صاحب نے اپنے عاشق کو دیکھکر یہ شعر پڑھا :۔

اے آتش فراقت دلہا کباب کردہ
سیلاب اشتیاقت جانہا خراب کردہ

خوشا نصیب اُس مرید کے، جس کا پیر خود اُس پر عاشق ہو جائے۔ ناظرین خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ اگر معشوق خود ہی عاشق پر عاشق ہو جائے تو عاشق کا کیا حال ہوگا۔ قصہ مختصر اجودھن سے سلطان السلاطین اور محبوب الٰہی کا لقب حاصل کر کے مرشد کے حکم سے دلی کو اپنی تبلیغی سرگرمیوں کا مرکز بنایا اور ۶۵۶ھ سے ۷۲۵ھ تک، یعنی تقریباً ستر سال تک آپ کی ذات اسلام اور مسلمانوں کے لئے، ایک عظیم الشان چشمہ فیض بنی رہی۔ آپ نے ہزاروں غیر مسلموں کو اسلام میں داخل کیا، اور ہزاروں مسلمانوں کو مبلغ اسلام بنا کر ہندوستان کے طول و عرض میں بھیجا۔ اور سیکڑوں مسلمانوں کو اپنی نگاہ سے مومن بنا دیا۔ جن کے سرتاج میرے روحانی مرشد حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلیؒ ہیں۔ جو حضرت کی وفات کے بعد ۷۲۵ھ میں مسند خلافت پر متمکن ہوئے۔ حضرت محبوب الٰہیؒ نے ایک چھوڑ سات بادشاہوں کا زمانہ دیکھا۔ لیکن مدۃ العمر دربار میں جانا تو درکنار، حضرت نے کسی بادشاہ کو اپنے دربار میں بھی حاضری کی اجازت نہیں دی۔ محبوب الٰہی ہونا آسان تو نہیں ہے۔

غزلیات

پہلی غزل ص۱۰۱

گزارِ ہست و بود - مراد ہے دنیا + بیگانہ وار - بیگانوں یا غیروں کی طرح سے یعنی
اس دنیا کو غور سے دیکھ + مثالِ شرار - یعنی مدتِ عمر بہت تھوڑی ہے + دم دے نہ جائے
یعنی دھوکہ نہ دے جائے - یہ محاورہ اقبالؔ نے اپنے اُستاد سے سیکھا تھا ؎

بدگمانی کی بھی حد ہے کوئی ، اللہ غنی !
میرا دم دینا ، سمجھتے ہیں وہ دم دینے کو

مانا ، بمعنی مجھے تسلیم ہے + تیری دید کے قابل نہیں ہوں - یعنی میں ایک گدائے بے نوا
ہوں ، تو خالقِ کون و مکاں ہے - اسلئے مجھے تجھ سے کوئی نسبت نہیں ہے - لیکن تو اس حقیقت
کو مدنظر رکھ کہ میری محبت کسقدر پاکیزہ ، کسقدر سچی ، اور کسقدر شدید ہے -
ہر رہگذر میں نقش کفِ پائے یار دیکھ - اس میں بھی تصوف کا رنگ ہے - یعنی
اگر تو غور و فکر سے کام لے تو ہر شئے میں تجھے خدا کا جلوہ نظر آسکتا ہے -
دوسری اور تیسری غزل میں کوئی مشکل لفظ نہیں ہے

چوتھی غزل بر ص۱۰۲

حلّ لغات | لاؤں وہ تنکے کہاں سے آشیانہ کے لئے الخ - بڑا بلند مطلع ہے
چونکہ معشوق کی راہ میں اپنی ہستی کو فنا کر دینا ، عاشقی کا کمال ہے - اسلئے اس مطلع
میں شاعر نے یہ آرزو ظاہر کی ہے کہ میں اُن تنکوں سے آشیانہ بنانا چاہتا ہوں ، جن میں
جل جانے کی صلاحیت ہو ، یعنی ایسی زندگی بسر کرنی چاہتا ہوں جس کا انجام معشوق

کی راہ میں فنا ہو جانا ہو - فی البحر عاشق ، مر مٹنے کے لئے آمادہ ہے - اس شعر کی سار
دلکشی اسکے اسلوب بیان میں پوشیدہ ہے ورنہ کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں ہے
ہفتاد و دو ملت - یعنی بہتر مذاہب یا فرقے - اس ترکیب میں اشارہ ہے ایک حدیث
کی طرف کہ حضور نے فرمایا کہ کچھ عرصہ کے بعد میری امت بہتر یا تہتر فرقوں میں منقسم
ہو جائیگی ، جن میں سے ایک ناجی ہوگا ، اور باقی سب ناری - پس ہفتاد و دو ملت
سے یہاں دنیا کے مختلف مذاہب مراد ہیں + لوٹ جائے یعنی بیتاب ہو جائے +
پاس تھا ناکامیٔ صیاد کا اے ہمصفیر - یہ شعر مضمون آفرینی کی عمدہ مثال ہے -
شاعر کہتا ہے کہ اے ہمدم ! اگر میں دام میں گرفتار ہو گیا تو اسلئے نہیں کہ میں دانہ
کا بھوکا تھا ، بلکہ اسلئے کہ مجھے صیاد (معشوق) کی خاطر منظور تھی - اگر میں گرفتار
نہ ہوتا تو اُسے اپنی ناکامی پر ملال ہوتا - اور میں چونکہ اس پر عاشق ہوں - اسلئے
اسکے ملال کی تاب نہیں لا سکتا - ہمصفیر ، بمعنی دوست ، ہم آواز ، ہم جنس + ایک دانہ
میں "ایک" شمار کے لئے نہیں ہے بلکہ تحقیر کے لئے ہے - ایک دانہ سے مراد ہے "چند دانوں
کے لئے" + اس چمن سے ہندستان مراد ہے + مُرغِ دل سے محبِّ وطن مراد ہے +
واضح ہو کہ اس غزل میں مقطع بھی تھا ، جسے اقبالؔ نے خارج کر دیا - میں اسے ذیل میں
درج کئے دیتا ہوں :-

ترک کر دی تھی غزل خوانی ، مگر اقبالؔ نے
یہ غزل لکھی ہمالیوں کو سُنانے کے لئے

پانچویں غزل بر ص۱۰۲

پہلا شعر :- مطلب یہ ہے کہ دنیا میں آنے سے پہلے ، انسان کی روح عالم قدس
میں رہتی تھی - یا حضرت آدم جنت میں رہتے تھے - لیکن اُنہوں نے ایک غلطی کی

جس کی پاداش میں اُن کو جنت سے نکلنا پڑا - اور وہ دنیا میں آگئے - یہاں آکر ان کی
اولاد دنیا کی دلفریبیوں میں گرفتار ہو گئی - ہوا - بمعنی حرص و طمع -
دوسرا شعر :- اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگرچہ انسان بہت کمزور ہے
لیکن اسکے باوجود اُسے اللہ نے اپنا خلیفہ بنایا ہے - خلعتِ شرافت سے مراد ہے ،
انسان کا اشرف المخلوقات ہونا +
تیسرا شعر :- اس شعر میں حضرت موسیٰؑ کے مشہور واقعہ کی طرف اشارہ ہے - کہ
اُنہوں نے اللہ سے دیدار کی درخواست کی تھی - چنانچہ طور پر اللہ نے اپنی تجلی فرمائی
طور جل گیا اور حضرت موسیٰؑ بیہوش ہو کر گر پڑے +
چوتھا شعر :- مطلب یہ ہے کہ انسان کسی حال میں بھی طلب کے جذبہ سے خالی نہیں
ہو سکتا - مثلاً اگر وہ یہ دعا کرے کہ اے خدا میرے دل کو طلب سے پاک کر دے تو یہ بھی
درپردہ طلب ہی ہے - پس انسان کا دل ، دامِ تمنا سے رہا نہیں ہو سکتا +
پانچواں شعر :- یہ شعر مضمون آفرینی کی عمدہ مثال ہے - کہتے ہیں کہ جو لوگ تیرے سچے
عاشق ہیں وہ تو تجھے اس دنیا میں بھی دیکھ لیتے ہیں ، لہذا اُن کے لئے حشر میں دیدار
کا وعدہ ، صبر آزما (تکلیف دہ) نہیں ہو سکتا -
چھٹا شعر :- اس میں تصوّف کا رنگ ہے - کہتے ہیں کہ خدا تو پردوں میں پوشیدہ تھا
وہ عیاں کیسے ہو گیا ؟ جواب دیتے ہیں کہ چونکہ کمال کا ذاتی تقاضا اظہار ہے ، اور
خدا منبعِ کمال ہے ، اسلئے اسکا حُسنِ کامل ، اسکی بے حجابی کا سبب بن گیا -
ساتواں شعر :- معالج کہتا ہے کہ دردِ فراق ، لا دوا ہے - اسپر اقبالؔ دردِ فراق
کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ چارہ گر دیوانہ ہے - جب تمام علاج بیکار ہو جائیں گے تو میں
موت کا نسخہ استعمال کرونگا - یہ شاعرانہ اندازِ بیان ہے اس حقیقت کے اظہار کرنے
کہ عاشق مر کر زندۂ جاوید ہو جاتا ہے +

آٹھواں شعر :- اس شعر میں اقبالؔ نے ہماری توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کی
ہے کہ گُل ، اللہ کی ہستی پر شاہد ہے - ورنہ بے شعور مادہ ، گل میں یہ خوبی کس طرح
پیدا کر دیتا ؟ اس میں یہ رنگت اور یہ خوبصورتی کیسے پیدا ہو جاتی ؟
نواں اور دسواں شعر :- اس میں خالص رنگ تغزل ہے - اور مطلب واضح ہے -

چھٹی غزل بر ص۱۰۳

حلّ لغات | سوزن - سوئی + خانماں برباد - وہ شخص جسکا گھر برباد ہو گیا
ہو + رفیقِ راہ منزل سے انسان مراد ہے جسکی زندگی شرر کی طرح عارضی ہوتی
ہے - اس شعر میں اقبالؔ نے انسان کی بے ثباتی کا نقشہ کھینچا ہے +

ساتویں غزل بر ص۱۰۵

حلّ لغات اور شرح مشکلات | دیدۂ دل وا کرے کوئی - کائنات کی حقیقت
اُس وقت سمجھ میں آسکتی ہے - جب انسان اُسے دل کی آنکھ سے دیکھے - دل کی
آنکھ ، مرشد کی صحبت سے کھل سکتی ہے - اسکے علاوہ اور کوئی صورت نہیں ہے
جب انسان دل کی آنکھ سے کائنات کو دیکھتا ہے تو اُسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر
شئے میں اُسی کا جلوہ ہے + واضح ہو کہ دل کی آنکھ بڑی مشکل سے کھلتی ہے - خود
اقبالؔ کہتے ہیں - ؏ بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا
لب گویا - کنایہ ہے حسین ابن منصور کے قول "انا الحق" سے جس پر اُسے
سولی دی گئی تھی + ہو دید کا جو شوق تو آنکھوں کو بند کر - یہ وہی مضمون ہے
جسے مطلع میں بیان کیا ہے - لفظ دید سے مراد "دیدارِ الٰہی" ہے - جسکے لئے ظاہری
آنکھیں بیکار ہیں + دیکھے مجھے کہ تجھکو تماشا کرے کوئی - اس شعر میں تصوّف کا

بلند ترین مقام بیان کیا گیا ہے۔ جب سالک اپنے آپ کو بواسطہ رسولؐ، عشق الٰہی میں فنا کر دیتا ہے تو اسکے اندر خدا کی صفات کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے جس طرح لوہا، اگر کچھ دیر تک آگ میں پڑا رہے تو خود آگ ہو جاتا ہے۔ اسی کو قرآنی اصطلاح میں "صِبْغَۃَ اللّٰہ" یعنی اللہ کا رنگ کہتے ہیں + عذر آفریں جرم محبت ہے حسن دوست۔ مطلب یہ ہے کہ اسکا حسن اسقدر دلکش ہے کہ مجھکو ارتکاب جرم پر مجبور کر دیتا ہے۔ اسلئے مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں میں حشر کے میدان میں، اسکی شان میں کوئی گستاخی نہ کر بیٹھوں + نگہ شوق، محبت بھری نگاہ + اڑ بیٹھے دیدار الٰہی کی تمنا کی + دو چار دن جو میری تمنا کرے کوئی یعنی اگر معشوق کچھ دنوں کے لئے مجھ پر عاشق ہو جائے تو اُسکو معلوم ہو کہ کسی کی تمنا کرنے میں کیا لطف پوشیدہ ہے +

آٹھویں غزل بر صفحہ ۱۰۵

پہلا شعر:۔ آرزوئے بیدلی۔ لفظی معنی ہیں عاشقی یا محبوب کا سودا یا اسکی تمنا۔ لیکن عاشقی میں چونکہ سراسر زیاں (نقصان) ہی ہے۔ اسلئے آرزوئے بیدلی سودائے زیاں سے عبارت ہے۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ چونکہ میری زندگی کی رونق (قیمت) عاشقی سے ہے اور عاشقی میں سراسر زیاں ہوتا ہے۔ اسلئے مجھے سودائے زیاں، یعنی آرزوئے بیدلی، بیحد و بے حساب ہے۔ اس شعر کی دشواری اسکے اسلوب بیان کی وجہ سے ہے ورنہ مطلب بہت آسان ہے کہ میں اسکے عشق میں سراپا یا مجسم آرزو بنگیا ہوں + اس غزل کے تمام اشعار میں غالب کا رنگ پایا جاتا ہے۔ وہی دشوار اسلوب بیان، وہی مضمون آفرینی، اور وہی رفعت تخیل، اور وہی فارسی تراکیب +

دوسرا شعر:۔ کہتے ہیں کہ مجھے گل و گلزار کی آرزو اسی وقت تک ہے جب تک میں اپنے ساقی سے جدا ہوں۔ اگر اسکی صحبت حاصل ہو جائے اور وہ اپنے ہاتھ سے دو چار جام مجھے پلائے تو فروغ شراب کا مجھ پر یہ اثر ہو گا کہ میں خود گلزار بن جاؤنگا۔

تیسرا شعر:۔ صیاد اُسی وقت تک باغ کو اپنے وجود سے زینت بخش رہا ہے جبتک میں نغمہ سرا ہوں۔ اور بجلی میرے ہی آشیانہ کو جلانے کے لئے بیتاب ہے۔ میرے بعد نہ صیاد باغ میں آئیگا، اور نہ بجلی میں یہ اضطراب باقی رہیگا۔ غالب نے اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے:۔

درخور عرض نہیں جوہر بیداد کو جا!
نگہہ ناز ہے سرمہ سے خفا میرے بعد

چوتھا شعر:۔ میں بظاہر مشت خاک ہوں۔ بالکل بے حقیقت ہوں۔ لیکن کسی کے عشق کا یہ فیض ہے کہ وسعت میں صحرا بن گیا ہوں، بلکہ میری وسعت زمین سے آسمان تک ہے۔ یہ بہت بلند شعر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عشق حقیقی، انسان کو غیر محدود بنا دیتا ہے۔ ع سما سکا نہ دو عالم میں مرد آفاقی،

پانچواں شعر:۔ مطلب اسکا یہ ہے کہ جس طرح نالہ و فریاد، جرس (گھنٹہ) کے اندر پوشیدہ ہے اور جب قافلہ روانہ ہوتا ہے تو اسکی آواز ظاہر ہو جاتی ہے، اسی طرح انسان کے اندر نالہ و فریاد پوشیدہ ہے۔ جب اسکی زندگی کا قافلہ کوچ کرتا ہے یعنی جب وہ خود دنیا سے رخصت ہوتا ہے، تو اپنی غفلت شعاری اور حماقتوں پر زبانِ حال سے نالہ و فریاد کرتا ہے۔

چھٹا شعر:۔ یہ شعر اقبال کی مثال نگاری کی بہت عمدہ مثال ہے۔ کہتے ہیں کہ بھنور پانی کی روانی سے پیدا ہوتا ہے اگر پانی ساکن ہو جائے تو بھنور کے دل میں کوئی عقدہ پیدا نہو۔ یعنی بھنور کا وجود ہی نہو۔ پس انسان کو لازم ہے کہ وہ دنیا حاصل کرنے کے لئے مضطرب نہو۔ بلکہ طمانیت پیدا کرے۔ اطمینان قلب سے ساری دشواریاں حل ہو جاتی ہیں۔ اگر انسان اپنے دل کو مطمئن کر لے، اور یہ نعمت یاد الٰہی سے حاصل ہو سکتی ہے تو اُسے کوئی پریشانی لاحق نہیں ہو سکتی۔ بہت عمدہ شعر ہے۔

ساتواں شعر:۔ بلبل سے انسان اور خموشی سے بے عملی مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا میں جو شخص 'عمل صالح' نہیں بجا لاتا، اس پر موت وارد ہو جاتی ہے۔ کیونکہ زندگی جد و جہد کا نام ہے۔

آٹھواں شعر:۔ مہماں، کنایہ ہے جوانی سے۔ مطلب یہ ہے کہ عاشقی اور تمنائے دیدار کے لئے صرف جوانی کا زمانہ موزوں ہے جبکہ انسان حصول مقصد کے لئے جد و جہد کر سکتا ہے۔

نویں غزل بر صفحہ ۱۰۶

یہ طویل غزل سراسر، تصوف کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اور جن لوگوں کا دل سوز و گداز کی لذت سے آشنا ہے، اُنکی نظر میں اسکا ہر شعر آب حیات کا حکم رکھتا ہے غور سے دیکھو تو یہ غزل نہیں ہے۔ بلکہ حقائق کے پھولوں کا گلدستہ ہے جسے اقبال نے عقیدت کے ہاتھوں سے سجایا ہے۔ اس میں حمد باری بھی ہے۔ نعت رسولؐ بھی ہے (روحی لہ الفداء) معرفت بھی ہے، فلسفہ بھی ہے، تغزل بھی ہے، سوز و گداز بھی ہے۔ وحدت الوجود بھی ہے۔ اور اللہ والوں کی صحبت کے فوائد کی طرف بھی اشارہ ہے بخوف طوالت ہر شعر کا مطلب نہایت اختصار کے ساتھ لکھتا ہوں:۔

پہلا شعر:۔ کہتے ہیں کہ میں، اپنی نادانی کے سبب سے، مدتوں خدا کو کائنات کی وسعت میں تلاش کرتا رہا۔ لیکن جب مرشد رومیؒ کی باطنی توجہ سے میرے دل کی آنکھیں روشن ہو گئیں تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ محبوب حقیقی میرے دل میں پوشیدہ ہے۔

دوسرا شعر:۔ اس میں بھی پہلے شعر کی طرح تصوف کا رنگ ہے۔ کہتے ہیں کہ جب اپنی حقیقت اپنی آنکھوں پر عیاں ہوئی۔ اور یہ بات صرف مرشد کی صحبت میں بیٹھکر حاصل ہو سکتی ہے تو یہ معلوم ہوا کہ، یہ جو کچھ باہر نظر آتا ہے، یعنی ساری کائنات میرے دل میں موجود ہے۔

نوٹ:۔ پہلے مصرع کو یوں پڑھنا چاہئے:۔ "حقیقت اپنی آنکھوں پر نمایاں جب ہوئی اپنی"۔ واضح ہو کہ ان دو شعروں میں اقبال نے سارے تصوف کا خلاصہ بیان کر دیا ہے۔ یعنی یہ کہ انسان، عالم صغیر ہے، سب کچھ اسکے اندر موجود ہے۔ اور جو شخص، اپنی حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے، اُسے خدا کی معرفت (پہچان) بھی حاصل ہو جاتی ہے۔

تیسرا شعر:۔ مذاق جبہ سائی۔ پیشانی گھسنے یا رگڑنے کی عادت یا خواہش۔ مراد ہے رنگِ نیاز کی لذت + سنگ آستان کعبہ۔ خانہ کعبہ (بیت اللہ) کی چوکھٹ کا پتھر، جس پر امام، لامحالہ، بوقتِ سجدہ اپنا سر رکھتا ہے + جا ملتا جبینوں میں، یعنی سجدہ کرنے والوں میں شامل ہو جاتا۔ مطلب یہ ہے کہ محبوب کے دروازہ پر سجدہ کرنے میں جو لذت ہے۔ اگر سنگ کعبہ اس سے آگاہ ہو جائے تو شاید وہ بھی عاشقوں میں شامل ہو جائے۔

چوتھا شعر:۔ مجنوں، قیس عامری کا مشہور لقب ہے۔ لیکن اس شعر میں مجنوں سے ہم انسان بھی مراد لے سکتے ہیں۔ یعنی اے انسان! تو اپنی نادانی کی وجہ سے دوسروں (معشوقوں) کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ اگر تو اپنی حقیقت سے آگاہ ہو جائے تو تجھے معلوم ہو گا کہ تجھ میں وہ خوبیاں پوشیدہ ہیں کہ اگر تو اُن کو برتنے کا دل رکھے تو خود ایک دنیا، تیری تلاش میں سرگرداں رہیگی۔ یعنی تیرے اندر بھی محبوبی کی شان پوشیدہ ہے

پانچواں شعر:۔ اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ
ایام مصیبت کے تو کاٹے نہیں کٹتے   دن عیش کے گھڑیوں میں گذر جاتے ہیں کیسے

چھٹا شعر:۔ بہت بلیغ شعر ہے۔ کہتے ہیں کہ جو شخص عشق الٰہی میں فنا ہونا چاہتا ہے

(ڈوبنا چاہتاہے) تو اسکے لئے کسی خاص اہتمام کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک شخص تخت شاہی پر بیٹھکر بھی اللہ سے لو لگا سکتا ہے۔ اصلی چیز، میلانِ طبع ہے نہ کہ ظاہری وضع اسکو اس مثال سے واضح کیا ہے کہ جو لوگ ڈوبنے کی ٹھان لیتے ہیں وہ کشتی میں بیٹھے ہو بھی ڈوب جاتے ہیں۔ اس شعر کا سارا لطف اسی "ڈوب جاتے ہیں" میں مضمر ہے۔ یہاں ڈوبنے سے فی الحقیقت ڈوبنا مراد نہیں ہے کیونکہ یہ خلاف عقل ہے، بلکہ اس سے کسی کی یاد میں فنا ہوجانا مراد ہے۔

ساتواں شعر:۔ اس شعر میں وحدت الوجود کا رنگ ہے۔ یہ رنگ، ساری عمر، اقبال کے دل و دماغ پر چھایا رہا۔ اگر کسی کو شک ہو تو ارمغان حجاز حصہ فارسی کا مطالعہ کرلے جو انکا آخری کلام ہے۔ صرف ایک شعر لکھے دیتا ہوں:۔

تلاشِ او کنی، جز خود نہ بینی
تلاشِ خود کنی، جز او نہ یابی

مطلب اس شعر کا یہ ہے کہ وہ تجھ میں، اور تو اس میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر تو اُسکو تلاش کریگا تو اپنے کو پا جائیگا۔ اور اپنے کو تلاش کریگا تو وہ ملجائیگا۔ اب اس شعر کو پڑھئے مطلب واضح ہوجائیگا۔

کہتے ہیں کہ اس کائنات میں اُس معشوق حقیقی کے سوا، اور کوئی ہستی موجود نہیں ہے۔ چنانچہ تمام حسینوں (انسانوں) میں وہی جلوہ گر ہے، جس نے اپنے آپ کو، حضرت موسیٰؑ سے چھپایا تھا۔ یعنی ہر شئے میں اُسی کا جلوہ ہے۔ کہیں وہ ذات پاک بلبل کے نغمہ میں ظاہر ہورہی ہے اور کہیں گلاب کی مہک میں۔

آٹھواں شعر:۔ چونکہ عوام اس حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے، اسلئے اقبال نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ اگر وحدت الوجود کی حقیقت سے آگاہ ہونا چاہتے ہو تو مرشد کامل کی صحبت اختیار کرو۔ چنانچہ اگلے چار شعروں میں اسی چیز کو بیان کیا ہے۔

نواں شعر:۔ کہتے ہیں کہ اے لوگو! اہلِ دل کے اندر یہ طاقت پوشیدہ ہوتی ہے کہ وہ مُردوں کو زندہ کر سکتے ہیں۔ یعنی جن لوگوں پر روحانی اعتبار سے موت وارد ہوچکی ہو (جو مسلمان خدا اور رسولؐ سے بیگانہ ہوکر اشتراکی یا ترقی پسند بن چکے ہوں) یہ عاشقانِ خدا، ان لوگوں کے اندر ایمان کی بجھی ہوئی شمع کو پھر روشن کر سکتے ہیں۔

دسواں شعر:۔ اگر کسی شخص کو دردِ دل کی آرزو، یعنی اگر کوئی شخص اللہ کے عشق میں فنا ہوجانے کا آرزومند ہو تو اُسے مرشدانِ کامل کی صحبت اختیار کرنی چاہئے۔ یہ دردِ دل ــ یہ عشق الٰہی کی آگ ــ صرف فقیروں کی جوتیاں سیدھی کرنے سے حاصل ہوسکتا ہے، یہ وہ نعمت ہے، یہ وہ دولت ہے جو بادشاہوں کو بھی نصیب نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ، صرف اللہ والوں کی صحبت اختیار کرنے سے مل سکتا ہے، نہ کہ اڈیٹری یا انتخابی دورے کرنے سے۔

ان عاشقانِ خدا کی شان یہ ہوتی ہے کہ بظاہر گدڑی پہنے ہوتے ہیں لیکن بباطن انکی آستینوں میں "یدبیضا" پوشیدہ ہوتا ہے۔ یدبیضا، حضرت موسیٰؑ کا مشہور معجزہ ہے۔ جو فرعون کا مقابلہ کرنے کے لئے عنایت ہوا تھا۔ یہاں مراد ہے شان نبوت کے ظل سے یعنی اولیا، اللہ میں بھی انبیا کی طرح فوق الفطرت طاقتیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ انکے پاس بھی ظلی طور پر "یدبیضا" ہوتا ہے۔

گیارہواں شعر:۔ نگاہ نارسا سے مادہ پرستوں یا نیچری قسم کے مسلمانوں کی طرف اشارہ ہے۔ جن کے سینے "ارادت" کے جوہر سے معرّا ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جس رونق کے نظارہ کے لئے مادہ پرستوں کی نگاہیں ترستی رہتی ہیں، وہ رونق، وہ روحانیت وہ سوز و گداز، وہ کیفیت اور سرمستی، انہی خلوت نشینوں کی بدولت اس دنیا میں مل سکتی ہے۔ یعنی اگر کسی کو، اپنے دل میں سوز و گداز پیدا کرنا مقصود ہو تو ان بزرگوں کی صحبت میں بیٹھے۔

بارہواں شعر:۔ اب یہاں سے شاعر نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ نعتِ رسولؐ کا آغاز کیا ہے۔ کیونکہ حضور انور صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی، جو محور کائنات اور باعث تخلیق موجودات ہے، در اصل عاشقوں کی معراج ہے۔ اقبال کا کمال دیکھئے، پہلے عاشق کا ذکر کیا، پھر عشق کا، پھر عاشقوں کی مجلس کا، پھر معشوق کا۔

کہتے ہیں کہ اے مسلمان! اپنے خرمن دل کو کسی ایسے شرر سے پھونک کہ خورشید تیاں بھی تجھ سے حرارت کا طالب ہوجائے۔ اور وہ چنگاری کون سی ہے، جس میں آفتاب سے بھی زیادہ سوزش ہے؟ وہ چنگاری عشق رسولؐ کی ہے، جو اقبال کی رائے میں مسلمان کا مقصد حیات ہے

تیرہواں شعر:۔ لیکن اے مخاطب! اگر تو عشق رسولؐ کی دولت حاصل کرنی چاہتا ہے تو سب سے پہلے اپنے 'دل' میں سوز و گداز پیدا کرلے، یعنی عاشقی کی صلاحیت اقبال نے اس شعر میں کسقدر واضح صداقت کا بیان کیا ہے! ہر شخص اس بات کو تسلیم کریگا کہ جبتک صلاحیت نہو، کسی فن میں کامیابی نہیں ہوسکتی۔ مثلاً ایک لڑکا اگر بولر (BOWLER) بننا چاہتا ہے تو، کرکٹ کا ماہر سب سے پہلا مشورہ اسکو یہی دیگا کہ اپنے اعضائے جسمانی میں بولنگ (BOWLING) کے لئے مناسب اور ضروری لچک پیدا کرو۔ اگر تمہارے اعصاب سخت ہیں تو اس فن میں کمال پیدا نہیں کرسکتے۔ یعنی بولنگ کے لئے، صلاحیت جسمانی شرط اولیں ہے۔

چودہواں شعر:۔ کس خوبصورتی سے اقبال نے سرکار دو عالم صلعم کا ذکر مبارک شروع کیا ہے! یعنی خود ناظرین سے سوال کرکے انہیں سراپا اشتیاق بنا دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اے مخاطب تو خود سوچ کر بتا کیا دنیا میں تو نے کوئی ایسا "حسین" دیکھا ہے جس کا عاشق خود سراپا حسن بن جائے؟ ظاہر ہے کہ ایسا حسین اس دنیا میں صرف ایک ہی ہے۔ جو اسوقت گنبد خضرا میں محو استراحت ہے۔ جو آج بھی

اُسی طرح زندہ ہے جس طرح سنہ ۱۱ھ میں تھا۔ جو آج بھی اپنے عاشقوں کو خواب میں اپنا جمال دکھا کر ہمیشہ کے لئے دیوانہ بنا دیتاہے۔ جو آج بھی اپنے چاہنے والوں پر روحانی فیوضات کی بارش کرتا رہتا ہے۔ جسکے نام پر آج بھی دنیا کے ۴۰ کروڑ مسلمان اپنا سر کٹانا باعثِ سعادت سمجھتے ہیں۔

پندرہواں شعر:۔ اب اقبال حضور انور صلعم سے براہ راست خطاب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے باعثِ تکوین روزگار! جب آپؐ نے علم و معرفت کے انتہائی نقطہ پر فائز ہونے کے باوجود، جناب باری تعالیٰ کی درگاہ میں اپنی عبدیت کا بایں طور اعتراف فرمایا کہ مَا عَرَفْنَاکَ حَقَّ مَعْرِفَتِکَ۔ یعنی اے مولا کریم! ہمنے (حضورؐ نے افراد امت کو بھی شامل فرمالیا) تجھکو اس طرح نہیں پہچانا، جس طرح کہ پہچاننے کا حق ہے۔

بھڑک اُٹھا کوئی تیری ادائے مَاعَرَفنَا پر
ترا رتبہ رہا بڑھ چڑھ کے سب ناز آفرینوں میں

یعنی جب آپ نے اپنا سرنیاز، اللہ کی بارگاہ میں جُھکایا اور معرفت کے باوجود اپنے عجز کا اعتراف فرمایا تو اللہ نے آپ کو سارے حسینوں (انبیا،) کا سرتاج بنا دیا بایں طور کہ آپ کو معراج کی رات، اپنے پاس بلاکر، دانائے سُبل، ختم الرسل اور مولائے کل کے مراتب عالیہ پر فائز کردیا۔

سولھواں شعر:۔ اے میرے آقاؐ! مدتوں سے حکما اور فلاسفہ آپؐ کے مرتبہ اور مقام میں بحث و تمحیص کررہے ہیں۔ لیکن آپؐ کے جمال سے ناواقف اور نا آشنا ہیں جسکی بنا پر انہیں بڑے مغالطے لاحق ہوگئے ہیں۔ مثلاً نجدیوں نے (از راہ نادانی) آپؐ کی مسجد (واقع مدینہ طیبّہ) کی دیواروں سے آپؐ کے اسمائے مبارکہ میں سے رؤف اور رحیم، یہ دو نام مٹا دیئے ہیں۔ حالانکہ قرآن مجید خود آپؐ کی شان میں، یہ

دونوں لفظ استعمال فرماتا ہے۔ وَبِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ۔ یعنی آپ (بھی) مومنوں پر رؤف اور رحیم ہیں۔

اسلئے اے میرے آقاؐ اور مولیٰ! میں آپؐ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپؐ کسی دن ان (منکرینِ شانِ رسالت) کو اپنے جمالِ جہان آرا کی ایک جھلک دکھا دیجئے۔

سترہواں شعر:- چونکہ شاعر یہ محسوس کر رہا ہے کہ براہ راست خطاب میں کہیں گستاخی یابے ادبی کا کوئی پہلو پیدا نہ ہو جائے، نیز بادشاہوں کے دربار میں زیادہ گوئی بھی معیوب ہے اور حضورؐ کے سامنے تو مسلمان اونچی آواز سے بھی بات نہیں کر سکتا، اسلئے اقبالؔ فوراً اپنے کو متنبہ کرتے ہیں کہ :-

خموش اے دل! بھری محفل میں یہ شیون نہیں اچھا
ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں

یعنی عاشق (مومن) کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ حضورؐ کی بارگاہ میں، بہرحال، ادب ملحوظ رکھے۔ سرِ تسلیم خم کرنا تو محبت کی "الف بے تے" ہے۔

آخری شعر میں اقبالؔ نے اس بات کی صراحت کر دی ہے کہ جو لوگ میرے مسلکِ عاشقی کے خلاف ہیں، اور مجھ پر نکتہ چینی کرتے ہیں، میں اُن کو بُرا نہیں سمجھتا، کیونکہ مسلکِ عاشقی میں، کسی کو بُرا کہنا سب سے بڑا جرم ہے۔ علاوہ بریں وہ کہتے ہیں کہ میں تو خود اپنے اوپر نکتہ چینی کرتا رہتا ہوں، تو دوسروں کو کیسے بُرا سمجھ سکتا ہوں؟

دسویں غزل بر صفحہ ۱۰۹

حلِّ لغات | سادگی بمعنی بیوقوفی یا بھولاپن + صبر آزما، یعنی دشوار، جس میں صبر کے اظہار کا موقع مل سکے + لَن ترانی سُنا چاہتا ہوں، یعنی مجھے بھی حضرت موسیٰؑ کی طرح دیدار کی تمنا ہے، اور میں بھی وہی جواب سُننا چاہتا ہوں۔ لن ترانی کے لغوی معنیٰ

ہیں، تو مجھے ہرگز۔ نہ دیکھ سکے گا + چراغِ سحر۔ اس ترکیب نے مصرع کے سوز وگداز میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے۔ قاعدہ ہے کہ سحر ہوتے چراغ بجھا دیتے ہیں۔ چراغِ سحر کنایہ ہے قُربِ وفات سے + راز کی بات۔ معشوق کی مہربانی کا تذکرہ۔

گیارہویں غزل بر صفحہ ۱۱۰

حلِّ لغات | بے نیاز بمعنی خدا + نیاز مند بمعنی بندہ یا انسان + دستِ کرم کشادہ کرے۔ جب بندوں پر کرم کی طرف مائل ہو + احتراز بمعنی بچنا۔ پرہیز کرنا + رند بمعنی عاشق + مدام۔ ہمیشہ + گوش بدل رہ۔ دل کی آواز پر کان لگائے رکھ یا دل کی حالت دیکھتا رہ۔ کہ اس میں سوز وگداز کا رنگ پیدا ہوا یا نہیں۔ کیونکہ دل اُسی وقت خانۂ خدا بنتا ہے جب اس میں یہ رنگ پیدا ہو جائے۔ اس نکتہ کو اقبالؔ نے شاعرانہ رنگ میں یوں بیان کیا ہے کہ دل کی یہ خاصیت ہے کہ جب وہ ٹوٹ جاتا ہے تو اس میں سے "نوائے راز" نکلتی ہے۔ یہ بہت دلکش اسلوبِ بیان ہے۔ اس حقیقت کو ظاہر کرنے کے لئے کہ جب دل میں سوز وگداز کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تو اللہ اُس میں جلوہ گر ہو جاتا ہے۔

"سخن میں سوز الٰہی! کہاں سے آتا ہے" اس مصرع میں تجاہلِ عارفانہ کا رنگ ہے۔ اقبالؔ سے بڑھ کر کون اُس حقیقت سے آگاہ ہو سکتا ہے کہ سخن میں سخنور کے دل سے سوز آتا ہے۔ یعنی وہ اپنے اشعار میں، اپنی خداداد قابلیت کی بدولت اپنے دل کا سوز وگداز منتقل کر دیتا ہے +

"جہاں میں دانہ کوئی چشمِ امتیاز کرے" اس مصرع میں اقبالؔ نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ دنیا میں، مختلف اشیا میں، امتیاز کرنے سے، انسان پریشانی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس بات کا ثبوت یہ ہے کہ بلبل نے لالہ و گل میں امتیاز کیا۔ چونکہ ہر وقت ہر جگہ، ہر باغ میں، بلبل کو "گل" کی صحبت نصیب نہیں ہو سکتی، اسلئے جب وہ گل کے بجائے لالہ یا نسترن کو دیکھتی ہے تو گل کے فراق میں نالہ و فریاد کرتی ہے۔ واقعی بہت بلیغ شعر ہے۔ اور اقبالؔ نے اس میں بڑی نکتہ آفرینی کی ہے + زبان دراز کرنا۔ بُرا بھلا کہنا + "اڑا کے مجھکو غبارِ رہِ حجاز کرے"۔ یہ مصرع ۱۹۰۵ء کے آخر کا ہے، اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عشقِ رسولؐ کا رنگ اقبالؔ کے دل میں جوانی ہی سے کارفرما تھا۔ یہ سچ ہے کہ وہ حجاز نہ جا سکے۔ لیکن عشقِ رسول کی بدولت لاکھوں مسلمانوں کے محبوب ضرور بن گئے۔ اگر اُنہوں نے اپنے آپ کو سرکارِ دوعالمؐ کے عشق میں فنا کر دیا، تو حضورؐ نے بھی اُن کو زندۂ جاوید کر دیا +

بارہویں غزل بر صفحہ ۱۱۱

پہلا شعر:- اس مطلع میں اقبالؔ نے قرآن حکیم کی اس مشہور آیت کی تشریح کی ہے اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا، جس کا ترجمہ یہ ہے "بیشک انسان ظالم اور جاہل ہے"۔ اقبالؔ نے ظالم اور جاہل ان دو لفظوں کی پہلے مصرع میں تشریح کی ہے۔ کہ مومن اپنے دل پر سختی کرتا ہے۔ یعنی اُسکو خلافِ شرع امور سے روکتا ہے، اسلئے ظالم ہے، اور غیر اللہ سے غافل رہتا ہے۔ یعنی اللہ کے سوا کسی سے محبت نہیں کرتا اسلئے جاہل ہے۔

دوسرا شعر:- اس میں وحدۃ الوجود کا رنگ ہے۔ یعنی انسان اُسی وقت تک اپنے آپ کو موجود سمجھتا ہے، جب تک اسکی آنکھ اللہ کے جلوے سے محروم یا غافل رہتی ہے۔ لیکن جب سالک پر تجلیاتِ ربّانی کا ظہور ہونے لگتا ہے تو جس طرح آفتاب کے سامنے ستاروں کا وجود باطل ہو جاتا ہے۔ اُسی طرح حق کے سامنے انسان کا وجود باطل ہو جاتا ہے۔ اس نکتہ کو جو تصوّف کی جان ہے (اور راقم الحروف کا ایمان ہے) اقبالؔ نے نہایت دلکش اور شاعرانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ دوسرا مصرع قرآن مجید کی اس آیت سے ماخوذ ہے۔ وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ، حق آ گیا اور اسکے آنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ باطل مٹ گیا۔

تیسرا شعر:- غوطہ زن۔ طالبانِ علم + گوہر بدست۔ موتی لیکر + خزف چینِ لبِ ساحل۔ یعنی میں دریا کے کنارے سنگریزے چُن رہا ہوں +

چوتھا شعر:- اس میں ہبوطِ آدم کی طرف اشارہ ہے + ذلت سے، بہشت سے نکلنے کی طرف اور شرافت سے، آدم کے اشرف المخلوقات اور خلیفۃ اللہ ہونے کی طرف اشارہ ہے، یعنی خدا تعالیٰ نے تو مجھکو اشرف المخلوقات بنا کر جنت میں رکھا تھا لیکن مجھ سے ایک غلطی ہو گئی جسکی پاداش میں جنت سے نکلنا پڑا۔

پانچواں شعر:- مطلب یہ ہے کہ انسان اس ساری کائنات سے اشرف اور افضل ہے کیونکہ وہ خلیفۃ اللہ یعنی اللہ کا نائب ہے اور یہ ساری کائنات اسکی خادم ہے۔

چھٹا شعر:- اس شعر کا اسلوبِ بیان بڑا دلکش ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب سالک اپنی خودی کی معرفت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے تو خود ہی مسافر ہوتا ہے اور خود ہی منزل ہوتا ہے۔ تلاش کون کرتی ہے؟ خودی اور کس کو تلاش کرتی ہے؟ اپنے ہی آپ کو، پس ہر سالک بیک وقت مسافر بھی ہے اور منزل بھی ہے۔ یعنی منطقی اصلاح میں خود ہی عالم ہے، خود ہی معلوم ہے۔ خود ہی ناظر ہے، اور خود ہی منظور ہے۔

تیرہویں غزل بر صفحہ ۱۱۲

پہلا شعر:- تصوّف کا رنگ ہے۔ یعنی اگر خدا کے دیدار کی آرزو ہو تو غیر اللہ سے قطع تعلق کر لو۔

دوسرا شعر:- کمالِ ترک، یعنی دنیا کی ہر شے اور ہر آرزو کو ترک کر دینا۔ اقبالؔ نے

اس شعر میں واعظ پر طنز کی ہے۔ کہ اگر "ترک" کا وعظ کرتے ہو تو پھر دنیا کے ساتھ ساتھ عقبیٰ کو بھی ترک کرو۔

تیسرا شعر:۔ تقلید، کسی کی اندھا دھند پیروی کرنا۔ اس شعر میں اقبال نے افراد قوم کو اپنے اوپر اعتماد کرنے کا درس دیا ہے۔ یعنی خضر کے سہارے زندگی مت بسر کرو۔

چوتھا شعر:۔ قلم کبھی اپنا ذکر نہیں کرتا اور نہ کبھی اپنا ذکر لکھتا ہے۔ بلکہ دوسروں کی باتیں لکھتا رہتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ اے نئی طلب! جب تیری کم مایگی کا یہ عالم ہے کہ تو ہمیشہ دوسروں کے اقوال اور خیالات بیان کرتا رہتا ہے تو پھر اغیار کے علوم و فنون پر ناز کیسا؟ ناز اُسکو زیبا ہے جو اپنے ذہن سے کوئی نئی بات پیدا کرے۔ دوسروں کی دولت پر ناز کرنا بہت بیجا ہے۔

پانچواں شعر:۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تو عشق اور وارداتِ عاشقی سے آگاہ نہیں ہے تو تجھے شاعری کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اسکے بجائے کوئی اور پیشہ اختیار کرلے۔

چھٹا شعر:۔ مطلب یہ ہے کہ "جگہ دل لگانے کی دنیا نہیں ہے، یہ عبرت کی جا ہے تماشا نہیں ہے" اگر تو دنیا میں آیا ہے تو یہ مت سمجھ کہ تجھے یہاں ہمیشہ رہنا ہے۔

ساتواں شعر:۔ عاشقی کا طریق یہ ہے کہ، انسان سب سے الگ تھلگ محبوب کی یاد میں مستغرق رہے۔ خدا، نہ بتخانہ میں ہے نہ حرم میں ہے نہ کلیسا میں، وہ تو اُس شخص کے دل میں جلوہ گر ہوتا ہے جو اسکا سچا عاشق ہے۔

آٹھواں شعر:۔ مطلب یہ ہے کہ انسان کو خدا کی عبادت، بالکل خلوص کے ساتھ کرنی چاہئے۔ اگر کوئی شخص جنت یا حوروں کے لئے عبادت کرتا ہے تو وہ عابد نہیں ہے بلکہ "تاجر" ہے۔

نواں شعر:۔ بہت مشہور شعر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بیشک انسان کو اپنی عقل کے مشورہ پر چلنا چاہئے۔ لیکن جب سرکار دو عالم صلعم کی عزت پر کٹ مرنے کا سوال پیدا ہو تو پھر عقل کے بجائے دل کے اشارہ پر چلنا مناسب ہے۔ عقل کو "پاسبان" اسلئے کہا ہے کہ وہ انسان کو ہلاکت سے بچاتی ہے۔

دسواں شعر:۔ مطلب یہ ہے کہ دوسروں کے بھروسے یا سہارے پر زندگی مت بسر کرو۔ اس نکتہ کو اقبال نے اسطرح بیان کیا ہے کہ "شہرت" کو انسان کا غیر تصور کیا ہے اور ہمیں صلاح دی ہے کہ اس غیر کا بھروسہ مت کرو۔

گیارھواں شعر:۔ چونکہ دوسری مرتبہ سوال کرنے میں گستاخی کا رنگ پایا جاتا ہے اسلئے اطاعت کا تقاضا یہ ہے کہ سالک تقاضا کرنا چھوڑ دے۔ یعنی اگر اللہ سالک کی درخواست منظور نہ کرے تو شرط ادب یہ ہے کہ سالک سرِ تسلیم خم کردے اور اپنی بات پر اصرار نہ کرے۔

بارھواں شعر:۔ بہت مشہور شعر ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ مجھے واعظ سے اسقدر اختلاف ہے کہ اگر وہ شراب کو جائز ثابت کردے، تو میں پینا چھوڑ دونگا۔ یعنی میں اسے حرام قرار دے دونگا۔

حصّۂ دوم

نظم پر صـ ۱۱۵

حلِّ لغات اور شرح مشکلات عروسِ شب۔ رات کی دلہن، یعنی رات + زلفیں خم سے ناآشنا تھیں، یعنی ابھی کائنات میں دن اور رات کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا + لذتِ رم یعنی لفظی معنی ہیں بھاگنے کی لذت۔ مراد یہ ہے کہ ستاروں کی گردش ابھی قائم نہیں ہوئی تھی + لباسِ نو، یعنی نئی صورت + بیگانہ سا لگتا تھا۔ یعنی ابھی پیدا ہوا تھا + آئینِ مسلّم۔ فطرت کا قانون جسے دنیا میں ہر شئے تسلیم کرتی ہے + امکان، منطق کی اصطلاح ہے۔ حکما کے نزدیک خدا تو اپنی ذات کے لحاظ سے "واجب" ہے۔ اسکے علاوہ ساری کائنات، اپنی ذات کے لحاظ سے "ممکن" ہے۔ اسلئے کائنات کو عالمِ امکان یا میدانِ امکان کہتے ہیں۔ اقبال نے یہاں لفظ "امکان"، کو عدم کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ اور اسی لئے "ظلمتِ خانہ" کا لفظ لائے ہیں۔ کیونکہ ظلمت تاریکی کو کہتے ہیں۔ اور عدم کو تاریکی اور سیاہی سے تعبیر کرتے ہیں۔ مصرع کا مطلب یہ ہے کہ دنیا ابھی ابھی عدم سے وجود میں آئی تھی + مذاقِ زندگی، یعنی زندگی + پہنائے عالم۔ دنیا کا طول و عرض یا اسکی وسعت، مراد یہ ہے کہ دنیا میں ابھی "ذی روح" پیدا نہیں ہوئے تھے۔ واضح ہو کہ اہل سائنس کا نظریہ یہ ہے کہ دنیا میں حیات کے اولین آثار کائنات کی پیدائش سے ۳۰ لاکھ سال کے بعد ظاہر ہوئے تھے + کمالِ نظمِ ہستی الخ یعنی کائنات میں ابھی قوانینِ فطرت جاری نہیں ہوئے تھے + ہویدا بمعنی ظاہر + نگینہ، بمعنی نگیں، یا گوہر + چشمِ خاتم۔ انگوٹھی کی آنکھ، مراد ہے وہ خالی جگہ جس میں قیمتی پتھر جڑا جاتا ہے۔ مطلب اس مصرع کا یہ ہے کہ ابھی دنیا میں قوانینِ فطرت کا نفاذ نہیں ہوا تھا +

نوٹ :۔ ان چاروں اشعار کا مطلب یہ ہے کہ ابھی دنیا کی ابتدا ہی ہوئی تھی۔ ۱۲

عالمِ بالا سے غیر مادّی عالم یا عالمِ ملکوت مراد ہے + صفا تھی جس کی خاکِ پا میں الخ مطلب یہ ہے کہ اُس کی خاکِ پا، صفائی کے اعتبار سے، جامِ جمشید سے بھی بڑھکر تھی یعنی وہ دانائے اسرار و رموزِ کائنات تھا + کیمیا گر۔ وہ شخص جو ادنیٰ قسم کی دھاتوں کو سونے میں تبدیل کرسکے۔ یہاں مراد ہے فطرت، (نیچر) لیکن لفظ فطرت سے نظم میں یہ دلکشی پیدا نہیں ہوسکتی تھی + عرش کا پایہ۔ اس میں لطیف کنایہ ہے اس بات کی طرف کہ محبت عرش (خدا) سے آئی ہے یا نہایت پاکیزہ شئے ہے + اکسیر۔ وہ مرکب جس کے لگانے سے ادنیٰ دھات، سونا بن جائے۔ یا نہایت زود اثر دوا۔ وہ شئے جو کسی شئے کی ماہیت کو بدل دے۔ (اکسیر تو قرآن میں موجود ہے لیکن مسلمان اُسے جنگلوں میں تلاش کرتے پھرتے ہیں)۔ چھپاتے تھے فرشتے جس کو الخ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر آدم اس سے واقف ہوگیا تو وہ ساری کائنات پر حکمراں ہوجائیگا۔ بالفاظِ دگر، خدا کا نائب بن جائیگا + اسمِ اعظم۔ لفظی معنی خدا کا سب سے بڑا یا متبرک ترین نام۔ مراد ہے اللہ کا، وہ اسم صفت، جس میں غیر معمولی تاثیرات پوشیدہ ہیں + فکرِ اجزا، یعنی نسخہ کے اجزاء (مفردات) کی تلاش + میدانِ امکاں، مراد ہے ساری کائنات + بارگاہِ حق کا محرم۔ یعنی وہ شخص جو اللہ کے ارادوں سے واقف ہو + تیرگی، بمعنی سیاہی + زلفِ برہم۔ کنایہ ہے بکھرے ہوئے بالوں سے۔ مراد ہے رات کی وہ سیاہی جو دور دور تک پھیلی ہوئی نظر آتی ہے + حرارت بمعنی زندگی + نفَس بمعنی سانس + مسیح ابن مریم۔ حضرت عیسیٰ کو اللہ نے یہ طاقت عطا فرمائی تھی کہ وہ اپنی سانس سے

مردہ کو زندہ کر دیتے تھے + ربوبیت ۔ لغوی معنی اللہ کی صفت پرورش مراد ہے ذات باری یا اُلوہیت + بے نیازی۔ محتاج نہ ہونے کی صفت ۔ واضح ہو کہ اللہ کی سب سے نمایاں صفت یہ ہے کہ وہ بے نیاز (صمد) ہے۔ کسی کا کسی رنگ میں بھی محتاج نہیں ہے + مَلک بمعنی فرشتہ + عاجزی بمعنی شانِ عبودیت یا رنگ احتیاج + اُفتادگی لغوی معنی (زمین پر) گرنا مراد ہے عاجزی مسکینی + تقدیر شبنم ۔ اوس کی ہستی کا اندازہ + تقدیر بمعنی قانونِ قدرت + چشمۂ حیواں ، اصطلاحی معنی میں وہ چشمہ (فرضی) جس کا پانی پی لینے کے بعد موت نہیں آتی ۔ مراد ہے ہمیشگی ، یا ابدیت ، یعنی محبت ایک ابدی شئے ہے + نام پایا عرش اعظم سے ۔ یعنی خدا نے اس مرکب کا نام محبت رکھا + مُہتِز مِس ۔ مراد ہے کیمیا گر + مستی نو خیز ، یعنی کائنات جو نئی نئی پیدا ہوئی تھی + گرہ کھولی ہنر نے اسکے الخ مطلب یہ ہے کہ محبوس کے اس "ہنر" نے کائنات کی تمام دشواریوں کو حل کر دیا ۔ یا دنیا کا کارخانہ جو بند پڑا تھا جاری ہو گیا ۔ کس طرح اور کیونکر جاری ہو گیا اسکا ذکر اگلے شعر میں ہے کہ "ہوئی جنبش عیاں" یعنی جب محبت کارفرما ہوئی تو کائنات میں حرکت پیدا ہو گئی + ذروں نے لطف خواب کو چھوڑا ۔ یعنی ذرّاتِ مادی متحرک ہو گئے + گلے ملنے لگے الخ یعنی ذرّات میں ترکیب کا عمل شروع ہو گیا + ہمدم سے مراد ہے یکساں صفات رکھنے والے ذرّات + غنچوں نے چٹک پائی ۔ مراد یہ ہے کہ ہستی یا کائنات کا نظم و نسق اپنے مرتبۂ کمال کو پہونچ گیا +

تبصرہ | یہ دوسرے دور کی پہلی نظم ہے جس کی بندش یہ بتا رہی ہے کہ اقبال نے اس کو بہت غور و فکر کے بعد مرتب کیا ہوگا ۔ اسکے شاعرانہ محاسن سے بخوف طوالت قطع نظر کرتا ہوں ۔ اور معنوی خوبیوں میں سے بھی صرف ایک خوبی کی تفصیل پر اکتفا کرتا ہوں ۔ واضح ہو کہ تصوّف کی مسلّمہ تعلیم یہ ہے کہ

"حرکت بدونِ محبت" محال ہے ۔ اگر محبت نہ ہوتی تو حرکت نہ ہوتی اور حرکت نہ ہوتی تو کائنات بھی نہ ہوتی ۔ یعنی اس کائنات کا وجود ، محبت پر موقوف ہے اقبال نے تصوف کی اسی بنیادی تعلیم کو شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے ۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ

(۱) محبت باعثِ ایجادِ عالم ہے ، وہ ایسی لطیف طاقت ہے جو اس کائنات کی رگ و پے میں جاری ہے ۔

(۲) محبت غیر مادی شئے ہے ۔ اسکے عناصر ترکیبی سب غیر مادی ہیں ۔

(۳) محبت ، دراصل کائنات کے تمام محاسن کا مجموعہ ہے اسلئے اس میں حسن بھی پوشیدہ ہے ۔

(۴) اقبال نے اس نظم میں کائنات کے حسن کو بھی ضمنی طور سے واضح کر دیا ہے ۔ جس طرح چمک تارہ کا حُسن ہے ، اُسی طرح سیاہی ، رات کا زیور ہے ، وقس علیٰ ہٰذا ۔

(۵) محبت ، ایک غیر فانی شئے ہے نیز یہ کہ محبت نہ ہوتی ، تو دنیا نہ ہوتی ۔

(۶) اس نظم میں اقبال نے اپنے فن (شاعری) کے اُس پہلو کو نمایاں کیا ہے جسے درجت کہتے ہیں ۔

(۷) یہ نظم اقبال نے سنہ ۱۹۰۶ء میں لکھی تھی ۔ اور اسکے مطالعہ سے یہ بات عیاں ہو سکتی ہے کہ اُنہوں نے اپنا مقصدِ حیات اسی زمانہ میں متعین کر لیا تھا یعنی دنیا کو محبت کا درس دینا ۔ چنانچہ انکی آئندہ شاعری تا دمِ آخر اسی مقصد کیلئے وقف عمل رہی ۔

(۸) دنیا میں جہاں کہیں کوئی حسن و خوبی یا نیکی یا صداقت ہے وہ سب ، محبت ہی کا پرتو ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اُنکی نظر میں حسن ، صداقت اور نیکی ، یہ تینوں ایک ہی چیز (محبت) کے تین پہلو ہیں ۔

نظم بر ص ۱۱۶

حل لغات اور شرح مشکلات | لازوال ۔ جسے فنا نہو یعنی ابدی + تصویر خانہ

تصویر کی نہ کوئی حقیقت ہوتی ہے اور نہ اس میں پائداری ہے ۔ یہی حال دنیا کا ہے + شب درازِ عدم کا فسانہ ۔ عدم کی طویل رات کا افسانہ ۔ یعنی دنیا کی کوئی اصلیت یا حقیقت نہیں ہے + رنگ تغیر ، یعنی تغیر یا تبدیلی ۔ دنیا کی بنیاد ، تغیر یا انقلاب پر ہے ۔ یہاں کسی شئے کو دوام نہیں ہے ۔ اسلئے زوال اور فنا ، ہر شئے کی حقیقت میں داخل ہے + اخترِ سحر سے وہ خاص ستارہ مراد ہے ، جو طلوع آفتاب سے پہلے مشرقِ اُفق پر نمودار ہوتا ہے + سوگوار بمعنی رنجیدہ یا غمگین +

تبصرہ | اس نظم میں اقبال نے تمثیلی رنگ میں اس صداقت کا اظہار کیا ہے کہ دنیا کی بنیاد تغیر پر ہے ۔ اسلئے یہاں کسی چیز کو ہمیشگی حاصل نہیں ہو سکتی ۔ لہٰذا حُسن کی حقیقت دوام نہیں ، بلکہ زوال ہے ۔ قمر ، اخترِ سحر ، شبنم ، پھول ، کلی ، موسم بہار ، اور ان سب حسینوں کا سرتاج "شباب" یہ سب حسین اشیاء ، رو بزوال اور فانی ہیں ۔

نظم بر ص ۱۱۷

حل لغات اور شرح مشکلات | تجھے ، پڑھنے والا مخاطب ہے + ذوقِ تپش ۔ تڑپنے کی لذت یعنی اضطرابِ مسلسل جو عشق کا ثمرہ یا نتیجہ ہے + بزم سے دنیا اور دنیا والے مراد ہیں ۔ شمع بزم ، وہ شمع جو محفل میں جلتی ہے ۔ یہاں بزم سے محفل مراد ہے + حاصل سوز و ساز ۔ بہت بلیغ ترکیب ہے ۔ اور اس سے وہ لطیف اور پاکیزہ جذبات مراد ہیں جو عاشقانہ زندگی کی بدولت حاصل ہوتے ہیں ۔ یا وہ روحانی فوائد جو عشق کا لازمی نتیجہ ہیں + شانِ کرم سے اللہ کا فضل و کرم مراد ہے + عشق گرہ کشا ، عشق حقیقی کی خاصیت یہ ہے کہ وہ تمام گرہوں (دشواریوں) کو کھول (حل کر) دیتا ہے ۔ اور تمام خرابیوں کا ازالہ کر دیتا ہے ۔ جب بندہ اللہ سے ملنا چاہتا

ہے تو اسکی راہ میں دشواریاں پیش آتی ہیں ۔ لیکن عشق اُن کو دور کر دیتا ہے اور بندہ اللہ سے واصل ہو جاتا ہے ۔ وہ دشواریاں جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں ، پانچ ہیں ۔ شہوت ، غضب ، فریفتگی ، حرص اور تکبر + دیر و حرم ۔ بتخانہ اور مسجد ۔ قید بمعنی تخصیص + گریۂ جانگداز سے سوز و گداز کی وہ کیفیت مراد ہے جو عشق کی بدولت دل میں پیدا ہو جاتی ہے ۔ اور اسی پر ساری روحانی ترقی موقوف ہے + تارے میں وہ ۔ وہ سے خدا کی صفات کی طرف اشارہ ہے یعنی ہر شئے میں اُسی کا جلوہ پوشیدہ ہے + چشم نظارہ میں نہ تو الخ ۔ بہت دلکش اندازِ بیان ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ جب تو اشیائے کائنات کو دیکھے تو ان میں امتیاز مت کر کہ یہ پھول ہے ۔ اور یہ کانٹا ہے ۔ پھول میں بھی وہی پوشیدہ ہے ۔ اور کانٹے میں بھی اُسی کا جلوہ ہے + اس شعر میں وحدت الوجود کا رنگ پایا جاتا ہے + بلند بال بمعنی عالی حوصلہ + رسم و رہِ نیاز بمعنی عاجزی یا غلامی کا طریقہ + پیر مغاں ۔ لغوی معنی میں آتش پرستوں کا مذہبی پیشوا ۔ چنانچہ حالی لکھتے ہیں ع آتش پہ مغاں نے راگ گایا تیرا ۔ مراد ہے میخانہ کا مالک یا منتظم + فرنگ کی مے ۔ یعنی مغربی تعلیم و تہذیب + نشاط بمعنی مسرّت یا خوشی ۔ یہ بہت بلیغ لفظ ہے جو اقبال نے اس مصرع میں اپنے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے استعمال کیا ہے ۔ لفظی معنی تو یہ ہوئے کہ فرنگ کی شراب سے نشاط (مسرت) حاصل ہوتی ہے ۔ لیکن مطلب شاعر کا یہ ہے کہ مغربی تہذیب اور مغربی تعلیم سے انسان ، دولت یا ثروت یا عہدہ حاصل کر سکتا ہے ۔ اور اس مادّی ترقی سے اُسے سطحی قسم کی مادی مسرت حاصل ہو سکتی ہے ۔ لیکن اس میں "کیف غم" نہیں ہے ۔ یعنی مغربی تہذیب سے دل میں عشق الٰہی کی آگ روشن نہیں ہو سکتی + خانہ ساز ۔ لغوی معنی وہ شراب جو گھر میں کشید کی گئی ہو ۔ یہاں مراد ہے اسلامی علوم اور اسلامی تہذیب +

بزمِ کہن بدلگئی - پُرانی محفل بدلگئی - یعنی مسلمانوں کی زندگی میں انقلاب رونما ہوچکا ہے وہ پہلے حاکم تھے اب محکوم ہیں + مئے مجاز - لغوی معنی مجاز کی شراب، مراد ہے مجاز کی تعلیم - واضح ہو کہ اقبالؔ کے یہاں یہ تین ترکیبیں بہت مستعمل ہیں - حقیقت و مجاز سوز و ساز اور ناز و نیاز - مجاز حقیقت کی ضد ہے - مثلاً شیر کے حقیقی معنی ایک خونخوار درندہ کے ہیں - لیکن مجازی طور پر بہادر آدمی کو بھی "شیر" کہہ دیتے ہیں - مطلب اقبالؔ کا یہ ہے کہ مسلمانوں کے رہنماؤں کو لازم ہے کہ اب قوم کو حقیقت سے روشناس کریں - "مجاز" کی وادی میں تو وہ مدت دراز تک سرگرداں رہ چکی ہے - مثلاً جب ہم دیوان حافظؔ میں شراب اور شاہد کا ذکر پڑھتے ہیں تو اُستاد بچوں یا طلبہ سے یہ کہہ دیتا ہے کہ یہاں شراب اور شاہد کے لغوی معنی مراد نہیں ہیں - بالفاظ دگر، ہم مجازی معنی مراد لیتے ہیں - اقبالؔ کہتے ہیں کہ اب قوم کو دیوان حافظؔ اور اس قسم کی دوسری کتابوں کے بجائے قرآن اور حدیث کا مطالعہ کرنا چاہئیے -

تبصرہ: یہ بہت غور طلب نظم ہے - کیونکہ ایک تو اس میں خیالات بہت بلند ہیں دوسرے یہ کہ اس سے اقبالؔ کے اُس ذہنی انقلاب کا علم حاصل ہوسکتا ہے، جو یورپ جاکر اُن کے اندر پیدا ہوا - یعنی یہ پہلی نظم ہے جس میں اُنہوں نے "پیغام گو" کی حیثیت اختیار کی ہے - یہی وجہ ہے کہ اس نظم کا عنوان "پیام" ہے - ضربِ کلیم میں بھی پیام کی مے ہے - جو چہار آتشہ ہوگئی ہے - دوسری خصوصیت اس نظم کی یہ ہے کہ اس میں وحدت الوجود کا رنگ پایا جاتا ہے - جو ابتدا ہی سے اُن کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا -

پہلا شعر:- کہتے ہیں کہ اے مخاطب! اگر عشقِ حقیقی تیرے اندر سوز و گداز کا رنگ پیدا کردے (شاعر نے یہ فرض کرلیا ہے کہ یہ رنگ پیدا ہوچکا ہے) تو تیرا فرض

ہے کہ جس طرح شمع، اہلِ محفل کو، اپنے سوز و گداز (جلنے) سے فائدہ (روشنی) پہونچاتی ہے، اُسی طرح تو اُن (دنیا والوں) کو اپنے سوز و گداز (ہمدردی) سے فائدہ پہونچائے - یعنی عشق حقیقی انسان کے اندر بنی آدم کے ساتھ حسنِ سلوک اور ہمدردی کا جذبہ پیدا کردیتا ہے -

دوسرا شعر:- عشق کا دار و مدار، کسی خاص مقام یا ظاہری خصوصیت پر نہیں ہے، بلکہ فضل الٰہی پر ہے - یعنی اگر خدا کا فضل شاملِ حال ہوجائے تو کافر اور سیہ کار بھی، نعمتِ عشق سے مالا مال ہوسکتا ہے - بالفاظ دگر خدا، مسجد یا مندر میں محدود نہیں ہے اور نہ اسکا فضل کسی خاص فرد سے وابستہ ہے -

تیسرا شعر:- سوز و گداز کے بغیر، انسان کے اندر نورانیت یا روحانیت پیدا نہیں ہوسکتی - چنانچہ دیکھ لو، شمع نے پہلے اپنے اندر سوز و گداز کا رنگ پیدا کیا تو قدرت نے اُسے نور کی قبا (نورانی زندگی) عطا کی - واضح ہو کہ یہ حسنِ تعلیل ہے -

چوتھا شعر:- اے انسان! اپنی آنکھ میں امتیاز (مختلف اشیا میں تمیز کرنے) کا سرمہ مت لگا - ہر شئے میں اُسی کا جلوہ پوشیدہ ہے اور ہر جگہ اُسی کی ذات کا ظہور ہو رہا ہے -

پانچواں شعر:- اقبالؔ کی رائے میں عشق کا تقاضا یہ نہیں کہ عاشق اپنی خودداری کو بالائے طاق رکھدے، اگر حسن مستِ ناز ہے یعنی عاشق سے تغافل کرتا ہے تو عاشق کو بھی خودداری سے کام لینا چاہئیے -

چھٹا شعر:- اے مسلمانوں کے لیڈر! انگریزی تعلیم اور مغربی تہذیب مسلمانوں کے لئے کبھی مفید نہیں ہوسکتی - مغربی تعلیم و تربیت کا نتیجہ "نشاط" (مادّی فارغ البالی) کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے - حالانکہ مسلمان کے لئے جو چیز ضروری ہے وہ "کیفِ غم" یعنی عشق رسولؐ ہے - اسلئے اے رہنما! تو مسلمانوں کو "خانہ ساز شراب" پلا،

یعنی اسلامی تعلیمات سے روشناس کر، اور اُن کے دلوں میں عشق رسولؐ پیدا کر -

ساتواں شعر:- اے رہنمائے قوم! کیا تجھکو خبر نہیں کہ زمانہ بدل گیا - مسلمانوں کی زندگی میں ایک عظیم الشان انقلاب رونما ہوچکا ہے - وہ جس ملک میں صدیوں تک حاکم رہے، اب اسی ملک میں محکوم ہیں (یہ سنہ ١٩٠٦ء کا ذکر ہے، اب سنہ ١٩٥١ء میں تو اُنکی ہستی بھی معرض خطر میں ہے اور اندیشہ ہے مبادا ہسپانیہ کی تاریخ، بھارت میں بھی دہرادی جائے -) اسلئے اب اُن کو مجاز کی شراب مت پلا - یعنی مجازی دنیا سے نکال کر حقیقی دنیا میں لا - اور زندگی کے حقائق سے روشناس کر - بالفاظ دگر انہیں یہ بتا کہ

خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

نوٹ:- افسوس صد افسوس کہ ہندستان اور پاکستان کے مسلمانوں نے ابھی تک حقائق حیات سے آگاہی حاصل نہیں کی - وہ بدستور خواب غفلت میں گرفتار اور کرشمۂ قدرت کے اُمیدوار ہیں - حالانکہ قدرت (اللہ) صرف انکی مدد کرتی ہے جو اپنے آپ کو امداد کا مستحق ثابت کردیتے ہیں -

نظم بر صفحہ ١١٨

حلّ لغات اور شرح مشکلات ہم بغل - واصل یا متحد + دریا سے مراد ہے ذات الٰہی + قطرۂ بے تاب سے مراد ہے انسان - واضح ہو کہ فلسفۂ وحدۃ الوجود میں خدا کو دریا اور انسان کو قطرہ سے تشبیہہ دیتے ہیں - اور مقصدِ حیات یہ ہے کہ قطرہ دریا میں شامل ہوجائے + پہلے گوہر تھا - انسان، بلحاظ ذات، گوہر (روح) ہے مادی نہیں ہے + گوہر نایاب - نایاب کے دو معنی ہیں (١) لغوی معنی

وہ شئے جس کا وجود نہ ہو - جو کہیں پائی نہ جائے - جب انسان خدا سے واصل ہوجاتا ہے تو اسکا ذاتی وجود باقی نہیں رہتا (٢) مجازی معنی قیمتی گوہر، جب انسان واصل بحق ہوجاتا ہے، تو خود خدا ہوجاتا ہے اور اس لحاظ سے وہ بلاشبہ "گوہر نایاب" بن جاتا ہے + کس ادا سے! یعنی کیسے دلپذیر انداز سے + دانۂ رنگ و بو - یعنی اس کائنات کی حقیقت + اسیرِ امتیازِ رنگ و بو - یعنی میں ابھی تک حقیقت سے ناآشنا ہوں -

نوٹ:- حقیقتِ کائنات یہ ہے کہ اسکی کوئی حقیقت نہیں ہے - حقیقت صرف خدا کی ہے جو واحد ہے - یعنی خدا کا وجود حقیقی ہے - کائنات کا وجود غیر حقیقی ہے، اور یہ جو کچھ نظر آتا ہے، بظاہر کثرت ہے، بباطن وحدت ہے، بظاہر اختلاف ہے، بباطن اتحاد ہے - جاہل آدمی، امتیازات میں اسیر ہے یعنی یہ میری کتاب ہے، وہ زید کا قلم ہے، یہ مکان میرا ہے یہ مکان تیرا ہے، یہ میرا بیٹا ہے وہ تیری بیٹی ہے - یہ ہندو ہے وہ مسلمان ہے - یہ میرا دوست ہے وہ میرا دشمن ہے - وغیرہ وغیرہ - لیکن جس شخص پر راز رنگ و بو (کائنات کی حقیقت) عیاں ہوجاتا ہے وہ جانتا ہے کہ یہ امتیازات سب اعتباری ہیں درحقیقت کسی شئے کا وجود ہی نہیں تو یہ امتیازات کا وجود کہاں سے، اور کیسے ثابت ہوسکتا ہے - تو پھر ہے کیا؟ وہی ایک ذات پاک جو پھول میں بھی ہے اور کانٹے میں بھی - بقول اقبالؔ ع

تارے میں وہ قمر میں وہ جلوہ گہہ سحر میں وہ

غوغا بمعنی شور و غل + شورش محشر - بمعنی قیامت کا ہنگامہ + شرارہ - بمعنی چنگاری + آتش خانۂ آذر - آذر حضرت ابراہیمؑ کے باپ کا نام تھا، جو بت پرست تھے سا اس سے مراد آتش کدہ بھی ہوسکتی ہے، اور وہ خاص آگ بھی جو حضرت

ابراہیم کو جلانے کیلئے تیار کی گئی تھی۔ مطلب یہ ہے کہ جب انسان مرجاتا ہے تو بظاہر اسکی روح کا شرارہ بجھ جاتا ہے لیکن دراصل وہ واصل باللہ ہو کر آتش کدہ (مرکز حیات) بنجاتا ہے + نفی ہستی بمعنی اپنی ہستی کی نفی کر دینا - یہ فنائے کلی کا مقام ہے۔ یعنی وہ حالت جب سالک اپنی ہستی کو، بواسطۂ مرشد کامل خدا کی ہستی میں فنا کر دیتا ہے، جس طرح لوہا آگ میں پڑ کر، اپنی ہستی کو آگ میں فنا کر دیتا ہے۔ واضح ہو کہ جب سالک اپنی ہستی خدا میں اس طرح فنا کر دیتا ہے تو اس میں خدائی صفات کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے + کرشمہ - دلکش ادا یا قابل تحسین فعل + دلِ آگاہ - وہ شخص، جو اپنی اور اس کائنات کی حقیقت سے آگاہ ہو، اور پہلے واضح کر چکا ہوں کہ انسان اور کائنات دونوں کی کوئی حقیقت (واقعیت یا اصلیت) نہیں ہے۔ جو کچھ نظر آتا ہے یہ سب فریبِ نظر ہے + لا کے دریا میں نہاں الخ صداقت کے لحاظ سے، ساری کتاب میں اس مصرع کا جواب نہیں ہے۔ بخوف طوالت صرف اسقدر مطلب لکھنا کافی ہے کہ اگر کسی شخص کو اللہ سے ملنے کی آرزو ہو تو اُسے اپنی اور کائنات کی نفی کرنی لازمی ہے - بالفاظ دگر اِلاّ اللہ تک پہنچنے کے لئے اُسے لا کی منزل سے گزرنا ہوگا۔ اللہ کو وہ شخص پا سکتا ہے جو پہلے اپنی ہستی کو، بواسطۂ مرشد، اسکی ہستی میں فنا کر دے۔ اس فنا کے بعد پھر بقا ملیگی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اسکے بعد پھر بقا ہی بقا ہے۔ کیونکہ قطرہ جب دریا میں مل گیا تو پھر فنا کہاں؟ چشم نابینا - دل آگاہ کی ضد ہے۔ یعنی وہ شخص جو اپنی اور کائنات کی حقیقت سے آگاہ نہیں ہے۔ جو اپنے آپ کو اور اس کائنات کو بھی موجود سمجھتا ہے۔ ایسا شخص تصوف کے نقطۂ نگاہ سے اندھا ہے۔ اور اسلئے وہ انجام کے مفہوم سے ناواقف ہے۔ دیکھو لو! اگر سیماب (پارہ) سے تڑپ زائل ہو جائے تو اس میں اور کچھ چاندی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یعنی سیماب، اگر اضطراب چھوڑ دے، تو اپنی حقیقت سے دور ہو جائیگا۔

اسی طرح اگر انسان، خدا سے ملنے (واصل ہونے) کی آرزو چھوڑ دے، اگر عشق الٰہی سے دستبردار ہو جائے تو پھر اپنی حقیقت سے بیگانہ ہو جائیگا - انسان کا انجام یہ ہے کہ وہ عشق الٰہی کی بھٹی میں اپنی ہستی کو فنا کر دے۔ اس فنا میں اسکے لئے بقا کا پیغام پوشیدہ ہے - لیکن مادہ پرست انسان اس نکتہ کو نہیں سمجھ سکتا + مستیٔ تسنیم عشق - یعنی شراب عشق کی مستی - تسنیم جنت کی ایک نہر کا نام ہے +

تبصرہ | اس نظم میں اقبال نے سوامی رام تیرتھ کی خدمت میں خراج عقیدت پیش کیا ہے - سطحی نگاہ رکھنے والوں کے دل میں شاید یہ شبہ پیدا ہو کہ سوامی جی تو ہندو تھے - پھر اقبال نے انکی وفات پر اپنی محبت کا اظہار کیوں کیا؟ اسکا جواب یہ ہے کہ ع پروانہ، چراغِ حرم و دیر نداند - یعنی اقبال مسلکِ عشق کے قائل ہیں اور سوامی جی بھی اسی راہ پر گامزن تھے۔ تو اختلاف کیسا؟ اسکی تفصیل یہ ہے کہ سوامی جی یہ کہتے تھے کہ

ایشور (اللہ) بھگتی (محبت) سے مل سکتا ہے - اور اقبال یہ کہتے ہیں کہ اللہ (ایشور) محبت (بھگتی) سے مل سکتا ہے۔ تو دراصل دونوں ایک ہی مسلک پر عامل ہیں۔

سوامی جی کا اصلی نام تیرتھ رام تھا - وہ ۱۸۷۳ء میں ضلع گوجرانوالہ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے تھے - ان کے والدین بہت غریب تھے - اسلئے انہوں نے بہت عسرت کی حالت میں تعلیم حاصل کی - انٹرنس پاس کرنے کے بعد وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے - ٹیوشن کے ذریعہ سے انہوں نے ایم اے (ریاضی) پاس کیا اور مشن کالج لاہور میں ریاضی کے پروفیسر مقرر ہو گئے - ویدانت کا رنگ شروع ہی سے ان پر چڑھا ہوا تھا - عمر کے ساتھ ساتھ یہ رنگ اور بھی گہرا ہوتا گیا جب اُن پر رام کی محبت کا غلبہ ہوتا تھا تو وہ ہفتوں بارہ دری کامران (کنارِ دریائے راوی) میں عالم محویت میں بیٹھے رہتے تھے - اور کبھی کبھی دریا کے کنارے کنارے اپنے محبوب کو ڈھونڈھتے ہوئے دور نکل جاتے تھے - کچھ دنوں کے بعد اُن کی رام بھگتی (رام سے عشق) کا شہرہ ہوگیا اور یہ حالت ہوئی کہ لاہور کے بڑے بڑے دولتمند (عورتیں اور مرد) اُن کے نقوش کف پا کو آنکھوں سے لگاتے تھے۔ بخوف طوالت انکے سوانح حیات تو درج کر نہیں سکتا، صرف اسقدر لکھتا ہوں کہ سنہ ۱۹۰۶ء میں وہ حسب معمول موسمی تعطیلات بسر کرنے کے لئے ہردوار (ضلع سہارنپور) گئے ہوئے تھے - ایک دن وہ اپنے شاگردوں اور عقیدتمندوں کے ہجوم میں دریائے گنگا کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے - اور ویدانت کے دریا بہا رہے تھے - یکایک انہوں نے اشنان کا ارادہ ظاہر کیا - اور تیرتے ہوئے دور تک نکل گئے - اسی حالت میں اُن پر رام کی محبت کا غلبہ ہوا - اور اُنہوں نے عین دریا میں سمادھی لگادی۔ یعنی اُن پر حالت جذب و مستی طاری ہو گئی - نتیجہ یہ نکلا کہ وہ لہروں میں غرق ہو گئے - تین دن کے بعد اُن کی نعش خود بخود کنارے سے آ لگی - جسے اُنکے عقیدتمندوں نے بڑے احترام کے ساتھ نذرِ آتش کر دیا۔

نوٹ :- سمادھی لگانا، ویدانت کی اصطلاح ہے۔ اس سے مراد ہے عاشق (بھگت) کا یہ تصور کرنا کہ محبوب مجھ سے جدا نہیں ہے بلکہ میرے گھٹ میں سمایا ہوا ہے - کچھ عرصہ کے بعد عاشق خود محبوب بن جاتا ہے - یعنی "او در من و من در او" والا معاملہ ہو جاتا ہے ۱۲

سوامی جی اور اقبال میں فرق یہ ہے کہ اقبال نے تصوف کے اُصول پر عمل نہیں کیا، لیکن سوامی جی نے ویدانت پر عمل کر کے دنیا کو دکھا دیا - چنانچہ اقبال نے اس نظم میں خود اس بات کا اعتراف کیا ہے :-

آہ کھولا کس ادا سے تو نے رازِ رنگ و بو   میں ابھی تک ہوں اسیرِ امتیازِ رنگ و بو

خلاصہ کلام یہ ہے کہ سوامی جی اور اقبال دونوں مسلک وحدۃ الوجود کے قائل ہیں فرق یہ ہے کہ سوامی جی نے جو زبان سے کہا اُس پر عمل کر کے بھی دکھا دیا -

نظم کا مطلب | بظاہر یہ نظم مشکل نہیں ہے، لیکن اس میں اقبال نے وحدۃ الوجود (ویدانت) کے بعض رموز و نکات بیان کئے ہیں، انکی وجہ سے اشعار کا مطلب دشوار ہو گیا ہے - اسلئے میری رائے میں یہ نظم بہت غور سے پڑھنے کے لائق ہے - کہتے ہیں کہ

(۱) سوامی جی نے وفات نہیں پائی بلکہ قطرہ (روح یا آتما) دریا (پرماتما یا خدا) سے مل گیا اس مصرع میں اقبال نے ویدانت کی بنیادی تعلیم بیان کر دی ہے - انسان کی روح کا خدا سے وہی رشتہ ہے جو قطرہ کا دریا سے ہے - یعنی انسان اور خدا دونوں کی اصل ایک ہی ہے، جس طرح قطرہ اور دریا کی - دریا قطروں کے مجموعہ ہی کا دوسرا نام ہے سوامی جی وفات یا وصال سے پہلے اگر بمنزلہ گوہر تھے تو واصل ہو کر گوہر نایاب بن گئے - یعنی خدا سے واصل ہو کر خود خدا ہو گئے - اقبال نے خدا کو گوہر نایاب سے تشبیہ دی ہے کیونکہ گوہر نایاب اُسے کہتے ہیں جسکی نظیر نہ مل سکے اور خدا کا مثیل بھی ناممکن ہے -

(۲) سوامی جی نے اپنے طرز عمل سے (تصوف یا ویدانت سراسر عمل کا نام ہے) - اس کائنات کا راز فاش کر دیا - یعنی اسکی حقیقت سے آگاہی حاصل کر لی - وہ کیا؟ یہ کہ یہ کائنات، سراسر فریب نظر ہے - اسکی کوئی حقیقت نہیں ہے بالکل دھوکہ کی ٹٹی ہے صرف اللہ (پرم آتما) موجود ہے - اسکے سوا اور کوئی شئے موجود نہیں ہے - اور جو کچھ نظر آتا ہے، پھول، کانٹے، عورت مرد، وحوش وطیور، ہندو مسلمان، دوست دشمن؛ یہ سب اُسی ذاتِ واحد کی تجلیات کا پرتو یا عکس ہے -

(۳) جب انسان مرجاتا ہے تو بظاہر اسکی زندگی کا غوغا مٹ جاتا ہے، لیکن دراصل وہ انسان، شورشِ محشر بن جاتا ہے - یعنی اسکی زندگی میں بدرجہا زیادہ شدت اور طاقت پیدا ہو جاتی ہے - (شورش محشر، غوغائے زندگی سے بدرجہا زیادہ شدید

ہوتی ہے) اور اسکی وجہ یہ ہے کہ انسانی زندگی مرنے کے بعد خدائی زندگی سے واصل ہوجاتی ہے۔ قطرہ جب دریا میں مل جاتا ہے تو اس میں بھی پورے دریا کے سیلان کی طاقت پیدا ہوجاتی ہے۔

(۴) اپنی ہستی کی نفی وہی شخص کرسکتا ہے جو حقیقت سے آگاہ ہوجاتا ہے۔ اور حقیقت کیا ہے؟ یہ کہ اِلّا اللّٰہ کا موتی، لا کے دریا میں پوشیدہ ہے۔ یعنی اگر کسی کو اللہ سے ملنے کی خواہش ہو تو پہلے اپنے آپ کو فنا کردے۔ اسی کو نفیٔ ہستی کہتے ہیں سوال یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو فنا کس طرح کرے؟ اسکا جواب تو بہت تفصیل طلب ہے جسکی متحمل یہ شرح نہیں ہوسکتی۔ مختصر یہ ہے کہ جس طرح لوہا جب آگ میں پڑ کر اپنی ہستی کو فنا کردیتا ہے تو اُسے دوبارہ نئی زندگی حاصل ہوتی ہے اور وہ زندگی ایسی ہوتی ہے کہ لوہا خود آگ ہوجاتا ہے۔ اسی طرح جب سالک اپنی ہستی کو عشق الٰہی کی آگ میں جلاکر فنا کردیتا ہے تو اُسے فنا کے بعد نئی زندگی حاصل ہوجاتی ہے۔ اور وہ زندگی ایسی ہوتی ہے کہ سالک خود خدا بن جاتا ہے۔ اور وہ یہ دیکھکر حیران رہ جاتا ہے کہ میں جسے ڈھونڈتا تھا وہ تو میرے اندر ہی پوشیدہ تھا۔

جنہیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں
وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں

اب اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ لَا کی منزل سے اِلَّا کی منزل کیسے نصیب ہوسکتی ہے، یعنی فنا سے بقا کیسے حاصل ہوسکتی ہے؟ تو اسکا صاف اور سیدھا جواب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص آپ سے یہ پوچھے کہ ہائیڈروجن اور آکسیجن کے ملانے سے پانی کیسے بن جاتا ہے تو اسکے علاوہ آپ اور کیا جواب دے سکتے ہیں کہ تجربہ گاہ میں ملاکر دیکھ لو۔ اور ملانے کا طریقہ کسی پروفیسر سے پوچھ لو۔ وہ بتا سکتا ہے کہ ان دونوں غازوں (گیسوں) کو کس تناسب سے ملایا جائے۔ اسی طرح میں

سائل کو یہ جواب دونگا کہ کسی خانقاہ میں بیٹھکر دیکھ لو، اور فنا ہونے کا طریقہ کسی شیخ سے دریافت کرلو، وہ بتا سکتا ہے کہ فنا فی اللہ کیسے ہوسکتے ہیں سچ

کس طرح جاتا ہے دل، بیدل سے پوچھا چاہئے

(۵) جو لوگ نابینا (حقیقت سے ناواقف) ہیں، وہ حیات انسانی کے انجام سے آگاہ نہیں ہوسکتے۔ انسان کا انجام یہ ہے کہ وہ ہمیشہ عشق الٰہی کی آگ میں جلتا رہے اور تڑپتا رہے۔ سیماب سے اگر تڑپ کی کیفیت زائل ہوجائے تو پھر وہ سیماب نہیں، بلکہ سیم خام بنجائیگا۔ اسی طرح اگر روح سے عشق کی صفت زائل ہوجائے تو روح اپنی ذات کے تقاضے سے محروم ہوجائیگی یعنی اپنے مرتبہ سے گرجائیگی۔

واضح ہو کہ اقبالؔ کی نظر میں انجام (فنا) کا مطلب، فنائے ذات نہیں ہے۔ یعنی فنا سے انکی مراد، مٹ جانا یا نیست ونابود ہوجانا نہیں ہے، بلکہ "فنا" تصوف کی اصطلاح میں وہ حالت ہے جبکہ سالک اپنی خواہشات، کو بکلی خدا کی مرضی کے تابع کردیتا ہے۔ یعنی مطیع کامل ہوجاتا ہے۔ اور یہ مسلّم ہے کہ اطاعت محبت کے بغیر ناممکن ہے۔ اسی لئے تصوف میں عشق (محبت) کو شرط اوّلین قرار دیا گیا ہے۔ اقبالؔ کی رائے میں عاشق کا انجام، فنا (نیستی) نہیں ہے، بلکہ مسلسل اضطراب ہے۔ چنانچہ اس حقیقت کو اُنہوں نے سیماب کی مثال سے واضح کردیا ہے۔

(۶) عشق وہ طاقت ہے جسکی بدولت ہستی کا بُت ٹوٹ جاتا ہے۔ یعنی عشق کی بدولت، سالک اپنی ہستی کو خدا کی مرضی میں فنا کردیتا ہے۔ واضح ہو کہ اپنی ہستی کو کسی کی مرضی میں فنا کردینا بہت مشکل ہے۔ کیونکہ ہر شخص کی خودی کا تقاضا یہ ہے کہ دوسرے میری اطاعت کریں۔ لیکن عشق وہ طاقت ہے کہ اسکی بدولت انسان، اپنی خواہشات کو خدا کی مرضی کے سامنے فنا کردیتا ہے۔ مثلاً نفس امّارہ کہتا ہے کہ پہلے رشوت کے ذریعہ سے دولت حاصل کرو، پھر ہوٹلوں میں جاکر اُس

دولت کے ذریعے عورت حاصل کرو۔ لیکن خدا کہتا ہے کہ رشوت بھی حرام ہے اور غیر منکوحہ عورت بھی حرام ہے اسلئے دونوں سے اجتناب کرو۔ اب اگر کوئی مسلمان (جسے موجودہ دور میں رجعت پسند کہا جاتا ہے) خدا کے حکم پر عمل کرے تو تصوّف کی اصطلاح میں ہم یوں کہتے ہیں کہ اُس نے اپنی مرضی کو خدا کی مرضی میں فنا کردیا۔ اس فنا کا ثمرہ بقا ہے۔

دوسرے مصرع میں، اقبالؔ نے "دارو" کو مذکر باندھا ہے۔ لیکن میں اسے مؤنث سمجھتا ہوں۔ کہتے ہیں کہ عشق حقیقی کی مستی (مدہوشی) دراصل ہوش کی دارو ہے، یعنی عشقِ حقیقی، انسان کے اندر صحیح شعور یا معرفت کا رنگ پیدا کردیتا ہے۔

واضح ہو کہ عام طور سے مستی، ہوش وحواس کو زائل کردیتی ہے۔ لیکن عشق کی مستی میں عجیب خاصیت ہے، اسکی بدولت انسان کو ہوش آجاتا ہے۔ یعنی وہ اپنی حقیقت سے آگاہ ہوجاتا ہے۔ یہ نکتہ مدنظر ہے کہ صوفی کے زاویۂ نگاہ سے صرف وہ شخص ذی ہوش، یا صاحب شعور ہے، جو عشق الٰہی میں سرشار ہو۔ اور جو عاشق نہیں ہے وہ ہوش وخرد سے محروم ہے۔ اس مصرع کی خوبی اسی نکتہ سنجی پر منحصر ہے۔

نظم بر ص۱۱۹

حلّ لغات اور شرح مشکلات واضح ہو کہ اقبالؔ نے یہ نظم از اوّل تا آخر، رمز وایما کے پردہ میں لکھی ہے۔ اسلئے ساری نظم میں، کسی لفظ کے حقیقی یا لغوی معنی مراد نہیں ہیں۔ اوروں سے ارباب خرد یا پیروانِ مسلکِ عقل مراد ہیں + میرا پیام اور ہے۔ یعنی اقبالؔ قوم کو عشق کا درس دینا چاہتے ہیں + طائرِ زیرِ دام سے (۱) غلام یا محکوم (۲) یا عقل پرست شخص مراد ہے + طائرِ بام سے مردِ مومن

مراد ہے + رازِ حیات، یعنی زندگی کی اصلیت یا حقیقت + سکون سے ویدانت کی تعلیم مراد ہے، جسکی رو سے نجات کا انحصار معرفت پر ہے۔ معرفت حاصل کرنے کے لئے مراقبہ (دھیان) ضروری ہے۔ اور مراقبہ کے لئے سکون شرط ہے۔ اسلئے، لفظ سکون پورے ویدانتی نظام پر حاوی ہے + مور بمعنی چیونٹی + لطفِ خرام یہ سکون کی ضد ہے، اور اس سے جد وجہد (عمل صالح) مراد ہے۔ واضح ہو کہ کوہ مجسم سکون ہے۔ اور چیونٹی مجسم جد وجہد ہے + جذب حرم سے عشق رسولؐ یا عشق اسلام مراد ہے + فروغ بمعنی آب وتاب، ترقی، رونق، عروج، + انجمن حجاز سے ملت اسلامیہ مراد ہے + مقام سے مرتبہ یا اعزاز یا درجۂ بلند مراد ہے + نظام سے وہ بنیادی اُصول مراد ہیں، جن پر دین اسلام مبنی اور موقوف ہے + ذوقِ طلب سے وہی عشق رسولؐ مراد ہے + گردشِ آدمی سے حالت عشق ومستی مراد ہے + گردشِ جام سے، عیش وعشرت کی زندگی مراد ہے + سوز سے عشق حقیقی مراد ہے + ساز سے کامیابی مراد ہے: واضح ہو کہ اقبالؔ نے ان دو لفظوں کو اپنی ہر کتاب میں استعمال کیا ہے اور مختلف معانی مراد لئے ہیں۔ یہاں اس شعر میں سوز وساز سے یہی مفہوم ظاہر ہوتا ہے + غمکدۂ نمود سے یہ دنیا مراد ہے۔ اقبالؔ نے ان دو لفظوں میں اس دنیا کی حقیقت بھی واضح کردی ہے:-

(۱) غمکدہ اسلئے کہا کہ یہاں ہر شخص جس قدر زیادہ دنیا میں منہمک ہوتا ہے اسی قدر زیادہ غمگین رنجیدہ اور پریشان ہوتا ہے، جس کا جی چاہے تجربہ کرکے دیکھ لے۔

(۲) نمود اسلئے کہا کہ اس دنیا کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ یہ صرف نظر آتی ہے۔ نمود کے لفظی معنی ہیں نمائش یا دکھاوا یا ظہور۔ دنیا صرف دکھائی دیتی ہے دراصل موجود نہیں ہے۔ اس نکتہ کو قبل ازیں واضح کرچکا ہوں۔

شرطِ دوام، بمعنی ابدی زندگی حاصل کرنے کی شرط + بادہ سے عشق رسولؐ یا

اسلامی انقلاب برپا کرنے کا جذبہ مراد ہے + بادہ ہے تیم رس ابھی - ابھی شراب میں نشہ کی کیفیت پورے طور سے پیدا نہیں ہوئی ہے + شوق ہے نارسا ابھی - ابھی عشق میں پختگی کا رنگ پیدا نہیں ہوا ہے + مصرع کا مطلب یہ ہے کہ ابھی ملتِ اسلامیۂ ہندیہ کے افراد کے اندر اسلامی انقلاب برپا کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوئی ہے + خُم بمعنی مٹکا شراب کا - مراد ہے ملت اسلامیہ یا علی گڑھ کالج کے مسلمان طلبہ + خشتِ کلیسا ، بمعنی گرجہ کی اینٹ - مراد ہے (۱) انگریز پرنسپل یا (۲) انگریزی حکومت یا (۳) انگریزی تعلیم و تربیت یا کافرانہ نظام تعلیم +

تبصرہ | یہ نظم اقبال نے ۱۹۰۷ء میں لکھی تھی - اس میں خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے پہلی مرتبہ اپنی قوم کے نوجوانوں سے خطاب کیا ہے - اور انہیں ، وہ پیغام دیا ہے جو انکی شاعری اور اُن کے فلسفہ کی ساری کائنات ہے یعنی عشقِ رسول ؐ کا پیغام - اسی بات نے اُنہیں مسلمانوں کی آنکھ کا تارا بنا دیا ، اور اُن کے کلام کو سندِ دوام عطا کر دی - واضح ہو کہ ۱۹۰۷ء کا زمانہ ہندوستان میں علی العموم اور بنگال میں علی الخصوص ، سیاسی شورش کا زمانہ تھا - چونکہ مسلمانانِ ہند کے سامنے کوئی نصب العین نہیں تھا ، اور اُن کے گمراہ ہو جانے کا فوری اندیشہ تھا اسلئے اقبال نے قوم کے نوجوانوں کو عشق اور عمل کا پیغام دیا - اس نظم میں ہمیں اُن تصورات کا ابتدائی نقش نظر آتا ہے جنہوں نے آگے چل کر ایک منظم فلسفۂ زندگی کی صورت اختیار کر لی - بالفاظ دگر اس نظم میں وہ چنگاریاں پوشیدہ ہیں جو کچھ عرصہ کے بعد شعلہ بن گئی -

اس نظم کا مفہوم پہلے شعر میں پوشیدہ ہے - یعنی اگر پہلے شعر کا مطلب سمجھ لیا جائے تو ساری نظم کا مطلب سمجھ میں آجائیگا - کہتے ہیں کہ ارباب عقل ، قوم کو یہ تلقین کرتے ہیں کہ عقل کی پیروی کرو ، لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ عشق کا اتباع کرو - بالفاظ دیگر

اس نظم میں عقل اور عشق کا موازنہ پیش کیا ہے - یہ اقبال کا وہ محبوب موضوع ہے جسے انہوں نے پیام مشرق سے لیکر ارمغان حجاز تک ہر کتاب میں بیان کیا ہے - یعنی عقل پر عشق کی برتری - اب سوال یہ ہے کہ مسلکِ عقل اور مسلکِ عشق میں کیا فرق ہے؟ اسکا جواب تو بہت تفصیل طلب ہے - مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ مسلکِ عقل سے شریعت کے ظاہری پہلو کی اتباع مراد ہے - اور مسلکِ عشق میں ظاہری پہلو کے علاوہ باطنی پہلو کی اتباع بھی شامل ہے - اسکو ایک مثال سے واضح کرتا ہوں - مثلاً زید ، شریعت کے ظاہری ارکان - نماز ، روزہ ، زکوٰۃ اور حج ، پر پابندی کے ساتھ عمل کرتا ہے ، تو اربابِ عقل (اور دل) کے نزدیک وہ اسلام کے تمام تقاضوں کو پورا کر رہا ہے - یہ طبقہ زید سے کسی مزید عمل کا مطالبہ نہیں کرتا - لیکن اربابِ عشق کے نزدیک ابھی زید کے ایمان میں نقص ہے - وہ یہ کہتے ہیں کہ زید حقیقی معنی میں اُس وقت مسلمان ہوگا جب اسکے اندر ، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر سر کٹانے کا جذبہ پیدا ہو جائے - پاکستان کے شاعر یکتا اور ملت اسلامیہ کے نامور فرزند حضرت مولانا ظفر علی خانصاحب قبلہ نے اسی نکتہ کو یوں بیان کیا ہے :-

نماز اچھی حج اچھا روزہ اچھا اور زکوٰۃ اچھی ۔۔۔ مگر میں باوجود ان کے مسلماں ہو نہیں سکتا
نہ جبتک کٹ مروں میں خواجۂ یثرب کی حرمت پر ۔۔۔ خدا شاہد ہے کامل میرا ایماں ہو نہیں سکتا

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مسلکِ عشق کی رو سے مسلمان کا ایمان اسوقت کامل ہو سکتا ہے ، جب وہ عشق رسول ؐ میں سرشار ہو کر اپنا تن من اور دھن سب کچھ سرکار دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں نذر کر دے -

ایک شخص پانچوں وقت کی نماز پڑھتا ہے - رمضان کے تیسوں روزے رکھتا ہے - ہر سال زکوٰۃ ادا کر دیتا ہے - اور بشرطِ استطاعت فریضۂ حج بھی بجا لاتا ہے لیکن جب اسلام کے نام پر سر کٹانے کا موقع آتا ہے تو بڑی خاموشی کے ساتھ ،

گھر کا دروازہ بند کر کے بیٹھ جاتا ہے - اقبال کی اصطلاح میں یہ شخص مسلکِ عقل پر گامزن ہے - کیونکہ عقل اُسے سمجھاتی ہے کہ اگر تو مارا گیا تو پھر تیرے بیوی بچے برباد ہو جائینگے - اقبال کہتے ہیں کہ اسکے بجائے مسلکِ عشق اختیار کرو ، جو یہ کہتا ہے کہ کچھ پرواہ نہیں ، اگر تیرے بیوی بچے برباد ہو جائیں ، اور تیرا سارا گھر لُٹ جائے مقصدِ حیات ، زن و فرزند نہیں بلکہ اسلام ہے - اسکی حفاظت اور بقاء کے لئے بے خطر میدان جہاد میں سرگرم دے -

(۱) اور دل یعنی عقل کے منشا ، پر چلنے والوں کی تلقین اور ہے (جو یہ ہے کہ دنیا میں خوب ترقی حاصل کرو ، دولت حاصل کرو ، عہدے حاصل کرو ، خطابات حاصل کرو) لیکن میں کچھ اور کہتا ہوں یعنی عقل والوں کے مسلک کے خلاف مسلکِ عشق اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہوں - اور عشق سے میری مراد عشق رسول ؐ ہے جس میں مسلمانوں کو نہ سرکار سے خطابات ملینگے - نہ جاگیریں ملینگی نہ عہدے ملینگے - اور نہ دولت ملیگی ، بلکہ جو کچھ پاس ہے اُسے بھی خدا اور رسول ؐ کی راہ میں خرچ کر دینا ہوگا - ورنہ ایمان کامل نہ ہوگا -

(۲) اے نوجوانو! تم اپنی قوم کے محکوم اور غلام رہنماؤں کی تقریریں تو بہت سُن چکے ہو ، اب ذرا ایک مومن کا پیام بھی سُن لو - دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ مردِ مومن کا پیغام ، غلام کے پیغام سے مختلف ہے -

(۳) عیش پسند ، عافیت کوش اور کاہل افراد یہ کہتے ہیں کہ سکون (بے عملی) ہی انسانی زندگی کا مقصد ہے - لیکن چیونٹی کی طرح جد و جہد کرنے والے اسکے خلاف یہ تلقین کرتے ہیں کہ زندگی کا حقیقی لطف جد و جہد اور کوشش میں پوشیدہ ہے -

(۴) ملت اسلامیہ کی ساری عزت ، عشق رسول ؐ پر منحصر ہے - اگر افراد قوم کے دل میں عشق رسول کا جذبہ کارفرما ہوگا تو قوم کو فروغ حاصل ہوگا - اے نوجوانو!

عشق رسول ؐ کا مقام بہت بلند ہے ، اور عشق ، انسان کی زندگی میں بہت بلند پایہ نظام پیدا کر دیتا ہے - عشق کا مقام اور اسکا قائم کردہ نظام ، دنیا کی ہر شئے سے اعلیٰ اور ارفع ہے -

(۵) اگر کسی شخص کے دل میں ذوق طلب نہو ، یعنی عشق رسول ؐ کا جذبہ موجزن نہو ، تو اسکا انجام فنا ہے - وہ شخص کبھی حیاتِ ابدی حاصل نہیں کر سکتا - یاد رکھو! گردش جام یعنی عیش و عشرت ، اور گردش آدمی یعنی جذبۂ محبت رسول ؐ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے - یاد رکھو کہ شراب کی مستی کو عشق رسول ؐ کی مستی سے کوئی نسبت نہیں ہے - اگرچہ مستی دونوں جگہ موجود ہے -

(۶) صبح ہوتے ، شمع نے اپنے ختم ہونے سے پہلے یہ نکتہ بیان کیا کہ اے اہل محفل! اگر زندگی کو کامیاب بنانا چاہتے ہو تو دل میں سوز پیدا کرو - کیونکہ سازِ حیات سوز و گداز پر موقوف ہے - جبتک عشق اختیار نہ کرو گے (سوز ، عشق کا لازمی نتیجہ ہے) تم مقصد حیات میں کامیاب نہیں ہو سکتے - یاد رکھو اس دنیا میں جو عمر کدہ نمود سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی - شرطِ دوام ہمیشگی کی زندگی کبھی حاصل نہیں ہو سکتی -

(۷) اے نوجوانو! تمہاری شراب (خواہشِ انقلاب) ابھی پختہ نہیں ہوئی ہے - اور تمہارا جذبۂ شوق (عشق رسول ؐ) بھی ابھی مرتبۂ کمال کو نہیں پہونچا ہے یعنی ابھی تمہارے اندر اسلامی انقلاب برپا کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوئی ہے اسلئے مصلحتاً تم ابھی کچھ عرصہ کے لئے اپنے کالج کا نظم و نسق انگریز پرنسپل (انگریزی حکومت) ہی کے ہاتھ میں رکھو -

نظم بر صفحہ ۱۳۰

حل لغات اور شرح مشکلات | ملی نگاہ - شاعر نے ستارۂ صبح (ایک خاص ستارہ

کانام ہے جو بہت روشن ہوتا ہے) کی روشنی کو نگاہ سے تعبیر کیا ہے + فرصتِ نظر نہ ملی - صورت حال یہ ہے کہ یہ ستارہ آخر شب یعنی ۴ بجے طلوع ہوتا ہے - اور صبح کے وقت جب آفتاب طلوع ہوتا ہے تو اسکی روشنی نورِ آفتاب میں گم ہو جاتی ہے - مطلب اس بند کا یہ ہے کہ ستارہ صبح کی زندگی بہت مختصر ہوتی ہے + بساط کیا ہے؟ یہاں بساط سے مراد طاقت یا حیثیت ہے - یعنی ستارۂ صبح کی کوئی حقیقت نہیں ہے - بس یوں سمجھو جیسے پانی کا بلبلہ یا شرارے کی چمک + زیورِ جبینِ سحر، صبح کی پیشانی کا زیور - سحر کو دلہن فرض کرکے، ستارۂ صبح کو اسکی پیشانی کا زیور قرار دیا ہے -

اس نظم کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کو غیر فانی ہونے کی آرزو ہو تو شیوۂ محبت اختیار کرے - اسکے ثبوت میں اقبال خود اپنے کلام کو پیش کرتے ہیں - اور کہتے ہیں کہ عشق نے میرے کلام کی بنیاد، مثل ابد، پائیدار کر دی ہے -

نظم بر صفحہ ۱۲۱

حلِّ لغات اور شرح مشکلات | پہلا بند، تشبیہِ مسلسل کی بہت عمدہ مثال ہے + کشتیٔ سیمیں قمر - چاند کی چاندی کی کشتی یعنی چاند + نورِ خورشید کے طوفان میں، یعنی سورج کی روشنی میں + مہتاب کا ہم رنگ - واضح ہو کہ کنول کا پھول چاند کی طرح سفید ہوتا ہے + جلوۂ طور سے اللہ کی صفات کی تجلی مراد ہے - جسکے سامنے حضرت موسیٰ کے ہاتھ کی سفیدی (یدِ بیضا) کی کوئی حقیقت نہیں ہے + شمیم، بمعنی خوشبو -

پہلے بند کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح سورج کی روشنی کے سامنے، چاند کی اور چاند کی روشنی کے سامنے کنول کی، اور جلوۂ طور کے سامنے یدِ بیضا کی اور باغ کی خوشبو کے سامنے، کلی کی کوئی حقیقت نہیں ہے - اسی طرح تیرے سیلِ محبت کے سامنے میرے دل کی کوئی حقیقت نہیں ہے - یعنی تو اسقدر حسین و جمیل ہے کہ تیری ایک نگاہ مجھے دیوانہ بنا دینے کے لئے کافی ہے +

تو جو محفل ہے، یعنی تیری ذات مرکزِ عشاق ہے + ہنگامۂ محفل ہوں میں، یعنی میرے دم سے تیری محفل کی رونق وابستہ ہے + اگر عاشق نہو، تو معشوق کی محفل سونی ہو جائیگی + حسن کی برق ہے تو، چونکہ معشوق، عاشق کے دل کو جلاتا ہے - اسلئے شاعر نے محبوب کو برق سے تشبیہہ دی ہے + عشق کا حاصل ہوں میں، یعنی میں بلحاظ عشقبازی، مرتبۂ کمال پر پہونچا ہوا ہوں + تو سحر ہے تو مرے اشک ہیں شبنم تیری - یعنی عاشق کی ذات، معشوق کے حسن کو درجۂ کمال تک پہونچاتی ہے - مثلاً اگر معشوق کو "سحر" قرار دیا جائے تو سحر کے لئے شبنم ضروری ہے - اگر شبنم نہو تو سحر کا وجود کیسے ثابت ہوگا؟ بس جس طرح شبنم سحر کا تکملہ ہے اسی طرح عاشق، معشوق کے لئے باعثِ تکمیل ذات ہے - عاشق نہو تو معشوق کا وجود کیسے ثابت ہوگا؟

دوسرے بند کا مطلب یہ ہے کہ اگر تو اپنے حسن میں بے نظیر ہے، تو میں اپنے عشق میں بے مثال ہوں - اگر تیرا کوئی ثانی نہیں ہے تو میرا بھی کوئی ثانی نہیں ہے + ہے مرے باغِ سخن کے لئے تو بادِ بہار - یعنی تیری محبت میرے دل میں بہترین شاعرانہ خیالات پیدا کرتی ہے - واضح ہو کہ عشق، شعر و شاعری کے لئے سب سے بڑا محرک ہے + میرے بیتاب تخیل کو دیا تونے قرار - یعنی تیری ذات میرے دل کی تسکین کا موجب ہے + نئے جوہر ہوئے پیدا میرے آئینہ میں - یعنی میرے دل میں اچھوتے خیالات پیدا ہونے لگے - حسن سے عشق کی فطرت کو ہے تحریکِ کمال - یعنی ذاتِ محبوب، عشق کو درجۂ کمال تک پہونچاتی ہے - اگر محبوب کی توجہ عاشق پر مبذول نہو، یا بدرجۂ اقل، اگر محبوب کی ذات، موجبِ تسکینِ قلبِ عاشق نہو تو عشق، مرتبۂ کمال کو نہیں پہونچ سکتا + نہال بمعنی پودا + قافلہ ہو گیا آسودۂ منزل میرا - یعنی تیری ذات میرے لئے باعثِ تسکین ہے +

اس بند میں شاعر نے یہ بتایا ہے کہ معشوق کی ذات، عاشق کے مخفی جوہروں (صلاحیتوں) کو ابھارتی ہے - اور اُسکو مرتبۂ کمال تک پہونچاتی ہے -

واضح ہو کہ یہ نظم، خالص رومانی شاعری کی مثال ہے - اور اقبال نے اس میں محبت کی جو خوبیاں بیان کی ہیں وہ شیلے اور کیٹس کے خیالات سے بہت ملتی جلتی ہیں - جیسا کہ سب جانتے ہیں شیلے (SHELLEY) کے نزدیک محبت ہی بنیادِ کائنات ہے - اجزائے کائنات کا ربطِ باہمی، اسی جذبۂ محبت پر موقوف ہے - بالفاظ دگر، اجزائے کائنات کی وابستگی کا دوسرا نام محبت ہے - جسکے بغیر اس کائنات کا وجود ناممکن ہے - اور انسانی زندگی ہر قسم کے کیف و سرور سے معرّا ہو جائیگی - جو شئے انسانیت کو میکانیت (MECHANISM) سے جدا کرتی ہے وہ یہی محبت تو ہے - اگر محبت نہو تو پھر انسان اور مشین میں کیا فرق ہے؟

نظم بر صفحہ ۱۲۲

حلِّ لغات اور شرح مشکلات | وزدیدہ نگاہی - یہ طرزِ دید - محبت کے آغاز کا ثبوت ہے - یعنی جب کوئی لڑکی کسی لڑکے سے محبت شروع کرتی ہے تو اسکی ابتدا اس طرح ہوتی ہے کہ وہ اُسے چھُپ چھُپ کر دیکھتی ہے - اور جب وہ اسکی طرف دیکھتا ہے تو فوراً آنکھیں چرُا لیتی ہے - یعنی دوسری طرف دیکھنے لگتی ہے + رمز، بمعنی طرز یا طریقہ + نیلی آنکھوں سے - یہ ترکیب اقبال کی قوتِ مشاہدہ پر دلالت کرتی ہے + ذکاوت، بمعنی دانائی عقلمندی + نورِ آگاہی سے روشن

تیری پہچان ہے کیا؟ اس مصرع کا مطلب یہ ہے کہ باطنی شعور کی بدولت تجھ میں حسن کی معرفت پیدا ہوگئی ہے - یعنی فطرت نے تجھے یہ صلاحیت عطا کر دی ہے کہ تو حسین اشیا، کو پہچان لیتی ہے + چڑھ بمعنی نفرت + اتار دیگے - یہ غلط ہے اسکی جگہ "اتار دیگی" ہونا چاہئے + تجسس، بمعنی تلاش + آہ! کیا تو بھی اُسی چیز کی سودائی ہے؟ یعنی کیا تجھے بھی "اُن" سے محبت ہے؟ حسن کا احساس، انسان سے خاص نہیں ہے، یعنی دنیا میں ہر ذی روح کے دل میں حسن کا احساس پایا جاتا ہے + شیشۂ دہر میں مانندِ مئے ناب ہے عشق، یعنی عشق کا جذبہ دنیا کی ہر شئے میں پوشیدہ ہے + خوابِ رگِ مہتاب ہے عشق، یعنی جذبۂ عشق، چاند کی رگوں میں بھی دوڑ رہا ہے یعنی سورج، چاند، گوہر، اشک، شبنم، غرضکہ دنیا کی ہر شئے میں اسکی جھلک پائی جاتی ہے + اس نظم کا خلاصہ یہ ہے کہ محبت وہ فطری جذبہ ہے جو ہر ذی روح میں پایا جاتا ہے -

نظم بر صفحہ ۱۲۳

حلِّ لغات اور شرح مشکلات | جب دکھاتی ہے سحر - یعنی جب صبح ہوتی ہے + کھول دیتی ہے کلی - یعنی کلی شگفتہ ہو کر پھول بن جاتی ہے + سینۂ زرین - کلی کے اندر زرد رنگ کا مادہ جمع ہوتا ہے، جسے عرفِ عام میں پھول کا زیرہ کہتے ہیں، اسکی وجہ سے اقبال نے کلی کے وسط کو سینۂ زرین (سنہرا) سے تعبیر کیا ہے + جلوہ آشام - لغوی معنی، جلوہ پینے والا - مراد ہے طالب جلوۂ خورشید - اقبال نے میخانہ کی رعایت سے آشام کا لفظ لائے ہیں + خورشید کے پیمانہ میں - یعنی کلی کی شگفتگی آفتاب کی روشنی پر موقوف ہے + سینہ شگافی کے مزے لیتی ہے - یہ شاعرانہ اندازِ بیان ہے - مطلب یہ ہے کہ کلی، آفتاب پر شیدا ہے - کیونکہ اسکی شگفتگی اور

تازگی سب اسکی روشنی پر موقوف ہے + میرے خورشید - یعنی اے میرے محبوب!
طرب اندوزِ حیات - یعنی میرا دل زندگی کی مسرت سے لبریز ہو جائیگا + جوہرِ اندیشہ
بمعنی اندیشہ یا قوتِ متفکرہ - شعرا عموماً اندیشہ کو "جوہر" سے تشبیہ دیا کرتے ہیں۔
کیونکہ جوہر وہ ہے جو بذاتِ خود قائم ہو - اور قوتِ متفکرہ بھی بذاتِ خود قائم ہے۔
غالب کہتے ہیں ؎

عرض کیجئے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

ہو عیاں جوہرِ اندیشہ میں پھر سوزِ حیات - یعنی اگر محبوب اپنی نقاب اُٹھا کر
شاعر کو اپنا جمال دکھا دے تو اسکا دل خوشی سے لبریز ہو جائیگا - اور اسکی
روح میں پھر زندگی کا سوز پیدا ہو جائیگا + "جانِ مضطر کی حقیقت کو نمایاں
کر دوں" بہت عمدہ مصرع ہے - کیونکہ جانِ مضطر کی حقیقت کو نمایاں کرنا ہے،
وہ اسطرح کہ عاشق کی جانِ مضطر کی حقیقت اسکے سوا اور کیا ہے کہ وہ ہر وقت
محبوب کا نظارہ کرتی رہے + دل کے پوشیدہ خیالوں کو عریاں کر دوں یعنی اپنے
جذباتِ عشق کا اظہار کر دوں - لیکن ان سب باتوں کے لئے محبوب کا نظارہ
شرطِ اولین ہے - اس نظم کا خلاصہ یہ ہے کہ اقبال اپنے محبوب سے خطاب کرتے
ہیں کہ جس طرح کلی کی شگفتگی آفتاب پر موقوف ہے - اسی طرح میرے دل کی شگفتگی
تیر نگاہ التفات پر منحصر ہے -

نظم ۱۲۵

حلِ لغات اور شرحِ مشکلات | دمِ سحر ہے - سحر کی پھونک سے، یعنی سحر سے،
مطلب یہ ہے کہ سحر کا وجود، تاروں کے حق میں پیامِ موت ہے اسلئے وہ دمِ سحر سے

ڈرتے ہیں + بیتاب ہے یعنی متحرک ہے + نہیں ہے یعنی دنیا میں سکون کہیں موجود
نہیں ہے - ستم کش سفر یعنی کائنات کی ہر شئے ہر وقت سفر میں ہے -

ہر شئے مسافر، ہر چیز راہی — کیا چاند تارے کیا مرغ و ماہی

مزرعِ شب کے خوشہ چینو - لغوی معنی رات کی کھیتی سے بالیاں چننے والو!
شاعر نے رات کو مزرع قرار دیکر تاروں کو خوشہ چیں باندھا ہے - یعنی تارے
رات ہی میں چمکتے ہیں - انکی زندگی رات پر منحصر ہے + اشہبِ زمانہ - زمانہ کا
گھوڑا - یعنی زمانہ + طلب کا تازیانہ - لغوی معنی، جب زمانہ کے گھوڑے پر خواہش
کا کوڑا پڑتا ہے تو وہ تیز دوڑتا ہے - مطلب یہ ہے کہ دنیا میں ہر شئے کو کسی نہ کسی
شئے کی طلب ہے - اور یہ طلب ہر شخص کو عمل پر آمادہ کرتی ہے، اور عمل، حرکت
کے بغیر ناممکن ہے + "مقام بے محل ہے" یعنی اس دنیا میں سکون (مقام) خلافِ
مصلحت ہے + قرار بمعنی سکون - واضح ہو کہ اقبال کے یہاں، حرکت میں زندگی
ہے - اور سکون میں موت ہے - اُنھوں نے اپنی ساری تصانیف میں
اسی حقیقت کو مختلف طریقوں سے واضح کیا ہے، چلنے والے نکل گئے ہیں - یعنی
جدوجہد کرنے والے کامیاب ہو جاتے ہیں - اور جو لوگ بے عمل ہیں وہ فنا ہو جاتے
ہیں + انجام ہے اس خرام کا حسن - یعنی جدوجہد کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان
کے اندر کمال (حسن) پیدا ہو جاتا ہے - پس جو شخص مرتبہ کمال حاصل کرنا چاہے
اُسے لازم ہے کہ اپنے نصب العین سے عشق اختیار کرے - عشق انسان
کو کامیابی سے ہمکنار کر دیتا ہے -

تبصرہ | بظاہر یہ بہت آسان نظم ہے - لیکن اس میں اقبال نے رمز و کنایہ
کے پردہ میں اپنا فلسفہ بیان کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ زندگی سراپا عمل اور
جدوجہد کا نام ہے - عملِ پیہم اور سعیِ مسلسل یہ زندگی اور ترقی کے لوازم ہیں

عمل، زندگی ہے - سکون، موت ہے - یعنی جو قومیں مصروفِ عمل ہیں وہ ترقی کرتی
ہیں - اور جو قومیں بے عمل ہیں وہ فنا ہو جاتی ہیں - جب کوئی قوم جدوجہد اور عمل
سے بیگانہ ہو جاتی ہے تو وہ دوسری قوم کی غلام ہو جاتی ہے - اسکی وجہ یہ ہے کہ
بے عملی سے اجتماعی احساس فنا ہو جاتا ہے اور جب یہ جوہر فنا ہو جاتا ہے تو ہر
فرد، ملت کی بقا سے غافل ہو کر اپنی انفرادی بقا کے لئے کوشش کرتا ہے - اور
وہ اس حقیقت سے بیگانہ ہو جاتا ہے کہ "فرد، قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں"
اسکا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہر فرد، اپنی جگہ، فنا ہو جاتا ہے، یعنی قوم کی ہستی کا چراغ
گُل ہو جاتا ہے - ہندی مسلمانوں کی گذشتہ تاریخ اس تلخ حقیقت پر شاہد ہے -
اسی لئے قرآن حکیم نے جہاد اور عمل صالح کو کامیابی کی شرط قرار دیا ہے - چونکہ اقبال
کا فلسفہ جس کو فلسفۂ خودی یا فلسفۂ عمل، یا فلسفۂ فقر کہتے ہیں، سراسر قرآن حکیم
سے ماخوذ ہے - اسلئے اُن کے یہاں بانگِ درا سے ارمغانِ حجاز تک ہر کتاب میں
جہاد - اور عمل ہی کا پیغام نظر آتا ہے - اس نظم کا خلاصہ یہ ہے کہ زندگی حرکت
(عمل) پر موقوف ہے +

نظم ۱۲۶

حلِ لغات اور شرحِ مشکلات | گُل سے شاعر کا محبوب مراد ہے + بلبل - گُل
کی رعایت سے ہمدم یا دوست کے لئے بلبل کا لفظ استعمال کیا ہے + چمن والوں سے
حلقۂ احباب مراد ہے + رنگین نوا - خوش الحان + ارتکابِ جرمِ الفت - کنایہ ہے
ہم آغوشی سے + نامرادی بمعنی ناکامی + محفلِ گُل، کنایہ ہے معشوق کی مجلس سے +
آئینہ دارِ شبِ دیجور - میری صبح، کالی رات کی طرح سیاہ تھی - آئینہ دار بمعنی
کنیز، جو کسی بیگم کو آئینہ دکھائے - مراد یہ ہے کہ میری صبح کالی رات کی خادمہ تھی -

یعنی اُسی کی طرح سیاہ تھی - مطلب یہ ہے کہ میں ناکام تھا + از نفس در سینۂ خوں گشتہ الخ
مطلب یہ ہے کہ چونکہ میں نامراد اور ناکام تھا، اور مایوسیوں کا شکار تھا، اسلئے ہر نفس
یعنی ہر سانس جو میرے خون سے لبریز سینہ کے اندر جاتی تھی، وہ سانس وہاں
جا کر نشتر کا کام کرتی تھی - اگرچہ بظاہر میں خاموش تھا - لیکن میرے دل میں
قیامت کا ہنگامہ پوشیدہ تھا -

تاثر کا جہاں یعنی عاشقانہ زندگی + کھیلتے ہیں بجلیوں کے ساتھ - یعنی میرے نالوں میں
غضب کی گرمی ہے - یا یہ کہ میرے نالوں میں بجلی کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے + غازۂ
اُلفت سے الخ مطلب یہ ہے کہ محبت نے میرے جسم کو مادیت اور کثافت سے پاک
کر کے منور کر دیا ہے + آئینہ میں عکسِ ہمدم الخ یعنی میرے وجود میں محبوب سما گیا ہے +
قید میں آیا یعنی جب میں نے عشق اختیار کیا تو بظاہر میں عشق کی قید میں آ گیا لیکن
بباطن مجھے تمام دنیا کی قیود سے آزادی حاصل ہو گئی + دل کے لُٹ جانے سے الخ
جب کوئی شخص عشق اختیار کرتا ہے تو بظاہر اسکا دل تباہ ہو جاتا ہے - لیکن در اصل
اُسے سارے جہاں کی دولت حاصل ہو جاتی ہے + ضو سے اُس خورشید کی الخ
خورشید سے محبت بھی مراد ہو سکتی ہے - اور ذاتِ محبوب بھی + اخترِ مرا تابندہ
ہے - یعنی میری زندگی کامیاب ہے - یا اسکا مطلب یہ ہے کہ میں اس عورت سے
محبت کرتا ہوں جو اسقدر حسین ہے کہ اسکی راہ کا غبار بھی چاندنی سے زیادہ دلکش
ہے + اے خنک روزے الخ مطلب یہ ہے کہ اے محبوب! تو نے مجھ پر ایک نظر ڈالی
اور ایک ہی نظر میں، مجھے محبت کے رموز و نکات سے آگاہ کر دیا - اور ایسا گرویدہ
بنا لیا کہ اب قیامت تک تیری محبت کا اثر زائل نہیں ہو سکتا - کس قدر مبارک
تھا وہ دن جب تو نے میرے جسم کو اپنی محبت کی آگ میں جلا کر خاک سیاہ کر دیا +

تبصرہ | اقبال نے یہ نظم ۱۹۰۸ء کے آغاز میں بمقام میونخ (MUNICH)

واقع ملک جرمنی لکھی تھی۔ جہاں سے انہوں نے فلسفہ میں پی۔ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری حاصل کی۔ اس میں خالص تغزل کا رنگ پایا جاتا ہے۔ شاعر نے بڑے دلکش انداز میں واردات عاشقی کا بیان کیا ہے۔ اور یہ بتایا ہے کہ لوگ جسے قید سمجھتے ہیں عاشق اُسکو آزادی سمجھتا ہے۔ لوگ جسے بربادی کہتے ہیں، عاشق کی نگاہ میں وہ سراسر آبادی ہے۔ الفت کے غازے میں یہ تاثیر ہے کہ خاک سیاہ آئینہ ہو جاتی ہے۔ یعنی محبت عاشق کو مادّیات سے بالاتر کر دیتی ہے۔

نظم بر صفحہ ۱۲۷

حلّ لغات اور شرح مشکلات نمود۔ لغوی معنی ظہور مراد ہے + نظیر، شبیہہ، یا نمونہ + حشیم ستارہ بیں، مراد ہے ماہر فلکیات یا ہیئت داں + صوفی نے جسکو دل کے الخ مراد ہے خدا کی قدرت کا جلوہ، جو صوفی کو اپنے دل میں نظر آتا ہے + قدرت کا بانکپن۔ یعنی قدرت (NATURE) کی کاریگری۔ مثلاً تتلی کے بازوؤ ہویدا بمعنی ظاہر + واضح ہو کہ جسکی چمک ہے پیدا، جسکی مہک الخ اس شعر میں صنعت لف و نشر مرتب ہے۔ یعنی اسکی تشریح یوں ہوگی، جسکی چمک، شبنم کے موتیوں میں پیدا ہے اور جسکی مہک پھولوں کے پیرہن میں ہویدا ہے " صحرا کو ہے بسایا الخ شاعر کو صحرا کی خاموشی میں بھی حسن نظر آتا ہے + ہنگامہ جس کے دم سے الخ یعنی بلاغ کی جو کچھ حسن نظر آتا ہے یہ سب فطرت کی کرشمہ سازی ہے + ہر شے میں ہے نمایاں الخ مطلب یہ ہے کہ فطرت کا حسن و جمال، کائنات کی ہر شے میں نظر آتا ہے۔ لیکن اس حسن و جمال کا کمال، محبوبہ کی آنکھوں میں نظر آتا ہے۔

اس نظم میں شاعر نے کمال خوبی کے ساتھ اپنی محبوبہ کی آنکھوں کی دلکشی کا بیان کیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ دنیا کی کوئی حسین شئے محبوبہ کی آنکھوں کی دلکشی کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ واضح ہو کہ اقبالؔ نے اس نظم میں بہت بڑی حقیقت کا اظہار کیا ہے۔ بلاشبہ دنیا کی کوئی شئے دلکشی میں آنکھ کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔

نظم بر صفحہ ۱۲۸

حلّ لغات اور شرح مشکلات مجموعۂ اضداد۔ اضداد جمع ہے ضد کی۔ لفظ ضد کو مثالوں سے سمجھ سکتے ہیں۔ جیسے زندگی ضد ہے موت کی۔ حادث ضد ہے قدیم کی۔ مجموعہ اضداد سے مراد یہ ہے کہ اقبالؔ کی طبیعت میں متضاد باتیں جمع ہوگئی ہیں۔ مثلاً وہ رونق محفل بھی ہے اور تنہا بھی ہے۔ زینت گلشن بھی ہے، آرائش صحرا بھی ہے۔ زمیں فرسا بھی ہے فلک پیما بھی ہے + رفعتِ پرواز سے بلندی تخیل مراد ہے + زمیں فرسا لغوی معنی زمین گھسنے والا، مراد ہے زمین پر چلنے والا + فلک پیما، لغوی معنی آسمان ناپنے والا، مراد ہے وہ شخص جسکے خیالات بہت بلند ہوں + رنگِ مشربِ مینا۔ یعنی شراب نوشی کا انداز یا طریقہ + حکمت آفریں بمعنی فلسفی۔ لیکن تجھے سودا بھی ہے۔ یعنی فلسفی (عقلمند) ہونے کے باوجود تو کچھ بیوقوف بھی ہے۔ یہاں سودا سے حماقت مراد ہے + جانبِ منزل رواں۔ یعنی تو سرگرم عمل ہے + اُفتادہ۔ رواں کی ضد ہے، بمعنی ساکن + حسنِ نسوانی ہے بجلی۔ یعنی تو عورتوں کے حسن سے متاثر ہو جاتا ہے + تیرا عشق بے پروا بھی ہے۔ یعنی تو اُنکی طرف مائل نہیں ہوتا + ہستی سے یہاں زندگی مراد ہے + آئین تفنن۔ تفریح یا دلگی کا انداز + تفنن کا مادّہ فن ہے۔ اسکے لغوی معنی ہیں مختلف النوع ہونا۔ یہاں ہنسی دلگی مراد ہے + شعر کا مطلب یہ ہے کہ تیری عاشقی میں دلگی کا رنگ نظر آتا ہے۔ آج ہندہ پہ مائل ہے، کل سعدیٰ پہ + ایک آستانہ پہ جبیں فرسا الخ مراد یہ ہے کہ تو کسی ایک محبوب سے مستقل طور پر محبت نہیں کرتا + آستانہ۔ کنایہ ہے، ذاتِ محبوب سے + تلوّن کیش۔ وہ شخص جس کا مذہب ہی تلوّن (رنگ بدلنا) ہو۔ جسے ایک طریقہ پر قرار نہ ہو۔ وہی مطلب ہے جو اوپر بیان ہو چکا۔ یعنی تو عاشق ہرجائی ہے۔

آشفتگی، پریشانی، یہ عشق کا لازمہ ہے + مشتِ خاک سے عاشق کی شخصیت مراد ہے۔ مجازی معنی جسم کے ہیں + زیر قبا۔ پیراہن کے اندر + مطلب یہ ہے کہ عشق کی آشفتگی نے میری شخصیت میں غیر محدودیت کی شان پیدا کر دی ہے + صحرا کنایہ ہے وسعت سے + ہیرا کنایہ قلب عاشق سے۔ ترشا ہوا۔ ہیرے کی قدر و قیمت اسکی تراش پر موقوف ہے۔ جسطرح ہیرے کے بہت سے پہلو ہوتے ہیں اُسی طرح دل پر ہزاروں کیفیات طاری ہوتی رہتی ہیں + چنانچہ اگلے مصرع میں، اقبالؔ نے خود شرح کر دی ہے کہ دل نہیں شاعر کا، ہے کیفیتوں کی رستخیز۔ رستخیز بمعنی ہنگامہ + بے نیازی سے ہے پیدا الخ مطلب یہ ہے کہ میں حسنِ مقید (وہ افراد جن میں حسن مطلق کی جھلک پائی جاتی ہے) سے چونکہ بے نیاز ہوں، اسلئے بے نیازی کی بدولت، میری فطرت میں حسنِ مطلق (ذاتِ خداوندی) کی آرزو (رنگ نیاز) پیدا ہو گئی۔ اس آرزو سے میرے اندر نیاز (طلب یا احتیاج) کا رنگ پیدا ہو گیا۔ اسلئے میں ہر وقت اُس حسن مطلق کی جستجو کرتا رہتا ہوں + موجب تسکیں تماشائے الخ اسکی تشریح یوں ہوگی " تماشائے شرارِ جستہ، موجب تسکیں نہیں ہو سکتا + تماشا شرارِ جستہ۔ لغوی معنی ہیں اُس چنگاری کا نظارہ، جو آگ سے نکلتی ہے، اور ایک لمحہ میں فنا ہو جاتی ہے۔ کنایہ ہے محبوب کے حسنِ فانی سے + دل برق آشنا رکھتا ہوں، برق کنایہ ہے حسن مطلق سے جسے فنا نہو۔ مطلب یہ ہے کہ میرا دل فانی حسینوں پر مائل نہیں ہے، بلکہ میں حسن مطلق کا طالب ہوں + ہر تقاضا عشق کی فطرت کا الخ یعنی میں اُس تجلی کامل کا آرزومند ہوں جس سے عشق کے تمام تقاضوں (خواہشوں) کی تسلّی ہو سکے + کُل سے حسن مطلق (ذات خداوندی) مراد ہے + اجزار سے وہ حسین افراد مراد ہیں جن میں اُس حسن مطلق کا جلوہ نظر آتا ہے + " حسنِ بے پایاں، دردِ لادوا رکھتا ہوں میں"۔ بہت بلیغ مصرع ہے۔ بلکہ ساری نظم کی جان ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میں بلحاظِ ذات، محدود ہوں، اور حسن مطلق، بلحاظ ذات غیر محدود (بے پایاں) ہے۔ اسکے باوجود میں اُس ذات غیر محدود کو حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ اور یہ ناممکن ہے کہ محدود، غیر محدود تک پہونچ جائے یا اُسے اپنے اندر جذب کرلے۔ اسلئے میرا درد لادوا ہے۔ اقبالؔ کے نزدیک رازِ حیات اسی نکتہ میں مضمر ہے۔ کہ انسان غیر محدود کو حاصل کرنے کی مسلسل کوشش کئے جائے۔ مقصد میں کامیابی ہو یا نہو، انسان کو اس عشق کی بدولت حیات ابدی حاصل ہو جائیگی۔ انہوں نے اسی نکتہ کو اگلی نظم میں وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ جس کا عنوان ہی " کوشش ناتمام " ہے اور اپنا فلسفہ اس نظم کے آخری شعر میں لکھدیا ہے:۔

رازِ حیات، پوچھ لے خضر خجستہ گام سے

زندہ ہر ایک چیز ہے کوششِ ناتمام سے

اقبالؔ کہتے ہیں کہ ابدی زندگی کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ عاشق، اپنے معشوق سے واصل نہو، اگر وصل ہو گیا کہ تو جد و جہد ختم ہو جائیگی۔ اور جب یہ ختم ہوگی تو زندگی ختم ہوگئی، یعنی عاشق پر فنا وارد ہو جائیگی۔ اس مضمون کو انہوں نے پیام مشرق میں یوں بیان کیا ہے:۔

تو نشناسی ہنوز شوق بمیرد ز وصل

چیست حیات دوام؟ سوختن ناتمام

یعنی اے مخاطب! تو ابھی تک اس نکتہ سے واقف نہیں ہوا ہے کہ وصل، عشق

کے لئے پیام موت ہے۔ ہمیشہ کی زندگی کیا ہے؟ مسلسل جلتے رہنا۔ چونکہ یہ شعر فلسفۂ اقبالؔ کے بنیادی تصور کا حامل ہے، اسلئے میں نے اسکی قدرے وضاحت کردی ہے۔ یہ مضمون اقبالؔ کی ہر تصنیف میں پایا جاتا ہے۔

زندگی الفت کی درد انجامیوں سے ہے الخ یعنی میری عاشقی میں "وصل" کا باب کہیں نہیں ہے۔ وہ تو سراسر دردِ فراق سے لبریز ہے + عشق کو آزادِ دستورِ وفا الخ یعنی میں کسی حُسنِ مقیّد (کسی خاص محبوب) کا پابند نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ میں تو ہر مقیّد میں حُسنِ مطلق کو تلاش کرتا ہوں۔ اور مطلق کہیں ملتا نہیں، اسلئے میں کسی مقید سے پیمان وفا نہیں باندھ سکتا + سچ اگر پوچھئے تو افلاسِ تخیل ہے الخ اے مخاطب! تو اگر سچ پوچھے تو کسی عاشق کا کسی خاص محبوب (حُسنِ مقید) سے پیمانِ وفا باندھنا، اس بات کی دلیل ہے کہ وہ قوتِ تخیلہ کی دولت سے محروم ہے۔ اسکی تفصیل یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مثلاً سُعدیٰ سے محبت کرتا ہے۔ اور اسکے علاوہ کسی دوسرے محبوب کی طرف متوجہ نہیں ہوتا، یا کسی اور کی تلاش نہیں کرتا تو اسکے معنی یہ ہیں کہ اسکے ذہن (تخیل) میں یہ بات کبھی نہیں آتی کہ جس محبوب سے میں نے پیمانِ وفا باندھا ہے، ممکن ہے، دنیا میں اُس سے خوبتر محبوب بھی کہیں موجود ہو۔ مطلب یہ ہے کہ حُسنِ مقید (خاص محبوب) پر قناعت کرلینا دلیل ہے اس بات کی کہ عاشق، حُسنِ مطلق کے تخیل سے بالکل محروم ہے + فیض ساقی شبنم آسا الخ یعنی شاعر کہتا ہے کہ صورتِ حال یہ ہے کہ میرا دل تو دریا (حُسنِ مطلق) کا طالب ہے۔ اور ساقی (خدا) کا فیض، شبنم (حُسنِ مقید) سے زیادہ نہیں ہے۔ اسلئے میں ہر وقت پیاسا (جویا) رہتا ہوں + آتش زیرپا، یعنی بیقرار + نقش ہوں، اپنے مصور سے گلا الخ مطلب یہ ہے کہ خدا نے مجھے پیدا تو کیا محدود طاقتوں کے ساتھ، اور غیر محدود کے حصول کی

آرزو، محدود دل میں رکھدی۔ اسلئے مجھے بجا طور پر اپنے مصوّر (خدا) سے شکایت ہے + محفلِ ہستی میں جب ایسا الخ مطلب یہ ہے کہ سابقہ مضمون کو باندازِ دگر باندھا ہے۔ یعنی جب دنیا میں حُسنِ مطلق کہیں نظر نہیں آتا۔ ہر جگہ حُسنِ مقید ہی پایا جاتا ہے۔ تو میں بجا طور پر یہ سوال کر سکتا ہوں، کہ پھر خدا نے مجھے غیر محدود تخیل کیوں عطا کردیا؟ یعنی حُسنِ مطلق (ذاتِ غیر محدود) کے حصول کی آرزو کیوں دل میں رکھدی؟ تنک جلوہ۔ وہ حُسن جس کا جلوہ چند روزہ ہو یعنی فانی ہو، تنک قلیل کے معنی میں آتا ہے + در بیابانِ طلب پیوستہ الخ ہم عاشقی کے میدان میں مسلسل کوشش کرتے رہتے ہیں۔ لیکن کامیاب نہیں ہوتے۔ کیونکہ کامیابی کے بعد جد وجہد ختم ہو جائیگی۔ اسلئے ہماری حالت سمندر کی موجوں کی سی ہے کہ تہِ دریا سے بلند ہوتی ہیں، اور ساحل سے ٹکراتی ہیں۔ اور انکا یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا جس طرح "شکست" موجوں کی ذات میں داخل ہے۔ اسی طرح ناکامی ہم محدود انسانوں کی ذات میں داخل ہے۔ محدود عاشق، غیر محدود معشوق کو بھلا کیسے اپنے اندر جذب کر سکتا ہے؟ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ اس "سوختن ناتمام" یا کوششِ ناتمام کی بدولت حیاتِ ابدی حاصل کر سکتا ہے۔ اور یہی انسانی زندگی کا مقصود ہے۔ اور یہی اقبالؔ کے فلسفہ کا خلاصہ ہے، جسکی تشریح میں اُنہوں نے ساری عمر بسر کردی۔

<u>تبصرہ</u> | یہ نظم اس لحاظ سے بہت غور طلب ہے کہ اس میں اقبالؔ نے فطرتِ انسانی کی ترجمانی کی ہے۔ انسان کی فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ "غیر محدود" کو جسے صوفیا "حُسنِ مطلق" سے تعبیر کرتے ہیں، اپنے اندر سمولینا یا جذب کرلینا چاہتا ہے۔ عاشقی کی اصطلاح میں یوں کہتے ہیں کہ عاشق یہ چاہتا ہے کہ معشوق اسکے اندر سما جائے۔ یہ چاہت اُسے ہر وقت، مثلِ صبا، مصروفِ جستجو رکھتی ہے۔

اس سعیٔ پیہم سے وہ اپنے محبوب سے قریب تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ یعنی تصوف کی اصطلاح میں اسکے اندر، محبوب کا رنگ پیدا ہوتا جاتا ہے جب اس رنگ میں شدت پیدا ہو جاتی ہے، تو عاشق بھی "زمان و مکان" سے بالاتر ہو جاتا ہے کیونکہ غیر محدود کی بنیادی صفت یہ ہے کہ وہ زمان و مکان کی قید سے بالاتر ہوتا ہے چونکہ محدود کبھی غیر محدود نہیں ہو سکتا، اسلئے عاشق کی جد وجہد کبھی ختم نہیں ہو سکتی اسکا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عاشق میں بھی شانِ ابدیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یعنی اُسے حیاتِ دوام کی نعمت حاصل ہو جاتی ہے۔ اور یہ سب کچھ عشق کی بدولت ممکن ہو سکتا ہے بس عشق ہی طبیب ہے، عشق ہی خضر ہے، عشق ہی رہنما ہے، عشق ہی سب کچھ ہے عشق ہی فانی کو غیر فانی۔ اور مقید کو مطلق اور محدود کو غیر محدود بنا سکتا ہے۔ بنا سکتا ہے بایں معنی کہ اس میں بھی غیر محدودیت کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے جس طرح لوہا کچھ عرصہ تک آگ میں رہے تو اگرچہ وہ آگ نہیں ہو جاتا، لیکن اُس میں آگ کے خواص ضرور پیدا ہو جاتے ہیں۔

میں نے چند لفظوں میں اقبالؔ کا سارا فلسفہ، طلبہ اور اساتذہ، دونوں کے لئے قلمبند کردیا ہے۔ اب اتنی صراحت اور کردوں کہ یہ فلسفہ قرآن مجید کی اس آیت سے ماخوذ ہے۔ صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً؟ یعنی اے مسلمانو! دنیا والوں سے کہدو کہ ہم نے تو اپنے آپ کو اللہ کے رنگ میں رنگین کرلیا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اللہ کے رنگ سے بہتر اور خوبتر کس کا اور کون سا رنگ ہو سکتا ہے؟ میں اس مختصر شرح میں اس آیت کی تفسیر تو لکھ نہیں سکتا، صرف اتنا اشارہ کافی ہے کہ عشق کے بغیر کوئی مسلمان اپنے آپ کو اللہ کے رنگ میں رنگین نہیں کر سکتا۔ اس جگہ یہ سوال پیدا ہوگا کہ عشق کس سے کیا جائے؟ اسکا جواب یہ ہے کہ اُس ذات سے، جسے خود خدا نے "مقام محمود" پر فائز کیا ہو۔

اُس ذات سے، جسکی شان میں خود خدا نے یہ فرمایا ہو:-

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ

اے رسولؐ! آپ مسلمانوں سے فرما دیجئے کہ اگر تم لوگ اللہ سے محبت کرنا چاہتے ہو تو میری اتباع کرو۔ یعنی مجھ سے محبت کرو۔ (کیونکہ اتباعِ رسولؐ، عشقِ رسولؐ کے بغیر ناممکن ہے) اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ خود تم سے محبت کرنے لگیگا۔ اسی لئے اقبالؔ نے عشقِ رسولؐ کو اپنے فلسفہ کا سنگِ بنیاد قرار دیا۔ اور ساری عمر قوم کو اسی عشقِ رسولؐ کا درس دیا۔ اب میں ناظرین کی سہولت کے لئے اقبالؔ کے فلسفہ کا خلاصہ درج کئے دیتا ہوں:-

(۱) انسان کی فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ غیر محدود کو اپنے اندر جذب کرلینا چاہتا ہے۔ ہر شخص (جو حیوانات کی سطح سے بالاتر ہے) اپنے دل کی گہرائیوں میں یہ آرزو پوشیدہ رکھتا ہے۔

(۲) یہ بات اُسی وقت کسی حد تک، ممکن ہو سکتی ہے، جب انسان، زمان و مکان کی قیود سے بالاتر ہو جائے۔

(۳) یہ صفت انسان میں اُسی وقت پیدا ہو سکتی ہے، جب وہ عشق اختیار کرلے۔ کیونکہ کائنات میں صرف عشق ہی وہ طاقت ہے جو انسان کے اندر غیر محدودیت کی شان پیدا کر سکتی ہے۔

(۴) عشق اُس ذات سے کرنا انسب ہے جو سب حسینوں کی سرتاج ہو بلکہ صاف لفظوں میں کیوں نہ کہدوں کہ عشق اُس سے کرنا چاہئیے۔ جس پر خود خدا عاشق ہو۔ بقول اقبالؔ:-

پھڑک اُٹھا کوئی تیری ادائے مَاعَرَفْنَاک پر

ترا رتبہ رہا بڑھ چڑھ کے سب ناز آفرینوں میں

نظم بر صفحہ ۱۳۱

حلّ لغات اور شرح مشکلات | فرقتِ آفتاب میں الخ یعنی صبح، اپنے وجود کے لئے طلوعِ آفتاب کی محتاج ہے۔ اسلئے آفتاب کے لئے کوشاں رہتی ہے + چشمِ شفق۔ اضافتِ بیانی ہے، یعنی شفق + خوں فشاں ہے، یعنی آرزو مند ہے + اخترِ شام اور اخترِ صبح، یہ دونوں خاص ستارے ہیں۔ ایک شام کو طلوع ہوتا ہے دوسرا صبح کو + قطبِ آسماں، وہ تارہ جو اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرتا (قطب از جا نمی جنبد) سوتوں کو ندّیوں کا شوق۔ یعنی نالے، ندیوں میں گرنے کے لئے بیتاب ہیں۔ اور ندیاں سمندر میں گرنے کے لئے، تیزی کے ساتھ بہتی چلی جارہی ہیں + موجۂ بحر کو تپش الخ سمندر چاند سے ملنے کے لئے مضطرب ہے + حسنِ ازل یعنی حسنِ مطلق بھی اپنا جلوہ دکھانے کے لئے بیقرار ہے + خجستہ گام۔ یعنی مبارک قدم + زندہ ہر ایک چیز ہے الخ یعنی زندگی مسلسل کوشش پر موقوف ہے۔ اگر حرکت ختم ہوجائے، تو زندگی بھی ختم ہوجائیگی + اس چھوٹی سی نظم میں اقبال نے قوم کو عمل (جد وجہد) کا پیغام دیا ہے۔ جو در اصل قرآن حکیم کی تعلیمات کا خلاصہ ہے۔ اس کتاب مقدس نے متعدد مقامات پر اس حقیقت کا اثبات کیا ہے کہ ایمان، بغیر عمل، بالکل بیکار، بلکہ مردہ ہے۔ اسی لئے ہر جگہ ایمان کے ساتھ عملِ صالح کی قید لگی ہوئی ہے +

نظم بر صفحہ ۱۳۲

حلّ لغات اور شرح مشکلات | رباب۔ ایک مشہور ساز ہے + آغوش سے خود رباب کا وجود، یعنی رباب مراد ہے۔ جسکے اندر نغمے پوشیدہ ہوتے ہیں +

بربط بھی ایک مشہور ساز ہے۔ بربطِ کون ومکاں، یعنی ساری کائنات + نغموں کے مزار یعنی سیکڑوں نغمے پوشیدہ ہیں + محشرستان۔ جائے حشر۔ مراد ہے وہ جگہ جہاں زبردست ہنگامہ بپا ہو۔ محشرستانِ نوا۔ آوازوں یا شور وغل یا آہ وفریاد کا ہنگامہ + منت کشِ ہنگامہ، یعنی ہنگامہ کا ممنونِ کرم + نسیمِ چمنِ طور، یعنی طور کے باغ کی ہوا + ہوائے نفسِ حور، یعنی حور کی سانس کی خوشبو + اشک کے قافلہ کو بانگِ درا الخ یعنی مجھ پر ناامیدی کا عالم طاری ہوجاتا ہے اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں + رفعتِ شبنم ہے مذاقِ رم سے الخ یعنی شبنم کی بلندی موقوف ہے، اس بات پر کہ اس میں رمیدن (زمین سے اُڑکر آسمان کی طرف جانے) کی خو (عادت) پائی جاتی ہے +

تبصرہ | اس نظم میں شاعر نے یہ حقیقت واضح کی ہے کہ غم آشنائی یا کیفیتِ سوز وگداز، بلندی فطرت کی دلیل ہے۔ یہ غم آشنائی۔ اقبال کے کلام میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے، جیسا کہ اس شعر کی شرح میں بیان کرچکا ہوں۔

پیرِ مغاں! فرنگ کی مے کا نشاط ہے اثر
اس میں وہ کیفِ غم نہیں مجھکو تو خانہ ساز دے

یہاں "کیفِ غم" سے وہی نوائے غم مراد ہے جو اس نظم کا عنوان ہے یہ غم آشنائی، عاشق کی خصوصیت ہوتی ہے۔ کیونکہ عشق انسان کے اندر سوز وگداز کی صفت پیدا کردیتا ہے۔ اسکا نتیجہ یہ ہوتاہے کہ انسان، دنیا میں ہر غمزدہ کے غم میں شریک ہوجاتا ہے۔ بالفاظِ دگر، ہر وقت کسی نہ کسی کے غم میں مبتلا یا شریک رہتاہے۔ یہی کیفیت، انسانیت کا معیار ہے۔ کیونکہ جو شخص کسی غمزدہ کے ساتھ غمگساری نہیں کرسکتا، اس میں اور حیوانات میں کوئی فرق نہیں ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ انسانی فطرت کی بلندی، غم

آشنائی پر موقوف ہے۔ جو انسان غم سے آشنا نہیں ہے وہ زندگی کی حقیقت سے آشنا نہیں ہوسکتا۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہ دنیا بظاہر بہت حسین اور دلچسپ ہے لیکن دراصل یہاں ہر راحت میں رنج، اور ہر شادی میں غم کا پہلو پوشیدہ ہے۔ اسلئے جو شخص غم آشنا نہو، رنج کا خوگر نہو، وہ نہ اس دنیا سے واقف ہوسکتاہے، اور نہ اپنی فطرت کی تکمیل کرسکتاہے۔

نظم بر صفحہ ۱۳۳

حلّ لغات اور شرح مشکلات | اجل ہے پیامِ عیش وسرور۔ یعنی مجھ کو یہ نصیحت مت کرو کہ مرنے کے بعد جنت میں عیش وعشرت کا سامان مہیا ہوگا + شرابِ طہور۔ جنت میں جو شراب ملیگی اس میں نشہ نہیں ہوگا، وہ ہر قسم کی بُرائی سے پاک ہوگی۔ اسلئے اُسے شرابِ طہور کہتے ہیں + پری کو شیشہ میں اُتارنا۔ یہ مشہور محاورہ ہے مطلب ہے کسی نازک مزاج شخص کو راضی کرنا۔ اس مصرع کا مطلب یہ ہے کہ محض لفظوں سے یا زبانی وعدوں سے کہ مرنے کے بعد جنت میں حوریں ملیں گی، اپنے دل کو تسکین مت دو + سلسبیل۔ یہ بھی جنت میں ایک نہر ہے + مجھے کلام نہیں، یعنی مجھے شک نہیں، یا اعتراض نہیں +

تبصرہ | اقبال نے اس نظم میں یہ نکتہ واضح کیا ہے کہ جوانی، عشرتِ آئندہ کی امید پر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس کی فطرت یہ ہے کہ وہ عشرتِ امروز پر ایمان رکھتی ہے۔ بالفاظ دگر، جوان آدمی کی فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ حوروں کے انتظار میں اپنی جوانی بسر نہیں کرسکتا۔

یہ سچ ہے کہ اقبال نے اس حقیقت کو بڑے دلکش انداز میں بیان کیاہے

لیکن "ہم سخن فہم ہیں غالبؔ کے طرفدار نہیں" حق یہ ہے کہ اُن کے اُستاد داغؔ نے جو بات ایک شعر میں پیدا کردی، وہ شاگرد سے پوری نظم میں پیدا نہو سکی آپ بھی سُن لیجئے :۔

حوروں کا انتظار کرے کون حشر تک!
مٹی کی بھی ملے تو روا ہے شباب میں

راقم الحروف کی رائے میں یہی بات تو تھی جس نے اقبالؔ کو داغؔ کی نذر کرکے یہ شعر لکھنے پر مجبور کردیا:۔

بو بہو کھینچے گا، لیکن عشق کی تصویر کون؟
مرگیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون؟

نظم بر صفحہ ۱۳۴

حلّ لغات اور شرح مشکلات | رازجو، بمعنی جویائے اسرارِ کائنات۔ یعنی انسان دنیا کی حقیقت معلوم کرنے کا آرزو مند ہے اور یہ جذبہ اسکی فطرت میں داخل ہے + بیتاب ہے ذوقِ آگہی کا، یعنی حقیقت سے آگاہ ہونے کے لئے بیقرار ہے، لیکن جب تک ایک شخص، مسلکِ عشق اختیار نہ کرلے، کسی راز سے آگاہ نہیں ہوسکتا + حیرت آغاز وانتہا ہے۔ یعنی فلسفہ کی ابتدا بھی حیرت سے ہوتی ہے، اور انتہا بھی حیرت پر ہوتی ہے۔ یہ افلاطون کا مشہور قول ہے، جو فلسفہ کے ہر طالبعلم کو معلوم ہے۔ چنانچہ پروفیسر میور ہیڈ (MUIR HEAD) نے اپنی کتاب علم الاخلاق، اسی جملہ سے شروع کی ہے + آئینہ کے گھر میں یعنی دنیا میں +

مطلب | کہتے ہیں کہ قدرت (اللہ) کی کارفرمائی انسان کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ ایک طرف تو قدرت نے انسان کے اندر تحقیق کا اور جستجو کا مادہ رکھدیا ہے

یعنی وہ اپنی اور کائنات کی حقیقت سے آگاہ ہونا چاہتا ہے۔ دوسری طرف اس حقیقت کو اس سے پوشیدہ کر دیا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہر فلسفی اپنی جگہ حیران نظر آتا ہے۔

گرمِ خرام، یعنی تیزی سے رواں ہے + جادہ پیما، لفظی معنی راستہ ناپنے والا مراد ہے چلنے والا + مستِ شرابِ تقدیر، یعنی قانونِ قدرت کے پابند ہیں + زندانِ فلک میں پابہ زنجیر، یعنی اپنے مقررہ راستوں سے ہٹ نہیں سکتے + عازمِ سحر خیز۔ نماز کے لئے طلوعِ آفتاب سے پہلے اُٹھنے والا + پیام "برخیز" جب صبح ہوتی ہے تو سب لوگ خواب سے بیدار ہو جاتے ہیں + پیتا ہے مئے شفق کا ساغر۔ یہ شاعرانہ اسلوبِ بیان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب شام ہو جاتی ہے تو شفق پھولتی ہے۔ اس سرخی کو شاعر نے شراب سے تعبیر کیا ہے + لذت گیرِ وجود ہر شئے۔ کائنات کی ہر شئے محض اپنے موجود ہونے کو غنیمت جانتی ہے، اور اپنے وجود ہی سے لذت حاصل کرتی ہے + سرمستِ نمودِ ہر شئے۔ اسکا مطلب بھی یہی ہے کہ کائنات میں ہر شئے اپنی نمود اور اپنے ظہور ہی کو اپنی معراج سمجھتی ہے مثلاً غنچہ کی شگفتگی ہی اسکا مقصدِ حیات ہے۔ اسکے علاوہ اسکی ہستی کا اور کوئی مقصد نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کائنات میں ہر شئے، قوانینِ فطرت کی پابند ہے۔ مثلاً ندی، دریا میں جا کر مل جاتی ہے، دریا سمندر میں جا کر گرتا ہے۔ ہوا چلتی ہے تو بادل اُڑتے چلے جاتے ہیں۔ بعض ستارے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکتے۔ اور بعض مقررہ راستوں سے سرمو تجاوز نہیں کر سکتے۔ آفتاب صبح کو طلوع ہوتا ہے، شام کو غروب ہو جاتا ہے۔ کائنات میں ہر شئے محض موجود ہونے پر مطمئن ہے۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں چاہتی، لیکن حضرت انسان کا حال، دنیا کی تمام اشیا سے مختلف ہے۔ وہ اپنی اور کائنات کی

حقیقت معلوم کرنی چاہتا ہے۔ اور اس معاملہ میں کائنات کی کوئی شئے اُس کی غمگسار یا اس تحقیق میں اسکی شریکِ حال نہیں ہے۔ اسلئے انسان کی زندگی، سراپا، پیچ و تاب اور سوز و اضطراب ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ کائنات میں ہر شئے، اپنی شخصیت کو نمایاں کرنا چاہتی ہے اور اس نمود ہی کو اپنی ہستی کا مقصد سمجھتی ہے۔ لیکن انسان اس سے بالاتر مقصد کے حصول میں منہمک ہے۔ وہ یہ کہ وہ اپنی اور اس کائنات کی حقیقت معلوم کرنی چاہتا ہے۔

نظم بر ص ۱۳۵

تبصرہ ۱ یہ نظم اقبالؔ نے اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے لکھی ہے، کہ شباب میں ہر متمدن شخص اپنے تخیل کی دنیا کو ایسی حسینہ اور جمیلہ عورت کے تصور سے آباد کرتا ہے، جس کا ثانی دنیا میں ناممکن ہے۔ ہر نوجوان یہ چاہتا ہے کہ وہ ایسی عورت کو اپنی محبوبہ بنائے جو حسن و جمال کے لحاظ سے ساری دنیا میں بے نظیر ہو، لیکن ایسا حسن اس دنیا میں کہیں موجود نہیں ہے کیونکہ حسین ترین عورت سے بھی زیادہ خوبصورت عورت کا تصور ممکن ہے۔ چونکہ یہ نظم مسلسل ہے اسلئے میں پوری نظم کا مطلب یکجا لکھے دیتا ہوں:-

کہتے ہیں کہ حسن میں یہ تاثیر ہے کہ انسان کے جذبات (نفسانی) میں تلاطم برپا ہو جاتا ہے، تمنائیں بیتاب ہو جاتی ہیں، اور آرزوئیں سینہ میں مچلنے لگتی ہیں۔ عالمِ شباب میں ہر نوجوان اپنے تخیل کو ایک آئیڈیل حسینہ سے آباد کر لیتا ہے۔ اس حسینہ کا عالمِ خارجی میں کہیں وجود نہیں ہوتا صرف اس نوجوان کے ذہن میں اسکا تصور ہوتا ہے۔

اس حسینہ کے تصور کی بدولت، ہر نوجوان کو یہ دنیا بہت پیاری معلوم ہونے لگتی ہے، چنانچہ وہ بھولے سے بھی موت کا تصور نہیں کرتا، کیونکہ اس سے وہ (اپنے آئیڈیل (اُس مثالی حسینہ) سے دور ہو جائیگا۔ اس فرضی حسینہ کے تصور میں انسان اس طرح کھو جاتا ہے کہ اُسے یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ دنیا فانی نہیں ہے۔ بلکہ میں، میرا عشق، اور میری معشوقہ، یہ سب ہمیشہ اسی طرح سبزہ زار پر، دریا کے کنارے، گلگشت میں مصروف رہیں گے۔ حسن میں یہ طاقت ہے کہ انسان کے دماغ سے موت یا فنا کے تصور کو فنا کر دیتا ہے۔ عاشق اگر یہ سمجھ جائے کہ یہ عورت خواہ وہ لیلیٰ ہو یا عذرا — فانی ہے اور اُسکا حسن بقول شوپن ہاور وہ جال ہے جس میں فطرت نوجوانوں کو پھانسنا چاہتی ہے۔ تو پھر جذبۂ عشق معاً سرد پڑ جائے۔

ہر نوجوان اپنی مثالی محبوبہ کے تصور میں گھنٹوں سر بگریباں بیٹھا رہتا ہے اور تصور میں اُس سے باتیں کرتا رہتا ہے۔ اور منظرِ عالمِ حاضر یعنی اپنی گرد و پیش کی دنیا سے بالکل بے خبر رہتا ہے۔ بلکہ کچھ عرصہ کے بعد مستقل طور پر بے خبر ہو جاتا ہے۔ اسکا تجربہ جوانی میں ہر عورت اور ہر مرد کو ہو جاتا ہے۔

جلوۂ حسن کا خاصہ یہ بھی ہے کہ عاشق کو بڑی سے بڑی قربانی کے لئے آمادہ کر دیتا ہے۔ اقبالؔ نے اس بات کو ادراک کی خامی کی دوری سے تعبیر کیا ہے۔ کیونکہ عاشق کے زاویۂ نگاہ سے ع

عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی

عام حالات میں عقل (ادراک) جذبات (تاثر) کی غلامی نہیں کرتی بلکہ معاملہ برعکس ہوتا ہے۔ عاشقی کی اصطلاح میں اسی کو ادراک کی خامی کہتے ہیں۔ جب عاشق پر جلوۂ حسن کی بدولت عشق کا غلبہ ہوتا ہے تو اسکی عقل

اسکے تاثرات (جذبات) کی غلام ہو جاتی ہے۔ اور جب یہ حالت پیدا ہو جاتی ہے تو عاشق اپنی جان پر کھیل جاتا ہے۔

لیکن افسوس کہ ایسا حسن جسکی بدولت یہ سب باتیں ممکن ہو جائیں تصور میں تو ممکن ہے لیکن خارج میں کہیں موجود نہیں ہے۔ کیونکہ دنیا میں ایک سے ایک بڑھ کر حسینہ موجود ہے۔ آپ جس عورت کو حسین ترین قرار دینگے ممکن ہے اُس سے بھی زیادہ حسین عورت کسی گوشہ میں موجود ہو۔

مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کو حسنِ مطلق کی تلاش ہو، تو وہ دنیا کے کسی فرد میں نہیں مل سکتا۔ ایسا حسن صرف خالقِ حسن کی ذات میں پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عقلمندوں نے کبھی فانی عورتوں سے دل نہیں لگایا، بلکہ اُس ذاتِ پاک کو اپنا مقصود بنایا، جو سراپا حسن ہے سراپا جمال ہے بلکہ منبعِ کمال ہے۔

نوٹ:- آخری مصرع فن کے لحاظ سے بہت لائقِ تحسین ہے۔ خاتمِ دہر یعنی دہر (دنیا) ہے خاتم (انگوٹھی) کی رعایت سے نگیں کا لفظ لائے ہیں۔ نگیں بمعنی قیمتی پتھر، مراد ہے "حسن"

نظم بر ص ۱۳۶

حلِ لغات ۱ نوافروش۔ یعنی پرندے + سبز پوش یعنی درخت اور پودے + مراقبہ۔ تصوف کی اصطلاح ہے۔ سالک کا تصورِ ذات میں محو ہو جانا۔ یعنی گیان، دھیان +

تبصرہ ۱ ماہ اگست ۱۹۰۷ء میں اقبالؔ کچھ دنوں کے لئے میونخ یونیورسٹی سے ہائیڈل برگ (جرمنی) گئے تھے، تاکہ وہاں مزید علمی تحقیقات کر سکیں، یہ شہر اپنی یونیورسٹی اور لائبریری کی وجہ سے ساری دنیا میں مشہور ہے۔

دریائے نیکر (NECKAR) کے بائیں کنارے پر آباد ہے۔ یہاں کی یونیورسٹی ۱۳۸۵ء میں قائم ہوئی تھی۔ اور اسکی لائبریری میں پانچ لاکھ سے زیادہ کتابیں موجود ہیں، شہر کی آبادی ۸۴ ہزار ہے +

اس زمانہ میں اقبال پر تصوف کا رنگ بہت غالب تھا۔ غالباً کسی دن شام کے وقت، وہ سیر کے لئے دریا کے کنارے گئے ہونگے۔ وہاں جو کیفیت ان پر طاری ہوئی اُسے اُنہوں نے اس دلکش نظم میں بیان کیا ہے۔ اس نظم میں مشہور انگریزی شاعر ورڈسورتھ (WORDSWORTH) کا تخیل کارفرما ہے۔ وہی دلکش اور سادہ زبان، وہی فطرت کی عکاسی، اور وہی اندازِ بیان۔ اس نظم میں جذبات زبان اور تخیل تینوں باتوں نے مل جُل کر عجیب دلکشی پیدا کر دی ہے۔ اسکو غور سے پڑھو تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے اپنے آپ کو فطرت کی وسعتوں میں گم کر دیا ہے۔ فطرت کے ساتھ ایسی ہم آہنگی، اُردو کی بہت کم نظموں میں نظر آ سکتی ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ اسوقت ہر شئے پر خاموشی اور سکون طاری ہے۔ قمر کی چاندنی، درختوں کی شاخیں، وادی کے پرندے پہاڑوں کے درخت، ستارے کوہ، صحرا، دریا، غرضکہ ساری فطرت خاموش ہے بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ مراقبہ میں ہے۔

لیکن شاعر کا دل کسی کی یاد میں مضطرب ہے۔ اسلئے وہ اپنے دل سے کہتا ہے کہ اے دل! جب اسوقت ساری فطرت ساکن اور خاموش ہے تو مناسب ہے کہ تو بھی فطرت سے ہم آہنگ ہو جا۔ یعنی یادِ جاناں میں محو ہو جا۔ یہ آخری شعر اس ساری نظم کی جان ہے۔

نظم بر ص ۱۳۷

حلّ لغات | حزیں بمعنی غمگین + نسترن زار۔ وہ جگہ جہاں سفید گلاب کے پھول اُگے ہوئے ہوں + ہم نفس بمعنی دوست +

تبصرہ | یہ نظم بھی گذشتہ نظم سے ملتی جلتی ہے۔ کیونکہ اس میں بھی اقبال نے فطرت کی عکاسی کی ہے۔ شاعر اپنے دل سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔ کہ تو رات کی تنہائی میں اسقدر رنجیدہ کیوں ہے؟ اگر اسوقت کوئی غمگسار یا رازدار تیرے پاس نہیں ہے تو کیا ہوا؟ کیا تارے تیرے ہمنشیں نہیں ہیں؟ (تاروں کو ہمنشیں کہنا، اقبال کے تخیل کی بلندی پر شاہد ہے) ذرا آنکھ کھول کر فطرت کا مطالعہ کر! اسوقت آسمان، زمین، بلکہ سارا جہان خاموش ہے، فطرت کے مناظر دیکھ! چاند، ستارے، کوہ، صحرا، کسقدر حسین ہیں! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساری فطرت گلشن بنگئی ہے۔ اور ان سب مناظر فطرت سے بڑھکر تیرے آنسو حسین ہیں! اگر تو غور سے دیکھے تو یہ آنسو موتیوں سے بھی زیادہ قیمتی ہیں۔ جب ساری فطرت تیری ہمدم اور ہمراز ہے تو پھر تو کیوں اسقدر افسردہ ہے؟

نظم بر ص ۱۳۷ و ص ۱۳۸

حلّ لغات | سُن اے طلبگارِ دردِ پہلو! یعنی عشق، عاشق سے خطاب کرتا ہے + غزنوی۔ چونکہ شاعر نے دل کو سومناتھ قرار دیا ہے، اسلئے غزنوی کا لفظ لایا ہے + ایاز۔ سلطان محمود غزنوی کا مشہور غلام + ہلال سے شخصیت مراد ہے + دامن دراز۔ طلب میں شدت کا رنگ پیدا کر + آتش زنِ طلسمِ مجاز ہو جا۔ یعنی انفرادی زندگی بسر کرنی چھوڑ دے + ہند کے فرقہ ساز سے ہندو قوم مراد ہے +

آذری کر رہے ہیں۔ یعنی تجھے بت پرستی کی طرف مائل کر رہے ہیں

تبصرہ | اس نظم میں اقبال نے پہلی مرتبہ مسلمانوں کو عشق رسول کا درس دیا ہے۔ چنانچہ ملت اور حجاز، یہ دو لفظ اس نظم کی جان ہیں۔ اسی مضمون کو آئندہ نظموں میں اقبال نے وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس نظم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کو اس حقیقت کا احساس ہو چکا تھا کہ ہندو اور مسلمان دونوں مل کر ایک قوم نہیں بن سکتے۔

(۱) مطلب یہ ہے کہ اگر عاشق، اپنے مقصد میں کامیاب ہونا چاہتا ہے تو پھر سراپا نیاز، یعنی معشوق کی مرضی میں فنا ہو جائے۔ جس طرح ایاز، سلطان محمود، اپنے آقا کی مرضی میں فنا ہو گیا تھا۔

(۲) دنیا میں کمال حاصل کرنے کے لئے، بادشاہ یا دولتمند ہونا ضروری نہیں ہے، اگر ایک مفلس اور گمنام شخص کوشش کرے تو وہ بھی صاحبِ کمال بن سکتا ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ کمال حاصل کرنے کے لئے دولت درکار نہیں ہے، بلکہ محبت بھرا دل درکار ہے۔ اور وہ ایک غریب آدمی کے سینہ میں بھی موجود ہے۔ پس طالبِ کمال کو لازم ہے کہ اپنے دل کے آئینہ کو صیقل کرے۔

(۳) دنیا میں پیکار اور کشمکش اسلئے ہے کہ شخصیت انسانی، پیکار (جد و جہد) ہی سے کمال حاصل کر سکتی ہے۔ اسلئے اے مسلمان! تو دنیا کی مشکلات سے پریشان مت ہو، بلکہ ہر حال میں اپنا فرض ادا کر۔

(۴) مسلمان کا فرض ہے کہ تھوڑی سی نیکی پر قناعت نہ کرے بلکہ ساری عمر نیکی (پھول) جمع کرتا رہے۔

(۵) اب وہ زمانہ نہیں کہ عاشق صحرا میں جا کر تنہائی میں زندگی بسر کرے۔ موجودہ حالات کا تقاضا یہ ہے کہ قوم کی خدمت میں اپنی زندگی بسر کر۔ اور جس طرح

شمع خود فنا ہو جاتی ہے، لیکن محفل کو منور کر دیتی ہے۔ اسی طرح تم بھی اپنی زندگی قوم کو فائدہ پہونچانے میں بسر کر دو۔

(۶) یاد رکھو! افراد کا وجود مجازی ہے۔ قوم کا وجود حقیقی (اصلی) ہے۔ یعنی افراد کی ہستی اور عزت، قوم کی بقا، اور عزت پر منحصر ہے۔ اگر قوم ضعیف ہو گئی تو افراد کبھی طاقتور نہیں ہو سکتے۔ اسلئے ہر فرد کو لازم ہے کہ اپنی ہستی ملت میں فنا کر دے۔

(۷) اے اقبال! چونکہ ہندو، مسلمانوں کو بُت پرستی کی طرف مائل کر رہے ہیں اور انکی ہستی کو مٹا دینے پر تلے ہوئے ہیں، اسلئے ہندوؤں سے کسی نیکی کی امید مت رکھو۔ ان سے قطع تعلق کر اور سرکار دو عالم صلعم کے عشق میں فنا ہو جا۔

نوٹ :۔ اقبال نے مقطع میں جس حقیقت کو واضح کیا ہے۔ آج ہر شخص اسکا اعتراف کرنے پر مجبور ہے۔ اُنہوں نے ۱۹۰۷ء میں ہندو قوم کی ذہنیت کا صحیح اندازہ کر لیا تھا۔ اور ۱۹۱۳ء میں جناب ابو الکلام صاحب آزاد نے الہلال کے مضامین میں اسی پیش کردہ نکتہ کی تشریح فرمائی تھی، جسے ۱۹۲۰ء میں انہوں نے بالکل فراموش کر دیا ۱۲

نظم بر ص ۱۳۹

حلّ لغات اور شرح مشکلات | عزلت۔ تنہائی + شکستہ گیت۔ واضح ہو کہ جب کسی پہاڑی ندی کا پانی یکے بادیگرے پتھروں سے ٹکراتا ہے تو قدرتی طور پر وقفوں کے بعد آوازیں پیدا ہوتی ہیں۔ اسکو اقبال نے ٹوٹے ہوئے گیتوں سے تعبیر کیا ہے + دلبری، بمعنی دلکشی + دعائے طفلک گفتار آزما۔ اقبال نے شکستہ گیتوں کو اُس بچہ کی دعا سے تشبیہ دی ہے، جس نے ابھی بولنا سیکھا ہے۔

اور اسلئے ٹوٹے پھوٹے الفاظ اسکے منہ سے نکلتے ہیں۔ تختِ لعلِ شفق، یعنی شفق + جلوسِ اخترِ شام۔ یعنی شام کے ستارے کا طلوع + بہشتِ دیدۂ بینا۔ یعنی عقلمند آدمی کے لئے یہ منظر نہایت دلکش ہے + ناشکیبا یعنی بیقرار + طفلِ صغیر چھوٹا بچہ + پیامِ شکیب، صبر کا پیغام +

تبصرہ | اس نظم میں اقبالؔ نے فراق کی کیفیت بیان کی ہے۔ اس میں تخیل کی بلندی کے ساتھ ساتھ، بلاغت اور فنِ شاعری کا کمال بھی نظر آتا ہے۔ کہتے ہیں کہ محبوب کی جدائی نے مجھے سرگرداں بنا دیا ہے۔ دنیا کی دلچسپیوں سے بیزار ہو کر، پہاڑ کے دامن میں گوشہ گیر ہو گیا ہوں۔ یہاں پہاڑی چشموں کی آوازوں میں جو وقفوں کے بعد پیدا ہوتی ہیں، بڑی دلکشی پائی جاتی ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کوئی بچہ اپنے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں دعا مانگ رہا ہے۔ شام کا وقت ہے شفق پھولی ہوئی ہے۔ اور اخترِ شام اپنی چمک دکھا رہا ہے۔ یہ نظارہ نہایت دلفریب ہے۔ اسقدر دلفریب کہ کسی کی یاد دل میں اور بھی چٹکیاں لینے لگی۔

میری مثال اُس چھوٹے بچہ کی سی ہے۔ جو بالکل تنہا ہو اور اندھیری رات میں گانا شروع کر دے۔ اور اپنی ناسمجھی کے باعث اپنی آواز کو غیر کی آواز سمجھے اور اس طرح اپنے آپ کو اس فریب میں مبتلا کر دے کہ کوئی غمگسار موجود ہے، جو مجھے لوری دے رہا ہے یا میرا دل بہلا رہا ہے۔ اسی طرح میں بھی اپنے دل کو صبر کی تلقین کرتا ہوں، گویا اپنی شبِ فراق کو فریب دیتا ہوں۔

نظم پر نمبر ۱۴۰

شرح مشکلات | اُفقِ خاور، مشرق مراد ہے + شعلہ نوائی۔ ایسا نغمہ جس سے سننے والوں کے دل پگھل جائیں + اجالا کر دیں، یعنی مشرقی اقوام کے دلوں کو گرما دیں + مانندِ سپند اپنی بساط۔ یعنی عرصۂ ہستی یا زندگی کی مدت بہت مختصر ہے۔ واضح ہو کہ اسپند کے دانہ کی زندگی ایک لمحہ کی ہوتی ہے۔ وہ جب آگ میں ڈالا جاتا ہے تو چٹختا ہے اور ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جاتا ہے۔ بساط کے لغوی معنی ہیں، وہ شئے جو بچھائی جائے۔ مراد ہے ہستی + صیقل یعنی پالش + سنگِ امروز۔ آج کا پتھر، یعنی آج (کا دن) + آئینۂ فردا۔ آنے والے کل کا آئینہ، یعنی یومِ آئندہ + جلوۂ یوسفِ گم گشتہ، یعنی مسلمانوں کی عظمتِ ماضی کی تفسیر + تپش آمادہ تر۔ یعنی زلیخا سے بھی زیادہ بیقرار + آئینِ نمو، یعنی بالیدگی کا قانون + چمن سے مسلمان قوم مراد ہے + آئینِ نمو کا سبق۔ یعنی جد و جہد کا درس (جو قرآنی تعلیمات کی روح ہے) قطرۂ شبنم بے مایہ سے مفلس اور کمزور مسلمان فرد مراد ہے + بادۂ دیرینہ سے وہی اسلامی تعلیمات اور روایات مراد ہیں۔ جن سے مسلمان بیگانہ ہو گئے ہیں + داغ سے عشقِ رسولؐ، یا عشقِ اسلام مراد ہے + وقفِ تماشا کر دیں یعنی مسلمانوں کو عشقِ رسولؐ کا درس دیں +

تبصرہ | اقبالؔ نے یہ بلیغ نظم ۱۹۰۸ء کے آغاز میں اپنے دوست اور ادبِ اُردو کے محسن شیخ سر عبدالقادر کے نام لکھی تھی۔ جو ۱۹۰۷ء میں اُن کے ساتھ انگلستان ہی میں مقیم تھے۔ شیخ صاحب مرحوم کا نام غایتِ شہرت کی بنا پر میرے تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ انہوں نے ۱۹۰۱ء میں اُردو زبان کی خدمت کا بیڑہ اُٹھایا۔ اور اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود، نصف صدی تک نہایت خلوص اور تندہی کے ساتھ اسکی ترویج و اشاعت میں کوشاں رہے۔ ادبِ اُردو کے محسن کی حیثیت سے اُنکا نام ہماری قومی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہیگا۔ شیخ صاحب میں بہت سی خوبیاں تھیں، لیکن میں اُن کی دو خوبیوں سے ہمیشہ متاثر ہوا۔ ایک تو یہ کہ وہ ہر شخص کی مدد کے لئے تیار رہتے تھے۔ دوسری یہ کہ "اس زمانہ میں اکثر

پر اور اسکی مشیت پر ایمان رکھتے تھے۔ جنوری ۱۹۵۰ء میں وفات پائی ؎

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا!

اس نظم میں اقبالؔ نے اپنے دوست کو اپنے دلی ارادوں سے آگاہ کیا ہے اور اس نظم کی اہمیت جو کچھ ہے، اسی بنا پر ہے کہ اس میں اقبالؔ نے مسلمانوں کو اپنے مقصدِ حیات سے آگاہ کر دیا۔ چنانچہ انکی حیاتِ ارضی کے باقی ماندہ تیس سال اس بات پر شاہد ہیں کہ اُنہوں نے جو فیصلہ ۱۹۰۸ء میں کیا تھا مرتے دم تک اُس پر نہایت مضبوطی کے ساتھ قائم رہے۔ واضح ہو کہ جو خیالات اقبالؔ نے اس نظم میں ظاہر کئے ہیں۔ اُنہی کو وضاحت کے ساتھ خضرِ راہ اور طلوعِ اسلام میں پیش کیا ہے۔

پہلا شعر:- اپنے دوست کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ ہمارے ملک ہندستان (یہ ۱۹۰۸ء کی نظم ہے) کے مسلمانوں کی قومی حالت قابلِ اطمینان نہیں ہے۔ انکا مستقبل تاریک نظر آتا ہے۔ اسلئے آؤ ہم تم مل کر اس تاریکی کو دور کر دیں، یعنی اپنی زندگی قوم کی خدمت میں بسر کرنے کا عزم کر لیں۔

دوسرا شعر:- انسان کی زندگی بہت مختصر ہے۔ اور جد و جہد کا زمانہ چند سال سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اسلئے ہمیں لازم ہے کہ اپنی زندگی قوم کو بیدار کرنے کے لئے وقف کر دیں۔ اور اسکے لئے حتی المقدور کوشش کریں۔

تیسرا شعر:- مسلمانوں کو عشقِ رسولؐ کا درس دیں، کیونکہ اس عشق کی بدولت ان میں یہ طاقت پیدا ہو جائیگی کہ وہ آئندہ زمانہ میں کامیاب ہو سکیں گے۔

چوتھا شعر:- آؤ! ہم انہیں اُن کے بزرگوں کے کارنامے سُنائیں تاکہ اُن کے اندر بھی، انکے نقشِ قدم پر چلنے کی آرزو پیدا ہو۔

پانچواں شعر:- آؤ! مسلمانوں کو جد و جہد کا سبق پڑھائیں اور اس حقیقت سے آگاہ کر دیں کہ دنیا میں جد و جہد کے بغیر کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ تاکہ وہ جو آج بے مایہ اور محکوم ہیں، آئندہ چل کر، سربلند اور کامیاب ہو سکیں۔

چھٹا شعر:- آؤ! ہندوستان کے مسلمانوں کو غیر اسلامی (عجمی) روایات، تہذیب اور تمدن سے متنفر کر کے، عربی زبان، تہذیب اور روایات کا شیدا بنا دیں۔

ساتواں شعر:- اس شعر میں تلمیح ہے اس بات کی طرف کہ ۱۹۰۸ء میں دمشق سے مدینہ منورہ تک ریل آ گئی تھی، کہتے ہیں کہ دنیا میں ہر وقت انقلاب رونما ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ دیکھ لو! مدینہ میں اونٹ بیکار ہو گئے۔ لہذا اب وقت آ گیا ہے کہ مسلمان بھی اپنے اندر انقلاب پیدا کریں۔ یا کم از کم اسکے لئے تیاری کریں۔

آٹھواں شعر:- ہمیں لازم ہے کہ مسلمانوں کو از سرِ نو حقائقِ اسلام (بادہ) سے روشناس کریں اور ان کے دلوں میں عشقِ رسولؐ کی آگ بھڑکائیں تاکہ وہ اپنا تن من اور دھن، سب اسلام کے نام پر قربان کر سکیں۔

نواں شعر:- یورپ، بالخصوص انگلستان میں، جس عشقِ رسول صلعم نے ہم کو غیر اسلامی (کافرانہ) زندگی سے محفوظ رکھا، ہم کو لازم ہے کہ دنیا کو اس نعمت سے روشناس کر دیں، یعنی تمام دنیا میں اسلام کا پیغام پہونچائیں۔

دسواں شعر:- کاش ہم شمع سے سبق لے سکیں۔ اگرچہ وہ خود جل کر ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن دنیا والوں کو اپنے نور سے منور کر دیتی ہے۔ اسی طرح ہم دوسروں کو اسلام کی نعمت سے مالا مال کرنے کے لئے اپنی زندگی وقف کر دیں۔

گیارھواں شعر:- شمع کے دل میں جو خیال بھی پیدا ہوتا ہے وہ اسکی زبان پر آ جاتا ہے (آگ میں) جلنا، خیال تو نہیں ہے جو دل میں پوشیدہ رہ سکے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح شمع کا ظاہر و باطن یکساں ہوتا ہے۔ بایں معنی کہ جو اسکے اندر ہے وہ جل جل کر باہر آتا رہتا ہے۔ حتی کہ اسکا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مسلمان

کو چاہیے کہ وہ اپنا ظاہر و باطن یکساں رکھے۔

نظم بر صفحہ ۱۴۱

حلّ لغات اور شرحِ مشکلات ا دیدہ خونابہ بار۔ خون کے آنسو بہانے والی آنکھ + تہذیبِ حجازی کا مزار۔ کنایہ ہے جزیرہ صقلیہ سے۔ کیونکہ اسے عربوں نے فتح کیا تھا + کھا گئی۔ یعنی فنا کر دیا + عصرِ کہن سے قدیم ایرانی اور رومی سلطنت مراد ہے + تیغ ناصبور۔ ایسی تلوار جو دشمنوں کو کاٹ کر ٹکڑے کر دینے کے لئے بیتاب ہو + شورشِ قُم۔ قُم کی آواز۔ قُم عربی لفظ ہے، امر کا صیغہ ہے، بمعنی اُٹھ! مطلب یہ ہے کہ انہوں نے ملکوں اور قوموں کو، اسلام کی بدولت زندہ کر دیا + توہم۔ یہاں اوہام پرستی اور شرک مراد ہے۔ جس میں دنیا کی اکثر اقوام ظہورِ اسلام کے وقت گرفتار تھیں + شمعوں سے لائٹ ہاؤس مراد ہیں، جو بندرگاہوں پر ملاحوں کی رہنمائی کے لئے نصب کئے جاتے ہیں + بحر پیما، یعنی ملاح + سبک سے مبارک مراد ہے + شیراز کا بلبل۔ شیخ سعدی مراد ہیں جنہوں نے بغداد کی تباہی پر مرثیہ لکھا تھا + ابن بدرون۔ اندلس کا مشہور ادیب اور شاعر تھا، جسنے غرناطہ کی تباہی پر مرثیہ لکھا تھا + آثار سے آثارِ قدیمہ یعنی پُرانی عمارات مراد ہیں + ایام سلف۔ زمانہ گذشتہ +

تبصرہ ا یہ نظم اقبالؔ نے جولائی ۱۹۰۸ء میں یورپ سے واپسی پر لکھی تھی۔ اسکے مطالعہ سے ہمیں اُس ذہنی انقلاب کا کچھ حال معلوم ہو سکتاہے، جو سہ سالہ قیامِ یورپ کے دوران میں اُن کے اندر پیدا ہو چکا تھا۔ جزیرہ سسلی جسے عربی میں صقلیہ کہتے ہیں، اٹلی کے جنوب میں واقع ہے۔ اسکا رقبہ ۹۹۲۶ مربع میل ہے۔ آبادی ۴۴ لاکھ ہے۔ عربوں نے اس جزیرہ کو ۸۲۷ء میں فتح کیا تھا اور ۱۰۹۰ء تک یہاں حکومت کی۔ تمام یورپین مورخین نے اعتراف کیا ہے کہ عربوں نے اپنے زمانہ حکومت میں اس جزیرہ کو تہذیب و تمدن اور علم و فضل اور صنعت و حرفت سے مالا مال کر دیا تھا۔ اقبالؔ نے صقلیہ کو تہذیبِ حجازی کے مزار سے تعبیر کرکے، دو لفظوں میں عربوں کے عہد حکومت کی داستان قلمبند کر دی ہے۔

پہلا بند:۔ کہتے ہیں کہ یہ جزیرہ مجھے اُس زمانہ کی یاد دلاتا ہے، جب یہاں عربوں کی حکومت تھی۔ وہ اپنے گرد و پیش کے تمام سمندروں پر قابض ہو گئے تھے دنیا کے تمام بادشاہ ان کے نام سے کانپتے تھے۔ اُنہوں نے دنیا کو اسلام کا پیغام دیا۔ اور اسکی بدولت بنی آدم کو گمراہی اور اوہام پرستی کے غار سے باہر نکالا۔

دوسرا بند:۔ اس بند میں اقبالؔ نے جزیرہ سے خطاب کیا ہے کہ اے صقلیہ! تیری بدولت بحیرۂ روم کی عظمت کو چار چاند لگ گئے ہیں۔ تیرا وجود اس سمندر کے لئے باعث زینت ہے۔ میری دعا ہے کہ تیرا نظارہ ہر شخص کے لئے دلکشی کا باعث ہو۔ اور تو اسی طرح اس سمندر کے وسط میں قائم رہے۔ چونکہ تو عربوں کی عظمتِ رفتہ کی ایک روشن یادگار ہے اسلئے میں تجھ سے محبت کرتا ہوں۔

تیسرے بند میں اقبالؔ نے یہ کہا ہے کہ جس طرح سعدی شیرازی نے زوالِ دولتِ عباسیہ پر، اور داغؔ نے زوالِ سلطنتِ مغلیہ پر اور ابن بدرون نے زوالِ دولتِ غرناطہ پر مرثیے لکھے اسی طرح میں تیری بربادی پر نوحہ خواں ہوں۔

نوٹ:۔ اُردو زبان میں صقلیہ پر اقبالؔ کے علاوہ اور کسی شاعر نے کوئی نظم نہیں لکھی۔

چوتھے بند میں پھر جزیرہ سے خطاب کرتے ہیں کہ تیرے آثارِ قدیمہ میں عربوں کی داستان مندرج ہے۔ اور تیرا ساحل زبانِ حال سے کہہ رہا ہے کہ کبھی عرب فاتحین یہاں آکر خیمہ زن ہوئے تھے۔ اے صقلیہ! تو اپنے درد کی داستان مجھے سُنا۔ کیونکہ میں تیرا ہمدرد ہوں۔ تو جس کارواں کی منزل رہ چکا ہے میں اسی کارواں کی گرد ہوں۔ یعنی میں بھی اُن عربوں کا نام لیوا ہوں، جنہوں نے تجھے تہذیب و تمدن سے مالا مال کیا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ تو مجھے اس زمانہ کی داستان سُنائے جب عرب تجھ پر حکمراں تھے۔

اس نظم کے آخری بند میں اقبالؔ نے سوز و گداز کا ایسا رنگ بھر دیا ہے کہ لفظوں کے ذریعہ سے اسکا اظہار ناممکن ہے۔ ہر مصرع، اثر آفرینی کے لحاظ سے اپنی جگہ لائق ہزار تحسین ہے۔ آخری شعر میں اقبالؔ نے جو بات کہی ہے اسکی صداقت پر کسی دلیل کی حاجت نہیں ہے۔ کون مسلمان ایسا ہوگا جو اس نظم کو پڑھے اور آبدیدہ نہ ہو جائے؟

غزلیات حصّہ دوم

پہلی غزل صفحہ ۱۴۳

پہلا شعر:۔ دم کے دو معنی ہیں (۱) دم بمعنی سانس (۲) دم بمعنی مختصر وقفہ + مطلب یہ ہے کہ انسان جس زندگی پر اس قدر ناز کرتا ہے، اسکی حقیقت دم کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اور یہ دم کیا ہے؟ صرف ہوا کی موج یعنی ہوا ہے۔ اور ہوا کو کبھی قرار نہیں ہوتا + رم، رمیدن سے ہے بمعنی بھاگنا۔ اس شعر میں اقبالؔ نے زندگی کی بے ثباتی کو بڑے دلکش انداز سے واضح کیا ہے۔

دوسرا شعر:۔ گُل کے زاویۂ نگاہ سے زندگی، تبسم اور مسرت کا نام ہے لیکن شمع کے نقطۂ نظر سے یہی زندگی گریۂ غم کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسانی زندگی مسرت اور رنج دونوں کے مجموعہ کا نام ہے۔

تیسرا شعر:۔ محرم سے مراد ہے دانائے راز یعنی وہ شخص جو ہستی کی حقیقت سے آگاہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ جو شخص محرم راز نہیں ہے، یعنی ہستی کی حقیقت سے واقف نہیں ہے اسکے لئے یا اسکی نظر میں "ہستی" ایک راز ہے، لیکن جو شخص ہستی کی حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے، وہ جانتا ہے کہ یہ ساری کائنات فانی ہے۔ صرف انسان کی روح باقی ہے۔ یعنی محرم راز اس نکتہ سے آگاہ ہو جاتا ہے کہ میرے سوا کائنات میں اور کسی شئے کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ بال جبریل میں اسی نکتہ کو یوں بیان کیا ہے:۔

> اک تو ہے کہ حق ہے اس جہاں میں
> باقی ہے نمودِ سیمیائی!

چوتھا شعر:۔ اس شعر میں اقبالؔ نے اُن حاجیوں پر طنز کیا ہے جو مکہ معظمہ سے صرف آبِ زمزم یا کھجوریں، بطور تحفہ اپنے ساتھ لیکر واپس آتے ہیں حالانکہ انہیں وہاں سے اپنے اندر تقویٰ اور طہارت کا تحفہ لیکر آنا چاہئے اور واپسی پر ایسی زندگی بسر کرنی چاہئے، جس کو دیکھکر دوسروں کے دلوں میں اسلام کی عظمت قائم ہو۔

دوسری غزل بر صفحہ ۱۴۳ و صفحہ ۱۴۴

پہلا شعر۔ خجستہ پے۔ اس شخص کو کہتے ہیں، جس کا آنا دوسروں کے لئے باعث برکت ہو۔ یعنی مبارک قدم + دیوانگی سے عشق رسولؐ مراد ہے + سودائے بخیہ کاری۔ مراد ہے دنیاوی معاملات کی درستی یا دنیا کے حصول کی کوشش + مجھے سر پیرہن نہیں ہے۔ یعنی میں دنیا کا طالب نہیں ہوں + مطلب یہ ہے کہ اے خدا! میرے اندر عشق رسولؐ کا تھوڑا سا رنگ پیدا کر دے"

تاکہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاؤں۔عقل تو مجھے دنیا حاصل کرنے کے طریقے سکھانا چاہتی ہے، لیکن میں دنیا کا طالب نہیں ہوں + یہ اقبالؔ کا محبوب موضوع ہے۔یعنی عقل پر عشق کی برتری +

دوسرا شعر:۔ مطلب اس لاجواب شعر کا یہ ہے کہ عاشق کی زندگی شمع مزار سے مشابہ ہے۔(ا) شمع کی طرح عاشق بھی ساری عمر جلتا رہتا ہے (ب) شمع مزار کی طرح عاشق بھی تنہائی میں زندگی بسر کردیتا ہے، کیونکہ کوئی شخص، عاشق کا دُکھ بانٹ نہیں سکتا۔

تیسرا شعر:۔ مطلب اس شعر کا یہ ہے کہ دنیا میں سچا دوست، جوکسی سے بے لوث محبت کرے، نا پید ہے۔

چوتھا شعر:۔ عرب کے معمار سے سرکار دو عالم صلعم کی طرف اشارہ ہے۔حصار ملت۔قوم کا قلعہ، یعنی قوم + معمار کی رعایت سے حصار کا لفظ لائے ہیں + مطلب یہ ہے کہ اسلام، نرالا دین ہے، کیونکہ اسکی تعلیم یہ ہے کہ ملت یا قوم کی بنیاد وطن نہیں ہے، بلکہ عقیدۂ توحید و رسالت ہے۔مسلمانوں کے علاوہ دوسری قوموں کا اصول یہ ہے کہ قوم وطن سے بنتی ہے۔لیکن اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ مسلمان، خواہ ہندی ہوں یا افغانی، ایرانی ہوں یا شامی، سب ایک قوم ہیں۔

پانچواں شعر:۔عقبیٰ، عقب سے نکلا ہے۔جسکے معنی ہیں پیچھے یا بعد۔مراد ہے موت کے بعد انسان کی حالت یا زندگی یا عالم آخرت + اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ عام طور سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم عالم ارواح سے دنیا میں آئے ہیں اور پھر مرنے کے بعد، دوسرے جہان میں چلے جائینگے۔لیکن یہ انکی غلط فہمی ہے یہ آنا اور جانا، سب اعتباری ہے۔اور دنیا اور عقبیٰ میں جو امتیاز کیا جاتا ہے یہ سب دھوکہ ہے۔حقیقت یہ ہے کہ یہ ساری کائنات ہماری خادم ہے۔

انسان اشرف المخلوقات ہے۔یہ ساری دنیا اسکے لئے بنائی گئی ہے۔اسلئے یہ ساری دنیا اسکا وطن ہے۔اسکا وطن کسی خاص خطہ میں محدود نہیں ہے

چھٹا شعر:۔ مدیر مخزن سے شیخ عبدالقادر مرحوم کی طرف اشارہ ہے۔جنہوں نے سنہ ۱۹۰۱ء میں لاہور سے مشہور ماہانہ رسالہ مخزن جاری کیا تھا۔اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں جو قومیں آج سربلند ہیں۔ان کے افراد اپنا قیمتی وقت، شعرو شاعری میں صرف نہیں کرتے بلکہ ترقی کے لئے جدوجہد کرتے رہتے ہیں۔

اس شعر میں اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے، جس کا ذکر، خود شیخ صاحب مرحوم نے بانگ درا کے دیباچہ میں کیا ہے کہ یورپ کے دوران قیام میں ایک دن اقبالؔ نے مجھ سے کہا کہ میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ شاعری ترک کردوں۔(دیکھو دیباچہ صلے وصد م)

تیسری غزل ۱۴۵

پہلا شعر:۔ مطلب یہ ہے کہ فی الحال میں خاموش ہوں۔لیکن اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ میرے دل میں گفتگو کرنے (قوم کو زندگی کا پیغام دینے) کی آرزو نہیں ہے ہے اور بہت شدید ہے۔چنانچہ جب میں اپنی قوم کو زندگی کا پیغام دونگا تو اس شدومد کے ساتھ دونگا کہ دنیا حیران رہ جائیگی۔(خدا نے اقبالؔ کی آرزو پوری کردی)

دوسرا شعر:۔ مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر شخص کی حالت مختلف ہے ایک کی طرز حیات دوسرے کے لئے مناسب نہیں ہے۔مثلاً موج کی زندگی حرکت اور سفر پر موقوف ہے۔اور موتی کی آب وتاب (زندگی) سکون اور قرار پر منحصر ہے۔

تیسرا شعر:۔ یہ شعر بہت غور طلب ہے، کیونکہ اس میں اقبالؔ نے انسانی فطرت

کو شاعری کے لباس میں پیش کیا ہے۔مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کی طبیعت میں اچھائی یا نیکی قبول کرنے کی صلاحیت (قابلیت) نہیں ہے۔آپ لاکھ انکی اصلاح کیجئے، آپ کی ساری کوششیں بیکار چلی جائینگی۔مثلاً سرو کے درخت کا جو عکس پانی میں نظر آتا ہے اس میں سرسبز ہونے کی صلاحیت (قابلیت) نہیں ہے، لہذا دن رات پانی میں رہنے کے باوجود، سرسبز نہیں ہو سکتا۔اس شعر میں تین لفظ غور طلب ہیں +

(۱) قابل، یعنی اصلاح قبول کرنے والا۔(۲) طبیعت، ذاتی خصوصیات کا وہ مجموعہ جو ہر انسان اپنی ماں کے پیٹ سے لیکر آتا ہے۔(۳) تربیت، استاد یا ماحول کا کسی شخص کے اندر اصلاح کرنا۔

چوتھا شعر:۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کے دل میں ہزاروں تمنائیں اور آرزوئیں ہر وقت چٹکیاں نہ لیتی رہتی ہوں۔لہذا یہ دنیا دراصل آرزو اور تمنا کا مرقع ہے +

پانچواں شعر:۔ اس شعر کا مطلب بھی وہی ہے جو پہلے کا ہے، یعنی مرتے وقت انسان پر یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ میں دنیا میں ساری عمر، آرزوؤں ہی میں مبتلا رہا۔اسلئے یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ انسان کا جسم یعنی اس کی جسمانی زندگی صدہا آرزوؤں کا مجموعہ ہے، اور کچھ نہیں ہے۔

چھٹا شعر:۔ یہ شعر بھی بہت غور طلب ہے۔مطلب یہ ہے کہ انسان کے اندر حسن مطلق کی تلاش کا جذبہ کارفرما ہے۔حالانکہ اُس نے اسکو کہیں دیکھا نہیں ہے۔پس اسکا اَن دیکھی چیز کی جستجو کرنا، دراصل خدا کی ہستی پر وجدانی دلیل ہے۔کیونکہ اگر خدا فی الحقیقت موجود نہیں ہے تو پھر انسان میں اسکی تلاش کا یہ جذبہ کہاں سے پیدا ہوگیا؟ انسان کی نگاہ کسی (خدا) کے جمال کی تمنائی ہے

اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا، پس معلوم ہوا کہ کوئی حسین ضرور موجود ہے، اگرچہ پنہاں ہے۔

ساتواں شعر:۔ یہ شعر مضمون آفرینی کی بڑی عمدہ مثال ہے۔غنچہ جب کھلتا ہے اور پھول کی شکل اختیار کرتا ہے تو اُسے شعرا غنچہ کے تبسم سے تعبیر کرتے ہیں۔غنچہ کہتا ہے کہ انسان بھی کسقدر ظالم اور بیدرد ہے کہ جب میں فنا ہوجاتا ہوں (جب میرا سبو ٹوٹ جاتا ہے) تو اُسے میرے تبسم سے تعبیر کرتا ہے۔سبُو، یعنی گھڑا یا شیشۂ شراب واضح ہو کہ غنچہ کی شکل، بڑی حد تک سبو سے مشابہ ہوتی ہے۔مطلب یہ ہے کہ دنیا کا دستور یہ ہے کہ یہاں ایک کی بربادی دوسرے کی آبادی کا باعث ہے مثلاً جب ریشم کا کیڑا کوئے کے اندر مرجاتا ہے، تو انسان کیلئے ریشمی لباس تیار ہوتا ہے

آٹھواں شعر:۔ مطلب یہ ہے کہ اس دنیا کا نظام محبت پر قائم ہے۔مثلاً گلاب کی ہستی رنگ اور خوشبو کے باہمی پیمان محبت پر موقوف ہے۔اگر رنگ اور بو باہم نہ ملتے تو گلاب کبھی عالم وجود میں نہ آتا۔اور ملنا، محبت کی دلیل ہے۔

نواں شعر:۔ مطلب یہ ہے کہ مجھ میں، یا میرے کلام میں کوئی ایسی خوبی موجود نہیں ہے جو مجھ سے پہلے دوسرے شعرا کے کلام میں نہ پائی جاتی ہو۔اگر میرا عیب جو (نکتہ چیں) میرے کلام میں کوئی خوبی پاتا ہے تو چونکہ وہ خوبی میری پیدا کردہ نہیں ہے، اسلئے اسکا، اُس خوبی کو میری ذات سے منسوب کرنا، اسکا ہنر نہیں ہے، بلکہ سچ پوچھو تو عیب ہے۔واضح ہو کہ اس شعر کی خوبی اسکے انداز بیان میں پوشیدہ ہے۔

دسواں شعر:۔ اس شعر میں بھی اقبالؔ نے بڑا دلکش انداز بیان اختیار کیا ہے مطلب یہ ہے کہ خدا نے انسان کو "دل" جیسی بیش بہا شئے عطا فرمائی ہے، بظاہر یہ اسکا بہت بڑا کرم ہے۔لیکن شاعر کہتا ہے کہ اگر گستاخی نہ ہو تو میں عرض کروں کہ یہ

کرم نہیں ہے، بلکہ درپردہ بہت بڑا ستم ہے۔ کیونکہ دل میں ہزاروں تمنائیں ہر وقت مچلتی رہتی ہیں۔ اور انسان اس دل کے کہنے میں آکر ساری عمر انکی پرستش کرتا رہتا ہے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ مقصدِ حیات سے غافل ہوجاتا ہے۔

گیارھواں شعر:۔ مطلب اس فلسفیانہ شعر کا یہ ہے کہ یہ ساری کائنات ایک مستقل وحدت ہے۔ اور وحدت کا اُصول ہر شئے میں کارفرما ہے۔ بظاہر دنیا میں ہزاروں چیزیں نظر آتی ہیں جو باہمد گر مختلف بلکہ متضاد ہیں، لیکن اس اختلاف کے باوجود ساری کائنات ایک واحد شئے ہے۔ یہ امتیاز محض فریب نظر ہے۔ بالفاظ دگر، رگِ گل اور انسان کا خون، دراصل دونوں ایک ہی حقیقت کے مختلف مظاہر ہیں۔ اسکی وحدت کا سبب یہ ہے کہ تصوف کی رو سے یہ ساری کائنات (اور اسکے مختلف مظاہر) اللہ کی صفت خالقیت کا عکس ہے۔ اسلئے ہر شئے کی اصل واحد ہے۔ اس عقیدہ کو تصوّف کی اصطلاح میں وحدت الوجود کہتے ہیں۔

بارھواں شعر:۔ تقلید کے لغوی معنی ہیں کسی حیوان کے گلے میں پٹہ ڈالنا۔ مراد ہے دوسروں کی پیروی کرنا بغیر سوچے سمجھے + مجاز۔ یہ حقیقت کی ضد ہے۔ مثلاً جب ہم کسی بہادر آدمی کو شیر کہتے ہیں تو یہاں شیر کے حقیقی معنی کے بجائے مجازی معنی مراد لیتے ہیں۔ یعنی شیر بمعنی بہادر، نہ کہ وہ حیوان جو پھاڑ کھاتا ہے + رخت سفر اُٹھانے، یعنی سفر پر روانہ ہوجائے، مراد یہ ہے کہ تقلید کی طرح مجاز کا دور بھی ختم ہوچکا ہے۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ جب کسی انسان پر "حقیقت" نمایاں ہوجاتی ہے ـــ اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے سوا، اور کسی شئے کا وجود حقیقی نہیں ہے ـــ تو وہ شخص کسی فلسفی کی تقلید کرتا ہے، اور نہ مجاز کے رنگ میں گفتگو کرتا ہے۔ بلکہ صاف لفظوں میں یہ کہہ دیتا ہے کہ اللہ کے سوا اور کوئی ہستی موجود نہیں ہے وجہ یہ ہے کہ جب حقیقت نمایاں ہوجاتی ہے تو پھر مجاز کی گنجائش ہی کہاں باقی

رہتی ہے؟ اقبالؔ کہتے ہیں کہ فلسفی، اسی وقت تک آپس میں فلسفیانہ مسائل پر مثلاً خدا کیا ہے؟ کائنات کیا ہے؟ گفتگو کرتے رہتے ہیں، یا کرسکتے ہیں جبتک حقیقت اُنکی نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔ اگر وہ حقیقت سے آگاہ ہوجائیں یعنی اگر اُنہیں یہ معلوم ہوجائے کہ اللہ کے سوا اور کوئی ہستی موجود نہیں ہے تو گفتگو ختم ہوجائیگی۔

تیرھواں شعر:۔ مطلب اسکا یہ ہے کہ اگر میں وطن سے دور رہوں تو میرے دوستوں کو میری جدائی سے رنجیدہ ہونا مناسب نہیں ہے، کیونکہ دنیا کا دستور یہ ہے کہ جب تک کوئی شخص ترک وطن نہیں کرتا، آبرو حاصل نہیں کرسکتا۔ دیکھ لو! جب موتی اپنے وطن (قعر دریا) سے دور ہوجاتا ہے، اُسوقت کسی شہزادی کے گلے یا کان کی زینت بنتا ہے۔

چوتھی غزل بر ص ۱۴۷

پہلا اور دوسرا شعر:۔ مطلب یہ ہے کہ کائنات کی ہر شئے میں خدا کا جلوہ نظر آتا ہے۔ بجلی، آگ، چنگاری، چاند، سورج اور تاروں میں جو چمک پائی جاتی ہے، یہ دراصل اُسی کی قدرت کا ظہور ہے، آسمان کی بلندی، زمین کی پستی پانی کی روانی اور ساحل کی افتادگی (سکون) غرضکہ ہر شئے میں اُسی کی جلوہ گری ہے۔

یہ تو ان شعروں کا ظاہری مطلب ہے۔ لیکن دراصل اقبالؔ ہمیں وحدت الوجود کی تعلیم دے رہے ہیں۔ یعنی تمام مظاہر کائنات کی حقیقت ایک ہی ہے۔ اور وہی موجود ہے۔ اسکے علاوہ کسی شئے کا وجود حقیقی نہیں ہے۔ بجلی کی نہ کوئی حقیقت ہے نہ اصلیت، دراصل وہی ذات واحد بجلی میں چمک رہی ہے۔ اسی طرح آگ، چنگاری، چاند، سورج، ستارے سب اشیاء میں اُسی کا ظہور ہورہا ہے

خدا کے علاوہ اور کوئی شئے موجود نہیں ہے۔

تیسرا شعر:۔ استعارہ، یہ علم بیان کی مشہور اصطلاح ہے۔ اسکی تعریف یہ ہے کہ جب ہم کسی لفظ کو مجازی معنی میں استعمال کرتے ہیں تو حقیقی اور مجازی معنی میں کسی نہ کسی علاقہ (رابطہ) کا پایا جانا ضروری ہے ورنہ کلام مہمل ہوجائیگا مثلاً ہمنے اپنے خادم سے کہا کہ پانی لاؤ جب وہ پانی لایا تو ہمنے کہا کہ ہماری مراد گھوڑے سے تھی تو خادم یہ کہہ سکتا ہے کہ جناب پانی اور گھوڑے میں تو کوئی علاقہ ہی نہیں، پس میرا ذہن گھوڑے کی طرف کیسے منتقل ہوتا۔

الغرض پانی بول کر گھوڑا، اور کتاب بول کر لڈو مراد نہیں لے سکتے۔ لہذا ثابت ہوا کہ حقیقی اور مجازی معنی میں کسی علاقہ کا پایا جانا ضروری ہے۔ اگر وہ علاقہ تشبیہ کا ہو تو اُسے استعارہ کہتے ہیں۔ مثلاً کل رات میں اپنے چاند سے ملا۔ یہاں چاند سے معشوقہ مراد ہے، کیونکہ اسکا چہرہ بھی چاند کی مانند ہے۔ (اگر نہو تو عاشق کے زاویۂ نگاہ سے دیکھو)

شعر کا مطلب یہ ہے کہ اگر میں صاف لفظوں میں یہ کہدوں کہ "ہمہ اوست" یعنی ہر شئے خدا کا مظہر ہے (یہی وحدت الوجود ہے) تو ممکن ہے شریعت میرا گریبان پکڑ لے یعنی علماء مجھ پر کفر کا فتویٰ لگادیں۔ اسلئے میں اپنے دل کا مطلب پردے (استعارہ) میں بیان کردیتا ہوں۔ یعنی میں نے یہ نہیں کہا کہ بجلی، آگ، شرارہ، چاند، سورج، تارہ، زمین آسمان۔ دریا۔ غرضکہ ہر شئے میں تو ہی تو ہے بلکہ یہ کہدیا کہ ان میں تیری ہی چمک پائی جاتی ہے۔

چوتھا شعر:۔ یہ شعر بھی وحدت الوجود کے رنگ میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ساری کائنات کی اصل یا بنیاد ایک ہی ہے۔ یعنی حیات + یہ حیات، عالم جمادات یعنی شجر، پھول، پتھر اور ستاروں میں، اپنی ابتدائی حالت میں ہے۔ یعنی شعور

سے محروم ہے۔ قانون ارتقا کے بموجب جب یہ حیات، جمادات سے ترقی کرکے نباتات میں آتی ہے تو اس میں حرکت (شان نمو) پیدا ہوجاتی ہے۔ اور جب عالم حیوان میں آتی ہے تو اس میں شعور اور احساس ظاہر ہوتا ہے اور جب انسان میں آتی ہے تو بیدار ہوجاتی ہے۔ یعنی شعور ذات پیدا ہوجاتا ہے۔

پانچواں شعر:۔ اس شعر میں انداز بیان اور مضمون آفرینی، دونوں خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ بظاہر آنسو، پانی ہے، لیکن محبت نے اسکے اندر بھی اس قدر سوز پیدا کردیا کہ صرف ایک آنسو نے مجھے جلا کر راکھ کردیا۔ مقصود اس سے یہ ہے کہ شاعر ہمارے دل میں سوز محبت کی شدت کا احساس پیدا کرنا چاہتا ہے۔

چھٹا شعر:۔ مطلب یہ ہے کہ میں عاشق ہوں۔ اور عاشق جنت کی خواہش، یا دوزخ کے خوف سے، خدا سے محبت نہیں کرتا، بلکہ اسکی محبت خلوص پر مبنی ہے وہ خدا سے اسلئے محبت کرتا ہے کہ خدا، منبع حسن وجمال ہے، مصدر فضل وکمال ہے اسکی ذات اسی لائق ہے کہ اس سے محبت کی جائے۔

ساتواں شعر:۔ پارے کی ہستی کا تقاضا یہی ہے کہ وہ ہر وقت متحرک (مضطرب) اور سکون سے دور رہے، شاعر نے اسکے اضطراب کو دیکھکر یہ نتیجہ نکالا کہ ہو نہو اس میں کسی عاشق کے دل کی تڑپ پوشیدہ ہے۔ اسی شعر میں جو شاعرانہ خوبی پائی جاتی ہے، اُسے اصطلاح میں "حسن تعلیل" کہتے ہیں۔ یعنی شاعر نے پارے کے اضطراب کی علت (وجہ) بیان کی ہے۔

آٹھواں شعر:۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے جب کلمۂ "لن ترانی" سُنا، (لن ترانی سے مراد ہے کہ اے موسیٰ تو مجھے ہرگز نہ دیکھ سکے گا) تو وہ چُپ نہیں ہوئے، بلکہ اُنہوں نے دوبارہ خدا سے عرض کی کہ تو ضرور اپنا جلوہ مجھے دکھادے۔ لیکن میں اسلئے چُپ ہوں (اصرار نہیں کرتا) کہ میں فرقت زدہ ہوں، مجھ میں بار بار

تقاضا کرنے کی طاقت نہیں ہے۔

شعر میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ مضمون بھی نیا نہیں ہے، لیکن اقبالؔ نے اپنے اندازِ بیان سے اس میں دلکشی ضرور پیدا کر دی ہے۔ طاقتِ تقاضا نہونے سے اس شعر میں بلا کا سوز وگداز پیدا ہو گیا ہے۔ اسکے علاوہ اس میں در پردہ، عاشقی کا کمال بھی پوشیدہ ہے کہ عاشق اب اس منزل میں ہے کہ تقاضا بھی نہیں کر سکتا۔ یقیناً یہ ضعف کی آخری یعنی بلند ترین منزل ہے۔

پانچویں غزل بر ص ۱۴۸

پہلا شعر:۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا کے ہنگامے یوں تو بہت دلکش ہیں، لیکن اُن کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ ان تمام ہنگاموں کا نتیجہ مایوسی، رنج اور افسردگی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ انسان ساری عمر ان میں مصروف رہتا ہے۔ مرتے وقت یہ احساس ہوتا ہے کہ:۔

ع خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا

دوسرا شعر:۔ مطلب یہ ہے کہ فلسفہ اور حکمت سے انسان کے دل کو اطمینان حاصل نہیں ہو سکتا۔ آسودگی اور اطمینان قلب صرف اللہ کی محبت سے حاصل ہو سکتا ہے۔

تیسرا شعر:۔ پہلا مطلب جو لفظوں سے ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ شراب پردہ میں رہنا پسند کرتی ہے۔ کشید سے پہلے انگور کے پردے میں تھی، کشید کے بعد بوتلوں میں پوشیدہ ہو گئی۔ یہ مطلب مضمون آفرینی کی بہت عمدہ مثال ہے۔ اگر مے سے محبت مراد لی جائے تو دوسرا مطلب یہ ہوگا کہ محبت کی خاصیت یہ ہے کہ وہ پردہ میں رہتی ہے۔ پہلے ذاتِ خداوندی میں پوشیدہ تھی۔ جب خدا نے اسے ظاہر فرمایا تو عاشقوں کے دل میں پوشیدہ ہو گئی۔

چوتھا شعر:۔ مطلب یہ ہے کہ حسن میں وہ تاثیر ہے کہ عقلمند آدمی بھی اس سے مغلوب ہو جاتا ہے۔ حسن، دانا کو نادان بنا دیتا ہے۔ دوسرا مصرع حسنِ بیان کی بڑی عمدہ مثال ہے۔

پانچواں شعر:۔ مطلب یہ ہے کہ یورپ کے حسینوں میں شرم وحیا کا مادہ نہیں پایا جاتا اور اقبالؔ کی رائے میں حسن کے لئے شرم وحیا بہت ضروری ہے۔ وجہ یہ ہے کہ شرم و حیا سے حسن کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔

چھٹی غزل بر ص ۱۴۸

پہلا شعر:۔ مطلب یہ ہے کہ ہم اُسی طرح جامِ شراب کا طواف کرتے رہتے ہیں، جس طرح شراب کا عکس۔ یعنی جام میں ہر وقت شراب کا عکس نظر آتا ہے اور ہم ہر وقت پیتے رہتے ہیں۔ مینوشی ہماری نماز ہے اور یہ نماز ہم صبح و شام ادا کرتے رہتے ہیں۔

دوسرا شعر:۔ مطلب یہ ہے کہ درخت اور پتھر، بلکہ تمام کائنات زبان حال سے خدا کی تسبیح کرتی رہتی ہے۔ اقبالؔ نے اس تسبیح کو خدا سے کلام کرنے سے تعبیر کیا ہے اور بلاشبہ بہت عمدہ مضمون باندھا ہے۔

تیسرا شعر:۔ مطلب یہ ہے کہ اس دنیا کی ساخت کچھ اس قسم کی ہے کہ یہاں بہت ہی کم لوگ ایسے ہیں جنکی تمنائیں بر آتی ہیں۔ ورنہ عام دستور یہی ہے کہ کارکنانِ قضا و قدر لوگوں کو ناکام اور نامراد ہی رکھتے ہیں۔ داغؔ نے کیا خوب کہا ہے ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارماں، لیکن پھر بھی کم نکلے!

ستم کشِ تپشِ ناتمام، سے وہ شخص مراد ہے جو تپشِ ناتمام کی اذیت میں مبتلا ہو۔ تپشِ ناتمام سے وہ کوشش مراد ہے۔ جس کا کوئی نتیجہ برآمد نہو۔ یعنی ناکامی عموماً لوگ جب اس دنیا سے جاتے ہیں تو ہزاروں آرزوئیں ساتھ ہی لے جاتے ہیں۔

چوتھا شعر:۔ لفظوں سے جو مطلب واضح ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ انسان کو خاموش ہی رہنا بہتر ہے۔ دیکھ لو! باغ میں جس قدر پرندے خوش آواز ہیں، مثلاً بلبل، طوطی، مینا، ان کی آواز، ان کے حق میں بلائے جان بنجاتی ہے۔ لوگ انہیں پنجروں میں قید کر کے لطفِ زندگی سے محروم کر دیتے ہیں۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہ دنیا بھی عجب مقام ہے! یہاں جو شخص سچی بات کہتا ہے، دنیا والے اُسے مبتلائے آلام کر دیتے ہیں۔ اگر کسی کو شک ہو تو وہ رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم، رئیس الاحرار مولانا حسرت موہانی، اور امام الاحرار مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کی زندگی کا مطالعہ کرے۔ اس صورت میں 'خوشنوائی' سے حق گوئی مراد لینی ہوگی۔ پابندِ دام کرتے ہیں۔ یعنی جیل خانہ میں بھیج دیتے ہیں۔

پانچواں شعر:۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ نشاط حاصل کرنے کے لئے شراب پیتے ہیں وہ شراب کا غلط استعمال کرتے ہیں۔ غالبؔ نے اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

یعنی اقبالؔ کی رائے میں شراب کا صحیح استعمال یہ ہے کہ اُسے 'بے خودی' کے لئے پیا جائے۔ واضح ہو کہ یہ شاعرانہ اندازِ بیان ہے، ورنہ دراصل اقبالؔ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ شراب حلال ہے۔ وہ شاعری کر رہے ہیں، فقہ کا مسئلہ بیان نہیں کر رہے ہیں۔ بالفاظ دگر اُنھوں نے اس شعر میں ایک مضمون پیدا کیا ہے۔ اسکے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ اگر شراب سے شرابِ معرفت مراد لیں تو دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے

کہ معرفت کی شراب، حلال ہے۔ بشرطیکہ انسان اسکو اس غرض سے پئے کہ بیخودی یعنی غیر اللہ سے بیگانگی ہو جائے۔ لیکن اگر کوئی شخص شرابِ معرفت اسلئے پیتا ہے کہ لوگ اسکی بزرگی کے معتقد ہو جائیں، اور اسکی عزت کرنے لگیں، جس کا نتیجہ نشاطِ دنیوی ہوگا، تو پھر یہ شراب، یعنی ایسی محبت، ناجائز بلکہ از روئے شریعت حرام ہے۔

چھٹا شعر:۔ اس شعر میں اقبالؔ نے واعظ سے اپنے اختلاف کی وجہ بیان کی ہے کہ میں ساری دنیا کو محبت کا پیغام دیتا ہوں۔ لیکن واعظ اس نعمت یا عطیۂ الٰہی کو صرف اپنے ہم عقیدہ لوگوں تک محدود رکھتا ہے۔ اسلئے میرا اسکا نباہ نہیں ہو سکتا۔

ساتواں شعر:۔ اس شعر میں اقبالؔ نے اولیاء اللہ اور بزرگانِ دین کی روحانی طاقت کا اثبات کیا ہے کہ اللہ کے بندوں یعنی اُنکی نگاہ میں یہ تاثیر ہوتی ہے کہ وہ ایک نظر سے، انسانوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں ع

الٰہی کیا چھپا ہوتا ہے اہلِ دل کے سینوں میں

ساتواں شعر:۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اپنی خاندانی عزت اور شرافت اور ذاتی ثروت کو برباد کر کے دادِ عیش دیتے ہیں، ان کا انجام ہمیشہ خراب ہوتا ہے۔ وہ بظاہر عیش وعشرت کرتے ہیں، لیکن دراصل اپنی زندگی تباہ کر لیتے ہیں۔

آٹھواں شعر:۔ وطنِ مازنی سے اٹلی (اطالیہ) مراد ہے۔ مازنی، دراصل اسکا تلفظ مزینی ہے۔ ضرورت شعری کی وجہ سے مازنی باندھا ہے۔ (مزینی، MAZZINI) اٹلی کا مشہور محب وطن، اور جمہوریت نواز تھا۔ ۱۸۰۵ء میں پیدا ہوا ۱۸۷۲ء میں وفات پائی۔ اُس نے اپنے ملک اور اپنی قوم کی خاطر ساری عمر سختیاں جھیلیں۔ آخری مرتبہ ۱۸۷۰ء میں حکومت نے اُسے گرفتار کیا اور ۱۸۷۲ء میں جیلخانہ ہی میں اسکا انتقال ہو گیا۔ اقبالؔ چونکہ خود ملوکیت کے

دشمن اور حریت کے علمبردار تھے۔ اسلئے اُنہوں نے اس شعر میں اس عظیم الشان انسان کی خدمت میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ دوسرا مصرع یہ بتاتا ہے کہ اقبالؔ نے یہ غزل اُس وقت لکھی تھی، جب وہ سنہ ۱۹۰۸ء میں یورپ سے واپس ہو رہے تھے۔

نواں شعر:- اس میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ مشرقی شعرا کی تقلید میں اقبالؔ نے بڑے دلکش انداز میں، اپنے گناہوں کا اعتراف کیا ہے۔ لفظ "دیر" بمعنی بتخانہ سے اس شعر میں غضب کی شوخی پیدا ہو گئی ہے

نظم ۱۴۹

تبصرہ بظاہر یہ ایک طویل غزل ہے۔ کیونکہ اس میں مطلع بھی ہے۔ اور مقطع بھی۔ لیکن دراصل یہ ایک نظم ہے اور اہم نظم ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس میں نہ تغزل ہے نہ وارداتِ عاشقی کا ذکر ہے۔ بلکہ اسکے ذریعہ سے اقبالؔ نے قوم کو اپنے آئندہ پروگرام سے آگاہ کیا ہے۔

یہ نظم اس انقلاب کا پتہ دے رہی ہے جو قیامِ یورپ کی بدولت اُنکی ذہنیت میں پیدا ہو گیا تھا۔ ڈگریاں حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اُنہوں نے یورپ کی تہذیب کا مطالعہ بھی جاری رکھا۔ چنانچہ دو سال کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہونچے کہ "تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کریگی"۔ اور اسکی وجہ یہ ہے کہ ہر وہ تہذیب جسکی بنیاد مادہ پرستی پر ہو، انسانیت کے حق میں پیامِ موت ہے۔ چنانچہ ہمنے اپنی آنکھوں سے اس شعر کی صداقت دیکھ لی۔

اس نظم سے اقبالؔ کی شاعری کا دوسرا دور ختم ہو جاتا ہے۔ اور سنہ ۱۹۰۸ء سے وہ ایک مفکرِ ملت یا حکیمِ اُمت کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں چنانچہ اُنہوں نے قرآن اور حدیث کو سامنے رکھکر مسلمانوں کے لئے ایک مکمل پروگرام مرتب کیا تاکہ مسلمانوں کا سفینہ، طوفان سے محفوظ رہکر، صحیح سلامت، منزلِ مقصود تک پہونچ جائے۔

دل تو یہ چاہتا تھا کہ اس نظم پر بحیثیت مجموعی تبصرہ کیا جائے۔ لیکن اقبالؔ نے اس نظم کے ہر شعر میں رمز و ایما سے کام لیا ہے۔ اسلئے طلبہ کی سہولت کی خاطر تبصرہ کے بجائے، ہر شعر کا جداگانہ مطلب ذیل میں درج کرتا ہوں:۔

(۱) چونکہ یورپ کا سرمایہ دارانہ اور مادہ پرستانہ نظامِ حیات باطل ہو چکا ہے، اسلئے اب دینِ اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور کامیابی کا زمانہ آگیا ہے۔ لہذا اسلام کے پاکیزہ اُصولوں کی اشاعت ہر مسلمان پر فرض ہے۔ تاکہ ساری دنیا اسکے نور سے منور ہو سکے۔ اسلام کے حقائق ابتک پردوں میں پوشیدہ تھے اور مسلمان تبلیغ سے غافل تھے۔ لیکن اب وقت آگیا ہے کہ ان حقائق کو منظرِ عام پر لایا جائے۔

(۲) وہ دور گذر گیا جب انگریزوں کے خوف سے، مسلمان علما حجروں میں چھپکر اسلام کے حقائق بیان کرتے تھے۔ اب انشاء اللہ مسلمان علانیہ، اسلام کی حقانیت، یورپ کے شہروں میں تحریر اور تقریر کے ذریعہ سے بیان کرینگے۔ اور ساری دنیا کو اسلامی اُصولوں سے روشناس کر دینگے۔

نوٹ:- اگرچہ اقبالؔ کی قوم نے ابھی تک اقبالؔ کی اس دیرینہ آرزو کی تکمیل کا کوئی انتظام نہیں کیا ہے۔ لیکن میں اللہ کی رحمت سے نااُمید نہیں ہوں کیا عجب ہے کہ اس نے نیا زنے یہ سعادت حکومت پاکستان کے لئے مقدر کر دی ہو۔

(۳) جو لوگ تبلیغ اسلام کی تڑپ رکھتے تھے لیکن قوم اور ماحول اور حالات سے مایوس ہو کر گوشۂ گمنامی میں چلے گئے تھے، انشاء اللہ اب دوبارہ میدانِ عمل میں آجائینگے۔ انکی جد وجہد (برہنہ پائی) کا عالم تو وہی رہیگا، لیکن محاذِ جنگ بدل جائیگا۔ یعنی جہاد کا طریقہ (خارزار) بدل جائیگا۔ مثلاً تلوار کے بجائے زبان اور قلم سے کام لینگے۔

(۴) مجھے آثار ایسے نظر آرہے ہیں کہ رحمتِ الٰہی کا پھر نزول ہوگا، اور آج سے تیرہ سو سال پہلے، اللہ نے جو کرم عربوں (صحرائیوں) پر کیا تھا، وہی کرم اب دوبارہ ملت اسلامیہ پر نازل ہوگا۔

(۵) میں نے فرشتوں سے یہ سُنا ہے۔ (یہ شاعرانہ اندازِ بیان ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے یقین ہے) کہ جس مسلمان قوم نے، کسی زمانہ میں قیصر (روم) اور کسریٰ (ایران) کے تخت اُلٹ دیئے تھے، وہ قوم اب پھر بیدار ہونے والی ہے۔

(۶) جب قوم کے لیڈروں نے، قومی کارکنوں کے جلسوں میں میرا تذکرہ کیا کہ اقبالؔ بھی خدمتِ قوم کے لئے آمادہ ہے تو بزرگانِ ملت (جن کو دنیا کا خوب تجربہ ہو چکا ہے) یہ بات سُن کر کہنے لگے کہ اقبالؔ چونکہ شمشیر برہنہ ہے سچ بولتا ہے، اور ہر شخص کو کھری کھری سُناتا ہے (مونہہ پھٹ ہے) اسلئے عوام اور خواص دونوں کی نظروں میں ذلیل رہیگا۔ اپنے بھی خفا رہینگے اور بیگانے بھی ناخوش رہینگے۔ یعنی قوم بھی ناراض رہیگی اور حکومت بھی ناراض رہیگی۔

(۷) اے اہلِ مغرب! یہ دنیا بہرحال دنیا ہے۔ اور اس میں اللہ کی مخلوق آباد ہے یہ کوئی دکان یا تجارتی ادارہ نہیں ہے۔ جس پر تمہارا قبضہ ہو سکے، یا جس پر تمہارا حکم نافذ ہو سکے۔ آگاہ ہو جاؤ کہ جس تہذیب کو تم دنیا والوں کے حق میں مفید قرار دے رہے ہو، وہ عنقریب ان کے لئے وبالِ جان بنجائیگی۔ زرِ کم عیار (یعنی کھوٹا سونا)۔

(۸) اور مجھے تو یہ نظر آرہا ہے کہ تمہاری یہ تہذیب جس پر تمہیں اسقدر ناز ہے، عنقریب تباہ ہو جائیگی۔ اور اسکے ساتھ تم بھی فنا ہو جاؤ گے۔ بات صاف ہے جو طائر اپنا آشیانہ کسی کمزور شاخ پر بناتا ہے، وہ شاخ یقیناً اسکے بوجھ سے

ٹوٹ جائیگی اور شاخ کے ساتھ آشیانہ بھی برباد ہو جائیگا۔

(۹) مورِ ناتواں سے مسلمان قوم مراد ہے۔ موجوں سے مصائب اور مشکلات مراد ہیں + انشاء اللہ، مسلمان قوم اگرچہ کمزور ہے۔ (مور بمعنی چیونٹی) لیکن وہ گلاب کی پتی کی کشتی بنا لیگی اور اگرچہ اسکی راہ میں صدہا مشکلات آئینگی، لیکن وہ ان سب پر غالب آجائیگی۔ سفینۂ برگِ گل سے بہت ادنیٰ درجہ کی زندگی اور ساز و سامانِ ظاہری کی کمی مراد ہے۔

(۱۰) آجکل کیفیت یہ ہے کہ قوم کے واعظین ہر مجلس میں اپنا وقار قائم کرنے کے لئے، لوگوں کو اپنی ملت دوستی اور قوم پروری کے جذبات کی داستانیں سُناتے رہتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں، اس طرح محض زبانی جمع خرچ سے قومی خادموں میں شمار ہو جائیگا۔

(۱۱) دینِ اسلام ایک تھا، اور ایک ہی ہے، لیکن افسوس کہ مسلمانوں نے اسکی مختلف تعبیرات کر کے، اپنے آپ کو صدہا فرقوں میں منقسم کر لیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ آج دنیا میں اتنی بڑی قوم کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ فرقہ بندی قوم کے حق میں سب سے بڑی لعنت ہے۔ جس سے اسکا وقار ختم ہو جاتا ہے۔

دوسرا اور دقیق مطلب یہ ہے کہ دراصل ساری کائنات ایک مستقل وحدت یا اکائی ہے۔ لیکن انسانی آنکھ چونکہ قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتی ہے اور مبتلائے فریب ہو جاتی ہے۔ اسلئے اُس نے اس وحدت کو کثرت میں تبدیل کر دیا۔ یعنی انسان اپنی نادانی اور غلط فہمی کی بنا پر اشیائے کائنات میں امتیاز کرتا ہے۔ وہ گل اور خار، چاند اور سورج، حیوان اور انسان، جمادات اور نباتات میں امتیاز کرتا ہے۔ حالانکہ یہ تمام اشیاء اُسی ذاتِ واحد کے مظاہر ہیں اور دراصل انکی اپنی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

(۱۲) میں نے ایک دن قوم کے ایک ہمدرد (قمری) سے یہ کہا کہ ہماری قوم میں جو لوگ

اپنے کو آزاد کہتے ہیں در اصل وہ بھی حکومت کے غلام ہیں، تو میری قوم کے نوجوان یہ سُن کر بول اُٹھے کہ ہو نہو یہ اقبالؔ تو حکومت کے سارے رازوں سے واقف معلوم ہوتا ہے۔ اس نے یہ کیسی بتہ کی بات کہی ہے!

دوسرا مطلب یہ ہے کہ شعرا "سرو" اور شمشاد اور صنوبر" تینوں کو آزاد باندھتے ہیں۔ آزاد، بایں معنی کہ یہ تینوں درخت بہار اور خزاں کی قید سے آزاد ہیں۔ چنانچہ اقبالؔ خود کہتے ہیں:۔ ؏

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پا بگِل بھی ہے

لیکن سب جانتے ہیں کہ صنوبر اس نام نہاد آزادی کے باوجود، پابگِل یعنی گرفتار ہے۔ بایں معنی کہ (۱) وہ اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکتا (۲) قانونِ نمو کا بہرحال پابند ہے (۳) ہوا روشنی پانی اور مٹی کا بہرحال محتاج ہے۔ جب میں نے اس حقیقت کا اظہار قمری سے کیا (جو صنوبر کو بہت پسند کرتی ہے) تو غنچے یہ کہنے لگے کہ واقعی یہ شخص چمن کا رازدار معلوم ہوتا ہے۔ یعنی یہ شخص اس تلخ حقیقت سے واقف ہے کہ دنیا کی تخلیق اس نہج پر ہوئی ہے کہ یہاں جو بظاہر آزاد ہے، بباطن وہ بھی گرفتار ہے۔

(۱۳) اس شعر میں اقبالؔ نے بہت بڑا نکتہ بیان کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کا اصلی عاشق وہ شخص ہے جو خدا کے بندوں کے ساتھ ہمدردی کرے اور انہیں راہ راست پر لائے۔

(۱۴) مطلب یہ ہے کہ جو لوگ خدمتِ قوم کے آرزومند ہوں اُن کو اس حقیقت کو ہمیشہ مدنظر رکھنا چاہیئے۔ کہ خدمتِ قوم، پھولوں کی سیج نہیں ہے۔ اس راہ میں بہت دشواریاں لاحق حال ہوتی ہیں۔ اور خادمِ قوم کو لازم ہے کہ وہ زبان سے اُف تک نہ کرے۔ (جنبشِ نظر بھی گناہ ہے) جو لوگ ضعفِ ایمانی کی بنا پر حرفِ

شکایت زبان پر لاتے ہیں، قوم میں انکی کوئی عزت باقی نہیں رہتی (رسوا کیا گیا ہے)

(۱۵) یہ شعر بہت اہم، اور اقبالؔ کے عزائم قلبی کا آئینہ دار ہے، بلکہ ساری نظم کی جان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگرچہ حالات میرے مخالف ہیں اور مشکلات میری راہ میں حائل ہیں (ظلمتِ شب)، لیکن میں ضرور اپنی قوم کو بیدار کرونگا۔ اور ترقی کی راہ پر چلاؤنگا۔ اور میں اس مقصد کے لئے، اپنی قوم کے اندر عشقِ رسولؐ کی آگ بھڑکاؤنگا۔ اور جوش دلانے والی نظموں سے اُن کی رگوں میں خون دوڑاؤں گا۔ میری آہ انگارے برسائیگی، اور میری سانس سے شعلے نکلینگے۔

(۱۶) اے مسلمان اگر تو نے اپنی زندگی کا مقصد صرف یہ قرار دیا ہے کہ کچھ عرصہ دنیا میں زندہ رہے اور پھر مرجائے (اسی کو نمود کہتے ہیں) تو یقین رکھ کہ تو ہمیشہ کے لئے مٹ جائیگا۔ جو شئے انسان کو حیات ابدی عطا کر سکتی ہے وہ عشق رسولؐ ہے۔ محض نمود، یعنی حیات چند روزہ، یہ تو حیوانات کی زندگی کا مقصد ہے۔ انسان تو اشرف المخلوقات ہے۔ اور پھر مسلمان تو خلیفۃ اللہ ہے۔

(۱۷) مقطع میں خالص تغزل کا رنگ ہے۔ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ ستم کشِ انتظار ہوگا، یعنی انتظارِ یار کی زحمت اُٹھا رہا ہوگا۔

حصّہ سوم

نظم ص ۱۵۵

حلِّ لغات بلاد جمع ہے، بلد کی، بلد بمعنی شہر۔ مسجودِ دلِ غمدیدہ یعنی مسلمانو کے غمگین دلوں کو بہت محبوب ہے۔ لغوی معنی ہیں "غمگین دل (دلّی کو) سجدہ کرتا ہے + اسلاف کا لہو خوابیدہ ہے۔ ہمارے آبا و اجداد کا خون اسکے ذرّے ذرّے میں ملا ہوا ہے۔ مثلاً ۱۸۵۷ء میں جب انگریزوں نے دلّی فتح کی تو صرف چیلوں کے کوچہ اور خانم کے بازار، دو محلوں میں پندرہ ہزار کے لگ بھگ مسلمانوں کو تلوار کے گھاٹ اُتار دیا + خیر الاُمم۔ اُمم جمع ہے اُمت کی۔ امت بمعنی قوم یا جماعت۔ خیر، بمعنی بہترین۔ بہترین قوم سے مراد مسلمان قوم ہے کیونکہ قرآن مجید نے اس قوم کو بہترین قوم فرمایا ہے + حاصل بمعنی خرمن، کھلیان، پیداوار + جہان آباد سے دلّی مراد ہے + کرامت بمعنی بزرگی۔ یا عظمت + ہمدوشِ ارم۔ اِرم وہ حسین شہر جسے شداد نے بسایا تھا۔ اور جس میں اُس نے جنتِ ارضی بنائی تھی۔ مطلب یہ ہے کہ بغداد بھی ارم کی طرح حسین شہر تھا۔ جانشینانِ پیمبرؐ سے سلاطین عباسیہ مراد ہیں جو اپنے آپ کو آنحضرت صلعم کا جانشیں سمجھتے تھے۔ اور تاریخ میں بھی "خلفا" کے لقب سے مشہور ہیں + چمن ساماں سے مراد یہ ہے کہ ہر غنچہ اپنی جگہ ایک چمن تھا + کا بنتا تھا جن سے روما۔ اشارہ ہے مشرقی سلطنتِ روم (قسطنطنیہ) کے عیسائی فرمانرواؤں کی طرف جو سلاطین عباسیہ (علی الخصوص، ہارون، مامون، متوکل) کی سطوت سے

کانپتے رہتے تھے + بزمِ ملتِ بیضا سے مسلمان قوم مراد ہے۔ لغوی معنی ہیں سفید یا روشن قوم کی محفل + دِیا، ہندی میں چراغ کو کہتے ہیں + فروزاں بمعنی روشن + تاک بمعنی انگور کی بیل + دیار بمعنی شہر + مہدیٔ اُمت۔ ایک ضعیف حدیث میں سلطان محمد الملقب بہ فاتح کو جس نے ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ فتح کیا تھا، اس اُمت کا مہدی قرار دیا گیا ہے + سطوت بمعنی شوکت و شان + آستانِ مسند آرائے شہِ لولاک "شہِ لولاک" یہ آنحضرت صلعم کا لقب ہے۔ "لولاک" ایک حدیث قدسی کا ابتدائی حصہ ہے۔ پوری حدیث یوں ہے۔ لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ، یعنی اللہ نے حضور انور سے فرمایا کہ اے میرے پیارے! اگر میں تجھے نہ پیدا کرتا تو آسمانوں (یعنی اس کائنات) کو (بھی) پیدا نہ کرتا۔ یعنی یہ کائنات حضور اقدس صلعم کی ذات پاک کی بدولت پیدا ہوئی ہے۔ ترکیب مذکورہ کا مطلب یہ ہے کہ قسطنطنیہ، حضور اکرمؐ کے جانشینوں یا خلفاء (عثمانی) کا آستانہ (باب الحکومت یا دار الخلافہ) ہے + نکہت بمعنی خوشبو + حضرت ایوب انصاریؓ سرکار دو عالم صلعم کے مشہور صحابہ میں سے ہیں۔ اور اُن خوش نصیب افراد میں سے ہیں، جن کو حضور سرور کائنات صلعم کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا۔ ۴۹ھ میں، جب امیر معاویہ نے قسطنطنیہ فتح کرنے کے لئے دوسرا لشکر بھیجا، تو اس میں حضرت ابو ایوب انصاریؓ بھی شریک ہوئے۔ اور داد شجاعت دی۔ لیکن دوران محاصرہ میں وفات پا گئے۔ اُن کی وصیت کے مطابق اُن کو قسطنطنیہ کی دیوار کے نیچے دفن کیا گیا + کُشت وخوں کا حاصل، جنگ و جدل کا نتیجہ + خوابگاہِ مصطفیٰؐ سے مدینہ طیبہ کی سرزمین مراد ہے + خاتم ہستی یعنی کائنات + تاباں، چمکدار + یثرب، مدینہ منورہ کا اصلی نام ہے + ماویٰ جائے پناہ + نقطۂ جاذب الخ تجھ سے محبت کی شعاعیں پھوٹ کر نکلتی ہیں، یا تو

تمام دنیا کے مسلمانوں کی محبت کا مرکز ہے۔ یا تیری طرف مسلمانوں کے دل کھنچے چلے جاتے ہیں۔

تبصرہ: یہ نظم از اوّل تا آخر تاثیر میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اقبال نے اس قسم کی نظمیں اسلئے لکھی ہیں کہ مسلمانوں کو اپنے اسلاف کے کارناموں سے کچھ تو آگاہی حاصل ہو۔ شاید اس طریقہ سے، ان کے اندر، اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چلنے اور دوبارہ سربلندی حاصل کرنے کا جذبہ بیدار ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اس نظم کے ہر شعر میں اپنی اثر آفرینی کا کمال دکھایا ہے۔

اس نظم میں اقبال نے دنیائے اسلام کے پانچ مشہور ترین شہروں کا نہایت جامعیت کے ساتھ تذکرہ کیا ہے۔ دلّی، بغداد، قرطبہ، قسطنطنیہ اور مدینۂ طیبہ اگر ان پانچ شہروں کی تاریخ لکھی جائے تو بلا مبالغہ ملت اسلامیہ کی تیرہ سو سال (۱۳۰۰) کی تاریخ مرتب ہو جائیگی۔ ذیل کی دو تاریخیں اس پر شاہد ہیں:۔

قیام خلافت بہ مقام مدینہ منورہ ۶۲۲ء (۱ھ) ۔ زوال خلافت قسطنطنیہ ۱۹۲۴ء (۱۳۴۲ھ)

ان پانچوں شہروں کی تاریخ تو خارج از بحث ہے عام شائقین کی آگاہی کیلئے مختصر تعارف سطور ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:۔

(۱) دہلی۔ مسلمانوں کی آمد سے پہلے، مہابھارت کے زمانہ میں اسکا نام ہستناپور تھا، بعد ازاں اندر پرستھ ہوا۔ مسلمانوں کے عہد حکومت میں کئی دفعہ اجڑی اور کئی مرتبہ آباد ہوئی۔ آخر میں شاہجہاں نے بسایا۔ اور ۱۶۳۶ء میں پایہ تخت بنایا۔ ۱۹۱۱ء میں انگریزوں نے اسکو اپنا دار الحکومت بنایا اور اسکے پہلو میں "نئی دلی" کے نام سے سرکاری دفاتر تعمیر کئے۔ یہ قدیم تاریخی شہر، جو بڑے بڑے دینی اور دنیاوی سلاطین کا مدفن ہے، جو صدیوں تک مسلمانوں کی تہذیب کا مرکز رہا ہے۔ دریائے جمنا کے دائیں کنارے پر آباد ہے۔ تقسیم سے پہلے اسکی آبادی دس لاکھ کے قریب تھی۔

(۲) بغداد۔ یہ قدیم تاریخی شہر جو کسی زمانہ میں، دنیائے اسلام کا مرکز تھا، دریائے دجلہ کے کنارے آباد ہے، اسکو ابو جعفر منصور نے جو خاندان عباسیہ کا دوسرا فرمانروا تھا ۷۶۲ء میں آباد کیا تھا۔ ہارون الرشید کے عہد میں اسکی عظمت اپنے انتہائی عروج کو پہونچ گئی اس زمانہ میں اس کی آبادی پندرہ لاکھ سے زیادہ تھی۔ اسکا لقب دار السلام تھا۔ ۱۲۵۸ء میں ہلاکو نے دریائے دجلہ کا پانی مسلمانوں کے خون سے سرخ کر دیا۔ ۱۳۹۳ء میں تیمور نے اس کو فتح کیا۔ ۱۶۳۸ء میں سلطان مراد عثمانی نے اسکو سلطنت عثمانیہ میں شامل کیا۔ ۱۹۱۷ء میں انگریزوں نے اس کو فتح کیا۔ اسوقت اسکی آبادی چار لاکھ کے قریب ہے۔

(۳) قرطبہ۔ اندلس کا مشہور شہر جسے عربوں نے ۷۵۶ء میں فتح اندلس کے بعد اپنا پایۂ تخت بنایا۔ اور ۱۲۳۶ء تک یہ شہر ہر اعتبار سے دمشق اور بغداد کا ہمسر رہا۔ اسکی جامع مسجد، جو دنیا کی سب سے بڑی مسجد تھی آج گرجا بنی ہوئی کسی مرد مومن کی آمد کا انتظار کر رہی ہے۔ اسوقت اس کی آبادی دو لاکھ کے قریب ہے۔ یہ شہر وادی الکبیر کے کنارے واقع ہے۔

(۴) قسطنطنیہ۔ اس تاریخی شہر کا اصلی نام بائی زین ٹیم تھا، جسے اہل میگارا نے ۶۵۷ق م میں آباد کیا تھا۔ ۳۲۸ء میں قسطنطین اعظم نے اسکو سلطنت روما کا پایۂ تخت بنایا۔ اور اسکا نام اپنے نام پر کونسٹینٹینوپل رکھا۔ ۱۴۵۳ء میں سلطان محمد فاتح نے اسکو فتح کیا۔ اور یہ شہر ۱۹۲۳ء تک سلطنت ترکی کا پایہ تخت اور مسلمانوں کا سیاسی مرکز رہا۔ یہ شہر ابنائے باسفورس کے کنارے آباد ہے۔ اس وقت اسکی آبادی دس لاکھ کے قریب ہے۔ آجکل اسکا سرکاری نام استنبول ہے۔

(۵) مدینہ منورہ۔ اس مبارک شہر کا قدیمی نام یثرب ہے۔ جب ۶۲۲ء میں سرکار دو عالم صلعم مکہ مکرمہ سے ہجرت فرما کر یہاں تشریف لائے تو اسکا نام مدینۃ النبی ہو گیا۔ یہ شہر مکہ مکرمہ کے شمال میں ۲۵۴ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اسکی آبادی تیس ہزار

ہے۔ مسجد نبوی تمام مسلمانانِ عالم کی محبت کا مرکز ہے۔ مکہ کی عظمت مسلّم ہے لیکن مدینہ بلاشبہ دنیا میں مسلمانوں کا محبوب ترین شہر ہے۔ اقبال لکھتے ہیں:۔

خاک یثرب از دو عالم خوشتر است
اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است

پہلا بند۔ بلاد اسلامیہ میں سے پہلا شہر دلّی (دہلی) ہے۔ کہتے ہیں کہ دلّی کی سرزمین مسلمانوں کو بہت محبوب ہے۔ کیونکہ اسکے ذرّے ذرّے میں اُن کے بزرگوں کا خون شامل ہو چکا ہے۔ اس سرزمین سے مسلمانوں کی عظمتِ ماضیہ وابستہ ہے۔ اور اسکی خاک میں وہ مسلمان سلاطین آرام کر رہے ہیں (مثلاً التمش، فیروز تغلق، سکندر لودی، شاہجہان اور حضرت عالمگیرؒ) جنکی حکومت پر اس دنیا کے انتظام کا دار و مدار تھا۔ ان بادشاہوں کی فتوحات اور شان و شوکت کی یاد ابھی تک میرے دل کو تڑپاتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ حکومت جا چکی ہے۔ (ڈیڑھ سو سال سے یعنی ۱۸۰۳ء سے لال قلعہ پر اغیار کا علم لہرا رہا ہے) لیکن اس حکومت کی یاد ابھی تک دل و دماغ میں محفوظ ہے۔

دوسرا بند۔ دلی کی عظمت میں بغداد بھی برابر کا شریک ہے۔ یہ شہر وہ ہے کہ تہذیب حجازی (لالۂ صحرا) اسکے لئے سامانِ ناز اور باعث افتخار تھی۔ اس شہر کی خاک بلاشبہ باغِ ارم کی ہم مرتبہ ہے۔ کیونکہ اس میں آنحضرت صلعم کے جانشیں (سلاطین عباسیہ) اقامت گزیں تھے۔ ان سلاطین کی شان و شوکت کا یہ عالم تھا کہ قسطنطنیہ کے عیسائی حکمران اُن کے نام سے کانپتے رہتے تھے۔

تیسرا بند۔ شہر قرطبہ بھی مسلمانوں کی آنکھوں کا نور ہے۔ کیونکہ اس شہر نے مغرب کی اندھیری رات میں تہذیب و تمدن اسلامی کا چراغ روشن کیا، جب یورپ کے تمام شہر جہالت کے سمندر میں غرق تھے اسوقت قرطبہ علم و فن کا مرکز بنا ہوا تھا اور انگلستان، فرانس، جرمنی، اور اٹلی کے عیسائی طلبہ اسکے مدرسوں میں علوم و فنون کی تحصیل کرتے تھے۔ یہ سچ ہے کہ جب قرطبہ کو عیسائیوں نے فتح کیا تھا تو انہوں نے اس عظیم الشان شہر کو تباہ کر دیا، اور کتب خانوں کو جلا دیا۔ اور مدرسوں کو بند کر دیا۔ لیکن علوم و فنون کا جو چرچا، اس شہر کی بدولت، یورپ کے مختلف شہروں میں ہو چکا تھا، اسکی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ آج یورپ میں جس قدر علوم و فنون ہمیں نظر آ رہے ہیں، یہ سب قرطبہ کے مسلمان علما، حکما، اور سائنسدانوں کا صدقۂ جاریہ ہے۔ اگر وہ یورپ کو قدیم دنیا کے تمام علوم و فنون سے روشناس نہ کرتے، تو آج یورپ میں نہ کوئی شخص فلسفہ کا نام جانتا، نہ سائنس کا۔ قرطبہ اُس تہذیب کا مدفن ہے، جس کی بدولت یورپ کے علمی باغوں کی بیلیں سرسبز ہو رہی ہیں۔ یعنی یورپ میں علوم و فنون کا چرچا ہے۔

چوتھا بند۔ شہر قسطنطنیہ قیصر قسطنطین (CONSTANTINE) متوفی ۳۳۷ء کا پایہ تخت تھا۔ یہ شہر سلطان محمد الملقب بہ فاتح کی (جس نے اس شہر کو ۱۴۵۳ء میں فتح کیا تھا) عظمت اور شجاعت کا مستقل ثبوت اور پائیدار نشان ہے۔ یہ سرزمین بھی دلّی اور بغداد، اور قرطبہ کی طرح مسلمانوں کی نظروں میں محترم ہے۔ کیونکہ ایک تو یہ شہر سلاطین عثمانیہ کا پایہ تخت رہ چکا ہے جنہوں نے کم و بیش پانچ سو سال تک اسلام کی عظمت قائم رکھنے کے لئے اپنا خون پانی کی طرح بہایا اور تن تنہا (جبکہ اسمٰعیل اور طہماسپ صفوی ایران میں اور جہانگیر و شاہجہان ہندوستان میں داد عیش دے رہے تھے) بیت المقدس کی حفاظت کے لئے سارے یورپ کا مقابلہ کیا۔ اور جب تک عربوں نے اُن کے ساتھ غداری نہ کی، انگریزوں کو اپنے ناپاک مقاصد میں کامیابی نہ ہو سکی۔ دوسرے یہ کہ اس شہر میں حضرت ابو ایوب انصاری رضؓ کا مزار ہے۔

اس شہر کی ہوا، میری رائے میں تو گلاب کی خوشبو کی طرح پاکیزہ ہے کیونکہ

یہاں حضرت ابوایوب انصاریؓ مدفون ہیں۔ جن کی قبر سے ابھی تک یہ آواز آرہی ہے کہ اے مسلمانو! یہ شہر ملت اسلام کا "دل" ہے۔ کیونکہ مسلمانوں نے اسکو صدیوں کی جنگ وجدال کے بعد فتح کیا ہے۔ واضح ہو کہ مسلمانوں نے قسطنطنیہ پر پہلا حملہ سنہ ۴۸ھ میں کیا تھا اور سنہ ۹۸ھ میں دوسرا لشکر روانہ کیا گیا تھا۔ اور آخری حملہ سنہ ۸۵۳ھ میں کیا تھا۔ گویا کم وبیش آٹھ سو سال تک مسلمان اس شہر کو فتح کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ اسلئے اقبالؔ نے بالکل سچ لکھا ہے کہ ؎ سیکڑوں صدیوں کی کُشت وخون کا حاصل ہے یہ شہر

پانچواں بند۔ اقبالؔ کا کمالِ فن دیکھئے کہ جس شہر کا ذکر بلحاظ تقدس سب سے پہلے کرنا چاہئے تھا، اسکا تذکرہ بغرض اثماٰفرینی سب سے آخر میں کیا ہے۔ یہی تو وجہ ہے کہ اس مصرع میں بلا کا زور اور غضب کی تاثیر پیدا ہوگئی ہے۔ ؎

وہ زمیں ہے تو، مگر اے خوابگاہِ مصطفیٰؐ

اے مدینہ کی پاک زمین! کیا ٹھکانا ہے تیرے مرتبہ کا! انسان درکنار، خود خانۂ کعبہ ۔ بیت اللہ شریف ۔ تیرے دیدار کو، اپنے حق میں "حجِ اکبر" سے بڑھکر سمجھتا ہے۔ تو دنیا میں اسطرح چمک رہا ہے، جیسے انگوٹھی میں نگینہ۔ جس طرح مکہ، اسلام کی ولادت گاہ ہے۔ اسی طرح تو مسلمانوں کی عظمت وشوکت کی ولادت گاہ ہے۔ اسلامی حکومت کا آغاز سنہ ۲ھ میں مدینہ ہی سے تو ہوا تھا۔ پھر سب سے بڑھکر یہ کہ تو نے اس شہنشاہِ معظم کو اپنے دل میں جگہ دی، جس نے ساری دنیا کو اپنے دامن میں پناہ دی۔ وہ شہنشاہ، جس کے غلام، دنیا کے شاہنشاہ ہوئے قیصر کے جانشین ہوئے (سلطان محمد فاتح) اور تختِ جمشید کے وارث ہوئے، (فاروق اعظمؓ) اول تو اسلام کی حیثیت پابندِ مقام ہے نہیں۔ لیکن اگر مصلحتًا اُسے کسی سرزمین سے وابستہ کیا جائے تو وہ سرزمین تو ہے۔ مسلمان نہ ہندی

ہے نہ ایرانی نہ شامی، لیکن وہ یثربی (مدنی) ضرور ہے۔ اور اس نسبت پر فخر کر سکتا ہے بلاشبہ اے یثرب! تو ساری دنیا کے مسلمانوں کا روحانی وطن (مرکز) ہے بلکہ ملجا، اور ماویٰ ہے۔ تو مسلمانوں کے دلوں کو اپنی طرف کھینچنے کی طاقت رکھتا ہے کون مسلمان ہے جو تیرے تصوّر سے ازخود رفتہ نہیں ہوجاتا؟ کون مسلمان ہے، جس کے دل میں تیرے دیدار کی خواہش نہیں ہے؟ اور کون مسلمان ہے، جو تیری خاک میں مدفون ہونا نہیں چاہتا؟

آخری شعر میں اقبالؔ نے اپنا دل کاغذ پر نکال کر دکھدیا ہے۔ یہ شعر نہیں ہے، بلکہ اُن کی شاعری کے ترکش کا آخری تیر ہے۔ کہتے ہیں کہ اے مدینہ منورہ! جب تک تو دنیا میں باقی ہے (اور یہ شہر ہمیشہ قائم رہیگا) تیرے صدقہ میں ہم (مسلمان) بھی اس دنیا میں باقی رہینگے۔ اگر دنیا میں صبح کا وجود ہے، تو اسکے ساتھ شبنم بھی ضرور موجود ہوگی۔ جس طرح شبنم کو صبح سے جدا نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح ملت اسلامیہ کو مدینہ سے جدا نہیں کرسکتے۔ کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ اس مقدس شہر کا فیضان بند ہوجائے۔

نظم برصـ ۱۵۸

حلِّ لغات | مآلِ حُسن ۔ حُسن کا نتیجہ یا انجام + ہراسِ فنا + مٹ جانے کا خوف متاعِ نور ۔ روشنی کی پونجی + قبائے زر یعنی چمکیلا لباس + اوج بمعنی بلندی + ولادتِ مہر ۔ طلوعِ آفتاب + وداعِ غنچہ، کلی کا رخصت ہونا + رازِ آفرینشِ گُل ۔ پھول کی پیدائش کا بھید + عدم، عدم ہے الخ ۔ یعنی عدم دراصل ہستی کا باعث ہے۔ مثلاً جب کلی معدوم ہوجاتی ہے، تو اسکے عدم سے پھول کی ہستی نمودار ہوجاتی ہے۔ یعنی دنیا میں ایک کی موت دوسرے کی زندگی کا سبب ہے + ثبات، یعنی

دوام یا ہمیشگی یا پائیداری +

مطلب | اقبالؔ ستارہ سے کہتے ہیں کہ تو اس قدر خوفزدہ کیوں رہتا ہے؟ کیا تجھے یہ خوف ہے کہ چاند طلوع ہوگیا یا صبح ہوگئی تو میں فنا ہوجاؤنگا؟ کیا تجھے یہ معلوم ہوگیا ہے کہ "حسن" کا انجام فنا ہے؟ ؎ وہی حسیں ہے حقیقت زوال ہے جسکی کیا تجھے یہ ڈر ہے کہ کوئی میری روشنی چھین کر لے جائیگا؟ کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ چنگاری کی طرح میری عمر بھی بہت مختصر ہے؟

اسکے بعد اقبالؔ نے یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ اس دنیا کا نظام یہ ہے کہ یہاں ایک کی بلندی، دوسرے کی پستی، اور ایک کی زندگی دوسرے کی فنا کا سبب بنجاتی ہے۔ مثلاً جب آفتاب طلوع ہوتا ہے تو لاکھوں ستارے فنا ہوجاتے ہیں۔ جو چیز ان ستاروں کے حق میں فنا کی نیند ہے، وہ آفتاب کے حق میں زندگی کی مستی بنجاتی ہے۔ جب غنچہ فنا ہوجاتا ہے تو اسکی فنا سے پھول کی پیدائش ہوجاتی ہے۔ لہذا ثابت ہوا کہ ایک کا عدم، دوسرے کی ہستی کا سبب ہے۔

اس نظم سے اقبالؔ ہمیں یہ سبق دیتے ہیں کہ اس کائنات میں سکون ناممکن ہے۔ یہاں ہر گھڑی، انقلاب اور تغیّر رونما ہوتا رہتا ہے۔ اگر اس کائنات میں کسی چیز کو دوام اور پائیداری ہے تو وہ یہی قانونِ تغیّر ہے۔ پس جب تغیّر اور انقلاب اس دنیا کا قانون ہے تو کسی انسان کو اُس تغیّر یا انقلاب سے خوفزدہ یا غمگین نہ ہونا چاہئے۔ جو اسکی زندگی میں پیدا ہو۔ کیونکہ تغیّر اور انقلاب سے کوئی شخص محفوظ نہیں رہ سکتا۔

نظم برصـ ۱۵۹

حلّ لغات | قران ۔ علم نجوم کی اصطلاح ہے۔ کسی برُج میں دوستاروں کے

جمع ہوجانے کو "قِران" کہتے ہیں۔ اگر کسی شخص کی پیدائش کے وقت، برُجِ طالع میں، زہرہ اور مشتری جمع ہوجائیں تو اُس شخص کو نجوم کی اصطلاح میں "صاحبقران" کہتے ہیں۔ مثلاً شاہجہان اور تیمور، دونوں، صاحب قِران، گذرے ہیں + انجام خرام ۔ یعنی اگر ہمارا یہ وصل، ہماری گردش کا انجام بنجائے ۔ اور ہم دونوں ہمیشہ ایک ہی برُج میں رہیں + مقدّر، بمعنی قانونِ قدرت + ثباتِ آشنائی خواب ہے، یعنی آشنائی یا اجتماع، عارضی یا چندروزہ ہے +

اس نظم کا مطلب شاعر نے خود ہی آخری مصرع میں بیان کردیا ہے۔ یعنی اس دنیا کا قانون یہ ہے کہ کوئی شئے جاندار ہو، یا بیجان، دوسری شئے کے ساتھ ہمیشہ وابستہ نہیں رہ سکتی۔ اس نکتہ کو اقبالؔ نے تاروں کے قِران باہمی سے واضح کیا ہے کہ جس طرح دو ستارے ہمیشہ ایک برج میں نہیں رہ سکتے۔ اسی طرح دو انسان ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ ایک نہ ایک دن ان دونوں میں جُدائی ضرور ہوجائیگی۔

نظم برصـ ۱۶۰

حلّ لغات اور شرحِ مشکلات | خرقۂ دیرینہ ۔ پُرانا لبادہ ۔ بادلوں کو خرقۂ دیرینہ سے اسلئے تعبیر کیا کہ جب سے آسمان ہے، بادل بھی اُسی وقت سے اُس پر چھائے ہوئے ہیں + مکدّر بمعنی دھندلا یا غبار آلود + جبینِ ماہ کا آئینہ یعنی چاند کا چہرہ + بربطِ قدرت ۔ یعنی قدرت ۔ نوا کی رعایت سے قدرت کو بربط سے تعبیر کیا ہے۔ خاموشی کو قدرت کی آواز قرار دینا، یہ شاعر کا دلکش اندازِ بیان ہے + جولانگاہِ عالمگیرؒ سے گولکنڈہ کا مشہور تاریخی قلعہ مراد ہے، جسے حضرت عالمگیرؒ نے ۱۶۸۷ء میں فتح کیا تھا + سکّانِ کہن ۔ قدیمی باشندے + دلدادہ ۔ محبت کرنے والا +

ترکیب ہے۔ کیونکہ ایران میں آفتاب (مہر) پرستی ہوتی تھی + ابر آذاری۔ آذار، قدیم کالدی یا سریانی زبان میں اُس مہینہ کا نام ہے۔ جو مارچ سے مطابقت رکھتا ہے۔ مراد ہے، موسم بہار کا بادل + جوئبار بمعنی دریا + عزلت خانہ۔ گوشہ تنہائی + مطرب۔ گانے والا + رنگین نوا خوش آواز + اُڑتی ہوئی تصویر سے بلبل مراد ہے۔ شاعر نے بلبل کو اُڑتی ہوئی تصویر سے تشبیہہ دی ہے + شوخ تحریر سے بھی بلبل ہی مراد ہے، یعنی بلبل قدرت کی بہت دلکش مخلوق ہے۔ گلستان زادوں سے باغ کے طائر مراد ہیں + شبان زادہ۔ چرواہے کا لڑکا + خاکدان، دنیا + مستور پوشیدہ + اشکباری کے بہانے، یعنی رونے کا سبب + بینا بمعنی روشن + گذرے ہوئے طوفان سے مسلمان قوم مراد ہے + ابر کی آغوش سے ملت اسلامیہ مراد ہے۔ گہر یا گوہر سے مسلمان افراد مراد ہیں، جو آئندہ پیدا ہونگے + شانِ جلالی۔ خدا کی صفات دو قسم کی ہیں، جلالی اور جمالی۔ یعنی وہ شان جس میں جلال (عظمت و شوکت) کا رنگ پایا جائے +

تبصرہ: یہ نظم سب سے پہلے رسالہ مخزن بابت ماہ جون ۱۹۱۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ اقبال نے اس کی تمہید میں لکھا تھا کہ "حیدرآباد (دکن) کے مختصر قیام کے دنوں میں میرے عنایت فرما جناب مسٹر نذر علی حیدری معتمد محکمہ فنانس، مجھے ایک شب اُن شاندار مگر حسرتناک گنبدوں کی زیارت کے لئے لے گئے، جن میں سلاطین قطب شاہیہ سو رہے ہیں۔ رات کی خاموشی اور بادلوں میں سے چھن چھن کے آتی ہوئی چاندنی نے اس پُر حسرت منظر کے ساتھ ملکر میرے دل پر ایسا اثر کیا جو کبھی فراموش نہ ہوگا۔ ذیل کی نظم انہی بے شمار تاثرات کا ایک اظہار ہے"۔

بلاشبہ یہ نظم بڑی اثر آفریں ہے اور معنوی خوبیوں کے علاوہ اس میں صنائع لفظی اور محاسن شعری بھی بکثرت موجود ہیں۔ تفصیل تو دشوار ہے۔ چند

گُل بدامن یعنی معمور + خراجِ اشک ادا کر، یعنی آنسو ٹپکا + گردوں پایہ یعنی بہت بلند، مراد ہے محترم ہے + برگشتہ قسمت قوم سے مسلمان قوم مراد ہے + حذر، بمعنی پرہیز + آرزو دے ناصبور۔ ایسی آرزو جو انسان کو بیقرار کر دے + آفتابوں سے بادشاہ مراد ہیں۔ جبیں گستر، لغوی معنی ہیں پیشانی بچھانے والا مراد ہے آسمان کی اطاعت سے + فغفوری: "فغفور" چین کے قدیم شہنشاہوں کا لقب ہے۔ قیصر، روم کے شہنشاہوں کا لقب ہے + یورش، بمعنی حملہ + کشتِ عمر۔ عمر کی کھیتی، یعنی عمر + جادۂ عظمت۔ بزرگی کی سڑک یعنی عظمت + عود۔ ایک ایرانی ساز کا نام ہے۔ عود کی تقریر سے، نغمہ دمسرود مراد ہے + نالۂ شبگیر، رات کے وقت عاشق کی آہ و فریاد + عرصۂ پیکار۔ میدان جنگ + سینۂ ویراں یعنی مردہ انسان + زحمت کشِ بیداد، یعنی روح جسم میں تکلیف اُٹھاتی رہتی ہے + کوچہ گردنے الخ یعنی جب سانس بانسری میں جاتی ہے تو فریاد کی شکل میں باہر نکلتی ہے + موجیں۔ کنایہ ہے بنی آدم سے + خسِ آتش سوار، لغوی معنی وہ تنکا جو آگ پر سوار ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اسکا فنا ہو جانا یقینی ہے + رنگہائے رفتہ سے مراد ہے وہ شئے جو فنا ہو چکی ہو + زیاں خانہ، نقصان کا گھر، یعنی دنیا + ملت گردوں وقار، یعنی نامور قوم + جدّت بمعنی نئی بات + مادرگیتی مراد دنیا + آبستن بمعنی کسی عورت کا حاملہ ہونا + قافلوں سے قومیں مراد ہیں + رہگذر سے دنیا مراد ہے + کوہ نور، وہ مشہور ہیرا، جو آجکل ملکۂ انگلستان کے تاج میں لگا ہوا ہے۔ اسکا وزن ۱۰۶ قیراط ہے + بابل۔ جناب مسیحؑ سے چار ہزار سال پہلے اُس ملک کا دارالحکومت تھا، جسے اب عراق کہتے ہیں۔ اسکی عظمت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ اس شہر کا طول ۱۵ میل تھا، اور شہرپناہ کے ۲۵۰ دروازے تھے۔ مہر ایران سے ملک ایران مراد ہے۔ یہ بڑی دلکش

اشاروں پر قناعت کرتا ہوں:۔

(۱) اس نظم میں اقبال نے منظر کشی اور مرقع نگاری کا کمال دکھایا ہے۔

(۲) یہ نظم تشبیہات اور استعارات، رمز و ایما اور کنایات سے معمور ہے۔

(۳) بعض مصرعے صنعت تضاد کے حامل ہیں۔ مثلاً:

ع بربطِ قدرت کی دھیمی سی نوا ہے خامشی

یا ع اس ستمگر کا ستم، انصاف کی تصویر ہے

واضح ہو کہ نوا، خاموشی کی؛ اور ستم، انصاف کی ضد ہے۔

(۴) بعض مصرعوں میں صنعت ایجاز پائی جاتی ہے۔ یعنی طویل داستان چند لفظوں میں بیان کر دی ہے۔ مثلاً:

ع شاخ پر بیٹھا کوئی دم، چہچہایا، اُڑ گیا

یا ع زندگی کی شاخ سے پھوٹے، کھلے، مرجھا گئے

(۵) اس نظم میں اقبال نے زندگی کی بے ثباتی کو بڑے مؤثر طریقے سے واضح کیا ہے۔

(۶) ساری نظم اول سے آخر تک سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی ہے۔

(۷) اس نظم میں فلسفہ اور شاعری کا خوشگوار امتزاج پایا جاتا ہے۔

(۸) چونکہ یہ نظم اقبال نے ایک خاص جذبہ کے تحت لکھی تھی اسلئے اسکے اکثر اشعار میں جوشِ بیان کی بہت عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً:

ع جادۂ عظمت کی گویا آخری منزل ہے گور

پہلا بند:۔ رات کا وقت ہے۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے ہیں۔ جنکی وجہ سے چاند دھندلا نظر آرہا ہے۔ ابھی صبح ہونے میں بہت دیر ہے سارے درختوں پر خاموشی کا عالم طاری ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت خاموشی ہی قدرت کی آواز ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ شاید اسلئے کہ اس دنیا کا

ہر ذرہ (ہر شئے، ہر فرد) رنج و غم میں ڈوبا ہوا ہے۔ کون ہے جسے اس دنیا میں کسی نہ کسی رنج یا مصیبت سے سابقہ نہیں پڑا؟ ساری ہستی (کائنات) غم اور الم میں غرق ہے۔ زندگی نام ہی رنج و کلفت کا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہستی، کہ خاموشی کے پردہ میں آہیں بھر رہی ہے۔

دوسرا بند:۔ اس وقت میں گولکنڈہ کے اُس عظیم الشان تاریخی قلعہ کے سامنے کھڑا ہوں جسے حضرت عالمگیرؒ نے ۱۶۸۷ء میں فتح کیا تھا۔

جولانگاہ، لغوی معنی وہ جگہ جہاں گھوڑے دوڑائے جائیں۔ اس ایک لفظ میں اقبال نے گولکنڈہ کے محاصرہ کی تاریخ بند کر دی ہے۔ حق یہ ہے کہ انھیں موزوں الفاظ کے انتخاب میں یدطولیٰ حاصل تھا۔ دنیا کے ہر قادر الکلام شاعر میں یہ وصف پایا جاتا ہے۔

گولکنڈہ، جو کسی زمانہ میں بڑا شاندار شہر تھا۔ حیدرآباد (دکن) سے مغرب کی جانب سات میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ چونکہ اس ریاست کا آخری فرمانروا ابوالحسن مسلمان ہونے کے باوجود، مرہٹوں سے ساز باز رکھتا تھا اور اُس نے قوم فروشی کو شعار زندگی بنا لیا تھا۔ اسلئے حضرت عالمگیرؒ نے ۱۶۸۷ء میں اس غدّار کا خاتمہ کر دیا۔

یہ قلعہ ایک پہاڑی پر بنا ہوا ہے۔ اور ہندوستان کے ان چند قلعوں میں سے ہے جو ناقابلِ تسخیر خیال کئے جاتے تھے۔ یہ قلعہ بہت پُرانا ہے۔ اور کسی زمانہ میں اسکے اندر ہر جگہ زندگی کے آثار نظر آتے تھے۔ لیکن اب بالکل ویران ہے۔ یہ قلعہ اپنے قدیمی باشندوں کی خاک کا عاشق ہے، یعنی ان کی قبریں اسکے اندر بنی ہوئی ہیں۔ (اشارہ ہے بادشاہوں کے گنبدوں کی طرف) اور پہاڑ کی چوٹی پر اسطرح کھڑا ہے جیسے کوئی سنتری نگہبانی کر رہا ہو۔

تیسرا بند:- نیلے آسمان پر ثریا (نجم آسمان) جلوہ گر ہے اور ابر کے روزن سے دنیا کے انقلابات کا تماشا دیکھ رہا ہے۔ اس نے سیکڑوں نامور افراد اور اقوام کے عروج و زوال کا تماشا دیکھا ہے۔ اسلئے اُسے بنی آدم کی ناکامی کی داستان حفظ یاد ہے۔ اگرچہ ستاروں کو کسی جگہ مستقل قیام کی اجازت نہیں ہے، لیکن یہ ستارہ تھوڑی دیر کے لئے فاتحہ خوانی کے لئے ٹھہر گیا ہے۔ حق یہ ہے کہ یہ دنیا زندگی کی دلفریبیوں سے معمور ہے اور ابتک سیکڑوں قومیں اور تہذیبیں برسر عروج آچکی ہیں اور ختم ہوچکی ہیں۔ مثلاً مصری، کالڈی، بابلی وغیرہ

چوتھا بند:- یہ قلعہ قطب شاہی خاندان کے بادشاہوں کا مدفن ہے۔ ان بادشاہوں کی بیکسی پر آنسو بہانے کو دل چاہتا ہے۔ بیشک یہ ایک قبرستان ہے۔ لیکن ہے بہت بلند مرتبہ، کیونکہ یہاں ایک بدقسمت قوم کے نامور بادشاہ سوئے ہیں۔ ان مقبروں کی شان اس قدر حیرت آفریں ہے کہ پلک مارنے کی بھی تاب نہیں ہے۔ اور ان مقبروں میں انسان کی ناکامی کی ایسی تصویر نظر آتی ہے جس کا بیان لفظوں کے ذریعہ سے ناممکن ہے۔

پانچواں بند:- یہاں ان مقبروں میں وہ بادشاہ، سورہے ہیں، جو اپنی زندگی میں، بڑی بڑی آرزوئیں رکھتے تھے۔ اور وہ آرزوئیں اُن کو ہر وقت بیچین اور مصروف کار رکھتی تھیں۔ آج وہ آفتاب (بادشاہ) قبروں کی تاریکی میں پوشیدہ ہیں۔ جنکے دروازہ پر آسمان بھی دست بستہ کھڑا رہتا تھا۔

یہ حسرتناک منظر دیکھکر شاعر دریائے عبرت میں ڈوب جاتا ہے۔ اور بے اختیار پکار اُٹھتا ہے:- ؎

کیا یہی ہے اُن شہنشاہوں کی عظمت کا مآل؟

کیا زندگی کا انجام یہی ہے کہ انسان، کچھ عرصہ تک اس دنیا میں ہنگامہ برپا کرے۔ اسکے بعد قبر کی آغوش میں چلا جائے؟ سچ یہ ہے کہ دنیا کا بڑے سے بڑا بادشاہ۔ فغفور چین ہو یا قیصر روم — موت کے حملہ کی تاب نہیں لاسکتا۔ بڑے بڑے بادشاہوں کی زندگی کا انجام بھی قبر ہی ہے۔ انسانی عظمت کو اگر ایک سڑک قرار دیا جائے تو اسکی آخری منزل "قبر" ہے۔

چھٹا بند:- یہ موت اسقدر یقینی ہے کہ دنیا کا کوئی انسان اس سے بچ نہیں سکتا۔ اور جب موت آجاتی ہے اور انسان مرجاتا ہے تو پھر رقص و سرود کی محفلیں، غمخواروں کی آہ و فریاد، ہنگامۂ جدال و قتال، اور نعرۂ تکبیر، مختصر یہ کہ کوئی آواز، مردوں کو زندہ نہیں کرسکتی۔ جو شخص ایک دفعہ مرگیا پھر زندہ نہیں ہوسکتا۔

ساتواں بند:- غور سے دیکھو تو اس دنیا میں جو شخص بھی ہے، وہ مصیبت میں مبتلا ہے۔ جس طرح سانس، بانسری میں داخل ہوکر فریاد بنجاتی ہے اُسی طرح روح جسم میں داخل ہوکر مبتلائے آلام ہوجاتی ہے۔ انسان کی زندگی نہایت مختصر ہے، بس یوں سمجھو، انسان اس دنیا میں اس طرح آتا ہے، جیسے کوئی پرندہ اُڑتا اُڑتا آیا، کسی شاخ پر بیٹھا، کوئی دم چہچہایا اور اُڑ گیا۔ بس انسان کی دنیاوی زندگی کی بھی یہی کیفیت ہے۔

اب شاعر حیات انسانی کی بے ثباتی پر تبصرہ کرتا ہے، اور کہتا ہے، کہ افسوس! ہم لوگ اس دنیا میں چند روز کے لئے آتے ہیں۔ ہماری زندگی ایسی ہے، جیسے آج کسی شاخ سے کلی برآمد ہوئی ہے، کل پھول بنی، پرسوں مرجھا گئی، موت ہر شاہ و گدا کی زندگی کا انجام ہے۔ یہ موت ہے تو ستمگر، (لطف زندگی کا خاتمہ کردیتی ہے) لیکن اسکے ستم میں بھی انصاف کا پہلو پوشیدہ ہے وہ یہ کہ یہ کسی کے ساتھ رعایت نہیں کرتی۔ اسکی حکومت میں شیر اور بکری سب ایک گھاٹ پانی پیتے ہیں۔ یعنی ہر شئے فانی ہے۔

آٹھواں بند:- اگر ہستی کو ایک دریا، یا غیر محدود سمندر فرض کیا جائے تو اس سمندر میں لاکھوں موجیں اُٹھتی رہتی ہیں، یعنی بے گنتی لوگ پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اور مرتے رہتے ہیں۔ ہم خوب جانتے ہیں کہ زندگی کا انجام فنا ہے۔ اسکے باوجود ہر شخص کو جینے کی ہوس ہے — سچ تو یہ ہے کہ زندگی کا نہ کوئی اعتبار ہے نہ اسکی کوئی حقیقت ہے۔ بس ایسا سمجھو جیسے چنگاری کہ ادھر چمکی اُدھر بجھ کر ختم ہوگئی — یا گھاس کا تنکا جو ادھر آگ میں پڑا، اُدھر ختم ہوگیا۔ مثالاً چاند کو دیکھ لو، یہ کس قدر حسین ہے! اور اسکا وجود، قدرت خداوندی کی دلیل ہے کہ زمین سورج کے گرد گردش کررہی ہے، اور یہ زمین کے گرد، گردش کررہا ہے، اسکے باوجود کبھی کسی جرم فلکی سے متصادم نہیں ہوتا — اسکے باوجود، جب صبح ہوتی ہے تو یہ بے نور ہوجاتا ہے۔

نواں بند:- جس طرح فرد اور افراد کی زندگی بے اعتبار ہے، اُسی طرح قوموں کی زندگی بھی بے ثبات ہے۔ ان کا عروج، دراصل، گذشتہ اقوام کے عروج کی تصویر ہے۔ یعنی جس طرح گذشتہ قومیں فنا ہوگئیں، اسی طرح موجود قومیں بھی فنا ہوجائینگی۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں کوئی قوم ہمیشہ کے لئے برسر اقتدار نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ دنیا، قوموں کی بربادی کی اس قدر عادی ہوگئی ہے کہ اب وہ کسی قوم کی بربادی سے مطلق متاثر نہیں ہوتی۔ اس دنیا میں ہر وقت انقلاب رونما ہوتا رہتا ہے۔ دنیا کی ترکیب ہی اس طرح ہوئی ہے کہ اس میں ہر وقت نئی باتیں ظاہر ہوتی رہتی ہیں۔ نت نئے حادثات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ اس عالم میں ہمیشہ نئے نئے آدمی برسر عروج آتے رہتے ہیں۔ مثلاً ہینی بال، سکندر، چنگیز تیمور، نپولین، اور ہٹلر، اور یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہیگا۔ کیا خوب کہا ہے، شیخ سعدی نے:- ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت ✣ رفت و منزل بدیگرے پرداخت

چونکہ شاعر نے گیتی کو 'مادر' قرار دیا ہے۔ اسلئے آبستن کا لفظ نہایت موزوں ہے۔ یعنی دنیا وہ عورت ہے جسکے رحم میں ہمیشہ نئی نئی قومیں جنتی رہتی ہیں۔

دسواں بند:- دنیا میں آج تک ہزاروں قومیں برسر عروج آچکی ہیں اور اپنی اپنی پنج روزہ نوبت بجاکر عدم کی آغوش میں چلی گئیں۔ آج کوئی شخص انکا نام بھی نہیں جانتا۔ صرف تاریخوں میں انکی داستانیں باقی رہ گئی ہیں مثلاً مصر، بابل، ایران، اور رومۃ الکبریٰ۔ ان اقوام کے تذکرہ کے بعد شاعر اپنی قوم کا ذکر کرتا ہے۔ اور جب اسکے زوال کا تصور کرتا ہے تو اسکے نازک دل پر ایک چوٹ سی لگتی ہے۔ اور وہ بے اختیار کہہ اُٹھتا ہے:-

آہ! مُسلم بھی زمانہ سے یونہی رخصت ہوا

ارباب نظر اور اصحاب علم جانتے ہیں کہ اس دو حرفی لفظ "آہ" کے اندر مسلمانوں کی عظمت کی ساری داستان پوشیدہ ہے۔ کیا آج کوئی شخص، یورپین ہو یا ایشیائی — یہ یقین کرسکتا ہے کہ سولھویں صدی عیسوی تک ترکوں کی سطوت کا یہ عالم تھا کہ قسطنطنیہ سے دو ہزار میل دور جزیرۂ انگلستان کی عورتیں، اپنے ضدی بچوں کو سلانے کے لئے یہ لوری دیا کرتی تھیں:-

"سوجا منے سوجا! ترک آرہے ہیں!"

HUSH! BABY HUSH! THE TURKS ARE COMING!

کیا آج کوئی شخص، یہ باور کرسکتا ہے کہ ہارون الرشید نے قیصر روم کے گستاخانہ خط کا جواب بایں الفاظ دیا تھا:-

"مسلمانوں کے امیر ہارون کی طرف سے، رومی کُتّے کے نام"!

بات یہ ہے کہ اگر ہمارے اندر ابن علقمی، حسین علی، عماد الملک، شجاع الدولہ، مرزا نجف خاں، میر جعفر، میر صادق، اور نواب الٰہی بخش، معروف جیسے بزرگ

بزرگ پیدا نہ ہوتے تو شاید ہماری حالت اتنی زبوں نہ ہو گئی ہوتی۔

گیارھواں بند:۔ اس بند میں شاعر نے نفس مضمون سے گریز کر کے، زندگی کی گوناگوں دلچسپیوں کی تصویر کھینچی ہے۔ اس بند کا انداز بیان بہت دلکش ہے۔ شاعر نے تشبیہ استعارہ اور کنایہ کا انبار لگا دیا ہے۔ رگِ گل کو موتی کی لڑی باندھا ہے، سورج کی کرنوں کو شبنم کے جال میں الجھایا ہے، دریا کے سینہ کو شعاعوں کا گہوارہ بنایا ہے۔ صنوبر کو محوِ زینت اور بادِ بہار کو آئینہ قرار دیا ہے کوئل اور بلبل باغ میں زمزمہ سرائی کر رہی ہیں انکے دم سے باغ میں زندگی نظر آتی ہے۔ غرضکہ گلشن اور کوہسار ہر جگہ زندگی اپنے جلوے دکھا رہی ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ انہی زندگی کے ہنگاموں میں موت بھی صیاد کی طرح گھات میں بیٹھی ہوئی ہے۔ اگر ایک طرف باغ میں کوئل گا رہی ہے۔ اور بلبل گلاب سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے تو دوسری طرف، انہی پھولوں کی پتیاں، مرجھا کر اس طرح زمین پر گر رہی ہیں، جس طرح سوتے بچے کے ہاتھ سے رنگین کھلونے زمین پر گر پڑیں۔ داد طلب بات یہ ہے کہ ایسا دلخراش مضمون باندھتے وقت بھی اقبالؔ کی شاعرانہ طبیعت، اپنے فرض سے غافل نہیں ہوئی۔ یعنی پھولوں کی مرجھائی ہوئی پتیوں کے گرنے کو، دستِ طفلِ خفتہ کے ہاتھوں سے کھلونے کے گرنے سے تشبیہ دینا، بلاشبہ اقبالؔ کے کمالِ فن کی دلیل ہے۔

اس دنیا میں اگرچہ ہر قسم کی عیش و عشرت کا سامان موجود ہے۔ لیکن اقبالؔ کہتے ہیں کہ یہ "بے اندازہ عیش" میرے دل سے ملتِ اسلامیہ کی بربادی کے غم کو دور نہیں کر سکتا۔

بارھواں بند:۔ اگرچہ اقبالؔ نے صراحت نہیں کی، لیکن میرا ظن غالب یہ ہے کہ "نیّر شاہوں" سے انکی مراد، صرف وہ بادشاہ ہیں، جنہوں نے اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کے لئے حکومت کی۔ مثلاً سلطان صلاح الدین ایوبیؒ

سلطان نورالدین زنگی۔ سلطان محمود بیگڑہ۔ سلطان عالمگیرؒ اور سلطان ٹیپو شہیدؒ۔

اقبالؔ کہتے ہیں کہ ہمارے دلوں میں اپنی قوم کی عظمت کی داستان ہنوز تازہ ہے اور ہم اپنے نامور اور عادل بادشاہوں کو کبھی فراموش نہیں کرینگے یہ آثار قدیمہ ہمارے لئے عبرت کے سامان مہیا کرتے ہیں۔ اور جب ہم اپنی قوم کی بربادی پر آنسو بہاتے ہیں تو ہماری آنکھ بینا ہو جاتی ہے یعنی ہمارے اندر اصلاح کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ یہ ہمارے آنسو نہیں ہیں بلکہ موتی ہیں جو ہم دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ہم عظیم الشان ملت اسلامیہ کے نام لیوا ہیں۔ اور اگرچہ نہایت زبوں حال ہیں، لیکن اس گئی گذری حالت میں بھی ہمارے اندر اتنی صلاحیت باقی ہے کہ ہم دنیا میں دوبارہ انقلاب برپا کر سکتے ہیں۔ ہمارے اندر ابھی اسقدر خوبیاں باقی ہیں کہ ہم خاکِ صحرا (اس دنیا کو جو ہمارے اُجڑ جانے سے اُجڑ گئی ہے) کو وادیٔ گل (نہایت دلکش مقام) بنا سکتے ہیں۔ دہقان (اقوام عالم) کھیتی کی طرف سے ناامید ہو چکا ہے، یعنی لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ شاید مسلمان اب دوبارہ سربلند نہ ہو سکیں۔ لیکن ہمارے اندر اب بھی اسقدر طاقت باقی ہے کہ ہم دنیا کو پھر عدل و انصاف سے معمور کر سکتے ہیں۔

آخری شعر میں شاعر نے اپنی اس رجائیت (امید ترقی کے اثبات) کی وجہ بیان کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ امت اسلامیہ کے لئے دنیا میں سربلندی کے دو زمانے (دور) مقدر ہیں۔ پہلے دور میں مسلمانوں نے شان جلال دکھائی یعنی تلوار کے زور سے دنیا کو فتح کیا۔ اب دوسرے دور میں شانِ جمال دکھائینگے۔ یعنی دلائل عقلیہ کے زور سے دنیا کو فتح کرینگے۔ بخوفِ طوالت

جلال اور جمال کی تفصیل تو درج نہیں کر سکتا۔ صرف اسقدر لکھتا ہوں کہ حضور آنحضرت صلعم کی زندگی میں یہ دونوں شانیں پائی جاتی ہیں۔ مکی زندگی شانِ جمال کی اور مدنی زندگی شان جلال کی مظہر ہے۔ اسلئے آپ کی امت میں بھی ان دونوں شانوں کا پایا جانا ضروری ہے۔

نظم ۱۶۶ برص

حلِّ لغات زیرِ دامانِ اُفق۔ افق کے دامن کے نیچے سے + دخترِ دوشیزۂ لیل و نہار۔ دن اور رات کو والدین فرض کر کے، صبح کو اسکی کنواری بیٹی باندھا ہے + درود۔ درودن بمعنی کاٹنا کا حاصل مصدر ہے۔ فصل (کھیتی) کی رعایت سے "درود" لائے ہیں + آئینہ کا رمراد ہے جلوہ گر + کشت خاور سے مشرق مراد ہے + محمل پرواز شب۔ محمل، جس میں پردہ نشین عورتیں (پرانے زمانہ میں) سفر کیا کرتی تھیں۔ عموماً اونٹ کی پشت پر باندھا کرتے ہیں۔ ڈولی کی طرح ہوتا ہے۔ چاروں طرف پردے پڑے ہوتے ہیں + لغوی معنی رات کی روانگی کا محل، مراد ہے رات + باندھا سر دوشِ غبار۔ یعنی غبار کے کاندھوں پر رات کو روانہ کر دیا۔ جب آفتاب کے طلوع ہونے کا وقت آتا ہے تو اس سے کچھ عرصہ پہلے، تاریکی، غبار، یا دھندلکے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ آسمان نے رات کے محمل کو دھندلکے ہی میں روانہ کر دیا۔ کتنا دلکش انداز بیان ہے! اسی طرح تاروں کے شراروں کو "بونے" سے تعبیر کرنا، کتنا انوکھا اور دلکش اسلوب ہے + نجم سحر سے وہ خاص ستارہ مراد ہے، جو طلوع آفتاب سے پہلے پچھلی رات کے وقت طلوع ہوتا ہے۔ اسے (LUCIFER) کہتے ہیں + نجم سحر کو۔ عابد شب زندہ دار سے تشبیہ دی ہے۔ یعنی وہ عابد جو ساری رات

عبادت میں گذارے + "کیا سماں ہے"۔ یعنی طلوع آفتاب کا سماں ایسا ہے جیسے کوئی شخص آہستہ آہستہ نیام سے چمکتی ہوئی تلوار نکالے۔ طلوع آفتاب کو اس تیغ آبدار سے تشبیہ دی ہے، جو نیام سے بتدریج باہر نکلے + مطلعِ خورشید اسکے دو معنی ہیں (۱) مطلع بمعنی غزل کا پہلا شعر۔ اگر "مضمون صبح" کی ترکیب کو مدنظر رکھا جائے تو یہ معنی لے سکتے ہیں (۲) مطلع بمعنی جائے طلوع اگر "خورشید" کو مدنظر رکھیں تو یہ معنی لے سکتے ہیں۔ خورشید کے مطلع میں صبح کا مضمون اس طرح پوشیدہ ہے جیسے بوتل میں شراب + بے تہِ دامانِ بادِ اختلاط انگیز صبح" صبح کی محبت پیدا کرنیوالی ہوا کے دامن کے نیچے۔ یعنی صبح کے وقت + شورشِ ناقوس۔ یعنی سنکھ کا شور۔ ناقوس مندروں میں بجایا جاتا ہے + آوازِ اذاں سے ہمکنار ہے۔ یعنی صبح کے وقت ناقوس اور مؤذن دونوں کی آوازیں بیک وقت بلند ہوتی ہیں + طائرانِ نغمہ سنج۔ گانے والے پرندے + ترنم ریز۔ موسیقی یا نغمہ برسانے والا + قانون کے دو معنی ہیں (۱) آئین (۲) ایک باجہ کا نام ہے یہاں قانون سے دوسرے معنی مراد ہیں کیونکہ آگے لفظ "تار تار" موجود ہے یعنی صبح کے باجہ (قانون) کے ہر تار سے نغمہ نکل رہا ہے +

تبصرہ یہ نظم اقبالؔ نے ۱۹۱۱ء کے آخر میں لکھی تھی۔ درحقیقت بڑی معرکۃ الآرا نظم ہے۔ شاعری کی تمام خوبیاں مثلاً تشبیہ استعارہ، کنایہ، بندش کی چستی الفاظ کی شوکت، تراکیب کی جدت، خیالات کی بلندی اور منظر کشی بدرجہ اتم اس نظم میں موجود ہیں۔ فارسی ترکیبوں، اور صنائع و بدائع لفظی و معنوی کی بدولت اقبالؔ نے ایسا طلسم باندھ دیا ہے کہ پڑھنے والا مبہوت ہو جاتا ہے۔ چونکہ اس نظم میں کسی فلسفیانہ نکتہ کی توضیح کے بجائے طلوع سحر کا منظر دکھایا ہے۔ اسلئے لفظوں کا پردہ ہٹا دیا جائے تو مطلب سمجھنا چنداں مشکل

نہیں ہے: مثلاً

(۱) افق کے دامن سے صبح نمودار ہو رہی ہے۔
(۲) آسمان پر جسقدر ستارے تھے سب غائب ہوگئے۔ کیونکہ مشرق میں آفتاب طلوع ہوگیا۔
(۳) جب آفتاب طلوع ہوگیا تو رات غائب ہوگئی۔
(۴) رات کے وقت آسمان نے تاروں کی کھیتی بوئی تھی، آفتاب اس کا حاصل ہے۔
(۵) سب ستارے غائب ہو چکے ہیں۔ صرف ایک نجم سحر رہ گیا ہے لیکن اسکی روشنی بھی بتدریج ماند پڑتی جاتی ہے۔
(۶) آفتاب اس طرح افق کے پردہ سے نکل رہا ہے، جس طرح کوئی شخص نیام سے تلوار کھینچ رہا ہو۔
(۷) آفتاب کے ظہور میں صبح کا وجود اس طرح پوشیدہ ہوتا ہے جس طرح شراب انگور میں۔
(۸) صبح کے وقت، ناقوس اور اذان کی آوازیں ایک ساتھ بلند ہوتی ہیں۔
(۹) کوئل کی آواز سنکر سب گانے والے پرندے بیدار ہوگئے۔ قانون قدرت یہی ہے کہ صبح کو طائرانِ خوش الحان، نغمہ سنجی کرتے ہیں +

نظم بر صـ ۱۶۷

حل لغات اور شرح مشکلات | منزل بمعنی قیام + جادہ پیمائی بمعنی صحرانوردی

دیارِ پیر سنجرؒ۔ سیدی ومولائی سلطان الہند خواجہ غریب نواز حضرت معین الدین حسنؒ کا شہر، یعنی اجمیر۔ سوانح نگاروں نے حضرت کو سنجری لکھا ہے۔ یہ دراصل کتابت کی غلطی ہے۔ صحیح لفظ سجزی ہے۔ کیونکہ آپ سجزستان (سیستان) میں پیدا ہوئے تھے۔ اور سجستان کو سجز بھی کہتے ہیں۔ سجزی کا

سنجری ہوگیا۔ حضرت اقدسؒ نے سنہ ۵۶۲ھ میں اجمیر کو اپنے قدموں کی برکت سے مالامال کیا۔ اور سنہ ۶۳۲ھ میں رحلت فرمائی۔ زندگی کے ستر سال تبلیغ واشاعت اسلام میں بسر کئے۔ اور بلاشبہ آپ نے اور آپ کے خلفاء نے سارے ہندوستان کو اسلام کے نور سے منور کردیا۔ اسی لئے آپ کا لقب "وارث النبیؐ فی الہند" ہے + درمانِ درد ناشکیبائی، یعنی اجمیر میں حضرت کا آستانۂ مبارک، عاشقوں کے لئے موجب تسکین ہے۔ وہاں جملہ روحانی امراض کا علاج (درماں) ہوسکتا ہے + ناآشنائے لب تھا الخ یعنی ابھی آرزو، لب تک نہیں آئی تھی + منت پذیر تابِ گویائی، یعنی زبان بولنے کی طاقت کا احسان اُٹھانے والی تھی۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ میں ابھی کچھ عرض نہیں کرنے پایا تھا + حرم کے رہنے والوں کو، یعنی اسلام کے سچے عاشقوں کو جو اسکی اشاعت کے آرزومند ہیں + تارکِ آئین آبائی۔ اے وہ شخص جس نے اپنے بزرگوں کے طریقہ کو چھوڑ دیا ہے۔ یعنی تبلیغ واشاعت اسلام سے غافل ہوگیا ہے + قیس سے مسلمان مراد ہے۔ لیلیٰ سے اسلام مراد ہے + (اندازِ لیلائی یعنی دلکشی۔ لیکن یہاں اس سے حقانیت اسلام مراد ہے + نہ تخم لا الٰہ تیری زمین شور سے پھوٹا۔ یعنی تو نے توحید کا پیغام دنیا کو نہیں سنایا (حالانکہ یہ ہر مسلمان کا اولین فریضہ ہے) زمانے بھر میں رسوا ہے تری فطرت کی نازائی۔ نازائی کے لغوی معنی ہیں بانجھ پن۔ پیدا کرنے کی صلاحیت کا نہ ہونا۔ مطلب یہ ہے کہ جب مسلمان نے تبلیغ اسلام چھوڑ دی تو وہ سارے زمانہ میں رسوا ہوگیا۔ دنیا کی دوسری قومیں کسی نہ کسی حد تک، کسی نہ کسی رنگ میں، اپنا فرض ادا کررہی ہیں۔ لیکن مسلمان قوم اپنے مقصدِ حیات سے بالکل غافل ہے۔ آج مسلمانانِ عالم، دنیا کے سامنے اپنا کوئی کارنامہ پیش نہیں کرسکتے، محض اسلئے کہ وہ اُس کام سے کنارہ کش ہوچکے ہیں، جسکے لئے اللہ نے اُن کو پیدا کیا تھا + کنشتی ساز۔

لغوی معنی ہیں وہ باجہ (ارغنون) جو گرجوں میں بجایا جاتا ہے + معمور نوا ہائے کلیسائی۔ جو کلیسا کی آوازوں سے بھرپور ہو۔ مطلب یہ ہے کہ آج مسلمان کی زندگی یہ ہے کہ وہ از سرتاپا، کفر کے سانچہ میں ڈھل چکا ہے۔ اسکے خیالات اور عقاید سب کلیسائی یعنی غیر اسلامی ہوگئے ہیں۔ اقبالؔ نے مسلمان کو اس مصرع میں اُس باجہ سے تشبیہہ دی ہے جو گرجوں میں بجایا جاتا ہے + آغوش بیت اللہ یعنی مسلمان کی تربیت اگرچہ اللہ کے گھر میں یعنی اسلامی ماحول میں ہوئی ہے اسکے باوجود اسکا دلِ شوریدہ، بتخانے کا شیدائی ہے۔ بالفاظ دگر مسلمان کی حالت یہ ہے کہ پیدا مسلمان کے گھر میں ہوا ہے، لیکن اعمال کافروں کے سے ہیں + وفا آموختی از ما بکار دیگراں کردی الخ انیسیؔ کے اس شعر کا ترجمہ یہ ہے کہ تجھے وفا کا سبق تو ہمنے پڑھایا، لیکن تونے ہمارے بجائے دوسروں کے ساتھ وفا کی، گویا جو موتی تونے ہمسے حاصل کئے وہ دوسروں پر نثار کئے۔

تبصرہ | اقبالؔ نے اس لاجواب نظم میں انیسیؔ شاملو کے ایک شعر پر تضمین کی ہے۔ اس شاعر کا نام مرزا یولقلی بیگ تھا۔ اگرچہ ترکی الاصل تھا لیکن ایران میں پیدا ہوا تھا اسلئے فارسی زبان میں طبع آزمائی کی۔ جوانی میں دوسرے ایرانی شعرا کی طرح قسمت آزمائی کی غرض سے ہندستان آیا۔ اور نظیریؔ کی وساطت سے، عبدالرحیم خانخاناں، صوبہ دار گجرات کی سرکار میں ملازم ہوگیا۔ خان مذکور نے اسکی بڑی قدردانی کی۔ اور محمود وایاز کی داستان نظم کرنے پر مامور کیا۔ چنانچہ اس نے مثنوی لکھنی شروع کی۔ لیکن موت نے تکمیل کی مہلت نہ دی۔ سنہ ۱۰۱۴ھ میں بمقام برہانپور (وسط ہند) وفات پائی۔ اسکے کلام میں صائبؔ اور غنیؔ کا رنگ پایا جاتا ہے۔ ایک شعر ملاحظہ ہو:-

یادگار از ما دریں عالم غم بسیار ماند ‖ رفت اگر آتش، نشانِ دود بر دیوار ماند

اقبالؔ نے انیسیؔ کے جس شعر پر تضمین کی ہے، اسکا انتخاب اسلئے کیا کہ اسکا مضمون موجودہ مسلمانوں پر ہو بہو صادق آتا ہے۔ اور جو پیغام مسلمانوں کو دیا ہے اُسے خواجہ غریب نوازؒ کی زبان سے یوں ادا کیا ہے کہ حضرت موصوف ہندستان کے مبلغین اسلام کے سرتاج ہیں۔ اسلئے مسلمانوں کو سرزنش کرنے کا حق، اُن سے بڑھکر اور کس کو حاصل ہوسکتا ہے؟ اس تضمین سے اقبالؔ کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس حقیقت سے آگاہ کریں کہ انکی ذلت کا سبب یہ ہے کہ اُنہوں نے تبلیغ واشاعت اسلام کو ترک کردیا ہے۔

نظم کا مطلب | (۱) چونکہ محبت کا خاصہ یہ ہے کہ عاشق ایک جگہ قیام نہیں کرسکتا اسلئے میں بادِ سحر کی طرح آوارہ رہتا ہوں۔ (۲) چنانچہ اسی جادہ پیمائی کے سلسلہ میں اجمیر جا نکلا۔ یہ وہ شہر ہے جہاں عاشقوں کو روحانی تسکین نصیب ہوتی ہے۔ اور بیقراری کا علاج میسر آسکتا ہے۔ (۳) میں حضرت اقدسؒ کے مزار مبارک پر حاضر ہوا کہ حالِ دل عرض کروں۔ لیکن ابھی میں کچھ کہنے نہیں پایا تھا کہ (۴) مرقد مبارک سے یہ صدا آئی "اے وہ شخص کہ تونے اپنے بزرگوں (باپ دادا) کے طریقہ کو چھوڑ دیا ہے۔ یعنی تیرے بزرگ تو تبلیغ واشاعت اسلام کیا کرتے تھے لیکن تو اس طرف سے بالکل غافل ہے۔ (۵) اے مسلمان! تو زبان سے تو محبت اسلام کا دعویٰ کرتا ہے، لیکن تیرے اندر محبت کی آگ بالکل سرد ہوچکی ہے۔ تعجب ہے کہ اسلام میں تو وہی دلکشی موجود ہے، جو پہلے تھی، لیکن تجھ میں اسکی محبت کا کوئی اثر نظر نہیں آتا۔ (۶) کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ کبھی تیرے دل میں، تبلیغ اسلام کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔ (زمین شور اُس زمین کو کہتے ہیں جس میں پیداوار نہ ہوسکے) اسکا نتیجہ یہ ہے کہ آج ساری قومیں تجھے نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں۔ اور یہ کہتی ہیں کہ مسلمانوں کا وجود

دنیا کے لئے کسی رنگ میں بھی مفید نہیں ہے۔ (۷) اے مسلمان! تو نے کبھی غور کیا کہ تیری زندگی کیسی ہے؟ مجھ سے سن! تو اُس باجہ کی طرح ہے، جس کے پردوں سے کفر کے نغمے نکل رہے ہوں۔ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ تو مسلمان ہو کر کفر کی خدمت کر رہا ہے۔ (۸) تو پیدا تو ہوا مسلمانوں کے گھر میں۔ لیکن تیری ہمدردی ہے، بتخانہ کے ساتھ۔ (۹) شاید تیرے ہی لئے انیسیؔ نے یہ شعر لکھا تھا کہ:-

وفا آموختی از ما، بکار دیگراں کر دی!
ربودی گوہرے از ما، نثار دیگراں کر دی

نظم برصفحہ ۱۶۸

حل لغات اور شرح مشکلات | کیفِ عشرت۔ راحت کی کیفیت + سحاب، بادل + الم کا سورہ۔ رنج کا باب۔ یہ بہت بلیغ مصرع ہے "ہے الم کا سورہ بھی جزوِ کتاب زندگی"۔ اس میں صنعت ایہام پائی جاتی ہے۔ الم۔ اگر اس لفظ کو الم پڑھا جائے تو رنج کے معنی ہونگے۔ لیکن اس کی صورت "الف لام میم" سے مشابہ ہے۔ اور سورہ بقرہ انہی حرفوں سے شروع ہوتی ہے۔ اسی لئے اقبالؔ نے الم کے ساتھ سورہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ تاکہ 'ایہام' کا رنگ پیدا ہو سکے۔ الم۔ سورہ جزو اور کتاب ان الفاظ میں صنعت مراعاۃ النظیر پائی جاتی ہے۔ لفظ کتاب میں بھی ایہام ہے۔ کیونکہ قرآن مجید کو بھی کتاب یا الکتاب' کہتے ہیں۔ اور اسکے پاروں کو اجزا کہتے ہیں۔ مطلب اس بے نظیر مصرع کا یہ ہے کہ رنج والم بھی انسانی زندگی کا ایک لازمی جزو ہے + غیر از فغاں۔ آہ و فغاں کے بغیر + دیدہ بینا میں یعنی عقلمند آدمی کی نظر میں مضراب سے غم اور ساز سے جوانی مراد ہے + شہپر، اگلے دو تین پر۔ جو نسبتاً

بڑے ہوتے ہیں۔ چنانچہ انہی کی مدد سے پرند اُڑتا ہے + انکشافِ راز۔ بھید کی تشریح + سرود بمعنی نغمہ + ہم آغوش بمعنی متحد + شام جسکی آشنائے نالۂ یارب" نہیں، یعنی جو شخص رات کی تنہائی میں آہ و فریاد نہیں کرتا۔ "یارب" کنایہ ہے آہ و فریاد سے + اشک کے کوکب۔ آنسوؤں کے ستارے + نظمِ دہر، دنیا کا انتظام + ادراک بمعنی علم + ہے ابد کے نسخۂ دیرینہ کی تمہید، یعنی عشق انسان کو حیات ابدی عطا کر دیتا ہے + زندگانی ہے عدم ناآشنا الخ یعنی عشق، معشوق کو بھی زندۂ جاوید بنا دیتا ہے + جبین کوہ۔ پہاڑ کی چوٹی یا بلندی + آئینہ روشن ہے اسکا الخ یعنی اسکی سطح آب، حور کے رخسار کی طرح شفاف ہے + رفعت بمعنی بلندی + محصور ہو۔ گھر جائے + رزم گاہ خیر و شر۔ نیکی اور بدی کی جنگ کا میدان + خفر ہمت ہو گیا الخ یعنی ہمت پست ہو گئی ہو۔

تبصرہ | جیسا کہ اسکے عنوان سے ظاہر ہے۔ اقبالؔ نے اس نظم میں غم کا فلسفہ بیان کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ نظم لفظ اور معنی دونوں کے لحاظ سے بہت مشکل ہے۔ یہ نظم انہوں نے "میاں فضل حسین صاحب بیرسٹر ایٹ لا، کے نام" لکھی تھی۔ جو اُس زمانہ میں لاہور میں پریکٹس کرتے تھے۔ میاں صاحب ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوئے تھے۔ اور اُنہوں نے ۱۹۳۶ء میں وفات پائی۔ اکبر الہ آبادی کا یہ شعر ان پر پورے طور سے صادق آتا ہے:-

تھے معزز شخص، لیکن ان کی لائف کیا لکھوں
گفتنی درجِ گزٹ، باقی جو ہے ناگفتنی

پہلا بند:- اگرچہ انسانی زندگی میں آسائش و مسرت، بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اور ہر شخص اسکا طالب نظر آتا ہے۔ لیکن آنسو (رنج و غم) بھی اسکے لئے بہت ضروری ہے۔ بلکہ غور سے دیکھا جائے تو زندگی کی بنیاد ہی غم پر

ہے۔ اسی لئے الم بھی انسان کے لئے، اتنا ہی ضروری ہے، جسقدر عشرت اور راحت۔ گلاب کے پھول میں سے اگر ایک پتی بھی کم ہو جائے تو اُسے گلاب نہیں کہہ سکتے۔ اسی طرح زندگی میں سے ایک پہلو یا جزو بھی کم ہو جائے تو زندگی مکمل نہیں ہو سکتی۔ ایسی بلبل آج تک پیدا نہیں ہوئی جس نے خزاں کی مصیبت نہ اُٹھائی ہو۔ اسی طرح دنیا میں کوئی انسان ایسا نہیں ہے جس نے رنج و غم کا ذائقہ نہیں چکھا۔ باغ کے لئے خزاں ضروری ہے۔ تو انسان کے لئے غم بھی ضروری ہے۔

دوسرا بند:- ہر انسان کے دل میں آرزوئیں مچلتی رہتی ہیں۔ اور چونکہ کسی شخص کی بھی ساری آرزوئیں پوری نہیں ہو سکتیں۔ اسلئے ہر شخص کبھی نہ کبھی غمگین ہو ہی جاتا ہے۔ لہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ رنج و غم کے بغیر انسانیت کامل ہی نہیں ہو سکتی۔ جو آدمی عقلمند ہے وہ داغ غم کو اپنے سینہ کا چراغ تصور کرتا ہے۔ اور آہ و نالہ کو اپنی روحانی ترقی کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ غم سے انسانی فطرت اپنے مرتبۂ کمال کو پہونچتی ہے۔ اور رنج و ملال سے دل کے آئینہ پر صیقل ہو جاتی ہے۔ اگر جوانی میں کسی پر غم مسلّط ہو جائے تو وہ خواب غفلت سے بیدار ہو جاتا ہے۔ اور زندگی (کائنات) کی حقیقت پر غور کرنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ غور و فکر اسکے اصلاح باطن کا ذریعہ بنجاتی ہے۔ دل کی ترقی کے لئے غم "شہپر" کا کام دیتا ہے۔ اور اسی غم کی بدولت، انسان اپنے دل کی پوشیدہ طاقتوں سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ غور سے دیکھو تو لوگ جسے غم کہتے ہیں وہ ہماری روح کا ایک نغمہ ہے، جو زندگی کے نغمہ سے متحد اور وابستہ ہے۔ یعنی غم زندگی کا جزو لازمی ہے۔

تیسرا بند:- جو شخص رات کو آہ و نالہ نہیں کرتا، یا رات کی تنہائی میں کبھی آنسو نہیں بہاتا، جس کے دل میں کبھی غم کا احساس پیدا نہیں ہوتا۔ جو شخص

ہمیشہ عیش و عشرت میں مشغول رہتا ہے۔ جس گلچیں کے ہاتھ میں کبھی کانٹا نہیں لگا۔ جس شخص نے کبھی ہجر کے صدمے نہیں اُٹھائے، جو شخص رنج و غم سے ناآشنا ہے۔ وہ دراصل زندگی کی حقیقت سے ناآشنا ہے۔ آخری شعر میں اقبالؔ اپنے دوست سے خطاب کرتے ہیں کہ تجھے چونکہ نظام کائنات سے آگاہی ہے، اسلئے میں گمان کرتا ہوں کہ تو اس رنج و غم کو جو مشیتِ ایزدی کے مطابق تجھ پر وارد ہوا ہے، بڑے صبر و سکون کے ساتھ برداشت کریگا۔

چوتھا بند:- واضح ہو کہ عشق اس کائنات میں وہ طاقت یا جوہر ہے جو اپنی ذات کے لحاظ سے زندۂ جاوید ہے۔ یعنی ابدی ہے اُسے کبھی فنا نہیں ہے۔ ہاں عقل انسانی، انسان کی طرح بیشک فانی ہے، عشق کے سامنے موت بالکل عاجز ہے۔ عشق چونکہ زندگی کا منبع ہے اسلئے ابدی ہے۔

اب اقبالؔ اس حقیقت کو مثالوں کے ذریعہ سے واضح کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ محبوب کے مرنے کا مطلب، اگر یہ ہو کہ وہ فنا ہو گیا تو محبت (عشق) کا جذبہ اور الفت کا جوش بھی عاشق کے دل سے فنا ہو جاتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا اس سے یہ ثابت ہے کہ محبوب بھی فنا نہیں ہوتا، بلکہ صرف عارضی طور پر کچھ عرصہ کے لئے ہم سے جدا ہو گیا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ "عشق کچھ محبوب کے مرنے سے مر جاتا نہیں ؛ روح میں غم بن کے رہتا ہے مگر جاتا نہیں"۔ تو غم کیا ہے؟ یہ دراصل عشق ہی کی ایک شکل ہے۔ محبوب کی زندگی میں جسے عشق کہتے ہیں، اسکے مرنے کے بعد وہی جذبہ غم کی صورت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ وہ تبدیل نہیں ہوتا، صرف اسکا نام تبدیل ہو جاتا ہے۔ قصہ مختصر، اگر عشق باقی ہے تو محبوب بھی باقی ہے۔ یعنی محبوب پر کبھی عدم کی کیفیت طاری نہیں ہوتی۔

پانچواں بند:- اب دوسری یعنی ندی کی مثال پر غور کرو۔ ندی پہاڑ کی چوٹی سے شور کرتی ہوئی آتی ہے۔ اسکا پانی نہایت شفاف ہوتا ہے۔ وادی کی چٹانوں سے ٹکرا کر اسکا پانی، لاکھوں بوندوں کی شکل میں نمایاں ہوجاتا ہے۔ اور چاروں طرف پھیل جاتا ہے۔ لیکن کچھ دور چل کر وہ پانی پھر ندی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ بس یہی زندگی (کی نہر) کا حال ہے۔ وہ بھی لاکھوں انسانوں کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ دنیا میں ہم ایک دوسرے سے جدا ہوجاتے ہیں دوسری دنیا میں (آگے چل کر) پھر سب جمع ہوجائینگے۔ لیکن ہم اپنی کوتاہ بینی کے سبب سے، عارضی فرقت کو دائمی سمجھکر غمگین ہوجاتے ہیں۔

چھٹا بند:- حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ مرجاتے ہیں، وہ ہم سے عارضی طور پر جدا تو بیشک ہوجاتے ہیں، لیکن فنا نہیں ہوتے۔ جسوقت عقل انسانی دنیا کی آفتوں میں گھر جاتی ہے یا جوانی کے جذبات سے مغلوب ہوجاتی ہے یا جسوقت انسان، اچھائی اور برائی میں تمیز نہ کرسکے اور اپنے لئے کوئی راہ معین نہ کرسکے، یا جسوقت وہ ہمت ہار جائے۔ اور اسکی عقل (فکر) عاجز ہوجائے اور کوئی صحیح فیصلہ نہ کرسکے۔ اور اسکا ضمیر بھی رہنمائی سے قاصر ہو۔ اور کوئی ناصح اور ہمدرد بھی نہ ہو، جو اسے صلاح دے سکے اور امید کی کوئی جھلک بھی اسے نظر نہ آئے۔ ہر طرف مایوسی ہو، اسوقت انسان اُن لوگوں کی زندگیوں سے ہدایت حاصل کرسکتا ہے، جو اس دنیا سے رخصت ہوچکے ہیں۔ ان کی زندگیاں ہمارے لئے سبق آموز ہیں۔ مثلاً اگر ہمیں کسی کوشش میں ناکامی ہو تو ہم بابر کی زندگی سے سبق حاصل کرسکتے ہیں۔ اگر ہماری راہ میں دشواریاں حائل ہوں، تو ہم مصطفےٰ کمال کی زندگی کو اپنے لئے نمونہ بنا سکتے ہیں۔

نظم نمبر ۱۷۱

حلِ لغات | مستِ ناز۔ محبوبہ مراد ہے + رقیب سے یہاں دوسرے پھول مراد ہیں۔ (جنکو اس محبوبہ نے نہیں توڑا) کنول سے شاعر (عاشق) کا دل مراد ہے + ہم آغوشِ مدعا، یعنی کامیاب + کسی کے دامن سے محبوبہ کا دامن مراد ہے + فسردہ بمعنیٰ رنجیدہ +

مطلب | یہ ایک چھوٹی سی رومانی نظم ہے۔ شاعر کو اس کی محبوبہ نے چند پھول تحفہ کے طور پر عطا کئے۔ اسکی اس نگاہِ کرم نے شاعر کے دل میں جو جذبات پیدا کئے، انکا اظہار اس نظم میں کیا ہے۔ کہتا ہے کہ جب کبھی میری محبوبہ باغ میں جا نکلتی ہے تو ہر کلی زبانِ حال سے یہ دعا کرتی ہے کہ خدا کرے وہ مجھے اپنے لئے منتخب کرلے، تاکہ میں اسکے ہاتھ میں پہونچکر رشکِ آفتاب بنجاؤں۔ اسکے بعد شاعر اُس کلی سے خطاب کرتا ہے کہ تو بڑی خوش نصیب ہے کہ محبوبہ نے تجھے توڑا اور دوسری کلیاں اس عزت سے محروم رہ گئیں۔ جب اُس نے تجھے توڑا تو تیری جدائی کا زمانہ ختم ہوگیا، کیونکہ تجھے وصال نصیب ہوگیا۔ اور میری رائے میں تو اپنے مقصدِ حیات کو پاگئی۔ اسکے بعد شاعر اپنے دل کی حالتِ زار بیان کرتا ہے کہ میرا دل جس پر اہلِ نظر (قدر شناس) تصدق ہیں۔ جس پر میرے شباب کو فخر ہے۔ افسوس ہے کہ ابھی تک اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوا۔ اس پھول (کنول) کی ابھی تک اپنی محبوبہ کے دامن تک رسائی نہیں ہوسکی۔ چونکہ محبوبہ (گلچیں) کا انتظار اس کو ہمیشہ غمگین رکھتا ہے اسلئے موسم بہار اسکو شگفتہ نہیں کرسکتا۔ مطلب یہ ہے کہ محبوبہ نے پھول توڑ کر اُن کو اپنی قربت کی عزت عطا کردی۔ لیکن میں ابھی تک اسکے وصال سے محروم ہوں۔ اسلئے دنیا کی کوئی مسرت (بہار) میرے دل کی کلی کو شگفتہ نہیں کرسکتی +

نظم نمبر ۱۷۲

حلِ لغات | توحید کی امانت سے توحیدِ الٰہی کا عقیدہ مراد ہے جو اسلام کا طغرائے امتیاز ہے + پہلا گھر۔ خانہ کعبہ مراد ہے۔ قرآن مجید فرماتا ہے کہ کعبہ جسے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ نے ملکر بنایا تھا، دنیا میں خدائے واحد کی عبادت کا پہلا گھر ہے + مغرب کی وادیوں سے، مراکو اور اسپین مراد ہیں + سیلِ رواں۔ بڑھتا ہوا سیلاب + باطل۔ اسلام کے علاوہ یا قرآن مجید کے علاوہ جسقدر مذاہب اور کتب ہیں، بقول قرآن حکیم سب باطل ہیں۔ ملاحظہ ہو آیت "وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ" اے رسول آپ کہدیجئے کہ حق آگیا، اور باطل مٹ گیا + اُندلس، عربی میں اسپین کا نام ہے + دجلہ۔ عراق میں مشہور دریا ہے۔ جسکے ساحل پر بغداد واقع ہے + ارضِ پاک سے حجاز کی مقدس سرزمین مراد ہے۔ جس میں مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ واقع ہیں۔ میرِ حجازؐ سے سرکارِ دوعالم صلعم مراد ہیں +

تبصرہ | جب اقبال نے وطنیت (نیشنلزم) کے عقیدہ کو ترک کیا۔ اور اسکے بجائے قرآن حکیم کی تعلیم کے مطابق، اسلام کو مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد قرار دیا، تو انہوں نے ترانہ ہندی کے جواب میں یہ ترانہ ملی لکھا۔ جو آج پاکستان کے بچہ بچہ کی زبان پر ہے۔ یہ ترانہ دراصل اقبال کی حق پژوہی اور صداقت پسندی پر شاہدِ عادل ہے کہ جب ان پر حقیقت منکشف ہوگئی تو انہوں نے صاف لفظوں میں اسکا اعلان کردیا اور اسبات کی مطلق پرواہ نہ کی کہ میری شہرت یا ہردلعزیزی کو نقصان پہونچ جائیگا۔

بیشک ۱۹۰۵ء سے پہلے وہ یہی سمجھتے تھے کہ مسلمان دوسری قوموں کے ساتھ ملکر "متحدہ قومیت" بناسکتے ہیں، یا کافر اور مسلم دونوں ملکر ایک قوم بن سکتے ہیں۔ لیکن جب انہوں نے قرآن حکیم کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا تو ان پر یہ صداقت واضح ہوگئی کہ مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد وطن نہیں ہے۔ بلکہ عقیدۂ توحید ہے۔ چنانچہ انہوں نے ۱۹۱۰ء سے لیکر تادمِ وفات اسی صداقت کی تبلیغ کی۔

نوٹ:- واضح ہو کہ ۱۹۲۲ء تک جناب ابوالکلام آزاد بھی اسی مسلک پر عامل تھے کہ مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد، وطن نہیں، بلکہ عقیدۂ توحید ہے، لیکن جب انہوں نے مسٹر موہن داس کرم چند گاندھی کو اپنا رہنما بنایا (جس کا اعتراف انہوں نے اپنے ۱۹۴۰ء کے خطبۂ صدارت میں کیا ہے) تو اس صریح قرآنی تعلیم کو پس پشت ڈال کر مسلکِ گاندھویہ اختیار کرلیا جسکی رو سے قوم کی بنیاد، مذہب نہیں بلکہ وطن ہے۔ غالبًا اسی انقلاب کو دیکھکر اقبال نے یہ شعر لکھا تھا:-

وائے بر عشقے کہ نارِ او فسرد!
در حرم زائید و در بتخانہ مرد!

نظم کا مطلب | (۱) ہم مسلمان ہیں۔ اور مسلمان کی تعلیم یہ ہے، کہ تمام مسلمان خواہ۔ وہ دنیا کے کسی حصہ میں رہتے ہوں، ایک مستقل قوم ہیں۔ کیونکہ انکی قومیت کی بنیاد، وطن پر نہیں ہے، بلکہ عقیدہ توحید پر ہے۔ اسلئے کوئی خاص ملک ہمارا وطن نہیں ہے، بلکہ ساری دنیا ہمارا وطن ہے۔ یہ مصرع "مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا" مسلمانوں کی ادبیات عالیہ میں ضرب المثل کی حیثیت اختیار کرچکا ہے۔

(۲) چونکہ ہم عقیدۂ توحید الٰہی کے حامل، اور اسکے امین ہیں، اور یہ عقیدہ

ایک حقیقت ابدی ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت اس عقیدہ کو نہیں مٹا سکتی۔ اسلئے ہم بھی نہیں مٹ سکتے۔

(۳) کعبہ، دنیا میں خدائے واحد کی عبادت کا پہلا گھر ہے۔ ہم اسکے نگہبان ہیں اور وہ ہمارا نگہبان ہے۔ جبتک کعبہ موجود ہے، مسلمان موجود رہینگے۔ اور جب تک مسلمان زندہ ہیں، کعبہ بھی برقرار رہیگا۔ یہ دونوں لازم اور ملزوم ہیں۔

(۴) مسلمانوں نے اپنے دین کی عظمت قائم رکھنے کے لئے ہمیشہ جہاد کیا ہے۔ اسلئے ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے تلواروں کے سایہ میں پرورش پائی ہے۔ چنانچہ ہمارا قومی نشان بھی ہلال ہے، جو تلوار سے مشابہ ہے۔

(۵) ہم نے مغرب میں مراقش اور [illegible] تک فتوحات کی ہیں اور تاریخ شاہد ہے کہ جب ہم تسخیر ممالک کے لئے نکلے تو دنیا کی کوئی طاقت ہمارے سیلاب کو نہ روک سکی۔

(۶) اے دنیا والو! یاد رکھو ہم مسلمان، باطل سے مرعوب نہیں ہو سکتے۔ باطل بارہا ہمارے مقابلہ میں آچکا ہے۔ لیکن ہمیں مغلوب نہیں کر سکا۔

(۷،۸) تاریخ گواہ ہے کہ ہم نے اندلس اور بغداد میں عظیم الشان حکومتیں قائم کیں اور دنیا کو علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کی دولت سے مالامال کر دیا۔

(۹) اور دنیا سے یہ حقیقت بھی پوشیدہ نہیں ہے کہ ہمنے حجاز کی عزت قائم رکھنے کے لئے اپنا خون، پانی کی طرح بہایا۔ حجاز کا ذرہ ذرہ۔ اس صداقت پر گواہی دے سکتا ہے کہ حرمین کو ہم اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔

(۱۰) سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے آقا اور پیشوا ہیں اور حضور اقدس کا نام پاک، ہر مسلمان کے حق میں باعث آرام جان ہے۔

(۱۱) اقبال کا یہ ترانہ، مسلمانوں کے لئے گویا "بانگ درا" ہے یعنی سربلندی اور برتری کے حصول کا پیغام ہے اور خدا کے فضل و کرم سے ہم ضرور کامیاب ہونگے۔

حل لغات | وطنیت۔ اس لفظ کے دو معنی ہیں (۱) اپنے وطن سے محبت کا جذبہ یا وطن پروری، اقبال کی رائے میں یہ جذبہ (چونکہ قدرتی ہے اسلئے) بالکل صحیح ہے اور اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس پر انہیں کوئی اعتراض بھی نہیں، وہ کہتے ہیں کہ دنیا میں ہر شخص کو اپنے وطن سے قدرتی لگاؤ ہوتا ہے۔

(۲) یہ لفظ موجودہ زمانہ میں ایک سیاسی اصطلاح بھی ہے، یا جیسا کہ خود انہوں نے اس لفظ کے نیچے بطور تشریح لکھا ہے۔ وطنیت کا ایک سیاسی تصور بھی ہے۔ اس تصور کی رو سے اسکا مفہوم پہلے مفہوم سے بالکل مختلف ہے اسکی تشریح یہ ہے:-

(ا) وطن، انسان کی تمام وفاداریوں کا مرکز ہے۔

(ب) جب دین اور وطن میں موازنہ ہو یا آویزش ہو، تو ہر انسان کا فرض یہ ہے کہ وہ وطن کو دین یا ایمان پر ترجیح دے۔ مثلاً مسلمان کے دین کا تقاضا یہ ہے کہ وہ کسی مسلمان ملک پر حملہ نہ کرے۔ لیکن اگر وطن کا فائدہ اس بات میں ہے کہ اس وقت پاکستان کا مسلمان، عربوں پر حملہ کرے تو اُسے دین کو بالائے طاق رکھکر، بلا تامل حملہ کر دینا چاہیئے۔ چنانچہ ۱۹۱۶ء میں عربوں نے اسی اُصول وطنیت کی بنا پر کافروں کے ساتھ مل کر ترکوں کے خلاف اعلانِ جنگ کیا تھا۔ (جسکی سزا وہ ۱۹۱۶ء سے اب تک بھگت رہے ہیں)

(ج) وطن، مذہب سے بلند تر ہے۔ مثلاً اگر کوئی پوچھے کہ تم کون ہو؟ تو وطنیت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم یہ جواب دیں کہ ہم پاکستانی ہیں۔ حالانکہ دین کی رو سے اس سوال کا جواب یہ ہے کہ مسلمان ہیں۔ مولانا محمد علی جنت آشیانی سے (جو بیت المقدس میں حضرات انبیائے کرام کے قدموں میں آرام کر رہے ہیں)

ایک غیر مسلم نے پوچھا کہ آپ پہلے کیا ہیں؟ ہندوستانی یا مسلمان؟ تو اس مرد مومن نے یہ جواب دیا کہ میں پہلے بھی مسلمان ہوں، بیچ میں بھی مسلمان ہوں، اور آخر میں بھی مسلمان ہوں۔ اسلام اس طرح میری رگ و پے میں سما گیا ہے کہ اب کسی اور تصور کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ بس یہی بات اقبال نے اس نظم میں بیان کی ہے۔

(د) مذہب اور سیاست جداگانہ ہیں۔ حالانکہ، اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ

جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

(ہ) مذہب، انسان کا پرائیوٹ (نجی) معاملہ ہے۔ اُسے سیاست یا اُمورِ مملکت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ حالانکہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ، دین اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ اور سیاست اسکا ایک شعبہ (محکمہ) ہے۔ یعنی دین سیاست پر بھی حاکم ہے۔

(و) انسان کا فرض ہے کہ وطن کے لئے جیئے اور اُسی کے لئے مرے۔ یعنی اپنی پوری زندگی وطن کی نذر کر دے۔ حالانکہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ مسلمان صرف اللہ کے لئے جیتا ہے اور اُسی کے لئے مرتا ہے۔ آیت ملاحظہ ہو۔

قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

اے رسول آپ اعلان کر دیجئے کہ میری نماز اور تمام دینی رسوم اور میرا جینا اور میرا مرنا، سب کچھ (ساری زندگی) صرف اس اللہ کے لئے ہے جو رب العالمین ہے۔

وطنیت کے اس مفہوم کو مدنظر رکھکر ہر مسلمان خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ لفظ وطن جب بطور ایک سیاسی تصور کے استعمال ہوتا ہے، تو وہ اسلام سے متصادم ہو جاتا ہے۔ یعنی ایک مسلمان، وطنیت کے سیاسی مفہوم کی رو سے، ہرگز ہرگز نیشنلسٹ یا قوم پرست نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اگر وہ مسلک وطنیت (نیشنلزم) اختیار کریگا تو اُسے لامحالہ اسلام سے دستبردار ہونا پڑیگا۔ بلاشبہ وطنیت، اسلام کی ضد ہے۔ اور یہ دونوں کسی طرح ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ جس طرح ایک مسلمان اشتراکی نہیں ہو سکتا، اُسی طرح وہ قوم پرست بھی نہیں ہو سکتا۔

یہی وجہ ہے کہ جب جنوری ۱۹۳۸ء میں مولانا حسین احمد صاحب دیوبندی نے دہلی کے جلسہ میں یہ کہا تھا کہ "موجودہ زمانہ میں قومیں اوطان (وطن کی جمع ہے) سے بنتی ہیں"۔ لہذا مسلمانوں کو لازم ہے کہ ہندوؤں کے ساتھ غیر مشروط طریق پر مل کر، متحدہ قومیت بنالیں، وغیرہ وغیرہ۔ تو اقبال نے اُن کے اس غیر اسلامی ارشاد کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تھی۔

میں نے یہ تشریح اسلئے کر دی ہے کہ نظم کا مطلب سمجھنے میں آسانی ہو جائے بنا کی، یعنی قائم کی + روش بمعنی طریقہ + تہذیب کے آذر نے یعنی تہذیب نے۔ تہذیب سے تہذیب مغرب مراد ہے + پیرہن سے تعلیمات یا اُصول مراد ہیں + کفن سے نفی یا تردید مراد ہے + نوی بمعنی جدید + بُت سے مسلک وطنیت مراد ہے + تراشیدۂ تہذیب نوی۔ نئی مغربی تہذیب کی ایجاد۔ بُت کی رعایت سے تراشیدہ کا لفظ لائے ہیں۔ کیونکہ عموماً بت پتھر کے ہوتے ہیں اور انہیں تراشا جاتا ہے + قید مقامی۔ یعنی کسی مقام کی قید یا پابندی + صورت ماہی یعنی مچھلی کی طرح + سُنّت۔ فقہ کی اصطلاح میں آنحضرت صلعم کے طریق زندگی کو سُنّت کہتے ہیں۔ خدا کے حکم پر عمل کرنا فرض ہے۔ اور حضور کے حکم پر عمل کرنا سُنت ہے۔ مثلاً جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فجر کی نماز میں فرضوں سے پہلے دو رکعت پڑھنا سُنت ہے۔ تو اسکا مطلب یہ ہے کہ ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ فرضوں سے پہلے دو رکعت نماز پڑھے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کا عرفی نام "اہل سنت والجماعت" ہے۔ یعنی وہ لوگ جو سنت نبویؐ پر عمل کرتے ہیں۔ محبوب الٰہی

سے ذات رسالتمآب صلعم مراد ہے + تسخیر، یعنی دوسرے ملکوں کو فتح کرنا + رقابت یعنی دشمنی + کمزور، سے کمزور اقوام مراد ہیں + جڑ کٹتی ہے۔ یعنی اسکی نفی ہو جاتی ہے +

پہلا بند :- موجودہ زمانہ میں، سیاست اور حکومت کے طور طریقے بالکل بدل گئے ہیں۔ ارباب حکومت نے بھی، لوگوں پر مہربانی اور ستم کے طریقے بدل دیئے ہیں۔ اس تبدیلی سے متاثر ہوکر، اکثر مسلمان ملکوں، اور حکومتوں نے بھی نئے طور طریقے اختیار کرلئے ہیں۔ موجودہ مغربی تہذیب نے انسانوں کی پرستش کے لئے جو نئے نئے معبود (صنم) یعنی مسلک ایجاد کئے ہیں۔ ان نئے معبودوں میں 'وطن' سب سے بڑا معبود ہے۔ جو آج اللہ کا مد مقابل بنا ہوا ہے۔ اور اس نئے خدا کے پیش کردہ اصول اس قسم کے ہیں کہ انکے اختیار کرنے سے دین (اسلام) فنا ہو جاتا ہے۔

دوسرا بند :- وطن کا یہ بُت جسے مغربی تہذیب نے بنا لیا ہے، دین نبویؐ کا دشمن ہے۔ اے مسلمان! چونکہ تو موحد ہے، اور توحید نے تیرے اندر کافی طاقت پیدا کر دی ہے، اسلئے تو اسکے مقابلہ کے لئے تیار ہو جا۔ تیرا وطن نہ مشرق ہے نہ مغرب، بلکہ اسلام ہے۔ اور اسلام، زمان و مکان کی قیود سے بالاتر ہے تو نہ ایرانی ہے نہ عراقی، نہ ہندی نہ پاکستانی، بلکہ مصطفوی، یعنی آنحضرت صلعم کا غلام ہے۔ تیرا روحانی تعلق، کسی ملک سے نہیں، بلکہ سرکار دو عالم کی ذات پاک سے ہے۔ پس تو اٹھ اور اس بُت کو پاش پاش کر کے، بُت شکنی کا وہی پرانا نظارہ دنیا کو دکھا دے جو کبھی تیرے اسلاف نے دنیا کو دکھایا تھا۔ مثلاً سلطان محمود غزنوی اور سلطان سکندر بت شکن کشمیری۔

تیسرا بند :- اگر تو اپنے آپ کو کسی خاص ملک سے وابستہ کرلیگا تو اسکا

نتیجہ بربادی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ یعنی مسلمان کی حیثیت سے تو ختم ہو جائیگا، تو دنیا میں مچھلی کی طرح رہ کہ وہ سارے سمندر کو اپنا وطن سمجھتی ہے۔ تو بھی ساری دنیا کو اپنا وطن سمجھ، یعنی ساری دنیا میں اسلام کا علَم بلند کر۔ اور اگر ضرورت پڑے تو ترکِ وطن کردے۔ جس طرح تیرے آقا اور مولیٰ سرکار دو عالم صلعم نے کیا تھا، کہ جب مکہ مکرمہ میں اسلامی زندگی بسر کرنی دشوار ہو گئی تو آپؐ نے یثرب کی طرف ہجرت فرمائی۔ اس طرح ہجرت سنتِ نبویؐ قرار پائی۔ پس اگر تو دیکھے کہ وطن میں اسلامی زندگی بسر کرنی دشوار ہے تو وطن کو ترک کردے اور پردیس کو اپنا وطن بنالے۔ تو جس ملک میں چلا جائیگا، وہی تیرا وطن بن جائیگا کیونکہ

مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا۔

یاد رکھ کہ سیاست کی اصطلاح میں وطن کا مفہوم، بالکل مختلف ہے اس مفہوم سے جو اسلام پیش کرتا ہے، بلکہ یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ (جیسا کہ میں وطنیت کی تشریح میں واضح کرچکا ہوں۔) سیاست میں وطن کا مفہوم یہ ہے کہ ہر شخص جس ملک میں پیدا ہوا ہے، وہ ملک اسکا دائمی وطن ہے، اور اسکا فرض یہ ہے کہ اپنے وطن کے لئے جئے، اور وطن کے لئے مرے۔ اسلام میں وطن کا مفہوم یہ ہے کہ وطن سے محبت کرو، اور اسکی حفاظت کرو۔ لیکن اگر تم اپنے وطن میں اللہ کا کلمہ بلند نہیں کر سکتے۔ تو پھر ترکِ وطن کردو۔ کیونکہ مقصدِ حیات وطن نہیں ہے، بلکہ اللہ ہے۔ مسلمان وہ ہے، جو اللہ کے لئے جیتا ہے اور اُسی کے لئے مرتا ہے۔ یہ دونوں مفہوم ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اسلئے ایک مسلمان، سیاسی اصطلاح میں وطن پرست ہرگز نہیں ہو سکتا کیونکہ وطن پرستی اور خدا پرستی، یہ دونوں باتیں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔

چوتھا بند :- آج دنیا کی مختلف اقوام، اسی وطنیت کی بدولت، ایک

دوسرے کی دشمن ہوگئی ہیں۔ روسی اپنے وطن کو دنیا میں سربلند کرنا چاہتے ہیں، امریکن اپنے وطن کو، انگریز اپنے وطن کو، جرمن اپنے وطن کو۔ یعنی ان میں سے ہر ایک اپنے وطن کو اپنا معبود سمجھتا ہے۔ لیکن مسلمان کا راستہ سب سے جُدا ہے۔ وہ نہ اس ملک کی سربلندی کا خواہاں ہے، نہ اُس کی۔ وہ تو اللہ کے نام کو دنیا میں سربلند کرنا چاہتا ہے۔

بہرحال وطنیت کے مفاسد (عیوب) بہت ہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں کہ اسکی وجہ سے اقوام عالم میں دشمنی پیدا ہوتی ہے۔ اور تجارت سے ان اقوام کا مقصد تجارت نہیں، بلکہ اُس ملک کو فتح کرنا ہوتا ہے، جس میں یہ اپنی تجارت کا جال بچھاتی ہیں۔ یورپین اقوام جس ملک میں تجارت کا سلسلہ شروع کرتی ہیں، رفتہ رفتہ اُسے اپنا غلام بنا لیتی ہیں۔ تیسرا عیب یہ ہے، کہ اس نظریۂ وطنیت کی رو سے سیاست میں ہر قسم کا مکر و فریب جائز ہے۔ چنانچہ اسکو سیاسی اصطلاح میں ڈپلومیسی (DIPLOMACY) کہتے ہیں۔

مقصد یہ ہے کہ عیاری اور فریب کاری سے کمزور اقوام کو اپنا غلام بنایا جائے۔ چوتھا عیب (اعتراض) یہ ہے کہ اس نظریہ کی رو سے، اللہ کی مخلوق مختلف قوموں میں منقسم ہو جاتی ہے۔ اور وہ قومیں ایک دوسرے کی دشمن بن جاتی ہیں۔ یعنی بنی آدم، جو سب اللہ کے بندے ہیں، وہ ایک دوسرے کے دشمن بن جاتے ہیں۔ اور اللہ کے بجائے اپنے اپنے وطن کی عبادت کرتے ہیں، اسکا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ "اسلامی قومیت" جو قرآن حکیم کا مقصود ہے، دنیا میں کبھی قائم نہیں ہو سکتی۔ یعنی اسلام تو یہ چاہتا ہے کہ ساری دنیا کے مسلمان ایک قوم بنجائیں۔ ع نیل کے ساحل سے لیکر تابخاکِ کاشغر، لیکن نظریۂ وطنیت یہ سکھاتا ہے کہ پاکستانی جداگانہ قوم ہیں، افغانی جداگانہ، ایرانی جداگانہ،

عراقی جداگانہ، مصری جداگانہ، یعنی :

قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

نوٹ :- یہی وجہ ہے کہ اقبال نے ساری عمر اپنی پوری قوت کے ساتھ وطنیت کے اس غیر اسلامی نظریہ کی تردید کی۔ اور بانگ درا سے لیکر ارمغان حجاز تک ہر کتاب میں اسکے مفاسد واضح کئے ۱۲

نظم ۱۷۵ برصۂ

حل لغات | بیاباں سے، مکہ اور مدینہ کا درمیانی ریگستان مراد ہے + دشنہ بمعنی خنجر + بخاری۔ بخارا (ترکستان) کا باشندہ + زہراب۔ وہ پانی جس میں زہر ملا ہوا ہو + بیباکانہ، نڈر ہو کر + زیارت سے یہاں روضۂ رسول صلعم کی زیارت مراد ہے۔ ہجرتِ مدفونِ یثرب سے حضور اقدسؐ کی ہجرت مراد ہے + سلامت بمعنی سلامتی یا حفاظت + محمل شامی سے وہ محمل مراد ہے، جو دمشق (ملک شام) سے ہر سال حج کے موقع پر مکہ مکرمہ آتی تھی، جس میں خانہ کعبہ کے لئے غلاف ہوتا تھا۔ محمل اُس ڈولی کو کہتے ہیں جو اونٹ پر باندھی جاتی ہے اور اس میں عموماً پردہ نشیں عورتیں سفر کرتی ہیں + جانکاہی۔ سخت محنت برداشت کرنا + عقل زیاں اندیش۔ شاعر نے عقل کو نقصان سوچنے والی اسلئے قرار دیا ہے کہ وہ انسان کو ایثار اور قربانی اور جان دینے سے باز رکھتی ہے۔ حالانکہ فرد اور قوم دونوں کی ترقی انہی باتوں پر منحصر ہے۔ جو قوم مرنے سے ڈرتی ہے وہ کبھی ترقی نہیں کر سکتی + تاثر سے یہاں عشق مراد ہے، جو انسان کو بے باکی سکھاتا ہے۔

مطلب | اس جذباتی نظم میں، اقبال نے اُس حاجی کے قلبی تاثرات قلمبند

گئے ہیں جس کا قافلہ مدینہ کے راستہ میں لُٹ گیا تھا۔ کچھ لوگ رہزنوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ باقی ماندہ مایوسی اور بیدلی کے عالم میں مکہ مکرمہ واپس چلے گئے۔ اب وہ حاجی اپنے دل سے یوں گفتگو کرتا ہے کہ کیا میں بھی واپس چلا جاؤں؟ یکایک اُسکی نگاہ اُس بخاری نوجوان پر پڑتی ہے جس نے رہزن کے خنجر کو ہلال عید تصور کیا اور کلمۂ شہادت پڑھکر اپنی جان خوشی خوشی دیدی۔ یہ منظر دیکھکر وہ کہتا ہے کہ عقل مجھ سے یہ کہتی ہے کہ یثرب کی طرف تنہا سفر کرنا مناسب نہیں لیکن عشق یہ کہتا ہے کہ اگر تو مسلمان ہے تو ضرور سفر کر۔ کیونکہ اگر تو حضور اکرم صلعم کے روضۂ مبارک کی زیارت کئے بغیر واپس چلا گیا تو قیامت کے دن تو حضور اکرم صلعم کے عاشقوں کو کیا مونہہ دکھائیگا؟ حضور انور صلعم کی ہجرت ہر مسلمان کو یہ سبق دیتی ہے کہ مسلمان کو مرنے سے ہرگز نہیں ڈرنا چاہئے، یہ سچ ہے کہ اگر میں شامی محمل کے ساتھ سفر کروں تو پھر مجھے کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوگا۔ لیکن عاشقوں کو تو اسی بات میں لذت محسوس ہوتی ہے کہ وہ محبوب کے لئے اپنی جان کو خطرہ میں ڈالیں۔

اسکے بعد اقبالؔ اس حاجی کے خیالات سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ عقل، انسان کو چالاکی اور عیاری سکھاتی ہے۔ اسکے مقابلہ میں عشق، انسان کے اندر جرأتِ رندانہ پیدا کرتا ہے۔ اور مقصدِ حیات میں وہی شخص کامیاب ہو سکتا ہے، جس کے اندر یہ صفت موجود ہو۔ ؎

کچھ ہاتھ نہیں آتا بے جراتِ رندانہ

نظم بر صفحہ ۱۷۶

حل لغات | شوریدہ بمعنی عاشق + خوابگاہ نبیؐ۔ حضورؐ کا روضۂ مبارک +

بنائے ملت۔ دین اسلام کے اصول یا اسکی بنیادی تعلیمات + زائران حریم مغرب۔ یورپ کے مقدس مقامات کی زیارت کرنے والے۔ مراد ہے ان لوگوں سے جو "اعلیٰ تعلیم" حاصل کرنے کے لئے یورپ کی مشہور درسگاہوں میں جاتے ہیں + ہزار رہبر۔ ہزار سے شدت اور مبالغہ مراد ہے، یعنی رہبری کا کتنا ہی دعویٰ کیوں نہ کریں + "تجھ" سے حضورؐ اور آپؐ کی تعلیمات مراد ہیں + "مرشد از خود بیں" اقبالؔ نے اس ترکیب کو دو واؤ کے درمیان اسلئے لکھا ہے کہ کہنے والا (عاشق) ان کو مرشد نہیں سمجھتا۔ وہ لوگ خود اپنے آپ کو قوم کا مصلح اور ہادی قرار دیتے ہیں، خود بیں بمعنی متکبر مغرور۔ اس لفظ سے ان نقلی رہنماؤں پر طنز کرنا مقصود ہے + اِن کو، یعنی ان باتوں کو + نئے زمانہ سے موجودہ مغرب زدہ زمانہ مراد ہے، جس میں ہر بُرائی، بھلائی ہے، اور ہر بھلائی بُرائی، بلکہ رجعت پسندی ہے + پرانی باتیں یعنی سچائی اور نیکی کے اُصول، جن کی اس زمانہ میں کوئی قدر نہیں ہے +

مطلب | یہ نظم نہیں ہے، بلکہ وہ آہیں ہیں جو ایک دردمند مسلمان کے جلتے ہوئے دل سے آخر شب کی تنہائی میں نکلی ہیں۔ جب اقبالؔ کا ملّی شعور بیدار ہوا تو اُنہوں نے دیکھا کہ جو لوگ مسلمانوں کے رہنما بنے ہوئے ہیں، وہ دراصل ان کے دشمن ہیں۔ کیونکہ حکومت کے آلہ کار ہیں، اور قوم فروشی کرکے، دنیاوی عزت (مثلاً خطابات، عہدے، جاگیریں) حاصل کر رہے ہیں۔ یہ دیکھکر اقبالؔ نے عالم خیال میں، سرکار دو عالم کے روضۂ مبارک پر حاضر ہو کر یوں عرض کیا (۱) کہ اے میرے آقاؐ! مصر اور ہندستان کے سربرآوردہ مسلم، خود اپنے ہی ہاتھوں سے اسلام کی بنیادیں کھود رہے ہیں، اور عوام کو یہ دھوکہ دے رہے ہیں کہ ہم دین اور ملت کی اصلاح کر رہے ہیں۔

(۲) یہ مغرب زدہ لوگ لاکھ ہماری رہنمائی کا دعویٰ کریں، لیکن ہمیں اِن سے کوئی واسطہ نہیں ہے، کیونکہ یہ لوگ، آپؐ کی سنّت سے بالکل ناآشنا ہیں۔ یہ لوگ علم دین حاصل کرنے کے بجائے عہدے اور خطابات حاصل کرتے ہیں۔ مسجد کے بجائے کلب میں جاتے ہیں، اور اللہ کے بجائے انگریز کو سجدہ کرتے ہیں +

(۳) یہ نام نہاد "لیڈرانِ قوم" اور مصلحین امت دراصل آفت کے پرکالے ہیں۔ اللہ آپؐ کی قوم کو ان کے شر سے محفوظ رکھے۔ ان کے کرتوتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ انگریز کی نگاہ میں محترم بننے کے لئے یہ لوگ، آپ کی امّت کو بلا تامل قربان کر دیتے ہیں۔

(۴) آخری شعر میں شاعر اپنے آپ سے خطاب کرتا ہے کہ اے اقبالؔ! مانا کہ جو کچھ تو کہتا ہے، وہ بالکل سچ ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ تیری ان سچی باتوں کو سنے گا کون؟ قوم کی ذہنیت تو بالکل بدل چکی ہے۔ جو شخص تیری ان باتوں کو سُنے گا وہ یقیناً یہی کہے گا کہ ؎

نئے زمانہ میں آپ ہم کو پُرانی باتیں سنا رہے ہیں

نظم بر صفحہ ۱۷۷

حل لغات | زیاں کار۔ وہ شخص جو اپنے نقصان کے درپے ہو + سود فراموش وہ شخص جو اپنے فائدے سے غافل ہو + ہمہ تن گوش، یعنی پوری طرح متوجہ + ہمنوا۔ لفظی معنیٰ ساتھ گانے والا، یہاں مراد ہے دوست + جرأت آموز۔ حوصلہ بڑھانے والی + تابِ سخن۔ شاعری کی لیاقت + خاکم بدہن یہ محاورہ ہے، لفظی معنی ہیں میرے مونہہ میں خاک؟ مراد یہ ہے کہ میں اپنی گستاخی کا اقرار کرتا ہوں + شیوۂ تسلیم۔ اطاعت کا طریقہ یا فرمانبرداری کی عادت + خوگرِ حمد

وہ شخص جو خدا کی تعریف کرنے کا عادی ہو + ذاتِ قدیم۔ "قدیم" علم کلام کی اصطلاح میں اُس ذات کو کہتے ہیں جسکی ابتدا نہو، یعنی ازلی۔ یہ حادث کی ضد ہے + اسلام کی رو سے صرف اللہ قدیم ہے، اور باقی سب کچھ حادث ہے + پھول تھا زیبِ چمن الخ یعنی خدا تو موجود تھا لیکن اسکی صفات کا اظہار نہیں ہوا تھا + صاحبِ الطافِ عمیم۔ وہ خدا جسکی مہربانی عام ہو + بوئے گل پھیلتی کس طرح الخ اگر مسلمان نہوتے تو ذات و صفات الٰہیہ کا چرچا کیسے ہوتا؟ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے نام اور اسکی صفات کو تو مسلمانوں ہی نے دنیا میں شائع کیا + جمعیتِ خاطر۔ باعث تسکین قلب + ہمکو جمعیتِ خاطر یہ پریشانی تھی۔ یعنی اگر ہمنے تیرے نام کو دنیا میں پھیلایا، اور اسکے لئے ہمیں دنیا میں منتشر ہونا پڑا تو یہ پریشانی اور انتشار ہمارے لئے جمعیت خاطر کا موجب بنگیا جمعیت اور پریشانی میں صنعتِ تضاد ہے، کیونکہ یہ دونوں لفظ آپس میں ضد ہیں + مسجود یعنی معبود۔ وہ شئے جسے پوجا جائے + خوگر پیکر محسوس۔ یعنی انسان مادّی اور محسوس اشیار کی عبادت کا عادی ہو گیا تھا + کیا کام ترا۔ یعنی تیرے نام کو دنیا میں بلند کیا۔ دنیا کو تیرے نام سے روشناس کیا + سلجوق ترکوں کے ایک مشہور قبیلہ کا نام ہے + تورانی، ترکستان کے باشندوں کا لقب + ساسانی، قدیم ایران کا حکمران خاندان + معمورہ، یعنی دنیا + بگڑی ہوئی بات کس نے بنائی؟ یعنی توحید کو کس نے دنیا میں قائم کیا؟ معرکہ آرا۔ میدان جنگ کو زینت دینے والا۔ یعنی مرد مجاہد + کلمہ۔ اسکا تلفظ کَ۔ لِ۔ مَہ ہے۔ یہ مسلمانوں کی دینی اصطلاح ہے۔ اور اس سے مراد ہے کلمہ توحید و رسالت یعنی لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ۔ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ، یا کلمہ شہادت یعنی اشھد اَن لا الٰہ الا اللّٰہ و اشھد ان محمداً عبدہ و رسولہٗ

سربکف - یہ محاورہ ہے، یعنی مرنے کے لئے تیار + بُت شکنی کیوں کرتی؟ یہ اشارہ
ہے سلطان محمود غزنوی کی جانب، جس نے سومناتھ کے پجاریوں سے یہ کہا
تھا کہ میں تاریخ میں بت فروش مشہور ہونا نہیں چاہتا + ہم توپ سے لڑ جاتے
تھے - اس میں اشارہ ہے ترکان عثمانی کی طرف جو اکثر میدان جنگ میں دشمنوں
سے اس طرح توپیں چھین لیتے تھے کہ وہ دیکھتے رہ جاتے تھے - تاریخ شاہد ہے
کہ ترکوں کے علاوہ، دنیا کی کسی قوم نے اس بیجگری کا مظاہرہ نہیں کیا + زیر
خنجر بھی یہ پیغام سُنایا الخ اس میں اشارہ ہے صحابہ کرام رضی کی طرف جنہوں نے
اسلام کی اشاعت میں اپنی جانیں قربان کردیں + اکھاڑا در خیبر کس نے؟
اشارہ ہے حضرت علی رضی کی طرف جنہوں نے ایمان کی طاقت سے، قلعہ خیبر کا
دروازہ اکھیڑ کر پھینک دیا تھا + مخلوق خداوندوں کے پیکر یعنی بت + زحمت
کش پیکار - جنگ کی تکلیف اُٹھانے والی + جہاندار بمعنی حکمراں + زمیں بوسی
سے سجدہ کرنا مراد ہے + محمود وایاز سے آقا اور غلام مراد ہے + بندہ بمعنی غلام
بندہ نواز بمعنی آقا + محفل کون ومکاں، یعنی دنیا + مئے توحید سے مراد ہے
عقیدۂ توحید + بحر ظلمات میں دوڑا دیئے الخ بحر ظلمات سے بحر اطلانتک
مراد ہے، جو افریقہ اور امریکہ کے درمیان واقع ہے - سمندر میں گھوڑے دوڑانے
سے استعارہ یا مبالغہ مراد نہیں ہے، بلکہ اس واقعہ کی طرف اشارہ مقصود
ہے، جب عقبہ بن نافع نے مراقش فتح کرنے کے بعد اپنا گھوڑا سمندر میں ڈالدیا
اور کہا اے خدا! مجھے افسوس ہے کہ تیری زمین ختم ہوگئی ورنہ میں اسی طرح
فتوحات کرتا چلا جاتا + باطل سے غیر اسلامی یا مشرکانہ تعلیم مراد ہے + نوع
انساں کو غلامی سے چھڑایا ہم نے - یعنی اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ دنیا میں کوئی
انسان، کسی دوسرے انسان پر حکومت نہیں کر سکتا - حکومت کا حق صرف

اللہ کو حاصل ہے - اور مسلمان اس معنی میں حکومت کر سکتا ہے کہ وہ دنیا میں اللہ
کے قانون (قرآنی ضابطہ) کو نافذ کریگا - یہی وجہ تھی ایک معمولی آدمی نے
حضرت فاروق اعظم رضی سے بھری مجلس میں یہ دریافت کر لیا تھا کہ آپ کو کپڑا تو دو گز
ملا تھا - آپ نے اپنا کُرتہ کیسے بنا لیا؟ + تیرے کعبہ کو جبینوں سے بسایا الخ
یعنی ہمنے ہر سال فریضۂ حج ادا کیا، اور تیرے گھر کی رونق کو برقرار رکھا + مست
مے پندار - غرور کی شراب میں مست ہیں یعنی مغرور ہیں + برق گرتی ہے، یعنی
اگر مصیبت آتی ہے تو مسلمانوں پر + بُت سے یہاں بت پرست مراد ہیں +
حدی خواں، حدی وہ نغمہ ہے، جس کو سُن کر اونٹ بہت خوش ہوتا ہے،
حدی خواں سے عرب مراد ہیں + قصور، قصر کی جمع ہے بمعنی محلات + اُٹھے سینۂ
صحرا سے حباب، یعنی تجھ میں وہ قدرت ہے کہ ریگستان میں چشمہ جاری ہوجائے
حباب پانی کے بلبلہ کو کہتے ہیں + رہرو دشت ہو سیلی زدۂ موج سراب -
یعنی تو اگر چاہے تو ریگستان کا سراب، فی الحقیقت پانی میں تبدیل ہو جائے -
اور صحرا کے مسافر اسکی موجوں کے تھپیڑے کھانے لگیں - رہرو = مسافر -
دشت = جنگل صحرا - سیلی = تھپڑ - موج سراب = سراب کی موج - سراب کا
مطلب یہ ہے کہ جب ریگستان میں ریت پر سورج چمکتا ہے تو دور سے یہ معلوم
ہوتا ہے کہ پانی موجیں مار رہا ہے - اسلئے سراب سے دھوکہ یا فریب مراد
لیتے ہیں + اس مصرع کا مطلب یہ ہے کہ خدا اگر چاہے تو سراب (ریگستان)
دراصل پانی بن جائے - اور اس میں موجیں اُٹھنے لگیں + ناداری مفلسی +
طعن اغیار - دشمنوں کے طعنے + عوض بمعنی صلہ یا بدلہ + اوروں نے سینہ لی
یعنی دنیا پر دوسروں کی حکومت قائم ہوگئی - مثلاً روس، امریکہ، انگلستان
اور یہ سب مسلمانوں کے دشمن ہیں + ساقی نہ رہے جام رہے - یعنی یہ ممکن

نہیں کہ مسلمان تو فنا ہوجائیں لیکن اسلام باقی رہے - اسلام تو مسلمانوں ہی
کے دم سے ہے + محفل سے مسلمان حکومتیں مراد ہیں جو ختم ہوگئیں - موجودہ مسلمان
حکومتیں سب کسی نہ کسی رنگ میں اغیار کے زیر اثر ہیں - جسکی تفصیل اس
شرح میں مناسب نہیں ہے + چاہنے والے بھی گئے - یعنی اب دنیا میں کوئی
ہارون الرشید ہے، نہ نور الدین زنگی ہے، نہ کوئی الپ ارسلاں ہے، نہ صلاح الدین
ایوبی ہے، نہ محی الدین عالمگیر رح ہے نہ کوئی فتح علی خاں المعروف بہ ٹیپو شہید ہے +
شب کی آہیں بھی گئیں، یعنی اب نہ کوئی علی ہجویری ہے، نہ معین الدین اجمیری رح
ہے، نہ بہاء الدین زکریا ملتانی رح ہے، نہ فرید الدین گنج شکر ہے، نہ میاں میر رح
ہے + دل تجھے دے بھی گئے - یعنی تیری محبت میں اپنے کو فنا کر دیا + صلہ لے بھی
گئے - یعنی تونے انہیں زندۂ جاوید بنا دیا - آج بھی لوگ ان کے دروازہ کی
خاک کو آنکھوں سے لگاتے ہیں -
نوٹ :- اس موقع پر مجھے اس زمانہ کے عاشقوں کے سردار حضرت حاجی سید
وارث علی شاہ صاحب قبلہ رح کا قول یاد آتا ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت عاشق
کو فنا نہیں کر سکتی، کیونکہ عاشق کی فنا سے خود معشوق کی فنا لازم آتی ہے
اور معشوق فنا ہو نہیں سکتا، اسکی ذات فنا سے پاک ہے وہ تو "الحی القیوم" ہے
اب انہیں ڈھونڈ چراغ رُخِ زیبا لیکر، یہ مصرع داغ کے اس شعر سے ماخوذ ہے -

> ہم سا جانباز زمانہ میں نہ پاؤ گے کہیں
> لاکھ ڈھونڈو گے چراغِ رُخِ زیبا لیکر

"چراغ لیکر ڈھونڈنا" محاورہ ہے - اسکے معنی ہیں بہت کوشش کے ساتھ
تلاش کرنا + دردِ لیلیٰ سے، لیلیٰ کی یاد - یا اسکی محبت مراد ہے + قیس کے پہلو سے
مسلمان کا دل مراد ہے جس میں حضور (لیلیٰ) کی محبت پوشیدہ ہے + نجد - حجاز اور

یمن کے درمیانی حصہ کو نجد کہتے ہیں - عربی ادب میں اسکا تذکرہ بکثرت موجود ہے -
اسکی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ لیلیٰ اسی علاقہ کی رہنے والی تھی + رم آہو کے لغوی
معنی ہیں ہرن کا بھاگنا، مراد ہے عاشقوں کی صحرا نوردی + حسن کے جادو سے
اسلام کی دلکشی مراد ہے + مُرسَل بمعنی بھیجا گیا، یعنی رسول + آشفتہ سری -
پریشانی یا اضطراب، جو ایک عاشق کی سب سے بڑی پہچان ہے + رسم سلمان رض
سے شیوۂ عاشقی مراد ہے + جادہ پیمائی تسلیم و رضا - یعنی اطاعت کی زندگی +
فاران، مکہ مکرمہ کے نزدیک ایک پہاڑی کا نام ہے - اسلامی ادبیات میں اس
لفظ سے دین اسلام مراد لی جاتی ہے + آتش اندوز کیا، یعنی آگ میں جلا دیا +
شورِ سلاسل - لفظی معنی قیدیوں کی زنجیروں کا شور، مراد ہے عُشاق کے مجمع
سے + قیس سے مسلمان مراد ہے - اے خوش آں روز الخ اس شعر کا مطلب
یہ ہے کہ وہ دن کتنا مبارک ہوگا، جب تو بڑے ناز و انداز کے ساتھ عاشقوں
کی محفل میں واپس آئیگا + بادہ کش، بمعنی شراب نوش + غیر سے یہاں غیر مسلم
اقوام مراد ہیں - جو دنیا میں عیش کر رہی ہیں + لب جو، نہر کے کنارے + جام
بکف، ہاتھ میں شراب کا پیالہ لئے ہوئے + نغمۂ کوکو، کوئل کا نغمہ + تیرے
دیوانے، یعنی مسلمان + منتظر ہُو - بہت بلیغ ترکیب ہے - "ہُو" کے لغوی معنی
ہیں "وہ" اس سے مراد ہے ذاتِ خداوندی - لیکن یہاں ہُو سے عشق کی وہ
باطنی تحریک مراد ہے جو اللہ کی عنایت کی بدولت مسلمان کے دل میں پیدا
ہوتی ہے - ہُو کے منتظر ہیں، یعنی تائید ایزدی اور فضل ربیّ کے منتظر ہیں - ہُو
کے معنی اشارہ کے بھی آتے ہیں، اور یہ معنی اس صورت میں پیدا ہوتے ہیں،
جب "ہو" کو لا الہ الّا ھو، کا مخفف قرار دیا جائے - یعنی تیرے دیوانے
اس بات کے منتظر ہیں کہ کوئی اللہ کا بندہ لا الہ الّا ھُو کا نعرہ بلند کرکے ان کے

دلوں میں تیری محبت کی آگ بھڑکا دے۔ غرضکہ "ہو" سے یہاں اشارہ غیبی یا تائید ایزدی مراد ہے۔ جیسا کہ اگلے شعر سے واضح ہے:-

اپنے دیوانوں کو پھر ذوقِ خود افروزی دے

یعنی تیرے عاشق اس بات کے منتظر ہیں کہ تو اپنا کرم نازل فرمائے، اور ان کو آتشِ عشق میں جلنے کی طاقت عطا فرمائے، تاکہ وہ اپنے آپ کو روشن کر سکیں۔ یعنی عاشقی کی دنیا میں نام پیدا کر سکیں، تجھ پر اپنی جان قربان کر سکیں + برقِ دیرینہ سے وہی عشقِ الٰہی کی آگ مراد ہے، جو ٹھنڈی پڑ چکی ہے + قوم آوارہ سے مسلمان قوم مراد ہے۔ جو اپنی جہالت کی وجہ سے غلط راستہ پر جا رہی تھی + عناں تاب ہے، یعنی اُس نے اپنے گھوڑوں کی باگ موڑ لی ہے۔ یعنی اب وہ صحیح راستہ پر آگئی ہے۔ اور وہ صحیح راستہ کون سا ہے؟ وہی جو حجاز کو جاتا ہے + تشنۂ مضراب ہے، یعنی مسلمان تیرے نام پر سر کٹانے کے لئے پھر تیار ہے، بس تیری ایک نگاہِ کرم درکار ہے + مورِ بے مایہ، کمزور چیونٹی، یعنی مسلمان قوم + ہمدوشِ سلیماں، سلیمان کی ہمپایہ۔ حضرت سلیمان مشہور پیغمبر ہیں، جن کو اللہ نے نبوت اور حکومت دونوں عطا فرمائی تھیں + ہند کے دیر نشینوں سے وہ مسلمان مراد ہیں جو اسلام کی روح یعنی عشقِ رسول سے بیگانہ ہو چکے ہیں + غماز بمعنی چغلخور + ایک بلبل ہے اس سے ذات شاعر مراد ہے + کاش گلشن میں الخ گلشن سے قوم مراد ہے + خون جگر سے قوم کی غفلت شعاری پر نوحہ خوانی مراد ہے + جوہر سے جذباتِ قلبی مراد ہیں + آئینہ سے دل مراد ہے + بلبلِ تنہا سے اقبال نے اپنی ذات مراد لی ہے + نوا سے شاعری مراد ہے + بادۂ دیرینہ۔ پرانی شراب یعنی عشقِ رسولؐ + عجمی خم۔ عرب کے لوگ اپنے علاوہ دوسری قوموں پر عجمی کہتے تھے۔ خم بمعنی مٹکا شراب کا + مراد ہے اُردو شاعری + حجازی مے سے اسلامی تعلیم مراد ہے۔ لَے سے خیالات مراد ہیں +

تبصرہ | علامہ اقبال نے یہ نظم انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسہ میں سنائی تھی، جو اپریل ۱۹۰۹ء میں منعقد ہوا تھا۔ شفاء الملک حکیم محمد حسن صاحب قرشی جو اس جلسہ میں شریک تھے، لکھتے ہیں کہ "جب ڈاکٹر صاحب نے اپنی سحر انگیز لے میں، ندرتِ تخیل کے اس شاہکار کو پڑھنا شروع کیا تو سارا مجمع مسحور نظر آتا تھا۔" پروفیسر عبدالقادر سروری رقمطراز ہیں کہ "شکوہ، جوابِ شکوہ، شمع اور شاعر، خضرِ راہ، اور طلوعِ اسلام میں سے کسی نظم کا جواب اُردو میں نہیں ہے۔ شکوہ میں جس شاعرانہ انداز سے مسلمانوں کی پستی کا گلہ، خدا سے کیا ہے، اور جوابِ شکوہ میں اُبھرنے کی جو ترکیب بتائی ہے، اس میں الہامِ ربانی کی شان نظر آتی ہے۔"

اگر اس شرح کے صفحات اجازت دیتے تو میں اس نظم پر مفصل تبصرہ لکھتا، اب مجبوراً چند سطور پر اکتفا کرتا ہوں۔ واضح ہو کہ شکوہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے اُردو ادب میں ایک انوکھی چیز ہے۔ ندرتِ تخیل کے علاوہ اس میں حقیقت نگاری اور شاعرانہ مصوری کی شان بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اس نظم میں اقبال نے لفظوں کے ذریعہ سے مسلمانوں کی تاریخ کی تصویر کھینچی ہے۔ اور تخیل کے موقلم سے اس میں ایسی رنگ آمیزی کی ہے کہ حقیقت مجسم ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ ان سب خوبیوں کے ساتھ ساتھ شکوہ کی زبان اس قدر دلکش ہے اور اشعار کی سلاست اور روانی کا یہ عالم ہے کہ پڑھنے والے پر محویت کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ استعارہ، تشبیہ اور رمز و کنایہ کا تذکرہ چنداں ضروری نہیں ہے۔ کیونکہ یہ تو وہ خصوصیات ہیں جو بانگِ درا کی تمام نظموں میں پائی جاتی ہیں۔ اب مطلب بیان کرتا ہوں:-

پہلا بند:- پہلے بند میں شاعر نے تمہیداً کہا ہے کہ آخر میں کب تک یوں خاموش بیٹھا ہوا، اپنی بربادی کا تماشا دیکھتا رہوں۔ کب تک اپنے مستقبل سے غافل رہوں۔ جب مجھے گویائی کی قوت حاصل ہے تو پھر میں اپنے اللہ کو، اپنی روداد غم کیوں نہ سناؤں؟

دوسرا بند:- اے خدا! یہ سچ ہے کہ تسلیم و رضا ایک مسلمان کا شیوہ ہے، لیکن میرے دل میں اس قدر شدید درد ہے کہ میں ضبط نہیں کر سکتا، اسلئے اگر میں تیری بارگاہ میں اپنے درد کا قصہ بیان کرتا ہے تو مجھے معذور سمجھ کر معاف کر دے، اور اپنے عاجز بندہ سے جو حمد و ثنا کا عادی ہے، تھوڑا سا گلہ بھی سُن لے۔

تیسرا بند:- یہ سچ ہے کہ تو اپنی ذات کے اعتبار سے قدیم ہے، یعنی ایک زمانہ ایسا بھی تھا جب تو موجود تھا، مگر تیری صفات کی جلوہ گری نہیں ہوتی تھی، یعنی یہ کائنات موجود نہ تھی۔ اب تو خود انصاف کرلے کہ اگر مسلمان نہ ہوتے تو تیری صفات (بوئے گل) کا علم، دنیا، والوں کو کیسے ہوتا۔ بس ہم مسلمانوں نے دنیا والوں کو تیرے نام سے اور تیری صفات سے آگاہ کیا۔ ہمنے ساری دنیا میں تیرے نام کو بلند کیا۔ اور اس سلسلہ میں ہمنے جس قدر کوشش کی یہ ہمارے لئے راحتِ خاطر کا باعث تھی، ورنہ تیرے محبوب کی امت دیوانی تو نہیں تھی کہ اُس نے بلا وجہ ساری دنیا کو اپنا دشمن بنا لیا۔

نوٹ:- واضح ہو کہ توحید اسلام دراصل تمام دنیائے کفر کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ اسلئے جب مسلمانوں نے توحید کا علم بلند کیا تو ساری دنیا انکی دشمن ہو گئی۔ چنانچہ سلطان نور الدین زنگی اور سلطان صلاح الدین ایوبی کی زندگی میرے دعوے پر شاہدِ عادل ہے ۱۲

چوتھا بند:- اب شاعر خود اپنے دعوے پر دلیل پیش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اے خدا! ہم (اسلام) سے پہلے تیرے بندوں کی یہ حالت تھی کہ وہ پتھروں اور درختوں کو خدا الیقین کرتے تھے۔ چونکہ انسان پیکرِ محسوس کی پرستش کا عادی ہو چکا تھا، اسلئے وہ تجھکو، کہ تو آنکھ سے نظر نہیں آتا، کیسے اپنا معبود بنا سکتا تھا تجھے خوب معلوم ہے کہ ہمارے وجود سے پہلے چین سے لیکر مراکو تک کوئی شخص تیرا نام نہیں لیتا تھا۔ مسلمانوں نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھکر تیرے نام کو دنیا میں بلند کیا یعنی بنی آدم کو توحید سے روشناس کیا۔

پانچواں بند:- ہم سے پہلے تیری دنیا میں صدہا قومیں آباد تھیں۔ سلجوقی، ایرانی، چینی، یونانی، یہودی، مجوسی، نصرانی۔ لیکن ان میں سے کسی نے بھی تیرے نام کو بلند کرنے کے لئے اپنی جان قربان نہیں کی۔ مسلمانوں ہی نے توحید کو دنیا میں قائم کیا۔

چھٹا بند:- وہ مسلمان ہی تھے جنہوں نے تیری عظمت دنیا میں قائم کرنے کے لئے ساری دنیا سے لڑائی مول لی۔ خشکی میں بھی لڑے اور تری میں بھی۔ کبھی یورپ سے برسرِ پیکار رہے، کبھی افریقہ سے۔ ہم نے دنیا کے تمام بادشاہوں کا مقابلہ کیا، اور ان کو زیر کر کے توحید کا علم بلند کیا۔

ساتواں بند:- ہم اگر جیتے تھے تو تیری راہ میں جہاد کرنے کے لئے، اور مرتے تھے تو تیرے نام کو دنیا میں بلند کرنے کے لئے۔ ہمنے کبھی مال و دولت یا حکومت کے لئے جہاد نہیں کیا۔ اگر مسلمان مال و دولت کے تمنائی ہوتے تو بت شکنی کے بجائے بت فروشی کرتے۔ لیکن تاریخ گواہ ہے کہ محمود غزنوی بت شکن تھا، بت فروش نہ تھا۔

آٹھواں بند:- ہم جب میدانِ جنگ میں سر سے کفن باندھکر آتے تھے تو دنیا کی کوئی طاقت ہمیں مغلوب یا مرعوب نہیں کر سکتی تھی۔ کیا یہ تاریخی واقعہ نہیں ہے کہ جنگِ موتہ میں تین ہزار مسلمانوں نے ایک لاکھ رومیوں کا مقابلہ کیا تھا؟ ہم ہر اُس قوم سے لڑنے کے لئے سربکف رہتے تھے، جو تجھ سے سرکشی کرتی تھی۔

زیرِ خنجر بھی ہمنے توحید کا پیغام دنیا کو سُنایا۔

نواں بند:۔ وہ مسلمان ہی تو تھے جنہوں نے خیبر کا دروازہ اُکھاڑ پھینکا۔ قسطنطنیہ کو فتح کیا۔ بتخانوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، اور کفار کے لشکر کاٹ کر رکھدیئے۔ ایران کے آتشکدہ کو ٹھنڈا کر دیا۔ اور تیرے نام کو زندہ کر دیا۔

دسواں بند:۔ مسلمانوں کے علاوہ اور کس قوم نے تجھ سے محبت کی؟ کس قوم نے تیرے اور تیرے رسولؐ کی عزت کے لئے اپنا خون پانی کی طرح بہایا؟ کس قوم کی تکبیروں سے دنیا میں توحید کا نور پھیلا؟ بتوں کے پوجنے والے کس قوم کی ہیبت سے لرزہ براندام رہتے تھے؟

گیارہواں بند:۔ عین جنگ کی حالت میں بھی جسوقت نماز کا وقت آجاتا تھا، تو ہم قبلہ رو ہو کر تیری درگاہ میں حاضر ہوجاتے تھے اور ہماری مساوات کا یہ عالم تھا کہ اسوقت محمود اور ایاز، آقا اور غلام سب ایک ہی صف میں کھڑے ہوتے تھے۔

بارہواں بند:۔ ہم نے اس دنیا میں مشرق سے لیکر مغرب تک تیرے نام کا ڈنکا بجادیا۔ ہمنے ساری دنیا کو تیرا پیغام سُنایا۔ اور تو جانتا ہے، کہ ہم کو اس مقصد میں کبھی ناکامی نہیں ہوئی۔ ہم کسی قوم سے مرعوب نہیں ہوئے۔ خشکی کا تو ذکر ہی کیا ہے ہم نے تو سمندر عبور کر کے تیرا پیغام دنیا کو سُنایا۔ اور ہم عرب سے جو نکلے تو بحر ظلمات تک توحید کا پرچم اُڑاتے چلے گئے۔

تیرہواں بند:۔ ہم نے دنیا سے کفر کو مٹا دیا۔ اور بنی آدم کو، ہر قسم کی غلامی سے آزادی عطا کی۔ ہمنے تیرے کعبہ کی حفاظت کی۔ اُسے آباد کیا، اور تیرے پاک کلام کو ہمیشہ سینہ سے لگایا۔ اسکے باوجود تو ہم سے ناراض ہے اور تجھے ہم سے یہ شکایت ہے کہ ہم بیوفا ہیں!

چودہواں بند:۔ ہمارے علاوہ اس دنیا میں دوسری قومیں بھی آباد ہیں۔ اُنمیں نیک بھی ہیں اور بد بھی ہیں۔ بے عمل بھی ہیں، باعمل بھی ہیں۔ اور بہت سے لوگ تیرے منکر بھی ہیں۔ اسکے باوجود تو ان پر مہربان ہے۔ لیکن مسلمان تیری نگاہ کرم سے محروم ہیں۔

پندرہواں بند:۔ آج مسلمانوں کی پستی کی یہ حالت ہے کہ بتخانوں میں بت پرست خوشی کے لہجہ میں یہ کہتے ہیں کہ مسلمان بہت جلد صفحہ ہستی سے مٹ جائینگے۔ اور ان کے بعد دنیا میں کوئی شخص نہ مکہ جائیگا نہ مدینہ، اور نہ دنیا میں کوئی قرآن کا نام لیگا۔ اے خدا! آج کافر ہم پر طنز کے تیر برسا رہے ہیں۔ اور اسلام کی ہنسی اُڑا رہے ہیں، کیا تجھے اپنی توحید کی بقا کا اب کوئی خیال نہیں ہے؟ کیا تو یہ پسند کریگا کہ کفر، اسلام پر غالب آجائے؟

سولہواں بند:۔ مجھے یہ شکایت نہیں کہ غیر مسلم دولتمند کیوں ہیں؟ افسوس کا صرف یہ ہے کہ ان کو ساری نعمتیں حاصل ہیں۔ اور مسلمان سے صرف یہ وعدہ ہے کہ مرنے کے بعد جنت ملے گی۔ آخر یہ بات کیا ہے کہ اب تو ہم پر زمانۂ سابق کی طرح مہربان نہیں ہے؟

سترہواں بند:۔ آج مسلمان سب قوموں سے زیادہ مفلس اور نادار ہیں حالانکہ تو قادر مطلق ہے۔ اور تیرے خزانہ میں کسی چیز کی کمی نہیں، اگر تو چاہے تو ریگستان کو سمندر میں تبدیل کر سکتا ہے۔ آج ہم غیروں کے طعنے سُن رہے ہیں، رسوا ہیں، نادار ہیں، اے خدا! کیا مسلمان ہونے کا صلہ یہ ہے کہ ہم دنیا کی نظروں میں ذلیل ہوجائیں۔

اٹھارہواں بند:۔ اے خدا! اسوقت حالت یہ ہے کہ دنیا اور اسکی دولت تو اغیار کے قبضہ میں ہے، مسلمان صرف خیالی دنیا میں بستے ہیں۔ تیری دنیا پر انہیں کوئی اقتدار حاصل نہیں ہے۔ اے خدا! ہم تو اسلئے دنیا میں زندہ رہنا چاہتے ہیں

کہ توحید قائم رہے اور تیرا نام زندہ رہے۔ کیونکہ یہ تو ناممکن ہے کہ مسلمانوں کے فنا ہوجانے کے بعد تیرا نام باقی رہے۔

نوٹ:۔ اس میں اشارہ ہے حضور انور صلعم کے اُن الفاظ کی طرف جو جنگ بدر کے موقع پر آپؐ کی زبان مبارک سے نکلے تھے کہ "اے خدا! اگر یہ مٹھی بھر جماعت آج فنا ہوگئی تو پھر تو قیامت تک نہ پوجا جاسکے گا۔"

انیسواں بند:۔ اے خدا! آج یہ کیفیت ہے کہ مسلمان ہر جگہ ذلیل و خوار ہیں۔ اور جو لوگ تیرے نام پر سر کٹانے کے لئے تیار رہتے تھے، رفتہ رفتہ ختم ہوتے ہیں۔ انہوں نے اگر تجھ سے محبت کی تو اسکا صلہ بھی انہیں مل گیا۔ اُنہوں نے تیرے نام پر سر کٹایا۔ تو نے اُن سے جنت کا وعدہ کیا۔ اور وہ ہنستے ہوئے رخصت ہوگئے۔ لیکن اب اُن لوگوں سے تیری محفل خالی ہوچکی ہے۔

بیسواں بند:۔ اے خدا! اسلام کی خوبیاں بدستور موجود ہیں۔ مُسلمانوں کی اسلام سے محبت بھی برقرار ہے۔ حج کعبہ کا سلسلہ بھی اُسی طرح جاری ہے مسلمانوں کے جذبات عاشقی اُسی طرح زندہ ہیں۔ اسلام کی دلکشی بھی بدستور قائم ہے۔ ہم بھی وہی ہیں، جو تھے، اور تو بھی وہی ہے جو تھا۔ پھر اس ناراضگی کا سبب کیا ہے؟

اکیسواں بند:۔ اے خدا! تو ہی بتا، آخر ہم نے کیا قصور کیا ہے؟ تجھکو بھلا دیا؟ تیرے رسولؐ کو فراموش کر دیا؟ بت پرستی اختیار کرلی؟ سرکار دو عالمؐ سے محبت ترک کر دی؟ حضرت سلمانؓ اور حضرت اویسؓ کی تقلید ترک کر دی؟ حقیقت یہ ہے کہ ہم اب بھی توحید کی آگ اپنے سینوں میں پوشیدہ رکھتے ہیں۔ اور بلالؓ کی طرح تیرے نام پر سختیاں جھیلنے کے لئے تیار ہیں۔

بائیسواں بند:۔ یہ مانا کہ ہم عشق و محبت میں اسلاف (اگلوں) کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ اور ہمارے اندر تسلیم و رضا (اطاعت) کا وہ رنگ بھی نہیں ہے جو

اُن بزرگوں میں پایا جاتا تھا۔ اور ہم اس حد تک اسلام کے پابند اور شریعت کے وفادار بھی نہیں ہیں، لیکن گستاخی معاف ہو "کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے" یہ بات ہماری سمجھ میں تو آئی نہیں۔

تیئسواں بند:۔ یہ حقیقت ہے کہ اسلام کا آفتاب کوہ فاراں کی چوٹیوں سے طلوع ہوا، اور تو نے اس دین کو کامل کر دیا۔ چنانچہ ہزاروں، لاکھوں، آدمی، اسلام کی خوبیوں کو دیکھکر حضور انورؐ کی غلامی میں داخل ہوگئے۔ اور حضور انورؐ نے اُن کے دل میں تیری محبت کی آگ روشن کر دی۔ چنانچہ ان بزرگوں نے اس آگ کی بدولت ایک دنیا کو اسلام کا گرویدہ بنا دیا۔ لیکن ہم بھی تو انہی مسلمانوں کی اولاد ہیں، پھر ہمارے اندر وہ آگ کیوں سرد ہوگئی ہے؟

چوبیسواں بند:۔ اب مسلمانوں میں عشق رسولؐ کا وہ جذبہ نظر نہیں آتا۔ اب مسلمان، اسلام پر دیوانہ وار نثار نہیں ہوتے۔ اب مسلمانوں کو اسلام سے وہ محبت باقی نہیں رہی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اب نہ ہمارے اندر حوصلہ ہے نہ ہمت ہے۔ آخر یہ بات کیا ہے؟ کاش تو پھر ہم پر ایک نگاہ کرم کرے، اور پھر ہماری محفل میں تشریف فرما ہو!

پچیسواں بند:۔ اے خدا! آج یہ حالت ہے کہ اغیار، عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں، دنیا کی نعمتوں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ اس کی محفل عیش سے بہت دور، سمٹے سمٹائے، کچھ فاقہ مست مسلمان بھی بیٹھے ہیں، اور تیری نگاہ کرم کے منتظر ہیں۔ اے خدا! تو ہم پر اپنا فضل نازل کر! اور ہمارے دلوں میں پھر اپنی محبت کی آگ روشن کر دے۔

چھبیسواں بند:۔ اے خدا! مسلمان قوم اپنی غلطی پر نادم ہے۔ اب پھر تیری طرف جھک رہی ہے۔ اگرچہ قوم "بے پر" اور بے زر ہے لیکن اس میں "پرواز"

یعنی ترقی کرنے کا جذبہ موجود ہے۔ قوم (باغ) کے ہر فرد (غنچہ) کے دل میں عشق رسولؐ کا جذبہ کارفرما ہے۔ بس تیری ایک نگاہ کرم کی دیر ہے۔ مسلمان پھر دنیا پر غالب آسکتے ہیں۔ مسلمان پھر تیری راہ میں سر کٹانے کے لئے تیار ہو سکتے ہیں۔ پوری قوم (طور) تیری راہ میں سرفروشی کے لئے آمادہ ہے۔

ستائیسواں بند:۔ اے خدا! ہماری مصیبتوں کو دور کردے! ہمیں، جو کہ اسوقت بہت مفلس اور حقیر ہیں، پھر سلیمان کا ہم مرتبہ بنادے! ہمارے دلوں میں عشق رسولؐ کی آگ بھڑکا دے۔ ہم ہندی مسلمانوں کو جو نام کے مسلمان ہیں، سچا مسلمان بنا دے۔

نوٹ:۔ واضح ہو کہ ہند کے دیر نشینوں سے ہندو یا بت پرست مراد نہیں ہیں، بلکہ خود وہ مسلمان مراد ہیں، جو عملی اعتبار سے "ہندو" یا بُت پرست ہوگئے ہیں۔ علامہ اقبالؔ نے ہمیشہ اپنی گفتگو میں یہی خیال ظاہر کیا، کہ اگر ہندستان کے دس کروڑ مسلمان، حقیقی معنوں میں مسلمان بنجائیں تو ساری دنیا کو فتح کر سکتے ہیں ۱۲

اے خدا! آج ہماری یہ کیفیت ہے کہ ہمارے دل حسرتوں کے خزانے بن گئے ہیں، اور اُن سے خون (مایوسی)، کی نہریں جاری ہیں۔ یعنی ہم سراپا حسرت ہیں۔ اور ہمارے سینے میں سیکڑوں نشتر چُبھے ہوئے ہیں۔ اور اُن سے نالہ و فریاد کی صدائیں نکل رہی ہیں۔ یہاں شکوہ ختم ہو جاتا ہے۔

اٹھائیسواں بند:۔ اب شاعر اپنے دل سے باتیں کرتا ہے کہ افسوس! مسلمانوں نے خود غیروں کو، قوم کی کمزوریوں سے آگاہ کر دیا۔ میر جعفر اور میر صادق نے مسلمان ہو کر، اسلام کو ضعف پہونچایا! ان غداروں، اور منافقوں کی بدولت، چمن برباد ہوگیا، سلطنت ختم ہوگئی۔ قوم غلام بنگئی

اور اسلام کے شیدائی (۱۸۵۷ء میں)، ایک ایک کرکے قوم پر نثار ہوگئے۔ (زمزمہ پردازانِ چمن ڈالیوں سے اڑ گئے) بس سارے باغ میں ایک بلبل (اقبالؔ کی ذات) رہ گئی ہے جو نغمہ پردازی کر رہی ہے (قوم کو اُبھار رہی ہے) اور اسکے سینہ میں ابھی تک جذبات کی شدت موجود ہے۔

نوٹ:۔ واضح ہو کہ یوں تو ساری نظم میں رمز اور کنایہ کی فراوانی ہے لیکن اِن آخری چار بندوں میں تو ساری گفتگو رمز اور کنایہ ہی کے پردوں میں کی ہے۔ طلبہ کو واضح ہو کہ آئندہ اشعار میں، کسی لفظ کے لغوی معنی مراد نہیں ہیں۔

انتیسواں بند:۔ اگرچہ قوم کے اکثر رہنماؤں نے خدمت قوم کے بجائے "خدمت سرکار" کو اپنا شعار بنا لیا۔ (قمریاں شاخِ صنوبر سے گریزاں ہوگئیں) اور لیڈروں کی اس خود غرضی اور ضمیر فروشی کا نتیجہ یہ نکلا کہ قوم کے افراد تباہ ہوگئے۔ (پھول کی پتیاں جھڑ کر پریشاں ہوگئیں) مسلمانوں کی تہذیب اور معاشرت سب ختم ہوگئی۔ (باغ کی پرانی روشیں ویراں ہوگئیں)

نوٹ:۔ واضح ہو کہ لفظ "روش" کے دو معنی ہیں (۱) وہ خوبصورت مگر تنگ راستہ جو باغ میں گلگشت کے لئے بنایا جاتا ہے۔ اور اسکے کنارے کنارے حسین پھول لگائے جاتے ہیں (۲) روش بمعنی طور، طریقہ، انداز، جو کسی قوم کی خصوصیات کو واضح کرے۔ یہ لفظ یہاں بہت موزوں ہے۔ میں شائقین کلام اقبالؔ سے معذرت خواہ ہوں کہ بخوف طوالت اس انداز سے پوری کتاب کی شرح نہیں لکھ سکتا۔ ۱۲

باز آمدم بر سر مطلب۔ مسلمانوں کے شعائر ملّی سب ختم ہوگئے۔ اور رفتہ رفتہ مسلمان علوم و فنون سے بے بہرہ ہوگئے۔ (ڈالیاں، پیرہن سے عریاں ہوگئیں) اسکے باوجود اقبالؔ نے اپنی روش نہیں بدلی۔ وہ برابر قوم کو ترقی کا پیغام دیتا رہا۔

کاش قوم اسکے کلام کا مطالعہ کرتی، اور اسکے کلام کو سمجھتی!

ع کاش گلشن میں سمجھتا کوئی فریاد اُس کی!

تیسواں بند:۔ چونکہ قوم مردہ ہو چکی ہے، یعنی احساس ہی سے عاری ہو چکی ہے اسلئے نہ جینے میں لطف ہے، نہ مرنے میں کوئی مزہ ہے۔ بس دن رات خون جگر پیتا ہوں۔ اور قوم کی بیکسی پر نوحہ خوانی کرتا رہتا ہوں۔ میرے سینہ میں سیکڑوں جذبات اور صدہا خیالات ہیں، جو ظہور کے لئے بیتاب ہیں۔ لیکن افسوس! قوم میں ان کے قدرداں ہی موجود نہیں۔ اگر قوم کے دل میں ملت کا درد ہوتا، تو وہ کسی دردمند کے جذبات کو سمجھ سکتی تھی ع قدر گوہر شاہ داند یا بداند گوہری۔

اکتیسواں بند:۔ اے خدا! میں تجھ سے دعا کرتا ہوں کہ میرے کلام میں ایسی تاثیر پیدا کردے کہ مسلمانوں کے قلوب اسکے مطالعہ سے متاثر ہو سکیں۔ اور انکے اندر احساس زیاں پیدا ہو جائے۔ تاکہ وہ تجھ سے دوبارہ پیمانِ وفا باندھ سکیں۔ اور پھر اسلام اور قرآن کی محبت انکے دلوں میں موجزن ہو جائے۔ (لطیفہ)

اگر میں نے اپنا پیغام شعر کی صورت میں پیش کیا ہے تو کیا مضائقہ ہے۔ پیغام کی روح تو قرآن سے ماخوذ ہے۔ (عجمی خم ہے تو کیا، مے تو حجازی ہے مری)۔ اگر میں نے اُردو زبان میں شاعری کی ہے تو کیا ہوا؟ مضامین اور خیالات تو اسلامی ہیں۔ ع (نغمہ ہندی ہے تو کیا، لَے تو حجازی ہے مری)

نظم برصفحہ ۱۸۷

حل لغات | طوف۔ طواف کرنا، گردش کرنا، کسی کے چاروں طرف گھومنا + حریم خاکی۔ کرۂ ارض یعنی دنیا + غوغا۔ شور و غل۔ ہنگامہ + استادہ۔ کھڑا ہوا + نغمہ زن۔ گانے والا +

تبصرہ | یہ فلسفیانہ نظم، اقبالؔ کی رمزیہ شاعری کی بہترین مثال ہے۔ اس نظم کا بنیادی تصور یہ ہے کہ خدا کا جلوہ ہر شئے میں پوشیدہ ہے۔ لیکن اقبالؔ نے خدا کا لفظ کہیں استعمال نہیں کیا۔

مطلب | اے چاند! فطرت نے تجھ سے زیادہ حسین کوئی شئے پیدا نہیں کی۔ دنیا کے گرد گھومنا، تیری پرانی عادت ہے۔ اسکے بعد تخئیل کی کارفرمائی شروع ہوتی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ تیرے سینہ میں جو داغ سا نظر آتا ہے، اسکو دیکھکر میں یہ خیال کرتا ہوں کہ شاید میری طرح تو بھی کسی کا عاشق ہے، بالفاظِ دگر، ہم دونوں عاشق ہیں، اور ہمارا محبوب ایک ہی ہے۔ اور دونوں کی منزلِ مقصود بھی ایک ہی ہے۔ دونوں خدا ہی کے طالب ہیں۔

دوسرا بند:۔ اے چاند! تو خدا کو تاروں کی خاموشی میں تلاش کر رہا ہے لیکن وہ زندگی کے ہنگاموں میں پوشیدہ ہے، سرو، سبزہ، بلبل، کلی، دریا، شبنم، صحرا، کوہسار ـــ ہر جگہ اُسی کی قدرت کا جلوہ ہے، اُسی نے سرو کو باغ میں قامت عطا کی، سبزے کو زمین پر پھیلایا، بلبل کو آواز عطا کی، اور پانی کو روانی بخشی۔ ہر جگہ اور ہر شئے میں اُسی کی صفات کا ظہور ہو رہا ہے۔ مجھ میں بھی وہی ہے اور تجھ میں بھی وہی ہے۔ یہ ساری کائنات اسکی ہستی پر گواہی دے رہی ہے۔ اگر وہ نہ ہوتا، تو کچھ بھی نہ ہوتا۔

نظم برصفحہ ۱۸۸

حل لغات | پریشاں۔ اسکے دو معنی ہیں۔ لغوی معنی منتشر یا پھیلا ہوا۔ مجازی معنی وہ شخص جسے اطمینان حاصل نہ ہو۔ شعرا خوشبو کو پریشاں، اسلئے باندھتے ہیں کہ خوشبو کا قاعدہ ہے کہ وہ اِدھر اُدھر پھیل جاتی ہے + خاموش ہوگیا ہے۔

تار رباب الخ یعنی اسوقت سب لوگ سو رہے ہیں + ہے میرے آئینہ میں الخ میرے آئینہ میں ہستی کے سونے کی تصویر نظر آتی ہے ۔ یعنی رات کے وقت سب جاندار سو جاتے ہیں + چشم گرداب یعنی بھنور کی آنکھ مراد ہے بھنور + موج بیتاب سو گئی ہے یعنی رات کے وقت سمندر بھی ساکن ہو جاتا ہے، یا ہو گیا ہے + دزد ادرہ گیا تو الخ یعنی کیا وجہ ہے کہ تو نہیں سویا؟ فسوں بمعنی جادو + چونکہ پہلے زمانہ میں جادوگر، لوگوں پر جادو کرکے انہیں مدہوش کر دیا کرتے تھے، یا سلا دیتے تھے، اسلئے شاعر نے رات کو جادوگر فرض کرکے اسکے لئے "فسوں" ثابت کیا ہے + چاند کی کھیتی میں، یعنی چاندنی میں + گہر بو تا ہوں، یعنی آنسو ٹپکاتا ہوں + مانندِ سحر روتا ہوں ۔ کنایہ ہے شبنم سے + شاعر نے شبنم کو سحر کا گریہ قرار دیا ہے + عزلت بمعنی تنہائی + برق ایمن ۔ ایمن سے مراد ہے ۔ وادیٔ ایمن جہاں حضرت موسیٰؑ نے خدا کی تجلی دیکھی تھی ۔ برق ایمن سے مراد ہے تجلیاتِ انوارِ الٰہیہ + میرے سینہ پر پڑی روتی ہے ۔ یعنی میرے دل پر اسوقت (رات کی تنہائی میں) برکات خداوندی کا نزول ہو رہا ہے + روتی ہے، کنایہ ہے، انسان کی ناقدری یا غفلت سے ۔ مطلب یہ ہے کہ رات کے وقت فیضان الٰہی کا نزول ہوتا ہے ۔ لیکن انسان اُسوقت محو خواب ہوتا ہے ۔ اسلئے میں انسانوں کی غفلت پر روتا ہوں ۔ چنانچہ اگلے شعر میں شاعر نے خود اس نکتہ کی صراحت کر دی ہے ۔ کہ میری محفل، یعنی قوم مردہ ہے + صفتِ شمع لحد ۔ قبر پر جو شمع جلتی ہے، کوئی اسکو دیکھنے والا نہیں ہوتا + بڑی دور ہے منزل میری ۔ یعنی میں اپنی قوم کو بیدار کرنا چاہتا ہوں ۔ لیکن اس مقصد میں کامیابی بڑی دور ہے + عہد حاضر سے اقبال کی مراد یہ ہے کہ اس زمانہ میں لوگوں کے دل روحانیت سے محروم ہو چکے ہیں ۔ موجودہ زمانہ، چونکہ مادہ پرستی کا زمانہ ہے، اسلئے یہ عہد، میری قوم کے مزاج کے مطابق نہیں ہے +

تبصرہ | یہ بھی فلسفیانہ نظم ہے ۔ اور اس میں بھی اقبالؔ نے رمز و کنایہ سے کام لیا ہے ۔ بنیادی تصور یہ ہے کہ رات کا وقت ہے ۔ ساری دنیا سو رہی ہے لیکن میں جاگ رہا ہوں ۔ کیوں؟ اسلئے کہ رات کا وقت ہے ۔ برکاتِ خداوندی کا نزول ہوتا ہے، لیکن افسوس کہ میری قوم کے افراد اسوقت سو رہے ہیں اور فیضان سماوی سے محروم ہیں ۔

مطلب | رات نے شاعر سے دریافت کیا کہ تو اسوقت، جبکہ ساری دنیا سو رہی ہے گل کی طرح خاموش اور خوشبو کی طرح پریشان کیوں پھر رہا ہے؟ شاید تو تاروں کے حسن سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے، یا چاندنی سے مسرت حاصل کرنے کا آرزومند ہے، یا تو کوئی آسمانی مخلوق ہے، اور کسی وجہ سے آسمان کو چھوڑ کر دنیا میں آگیا ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ تو دنیا کا باشندہ تو معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ دنیا کے لوگ تو اسوقت سب سو رہے ہیں ۔ بلکہ انسانوں کا تو ذکر ہی کیا ہے، اسوقت تو دریا بھی ساکن ہے ۔ بلکہ ساری کائنات ساکن ہے لیکن تو سکون سے ناآشنا ہے، کیا بات ہے کہ میرا جادو تجھ پر نہ چل سکا؟

شاعر جواب دیتا ہے کہ اے رات! بہرحال تو رات ہے، تو میرے دردِ دل کو کیا سمجھ سکتی ہے؟ آہ! اس وسیع دنیا میں کوئی میرا ہمدم، یا ہمراز نہیں ۔ میں اپنا دکھڑا کسے سناؤں؟ اور اپنی سوزشِ قلبی کا نظارہ کسے دکھاؤں؟ اسوقت آسمانی برکات کا نزول ہو رہا ہے ۔ لیکن قوم تو سو رہی ہے، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ مردہ ہے ۔ چونکہ عہد حاضر نے انسانوں کو مادہ پرستی سکھا دی ہے ۔ اور میری قوم بھی اس مرض میں مبتلا ہے، اسلئے وہ اپنے نقصان کا احساس نہیں کر سکتی ۔ میں اپنی قوم کو عشقِ رسولؐ کا پیغام دے رہا ہوں ۔ لیکن وہ اس طرف متوجہ ہی نہیں ہوتی، چونکہ میں اس پیغام محبت کو اپنے سینہ میں ضبط نہیں کر سکتا ۔ اسلئے جب بیتاب ہوتا ہوں تو مجبور ہو کر رات کی تنہائی میں گھر سے باہر نکل جاتا ہوں، تاکہ اپنا دردِ دل، تیرے چمکتے ہوئے ستاروں ہی کو سنا دوں ۔

نوٹ :- بظاہر یہ ایک نظم ہے، لیکن دراصل اقبالؔ نے قوم کی بےحسی کا مرثیہ لکھا ہے ۔

نظم بر صفحہ ۱۹۰

حل لغات | شامِ سیہ قبا ۔ چونکہ شام کے وقت سیاہی چھا جاتی ہے ۔ اسلئے شاعر نے شام کو، سیہ قبا، پہنائی ہے + لالے کے پھول مارے ۔ یعنی سورج نے افق کو سرخ کر دیا ۔ کنایہ ہے شفق سے جو غروب آفتاب کے وقت نظر آتی ہے + دھوپ کا زیور کنایہ ہے سرخی سے + محمل میں خامشی کے الخ رات کی لیلیٰ خاموشی کے محمل میں بیٹھکر آئی، یعنی رات ہو گئی اور خاموشی چھا گئی + چمکے عروس شب کے الخ یعنی تارے چمکنے لگے + محوِ فلک فروزی الخ یعنی تارے آسمان کو چمکانے میں مصروف تھے + جاگ اٹھیں سونے والے ۔ یعنی انسان خواب غفلت سے بیدار ہو جائے + آئینے قسمتوں کے الخ بہت بلیغ مصرع ہے ۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ دنیا والے چونکہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری قسمت ستاروں سے وابستہ ہے ۔ یا ستارے ہماری قسمت پر اثر انداز ہوتے ہیں ۔ اسلئے امید واثق ہے کہ وہ تمہارے پیغام (سرود) کو بڑے غور سے سنینگے + وسعت تھی آسمان کی معمور الخ ۔ یعنی فرشتوں نے یہ گیت جو تیسرے بند میں درج ہے، گانا شروع کیا + حسنِ ازل ۔ خدا کی قدرت کا جلوہ + شبنم کی آرسی ۔ چونکہ شبنم کے قطرہ میں گلاب کا عکس نظر آتا ہے، اسلئے شاعر نے قطرۂ شبنم کو آرسی باندھا ہے + آئینِ نو ۔ نیا قانون آئینِ نو سے ڈرنا ۔ اپنی قومی زندگی میں تبدیلی سے ڈرنا + طرز کہن سے مراد ہے اجتماعی زندگی کا پرانا طریقہ + اڑنا یعنی قائم رہنا + تیز گام بمعنی تیز چلنے والا + رواروی بمعنی ہنگامہ، انقلاب یا حرکت + جذب باہمی سے بظاہر کشش کا قانون مراد ہے لیکن دراصل اس سے مراد ہے باہمی الفت +

تبصرہ | اس دلکش تمثیلی نظم میں، اقبالؔ نے تاروں کی زبان سے قومی زندگی کا راز فاش کیا ہے ۔ یعنی یہ حقیقت واضح کی ہے کہ مسلمان اگر بحیثیت قوم، ترقی کرنا چاہتے ہیں تو تاروں کی زندگی سے سبق حاصل کریں ۔ انکا انتظام، جذب باہمی سے قائم ہے ۔ اسی طرح مسلمان بھی الفت باہمی کی بدولت ترقی کر سکتے ہیں ۔

مطلب | پہلا بند :- جب سورج غروب ہو گیا تو رات ہو گئی اور آسمان پر تارے نکل آئے ۔ ایک فرشتے نے تاروں سے کہا :-

دوسرا بند :- اے تارو! تم سب گردوں نشیں (معزز) ہو! اسوقت کوئی ایسا نغمہ چھیڑو کہ زمین کے باشندے بیدار ہو جائیں ۔ چونکہ وہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تم انکی قسمتوں پر اثر انداز ہو، اسلئے مجھے توقع ہے کہ وہ ضرور تمہارے پیغام (نغمہ) کو سنیں گے ۔ فرشتہ کی یہ بات سنکر، ستاروں نے یہ نغمہ شروع کیا ۔

تیسرا بند :- تاروں کی چمک دمک میں خدا کی قدرت کا جلوہ نظر آتا ہے، بلکہ "خدا کا عکس" تاروں میں اسی طرح نظر آتا ہے، جس طرح گلاب کا عکس، شبنم کی آرسی میں ۔ جو "قوم لکیر کی فقیر" بنی رہتی ہے اور حالاتِ حاضرہ سے مطابقت نہیں کرتی ۔ وقت کے تقاضوں کو نہیں پہچانتی، وہ ترقی نہیں کر سکتی "زمانہ" ہر وقت آگے بڑھتا رہتا ہے ۔ جو قومیں زمانہ کا ساتھ نہیں دیتیں اور اپنی جگہ بےحس پڑی رہتی ہیں، ان کے اس جمود کا نتیجہ اسکے سوا اور کچھ نہیں نکلتا کہ دوسری قومیں ان کو کچلتی ہوئی آگے بڑھ جاتی ہیں ۔

جو ستارے اسوقت ہماری نظروں سے اوجھل ہیں، ہم ان کو بھی اپنی

برادری (جماعت) میں شامل سمجھتے ہیں۔ افسوس اس نکتہ کو زمین والے اب تک نہیں سمجھے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ مسلمانوں کو لازم ہے کہ صرف انہی مسلمانوں کو اپنا بھائی نہ سمجھیں جو ان کی نظروں کے سامنے ہیں (ان کے شہر میں رہتے ہیں) بلکہ تمام دنیا کے مسلمانوں کو اپنا بھائی سمجھیں (جو دوسرے ملکوں میں رہتے ہیں) مسلمانوں کا قومی نظام صرف اس صورت میں قائم رہ سکتا ہے، کہ وہ "جذب باہمی" کے اصول پر عمل کریں یعنی آپس میں سب مسلمان (از ہندوستان تا مراکش) ایک دوسرے سے محبت کریں اور ہر مسلمان دوسرے مسلمان کو اپنا بھائی سمجھے + خلاصۂ کلام یہ کہ اس نظم میں اقبال نے مسلمانوں کو تنظیم اور ربط و ضبط باہمی کا پیغام دیا ہے۔

نظم بر صـ ۱۹۲

حلّ لغات | تخیل۔ اس کے لغوی معنی ہیں خیال میں آنا۔ منطقی اصطلاح میں اس کی تعریف یہ ہے کہ جب نفس مُدرِک ان صور جزئیہ کا ادراک کرتا ہے جو بذریعہ حواس خمسہ ظاہری، خزانۂ خیال میں جمع ہو جاتی ہیں تو اس کیفیت اور ادراک کو تخیل کہتے ہیں۔ یہاں اس شعر میں تخیل سے اس کے عرفی معنی مراد ہیں یعنی قوتِ متخیلہ جس کی بدولت ایک شخص گھر بیٹھے "عالم خیال" میں ساری دنیا کی سیر کر سکتا ہے بلکہ بقول اقبال، آسمان پر بھی جا سکتا ہے۔ مثلاً ایک شخص لاہور میں بیٹھا یہ تصور کر سکتا ہے کہ اس وقت مدینہ میں حضور انور صلعم کے مواجہہ شریف میں بیٹھا ہوا حالِ دل بیان کر رہا ہوں، یا ماسکو میں اسٹالین کے ساتھ چائے پی رہا ہوں +
حلقۂ صبح و شام سے نکلا یعنی اس دنیا کی حدود و قیود سے آزاد ہو گیا

اور جنت میں پہنچ گیا + ارم سے یہاں جنت مراد ہے + خاتم آرزوئے دیدہ و گوش۔ کان اور آنکھ جس قدر آرزوئیں کر سکتے ہیں سب کی ختم کرنے والی۔ خاتم کو دو طرح پڑھ سکتے ہیں (۱) خاتِم بمعنی ختم کرنے والا (۲) خاتَم بمعنی انگوٹھی یا مہر۔ مصرع کا مطلب یہ ہے کہ انسان جس قدر آرزوئیں کر سکتا ہے ان سب کی تکمیل کا سامان جنت میں موجود ہے + طوبیٰ۔ جنت میں ایک درخت ہے + جلوہ فروش یعنی حوریں، آزادی کے ساتھ اپنا حسن و جمال دکھا رہی تھیں + ساقیانِ جمیل یعنی خوبصورت لڑکے جو جنت میں شراب پلائیں گے جنکو اصطلاح میں "غلمان" کہتے ہیں + ایک تاریک خانہ۔ کنایہ ہے جہنم سے + طالع قیس و گیسوئے لیلیٰ۔ یعنی وہ جگہ قیس (مجنوں) کے نصیبہ یا قسمت کی طرح اور لیلیٰ کی زلفوں کی طرح سیاہ تھی + دوش بدوش۔ کاندھے سے کاندھا ملائے ہوئے یعنی مدمقابل + کرۂ زمہریر سے وہ کرہ مراد ہے جو کرۂ ہوا کے وسط میں واقع ہے۔ اس لفظ کے لغوی معنی ہیں سرمائے شدید یا سخت سردی + سروش بمعنی فرشتہ + تہی آغوش بمعنی خالی + مستعار۔ عاریت سے نکلا ہے۔ مانگی ہوئی چیز + لرزاں کانپنے والا + عبرت کوش۔ نصیحت حاصل کرنے والا + انگار۔ اگر اس کو پنجابی زبان کا لفظ مانا جائے تو مراد ہے انگارے یعنی دہکتے ہوئے کوئلے۔ اور اگر فارسی لفظ قرار دیا جائے تو اس کے معنی ہیں خیالات، تصورات یا پندار +

تبصرہ بڑی دلکش اور مؤثر نظم ہے۔ بنیادی تصور یہ ہے کہ جہنم، دراصل تاریک اور خاموش اور سرد ہے اس کی گرمی یا اس کے شعلے ذاتی نہیں ہیں بلکہ جو لوگ اپنی بداعمالیوں (رشوت ستانی، خیانت، بلیک مارکیٹ نفع اندوزی، ذخیرہ سازی) کی بناء پر یہاں آتے ہیں وہ اپنی بداعمالیاں

اپنے ساتھ لاتے ہیں اور یہی بداعمالیاں، یہاں آکر انگاروں اور شعلوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ یعنی انسان اپنی دوزخ خود اپنے ہاتھوں سے بناتا ہے مثلاً جو زمیندار یا جاگیردار، غریب کاشتکاروں کا خون چوس چوس کر اپنی تجوریاں بھرتا ہے۔ تو دوزخ میں یہی دولت، اس کے حق میں وبالِ جان بن جائیگی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے۔

"قیامت کے دن اُن لوگوں کی جنہوں نے دنیا میں سونا، چاندی جمع کیا اور اسے اللہ کے راستہ میں خرچ نہیں کیا، پیشانیوں، پہلوؤں اور پشتوں کو، اُسی سونے چاندی سے "(جس کو گرم کر لیا جائے گا) داغا جائیگا اور فرشتے سرمایہ داروں سے کہیں گے کہ "فَذُوقُوا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُونَ" "
یعنی مزہ چکھو اُس دولت کا جسے تم نے جمع کیا تھا۔

(دیکھو سورہ توبہ آیت ۳۴-۳۵)

مطلب | شاعر کہتا ہے کہ ایک دن میں نے عالم خیال میں آسمان کی طرف پرواز شروع کی۔ وہاں کوئی شخص میرا واقف نہیں تھا۔ تارے مجھے بڑے تعجب سے دیکھتے تھے کہ یہ شخص کہاں جا رہا ہے۔ لیکن میرا سفر ایک راز تھا جس سے وہ آگاہ نہیں تھے۔ یعنی میں جہنم کی ماہیت دریافت کرنے جا رہا تھا۔

پہلے میں جنت میں گیا وہاں درختوں پر پرندے گانا گا رہے تھے، اور حوریں آزادی کی ساتھ، باغوں کی سیر کر رہی تھیں، جنتی لوگ شراب طہور پی رہے تھے۔ دور سے میں نے ایک نہایت سیاہ مکان دیکھا۔ لیلیٰ کی زلفوں سے بھی زیادہ سیاہ۔ سیاہی اور تاریکی کے علاوہ وہاں سردی اس قدر شدید تھی کہ اس کے سامنے کرۂ زمہریر کی بھی کوئی حقیقت نہیں تھی۔

میں نے فرشتوں سے پوچھا کہ یہ کیا جگہ ہے؟
انہوں نے کہا کہ یہ جہنم ہے۔ آگ اور روشنی دونوں سے محروم ہے اس کے شعلے ذاتی نہیں ہیں، بلکہ جہنمی لوگ اپنے شعلے (انگارے) دنیا ہی سے اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ مثلاً ان دولتمند لوگوں کے حق میں (جو اپنی دولت راہ خدا میں خرچ نہیں کرتے) ان کی وہ دولت ہی، عذاب بن جائیگی۔ (جیسا کہ قرآنی آیت سے واضح ہے)

اگر انگارے خیالات مراد لی جائے تو یہ معنی ہوں گے کہ دوزخی لوگ اپنے خیالات اور اعمال بد، ساتھ لاتے ہیں اور یہ خیالات ہی ان کے حق میں عذاب (آگ کے شعلے) بن جاتے ہیں۔ خلاصۂ کلام یہ کہ جہنم کے شعلے ذاتی نہیں بلکہ مستعار ہوتے ہیں۔ اور یہی ہے وہ بنیادی تصور جسے اقبال ہمارے ذہن نشین کرنا چاہتے ہیں۔

نظم بر صـ ۱۹۴

حلّ لغات | عامل دو معنی ہیں (۱) عمل کرنے والا یا پابند (۲) گورنر یا حاکم یہاں پہلے معنی مراد ہیں + ارباب ریا۔ یعنی منافق لوگ جو دکھاوے کے لئے نیک کام کرتے ہیں + مصلحت آمیز۔ جس میں کوئی فائدہ پوشیدہ ہو + تملق۔ خوشامد + سراپا اعجاز۔ بہت عجیب + مدحتِ سرکار۔ انگریزوں کی تعریف و توصیف + فکرِ روشن۔ ذہنِ رسا یا قوتِ مدرکہ + اقبال نے فکر کو مذکر باندھا ہے + موجدِ آئینِ نیاز۔ یعنی تیری عقل نے غلامی کا طریقہ یا شیوہ ایجاد کیا ہے (علی گڑھ، لاہور اور پشاور کے اسلامیہ کالجوں کے انگریز پرنسپلوں نے جن کو اقبال نے خشتِ کلیسا سے تعبیر کیا ہے، مسلمان

نوجوانوں کو خوئے غلامی میں "پختہ تر" کردیا۔ درِ حکام - سرکاری افسرانِ اعلیٰ کی کوٹھیاں، جن کا طواف، مسلمان سرمایہ دار اور خطاب یافتہ یا خطاب کے امیدوار مسلمان، بڑے خلوص کے ساتھ کیا کرتے تھے + مقامِ محمود - یہ ترکیب قرآن مجید کی اس آیت سے ماخوذ ہے +

عَسٰۤی اَنْ یَّبْعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا - یقین ہے کہ آپ کا رب آپ کو مقامِ محمود عطا فرمائے گا۔ مقامِ محمود سے مراد ہے نہایت بلند اور محترم درجہ یا قربِ خداوندی +

اقبال نے بظاہر اس ترکیب کے لغوی معنی مراد لئے ہیں یعنی مسلمان حکام کے دروازوں کو اپنے حق میں بہت مفید (قابلِ تحسین مقام) سمجھتے ہیں لیکن دوسرے معنی بھی مراد ہو سکتے ہیں یعنی یہ کہ دنیا پرست مسلمان انگریزوں کی چوکھٹ کو اپنے حق میں "قربِ خداوندی" سے کم نہیں سمجھتے + پالیسی انگریزی زبان کا لفظ ہے Policy یعنی طریق کار یا دنیا میں ترقی حاصل کرنے کا طریقہ۔ واضح ہو کہ پالیسی موجودہ سیاسیات کی اصطلاح ہے اور اس میں عیاری اور فریب کا مفہوم پوشیدہ ہے۔ چنانچہ آج کل ووٹوں کے امیدوار کو خواہ وہ "صالح" ہو یا غیر صالح، بڑی پالیسی سے کام لینا پڑتا ہے ورنہ کامیابی حاصل ہونی دشوار ہے + پیچیدہ تراز زلفِ ایاز - بڑا بلیغ مصرع ہے۔ زلف کی خوبی یا حسن، اس کی پیچیدگی میں منحصر ہے، اس لئے ایاز کا لفظ لائے ہیں جس سے اس جگہ وہ شخص مراد نہیں ہے، جو سلطان محمود کا غلام تھا، بلکہ معشوق مراد ہے۔ یعنی آجکل کے لیڈروں کی پالیسی، معشوقوں کی زلفوں سے بھی زیادہ پیچیدہ ہوتی ہے پیچیدگی سے وہی منافقت مراد ہے کہ ظاہر کچھ باطن کچھ +

سہ اس میں کیا شک ہے کہ محکم ہے ابلیسی نظام ؛ پختہ تر جس سے ہوئے خوئے غلامی میں غلام

پردۂ خدمتِ دیں میں ہوسِ جاہ کا راز - یعنی بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ وہ ظاہر تو یہ کرتے ہیں کہ ہم اسلام یا مسلمانوں کی خدمت کر رہے ہیں۔ لیکن دراصل وہ اپنی ترقی کے لئے سارے جتن کرتے ہیں۔ مثلاً آج کل پاکستان میں ایک جماعت ہے جس کے ارکان ظاہر تو یہ کرتے ہیں کہ ہم اس ملک میں اسلامی حکومت قائم کرنی چاہتے ہیں لیکن چنانچہ آج کل یہ جماعت ووٹوں کی دھن میں پھرکی بنی ہوئی ہے + دست پرور - یعنی تو اخباروں کے مالکوں کو بھاری رقمیں دیتا رہتا ہے۔ تاکہ وہ تیرا پروپیگنڈہ کرتے رہیں + تشہیر کا ساز چھیڑنا یعنی پبلسٹی کرنا۔ شرابِ شیراز یعنی تیرے کلام میں حافظ شیرازی کی سی دلکشی پائی جاتی ہے +

تیری مینائے سخن میں الخ یعنی تیری شاعری کی بوتل میں شیراز کی شراب بھری ہوئی ہے + شریکِ تگ و تاز یعنی لیڈری کے لئے دوڑ دھوپ کر + غمِ صیاد نہیں یعنی حکومت کی خفگی یا عتاب کا اندیشہ نہیں (کیونکہ تو درِ حکام کو مقامِ محمود سمجھتا ہے) پر و بال بھی ہیں یعنی لیڈری کے اوصاف موجود ہیں + دماغِ پرواز - دنیاوی ترقی کی آرزو + عاقبت منزلِ ما وادیٔ خاموشان است الخ

چونکہ انسانی زندگی کا انجام بہرصورت قبرستان ہے تو پھر انسان کیوں اس چندروزہ زندگی کا بہترین طریق پر استعمال نہ کرے (بار بار تو آنا نہیں ہے) پس لازم ہے کہ اٹھ اور ساری دنیا میں اپنے نام کا ڈنکا بجا دے +

تبصرہ دراصل اس دلکش نظم میں اقبال نے اپنے زمانے کے لیڈروں کی اصلی تصویر دکھائی ہے۔ یہ نظم طنزیہ شاعری کی بہترین مثال ہے۔

مطلب کہتے ہیں کہ ایک دن میں نے اقبال سے یہ کہا کہ لیڈری کے لئے جن صفات کا پایا جانا ضروری ہے وہ سب تجھ میں موجود ہیں پھر تو اس نعمتِ عظمیٰ کے لئے جدوجہد کیوں نہیں کرتا؟ اب شاعر ان صفات کی صراحت کرتا ہے۔

(۱) پہلی خوبی تجھ میں یہ ہے کہ تجھے شریعتِ اسلامیہ سے کوئی سروکار نہیں ہے۔

(۲) تو بھی دوسرے لیڈروں کی طرح ریاکار ہے بلکہ اس فنِ لطیف میں کامل ہے۔ مثلاً تیرے دل میں انگریز کی محبت بسی ہوئی ہے لیکن تو زبان سے عشقِ رسول ﷺ کا اظہار کرتا ہے۔

(۳) تیسری خوبی یہ ہے کہ تو ہمیشہ "دروغِ مصلحت آمیز" پر عمل کرتا ہے۔ یعنی تو سو فی صدی جھوٹ بولتا ہے لیکن جب قوم اس کی وجہ دریافت کرتی ہے تو اسکی پوشیدہ مصلحتیں بیان کر دیتا ہے مثلاً یہ کہ اگر میں سچ بولتا تو لاٹ صاحب ناراض ہو جاتے۔ کالج کی گرانٹ بند ہو جاتی۔ وہ آئندہ کسی اجلاس میں شریک نہ ہوتے۔ کسی مسلمان کو ڈسٹرکٹ بورڈ میں نامزد نہ فرماتے وغیرہ وغیرہ۔

(۴) چوتھی خوبی یہ ہے کہ تو خوشامد اور چاپلوسی کے فن میں طاق ہے بلکہ تیرے ایجاد کردہ طریقِ خوشامد میں تو معجزہ کا رنگ پایا جاتا ہے۔ کوئی شخص اس فن میں تیرا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

(۵) تو ہمیشہ اپنی تقریر کو سرکارِ (برطانیہ) کی مدحت و ستائش پر ختم کرتا ہے بلکہ بعض اوقات جب تجھے جنرل نکلسن کے ساتھ آبائی تعلقات کا خیال آجاتا ہے تو بھری مجلس میں تو پکار اٹھتا ہے کہ "انگریزوں سے غداری"

اللہ اور اس کے رسول سے غداری کے مترادف ہے۔ ع

"پھروں جو اس سے تو مجھ سے مرا خدا پھر جائے"

(۶) تو حکام کی کوٹھیوں کے طواف کو اپنے لئے باعثِ سعادتِ اُخروی سمجھتا ہے۔ اور تیری حکمتِ عملی بھی ایسی پیچیدہ ہے کہ کسی کی سمجھ میں نہیں آتی کہ دراصل تیرا مقصد کیا ہے ع

باغباں بھی خوش رہے راضی رہے صیاد بھی

(۷) ساتویں خوبی تجھ میں یہ ہے کہ تو دوسروں کی طرح، اوّل درجہ کا مکار ہے۔ اور پبلک کو فریب دینے کے فن میں ماہر ہے۔ یعنی تو دنیا حاصل کرنے کے لئے مذہب فروشی کر سکتا ہے، اور دین کی خدمت کے پردے میں دنیاوی عزت حاصل کرنے کے ارادوں اور خواہشوں کو پوشیدہ کر سکتا ہے۔

(۸) آٹھویں خوبی تجھ میں یہ ہے کہ تو عید بقر عید کو شاہی مسجد میں نماز پڑھنے بھی چلا جاتا ہے۔ اور اپنے ذاتی رسوخ کی بنا پر پہلی صف میں جگہ بھی حاصل کر لیتا ہے۔ نیز یہ کہ جب تو وعظ سنتا ہے تو تیرا رومال بھی اشکوں سے تر ہو جاتا ہے۔

(۹) نویں خوبی یہ ہے کہ تو ملک کے تمام مقتدر اخباروں کی بھی "خدمت" کرتا ہے۔ اور وہ بھی اپنے کالموں میں تیرا "ذکرِ خیر" کرتے رہتے ہیں

(۱۰) دسویں اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ تو شاعر بھی ہے اور تیرے کلام میں حافظ کی طرح بڑی دلکشی ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ گرفتاری کا تجھے خوف نہیں (ملاحظہ ہو خوبی ۵) اور معاش کی تجھے فکر نہیں - (دیکھو خوبی ۲) پھر کیا وجہ ہے کہ تو لیڈری

کے لئے کوشش نہیں کرتا۔ اٹھ اور ان صفاتِ عالیہ سے فائدہ حاصل کر، کیا تونے اس نکتہ پر غور نہیں کیا کہ جب زندگی کا انجام، فنا ہے تو لازم ہے کہ انسان اس چند روزہ زندگی کو حتی المقدور عزت اور راحت کے ساتھ بسر کرے۔ مرنے کے بعد تو گوشۂ گمنامی میں چلا ہی جانا ہے۔ کم از کم اس زندگی میں تو کوئی ہنگامہ برپا کرلے۔

نظم برص ۱۹۵

حلّ لغات | شراب حقیقت سے حقیقت مراد ہے۔ حقیقت کے تین معنی ہیں (۱) عرفی معنی سچی بات مثلاً حقیقت یہ ہے کہ انسان فانی ہے (۲) اصطلاحی معنی (جبکہ اسے فلسفہ کی اصطلاح قرار دیا جاتا ہے) اصل کائنات (خدا پرستوں کے نزدیک خدا، اور مادہ پرستوں کے نزدیک مادہ) واضح ہو کر فلسفہ میں حقیقت ہی سے بحث کی جاتی ہے اور تمام بحثیں اسی اصل اصول سے نکلتی ہیں۔ جنکی تفصیل اس شرح میں کرنا ناممکن ہے۔ (۳) لغوی معنی، وہ شئی جو ہمیشہ قائم رہے، اس لحاظ سے باطل کی ضد ہے۔

ہندوستان کا جام، حقیقت کی شراب سے لبریز ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان کے حکماء نے "حقیقت" کی تحقیق میں بڑی معرکۃ الآراء بحثیں کی ہیں۔

خطۂ مغرب سے یورپ مراد ہے۔ واضح ہو کہ یورپ کے حکماء نے ہندوستان کے فلسفہ کے مختلف مدارس سے جن کو اصطلاح میں "درشن" کہتے ہیں، بہت کچھ استفادہ کیا ہے اور یہاں کے قدیم حکماء کی منطقی موشگافیوں

کا اعتراف کیا ہے۔ میرے خیال میں حقیقت سے متعلق بحثوں میں ہندی حکماء نے بڑی بالغ نظری کا ثبوت دیا ہے۔ چنانچہ یورپ کے حکماء نے ابھی تک کوئی ایسا فلسفیانہ نظریہ پیش نہیں کیا جسے ہندی حکماء نے کسی نہ کسی رنگ میں، قبل ازیں پیش نہ کر دیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال نے، جو خود بھی ایک بلند پایہ فلسفی تھے اور بقول ڈاکٹر آرنلڈ، مشرق اور مغرب کے تمام فلسفیانہ مدارسِ فکر پر عمیق نظر رکھتے تھے، ہندی فلسفہ کی عظمت کا اس شعر میں اعتراف کیا ہے + رام ہند۔ رام میں صنعت ایہام ہے۔ کیونکہ اس کے دو معنی ہیں (۱) رام کو سنسکرت کا لفظ قرار دیا جائے تو یہ ایک شخص کا نام ہے (۲) رام کو فارسی لفظ قرار دیا جائے تو اس کے معنی ہیں مطیع، فرمانبردار۔ یعنی یورپ کے سارے حکماء، ہندی فلسفہ کے مداح ہیں + فکر فلک رس۔ آسمان تک پہنچنے والی قوتِ مفکرہ۔ واضح ہو کہ فکر وہ قوت ہے جس کی بدولت انسان فلسفیانہ اور منطقی مسائل میں غور وخوض کر سکتا ہے + ملک سرشت۔ ایسے نیک لوگ جو فرشتوں کی طرح پاکیزہ عادات رکھتے تھے + اہل نظر۔ ارباب عقل + اعجاز: معجزہ + رام کو اقبال نے چراغ ہدایت اس لئے کہا ہے کہ انھوں نے اہل ہند کو خدا پرستی سکھائی + دھنی تھا یعنی شمشیر زنی میں ماہر تھا + فرد۔ یعنی یکتا +

تبصرہ اقبال نے اس نظم میں شری رامچندر جی کی خدمت میں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ جن کو تمام سناتن دھرمی ہندو، خدا کا اوتار، اور شری کرشن جی سے بھی زیادہ واجب الاحترام سمجھتے ہیں۔ اسی لئے اقبال نے یہ لکھا ہے کہ رام کے وجود پر ہندوستان کو ناز ہے۔ ان کی شخصیت میں بہت سی خوبیاں جمع تھیں مثلاً وہ بہت بہادر تھے، پاک

طینت تھے اور اپنے باپ کے بہت فرمانبردار تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے باپ کے کہنے سے چودہ سال کے لئے "بن باس" اختیار کیا۔ تمام تکالیف کو بخوشی برداشت کیا۔ اور دنیا کے سامنے اطاعتِ والدین کا قابل قدر نمونہ پیش کیا +

نظم برص ۱۹۶

حلّ لغات | پتہ کی بات ایسی بات جس میں کوئی نکتہ پوشیدہ ہو + ہنگامہ آفریں نہیں الخ یعنی جب چلتی ہے تو شور نہیں کرتی + پاشکستہ۔ لغوی معنی وہ جس کا پاؤں ٹوٹ گیا ہو + مراد ہے ایک جگہ قائم یا ساکن + نکہت یعنی خوشبو + مینا یعنی بوتل + شورشِ قلقل۔ جب بوتل سے شراب یا عرق انڈیلتے ہیں تو آواز پیدا ہوتی ہے جسے قلقل کہتے ہیں + جامِ خرامِ آشنا۔ جام کو خرام آشنا اس لئے باندھا کہ وہ مدام گردش میں رہتا ہے یعنی دورِ شراب چلتا رہتا ہے + شاعر کے فکر کو الخ یعنی شاعر چونکہ خاموش رہتا ہے، اس لئے اس کی فکر بہت تیزی کے ساتھ پرواز کرتی ہے + سرمایہ دارِ گرمیِ آوازِ خامشی، یہ بہت بلیغ مصرع ہے اور اقبال کے مخصوص اسلوب بیان کا حامل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شاعر کی خاموشی میں وہی تاثیر پائی جاتی ہے جو دوسروں کی آواز (گویائی) میں ہوتی ہے۔ لفظ "سرمایہ دار" مجازی معنی میں مستعمل ہے۔ مراد یہ ہے کہ شاعر کی خاموشی، گویائی کی دولت سے مالامال ہوتی ہے یعنی اپنے اندر گویائی سے بڑھکر طاقت رکھتی ہے +

تبصرہ | یہ نظم اقبال کی تخیل کی عمدہ مثال ہے جس کی بدولت وہ معمولی واقعات سے بھی فلسفیانہ نکات پیدا کر لیا کرتے تھے۔ اس

نظم کا قصہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ اقبال اپنے دوست نواب سر ذوالفقار علی خاں صاحب مرحوم کی موٹر میں سر جوگندر سنگھ اور مرزا جلال الدین صاحب بیرسٹر کے ساتھ سیر کو گئے تھے۔ اُس زمانہ میں موٹریں عام طور سے چلنے میں بہت شور کرتی تھیں لیکن نواب صاحب کی موٹر چونکہ بہت قیمتی تھی، اس لئے اس میں یہ نقص نہیں تھا۔ (یہ موٹر جس کا نام TALBOT تھا نواب صاحب نے ۱۹۱۱ء میں منگوائی تھی) چنانچہ سر جوگندر سنگھ نے متعجب ہو کر علامہ اقبال سے یہ بات کہی کہ "نواب صاحب کی یہ موٹر کس قدر خاموش ہے" یہ فقرہ سن کر اقبال کا ذہنِ رسا، فوراً اسطرف منتقل ہو گیا کہ اس موٹر پر کیا منحصر ہے، جادۂ حیات میں ہر تیز پا خاموش ہے۔ چنانچہ دوسرے دن اقبال نے اس معمولی سی بات پر یہ نظم سپرد قلم کر دی۔

نواب سر ذوالفقار علی خان صاحب مرحوم کا آبائی وطن "مالیر کوٹلہ" تھا، اور وہاں کے حکمران خاندان سے تعلق تھا۔ ۱۸۷۵ء میں پیدا ہوئے ۱۸۹۳ء میں گورنمنٹ کالج سے بی اے پاس کیا۔ ۱۸۹۶ء سے ۱۸۹۹ء تک کیمبرج اور پیرس میں رہے۔ ۱۹۱۱ء میں سی ایس آئی اور ۱۹۱۹ء میں سر کا خطاب ملا۔ ۱۹۲۰ء میں کونسل آف اسٹیٹ کے رکن منتخب ہوئے اور ۱۹۲۶ء میں مشرقی پنجاب سے مرکزی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ۲۶ مئی ۱۹۳۳ء کو بمقام دہرہ دون وفات پائی۔

نواب صاحب مسلمانوں کے سچے ہمدرد اور علم و ادب کے شیدائی تھے۔ جب علامہ اقبال مرحوم ۱۹۰۸ء میں یورپ سے واپس آئے تو شیخ سر عبدالقادر مرحوم نے ان کو، نواب صاحب سے متعارف کیا۔ چونکہ نواب صاحب علم دوست تھے اس لئے بہت جلد دونوں میں دوستانہ

تعلقات قائم ہوگئے۔ جب ۱۹۱۰ء میں نواب صاحب نے کوئینز روڈ پر اپنی عالی شان کوٹھی تعمیر کی تو اس کا نام "زر افشاں" اقبال ہی نے تجویز کیا تھا۔ ۱۹۲۱ء میں نواب صاحب نے اقبال کی شاعری پر انگریزی میں سب سے پہلی کتاب لکھی جس کا نام تھا "مشرق سے ایک آواز" نواب صاحب ہی کی کوشش سے اقبال کو ۱۹۲۳ء میں سر کا خطاب ملا تھا۔ اور اسمیں کوئی شک نہیں کہ اقبال کو علمی دنیا سے روشناس کرنے میں نواب صاحب کا بڑا حصہ ہے۔ چونکہ وہ اقبال کے محسن تھے۔ اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ ان کے احسانات کا تذکرہ کردوں۔

سر جوگندر سنگھ دراصل نواب صاحب کے دوست تھے اور اس زمانہ میں امرتسر میں رہتے تھے۔ لیکن وہ بھی نواب صاحب کی طرح علم و ادب کے دلدادہ تھے۔ اس لئے اکثر ان سے ملنے کے لئے لاہور آتے رہتے تھے۔ ان سے اقبال کی ملاقات نواب صاحب ہی کے یہاں ہوئی تھی۔ سکھوں میں صرف دو آدمی ایسے گذرے ہیں جو اقبال کے کلام کے شیدائی تھے۔ ایک تو یہی جوگندر سنگھ، دوسرے امراؤ سنگھ گل جو زیادہ تر فرانس میں رہا کرتے تھے، اور انہوں نے وہیں شادی بھی کرلی تھی۔ جوگندر سنگھ چونکہ انگریزی اور فارسی دونوں زبانوں میں مہارت رکھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے "اسرار خودی" پر انگریزی میں کئی قابل قدر مضامین بھی لکھے تھے۔

مطلب | جگ اندر نے جب یہ کہا کہ نواب صاحب کا موٹر کس قدر خاموش ہے تو یہ سن کر میں نے کہا کہ موٹر ہی پر کیا منحصر ہے، زندگی کے سفر میں تیز رفتاری وہی دکھاتے ہیں، جو خاموش ہیں۔ مثلاً،

گھنٹہ شور کرتا ہے، اس لئے ساکن ہے، خوشبو خاموش ہے اس لئے بہت جلد پھیل جاتی ہے۔ بوتل شور کرتی ہے اس لئے ساکن ہے، جام خاموش ہے اس لئے گردش کرتا رہتا ہے۔ یہی حال شاعر کی فکر کا ہے وہ خاموش ہے اس لئے آسمان تک پہنچ جاتی ہے۔

واضح ہو کہ یہ سب حسن تعلیل کی مثالیں ہیں، شاعر نے اپنی قوت تخیل کی بدولت یہ شاعرانہ نکتے پیدا کئے ہیں +

نظم بر صفحہ ۱۹۷

حل لغات | محروم عمل - نرگس اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرسکتی اس لئے اسے عمل سے محروم باندھا ہے + مجبور تماشا ہے یعنی باغ کا منظر دیکھنے پر مجبور ہے خواہ وہ منظر اسے پسند ہو یا نہ ہو + محروم تمنا ہے۔ یعنی صنوبر کی فطرت ہی اس قسم کی ہے کہ وہ کسی قسم کی آرزو نہیں کرسکتا + تسلیم بمعنی اطاعت + خوگر بمعنی عادی + سرگرم تقاضا ہے یعنی انسان اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے کوشش کرتا رہتا ہے + ذرّہ کنایہ ہے انسان سے + وسعت کی ہوس یعنی ترقی کی آرزو + ہیئت بمعنی شکل و صورت +

مطلب | اقبال نے اس نظم میں انسان کی وہ خصوصیت بیان کی ہے جس کی بدولت وہ کائنات کی تمام اشیاء (جمادات نباتات اور حیوانات) سے ممتاز ہے۔ وہ خصوصیت یہ ہے کہ کائنات میں ہر شے مجبور محض ہے۔ لیکن انسان کو محدود دائرے میں اختیار بھی حاصل ہے۔ انسان چونکہ دانا بینا اور توانا ہے۔ اس لئے اگر وہ چاہے تو

اس چمنستان (دنیا) میں انقلاب پیدا کرسکتا ہے۔ اقبال نے یہ تین لفظ بہت موزوں استعمال کئے ہیں اس کی تفصیل یہ ہے

(۱) انسان دانا ہے یعنی عقل رکھتا ہے۔
(۲) بینا ہے یعنی حواس خمسہ ظاہری سے علم حاصل کرسکتا ہے۔
(۳) توانا ہے یعنی اپنی خواہشات کی تکمیل کرسکتا ہے۔

نظم بر صفحہ ۱۹۸

حل لغات | تَدَبُّر - کسی امر میں غور و خوض کرنا۔ کسی بات کے سمجھنے پر اپنی تمام ذہنی قوتوں کو مبذول کرنا + گردوں سے قوم مراد ہے + ٹوٹا ہوا تارا۔ اس سے وہ فرد مراد ہے جو قوم سے جدا ہوگیا ہو + دارا۔ قدیم ایران کا مشہور بادشاہ جسے سکندر نے ۳۳۱ ق م میں شکست دی تھی + تاج سر دارا سے مملکت ایران مراد ہے جسے مسلمانوں نے فاروق اعظم رض کے عہد خلافت میں فتح کیا تھا + تمدن آفریں - عربوں نے دنیا کو ایک اعلیٰ درجے کے تمدن (تہذیب و معاشرت) سے روشناس کیا + خلاق۔ لغوی معنی بہت پیدا کرنے والا + آئین جہانداری - حکمرانی کے قوانین + سماں - نقشہ یا منظر + الفقر فخری یہ حضور صلعم کا ارشاد ہے کہ شان فقر میرے لئے باعث فخر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے اپنی تمام تصانیف میں مسلمانوں کو اپنے اندر شان فقر پیدا کرنے کی تلقین کی ہے +

افسوس ہے کہ میں دریا کوزہ میں نہیں بند کرسکتا اس موضوع پر مستقل کتاب لکھوں گا (بتوفیقہٖ) +

شان امارت - حکومت کی شان + "با آب و رنگ و خال و خط چہ حاجت

حاجت روئے زیبا را۔"

یہ حافظ شیرازی کی مشہور غزل کا مصرع ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جو عورت، فطری طور پر خوبصورت اور دلکش ہوتی ہے اسے لپ اسٹک پوڈر، کریم، ویسلین اور کیوٹیکس کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح ایک حسین عورت، آرائش ظاہری سے بے نیاز ہوتی ہے اسی طرح ہمارے خلفاء ظاہری شان و شوکت سے مستغنی تھے۔ اشارہ ہے فاروق اعظم کی طرف، جن سے بڑا حاکم مدبر منتظم سیاست دان اور جامع حیثیات انسان ابھی تک دنیائے اسلام میں پیدا نہیں ہوا یونان کا تو ذکر ہی کیا ہے قیصر اور کسریٰ ان کے نام سے کانپتے تھے۔ لیکن ان خوبیوں کے باوجود ان کی سادگی اور درویشی کا یہ عالم تھا کہ ان کے کُرتے میں پیوند لگے ہوتے تھے اور زمین پر سوتے تھے۔ غیور یعنی غیرت دار۔ غیرت بھی مروت کی طرح وسیع المعانی لفظ ہے۔ مراد ہے، انسان کا ہر بری اور ذلیل حرکت سے اجتناب کرنا۔ یعنی ہمارے اسلاف مفلسی کی حالت میں بھی کوئی بات شرافت کے اصول کے خلاف نہیں کرتے تھے۔ منعم بمعنی دولتمند + گدا کے ڈر سے - یعنی مسلمان اس قدر غیرت دار تھے کہ مفلسی میں بھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے تھے۔

جہانگیر و جہاندار و جہاں بان و جہاں آرا۔ بہت عمدہ مصرع ہے۔ لفظی معنی ہیں۔ جہاں کو فتح کرنیوالے اس پر حکومت کرنے والے اس کی نگہبانی کرنے والے اور اسے آراستہ کرنے والے۔ تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں نے چاروں کام انجام دئے تھے

تخیل سے یہاں تصور یا خیال مراد ہے۔ یعنی تو مسلمانوں کی عظمت و شوکت کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ واضح ہو کہ یہ بات اقبال نے بالکل سچ لکھی ہے۔ آج کل کے غلام مسلمان اپنے بزرگوں یا اسلاف کی سطوت و شوکت کا تصور بھی نہیں کر سکتے + آبار۔ باپ دادا + توگفتار، وہ کردار الخ یعنی تو محض باتیں بنا سکتا ہے (اور وہ بھی اس وقت، جب مجھے اس فنِ لطیف کے جوہر دکھانے کے لئے کسی شاندار ہوٹل میں عصرانہ پر مدعو کیا جائے) اور تیرے اسلاف تلوار کے جوہر دکھاتے تھے۔ (آخری مرتبہ ۱۸۵۷ء میں انھوں نے اپنی تلوار کے جوہر دکھائے تھے لیکن مرزا الٰہی بخش اور حکیم احسن اللہ خان جیسے غداروں نے، جن کی تفصیل اپنی مجوزہ تاریخ میں درج کرونگا، اس انقلاب کو ناکام بنا دیا) تو ثابت یعنی آجکل کے مسلمان عمل اور حرکت سے محروم ہیں + وہ ستیارہ۔ تیرے اسلاف ہر وقت مصروفِ جہاد رہتے تھے + اسلاف جمع ہے سلف کی سلف یعنی زمانہ گزشتہ یا اگلے وقتوں کے لوگ + میراث۔ وہ دولت یا سامان یا جائیداد جو کسی کو ترکہ میں ملے + ثریا کا لفظ اس لئے لائے ہیں کہ یہ ستارہ (دراصل مجموعہ ہے چند ستاروں کا، اسی لئے عقدِ ثریا کہتے ہیں) زمین سے بہت زیادہ فاصلہ پر ہے + عارضی شی تھی یعنی حکومت، کسی قوم میں ہمیشہ نہیں رہا کرتی + آئینِ مسلّم۔ یعنی وہ قانون جو سب لوگوں کو تسلیم ہو یا جو ثابت شدہ ہو + مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں یہ قانون جاری ہے کہ کوئی قوم ہمیشہ سربلند یا حکمران نہیں رہ سکتی۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ حکومت کا نتیجہ دولت، دولت کا نتیجہ عورت، عورت کا نتیجہ عیش و عشرت، عیش و عشرت کا نتیجہ غفلت اور غفلت کا نتیجہ غلامی +

سیپارہ۔ اس کے دو معنی ہیں (۱) عرف عام میں قرآن مجید کے کسی جزء کو کہتے ہیں مثلاً الف لام میم۔ سیقول اور تلک الرسل (۲) لغوی معنی ہیں۔ تیس ٹکڑے۔ اس شعر میں دوسرے معنی مراد ہیں یعنی جب ہم اپنے اسلاف کی کتابیں یورپ کے کتب خانوں میں دیکھتے ہیں۔ تو دل کے تیس ٹکڑے ہو جاتے ہیں (بہت رنج ہوتا ہے) واضح ہو کہ اقبال نے اس مصرع میں بلاغت کا کمال دکھایا ہے۔ الفاظ سے تو اس قدر ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی کتابیں آج یورپ کے کتب خانوں کی زینت بنی ہوئی ہیں لیکن اس بات میں مسلمانوں کی بربادی کی تاریخ بھی پوشیدہ ہے مثلاً اگر نامور سلطان ٹیپو شہید کو شکست نہ ہوتی تو اس مردِ مومن کا نادرالوجود کتب خانہ، انڈیا آفس لائبریری اور برٹش میوزیم کی زینت کیسے بنتا؟

غنی روزِ سیاہ پیرِ کنعاں را تماشا کن الخ اے غنی! حضرت یعقوبؑ کی بدقسمتی تو دیکھو! کہ خود تو بیٹے کے فراق میں رو رو کے اندھے ہو گئے لیکن ان کی آنکھوں کی روشنی (بیٹے) نے زلیخا کی آنکھوں کو روشن کر دیا۔ اس شعر میں "نورِ دیدہ" کی ترکیب بہت بلیغ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حقدار یا مستحق تو محروم رہا، اور اغیار یا غیر مستحق لوگ فیضیاب ہو گئے +

تبصرہ | بڑی دلکش، دلپذیر اور اثر آفریں نظم ہے۔ اقبال کے جذبات و احساسات ملّی کی آئینہ دار ہے۔ مقصد یہ ہے کہ قوم کے نوجوانوں کے اندر اپنی حالت کا، اپنے آباؤ اجداد کی حالت سے موازنہ کرنے کا خیال پیدا ہو۔ یہ مصرع "تجھے آباء سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی" اس نظم کی جان ہے۔

نوٹ | مجھے افسوس ہے کہ آج کل قوم کے نوجوانوں کو کالجوں میں مخلوط تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے اتنی فرصت ہی نہیں کہ وہ موازنہ کا ناخوشگوار فریضہ انجام دے سکیں۔ انسان ایک وقت میں ایک ہی کام کرسکتا ہے، اور موازنہ سے مشاہدہ، بہرکیف، زیادہ دلچسپ اور دلپذیر ہے +

مطلب | اے نوجوان! کبھی تو نے اس بات پر بھی غور کیا کہ تو جس قوم کا فرد ہے، وہ کسی زمانہ میں کس قدر عظیم الشان تھی؟ سُن! تو اس قوم کا فرد ہے۔ (نام لیوا ہے) جس نے قیصر کا تخت الٹ دیا تھا اور کسریٰ کے تاج کو پامال کر دیا تھا۔ تیرے اسلاف اگرچہ عرب کے صحرا سے نکلے تھے لیکن انھوں نے دنیا میں نئے تمدن کی بنیا د رکھدی اور علوم و فنون کے دریا بہا دئے اور حکمرانی کا نیا طریقہ دنیا کو سکھایا۔ یعنی ان کی بادشاہت، میں بھی درویشی (فقر) کا رنگ جھلکتا تھا۔ اور وہ اس قدر غیرت مند تھے کہ مفلسی میں بھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ تجھے اپنے بزرگوں سے کوئی نسبت نہیں ہے۔ وہ میدانِ جنگ میں اپنی تلوار کے جوہر دکھاتے تھے، تو ہوٹلوں بیٹھ کر سگرٹ کے دھوئیں میں چاء پیتا ہے حکومت تو خیر ایک عارضی چیز ہے اس کے جانے کا تو مجھے اتنا غم نہیں ہے جتنا رنج اس بات سے ہوتا ہے کہ آج ہمارا سارا علمی سرمایہ اغیار کے قبضہ میں ہے۔

نوٹ | غنی کاشمیری کا نام ملا محمد طاہر تھا۔ کلیم اور صائب کا دوست اور ہمعصر تھا۔ فارسی شاعری میں ایک خاص طرز کا موجد تھا۔ جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ تصنع، پیچیدگیاں، دشواری اور مشکل پسندی یہ اسکے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ صائب کی طرح یہ بھی مثال نگاری میں بہت بلند درجہ رکھتا ہے۔ چالیس سال کی عمر میں ۱۶۶۱ء میں وفات پائی غنی کی سیرت کا بہترین پہلو یہ ہے کہ اس نے ساری عمر کسی کے سامنے دست سوال دراز نہیں کیا۔

نظم بر صد ۱۹۹

حلِّ لُغات | غُرّہ۔ کثیر المعانی لفظ ہے (۱) سفیدی (۲) روشنی (۳) چمک (۴) گھوڑے کی پیشانی پر سفید داغ (۵) چاندرات، یا چاند کی پہلی تاریخ (۶) فاقہ یا روزہ۔ اس جگہ جیسا کہ ذیلی عنوان سے واضح ہے غرّۂ شوال سے مراد ہے ہلالِ عید یعنی چاندرات + شوال۔ قمری سال کا دسواں مہینہ جس میں ہر مسلمان فضول خرچی کو باعثِ سعادتِ دارین یقین کرتا ہے اور اس قدر کھاتا ہے کہ رمضان کی ساری کسر پوری کر لیتا ہے، بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ + نورِ نگاہِ روزہ دار۔ یعنی روزہ دار کی آنکھوں میں تیرا وجود باعثِ مسرت ہے۔ تجھے دیکھکر اس کی آنکھوں میں روشنی پیدا ہو جاتی ہے + عید۔ عود سے ماخوذ ہے جس کے لغوی معنی ہیں واپس آنا، لوٹنا، چونکہ عید بھی ہر سال آتی ہے اس لئے اسے عید کہنے لگے + تمہید یعنی آغاز یا ابتدا + سرگزشتِ ملتِ بیضا۔ روشن (مسلمان) قوم کی داستان + دیرینہ۔ پرانی۔ قدیم + رنگین قبا کنایہ ہے سرخیٔ خونِ اعدا سے + تیری قسمت میں ہم آغوشی الخ یعنی تو اسی عَلَم (جھنڈے) سے ہم آغوش ہے۔ واضح ہو کہ مسلمانوں کے قومی علم کے پھریرے پر ہلال کا نشان بنا ہوا ہے آشنا پرور۔ دوست نواز یعنی وفادار + وفا، آئین ترا۔ تو بھی،

وفا دار ہے + پیراہن سیمیں - چاندی کا لباس یعنی سفید رنگ + اوج بلندی + قافلے - مراد ہے دیگر اقوام عالم + برق رفتاری سے اُن قوموں کی روز افزوں ترقی مراد ہے + رہرو درماندہ - تھکے ہوئے مسافر سے مسلمان قوم مراد ہے + "منزل سے بیزاری" ساری نظم میں اس سے زیادہ بلیغ ترکیب نہیں ہے - اس کی شرح لکھوں تو مستقل کتاب مرتب ہو جائے گی - مسلمان قوم ہی دنیا میں وہ نرالی قوم ہے جو اپنی منزل مقصود سے بیزار ہے - اور اگر کوئی اللہ کا بندہ اس قوم کو اس منزل کی طرف لے جانا چاہے تو اُسے "کافر" قرار دے دیتی ہے - مختصر یہ کہ زبان سے تو اس قوم کا ہر فرد یہ کہتا ہے کہ منزل مقصود کعبہ ہے، لیکن رُخ ہر ایک کا ترکستان کی طرف ہے - اور وہ دن دور نہیں جب ماسکو کی طرف ہو جائے گا -

تہی ساغر - اے وہ شخص جسکا پیالہ خالی ہے یا جو مفلس ہے - اقبال نے ہلال کو "تہی ساغر" باندھا ہے - کیونکہ ہلال کی شکل، خالی پیالہ کی طرح ہوتی ہے + زنجیروں سے مراد لعنت - اقبال کی رائے میں فرقہ بندی سے بڑھکر کوئی لعنت نہیں ہے - شکستِ رشتۂ تسبیح شیخ - لفظی معنیٰ ہیں شیخ صاحب کی تسبیح کے تاگے کا ٹوٹ جانا - مرادی معنیٰ ہیں قوم کے شیرازے کا منتشر ہو جانا یا قوم کا صدہا فرقوں میں منقسم ہو کر ضعیف اور ذلیل ہو جانا + برہمن کی پختہ زناری - برہمن کا جنیو روز بروز مضبوط ہو جاتا ہے - یعنی غیر مسلم اقوام مثلاً ہنود، نصاریٰ، سکھ روز بروز طاقتور ہوتی جاتی ہیں + کافروں کی مسلم آئینی سے مراد یہ ہے کہ غیر مسلم اپنی دانائی کی بدولت، اسلامی اصول زندگی اختیار کرتے جاتے ہیں مثلاً توحید، مساوات، جمہوریت، حُریّت ضمیر، مطالعۂ فطرت، سیر فی الارض، تحقیق و تلاش، طلب علم و فن، تجارت، سیاحت نکاح بیوگان وغیرہ یہ وہ امور ہیں جن کی تعلیم قرآن نے صاف لفظوں میں دی ہے لیکن ع ہم تو ایسے ہی میں رہے اغیار بے اے ہوگئے۔

مسلمانوں کی مسلم آزاری - کاش اقبال آج زندہ ہوتے اور مسلمانوں کے طرز عمل کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے - بیشک ان کی زندگی میں بھی مسلمان، مسلمان کو ستاتا تھا لیکن اب تو اور ہی عالم ہے + بارشِ سنگِ حوادث - مصیبتوں کا نزول، بڑی شدت کے ساتھ جس طرح بارش ہوتی ہے + آئینہ دیواری سے جمود اور بے حسی مراد ہے + تملق پیشگی - خوشامد کو اپنا پیشہ بنا لینا + آبرو والوں سے مسلمان مراد ہیں + جو بے آبرو تھے یعنی جو صدیوں سے غلامی کی زندگی بسر کر رہے تھے + جس کو ہم نے آشنا لطفِ الخ - یعنی جسے ہم نے بولنا سکھایا + اشارہ ہے اس قوم کی طرف جسے مسلمانوں نے پتوں کے بجائے برتنوں میں کھانا اور دھوتی کے بجائے پاجامہ اور انگرکھا پہننا سکھایا + حریف یعنی رقیب یا مدمقابل + اور ایران میں ذرا الخ واضح ہو کہ جب تک ایران کی موجودہ دور (۱۸۹۶ء تا ۱۹۱۲ء) کی تاریخ مدنظر نہ ہو اس مصرع کا مطلب سمجھ میں نہیں آسکتا - لیکن اس شرح میں اس تفصیل کی گنجائش نہیں ہے - مختصر طور پر یوں سمجھ لیجئے کہ اقبال نے جس زمانہ میں یہ نظم لکھی تھی اس زمانہ میں یعنی ۱۹۱۱ء میں ایران پر بہت برا وقت پڑا ہوا تھا -

(۱) انگریزوں اور روسیوں نے ایک خفیہ معاہدے کی رو سے ۱۹۰۷ء میں ایران کو آپس میں تقسیم کر لیا تھا -
(۲) اس لئے یہ دونوں قومیں ملک میں ہر قسم کی بدنظمی پھیلا رہی تھیں،
(۳) محمد علی شاہ، جسے قوم نے ۱۹۰۹ء میں معزول کر دیا تھا، دوبارہ تخت حاصل کرنے کی فکر میں تھا - چنانچہ ۱۹۱۱ء میں اس نے ایران پر حملہ کیا لیکن شکست کھائی -
(۴) ناکام ہو کر اس نے اپنے چھوٹے بھائی سالار الدولہ کو حملہ کرنے کی ترغیب دی - چنانچہ اس نے خانہ جنگی کا سلسلہ شروع کر دیا - لیکن ۱۹۱۲ء میں شکست کھا کر کردستان بھاگ گیا -
(۵) مسلسل بدنظمی اور خانہ جنگی کی وجہ سے ایران کا دیوالہ نکل گیا - حکومت نے امریکہ سے مالی امداد طلب کی لیکن روس نے سخت مزاحمت کی -

ان تمام واقعات کو سامنے رکھ کر مصرع پڑھئے - تو اس کی صداقت آشکار ہو جائے گی -

چاک کر دی ترکِ ناداں نے خلافت کی قبا

یہ مصرع بھی تشریح طلب ہے اور اس کے سمجھنے میں دو مختلف قسم کی دشواریاں حائل ہیں :-

پہلی دشواری یہ ہے کہ ترکوں نے "خلافت کی قبا" ۱۹۲۴ء میں چاک کی - لیکن اقبال نے یہ نظم ۱۹۱۲ء کے آغاز میں لکھی تھی - لہٰذا ہر شخص یہ سوال کرے گا کہ اقبال نے بارہ برس پہلے اس واقعہ کا ذکر کیسے کر دیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ مصرع اقبال کی سیاسی بصیرت کی دلیل ہے انھوں نے ترکی کے داخلی حالات کا مطالعہ کر کے یہ پیش گوئی کی تھی جو ۱۹۲۴ء میں پوری ہو گئی -

دوسری دشواری یہ ہے کہ اقبال نے کیا دیکھ کر یہ پیش گوئی کی تھی؟ اس کا جواب بھی واقعی بہت تفصیل طلب ہے - جبتک ترکی کی موجودہ دور (۱۸۹۶ء تا ۱۹۱۲ء) کی تاریخ پیش نظر نہ ہو - عام آدمی نہیں سمجھ سکتا کہ اقبال نے یہ مصرع کیوں لکھا - مختصر طور پر یوں سمجھ لیجئے کہ اقوام یورپ کے دماغ میں یہ خیال جاگزیں ہو گیا تھا کہ جب تک سلطان روم کے نام کے ساتھ خلیفۃ المسلمین کا لقب وابستہ ہے اس کی مرکزی حیثیت ختم نہیں ہو سکتی - اس لئے یہ قومیں، ترکی کے خلاف رات دن ریشہ دوانیوں میں مصروف رہتی تھیں - انھی دشمنان ملت کے ابھارنے پر ۱۸۹۷ء میں یونان نے ترکوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور جب مارشل ادہم پاشا نے یونان کو مسلسل شکستیں دیکر ایتھنز (یونان کا دارالسلطنت ہے) کا محاصرہ کیا تو روس، فرانس اور انگلستان تینوں نے ترکی کو الٹی میٹم دیدیا کہ یونان خالی کر دو ورنہ ہم سے لڑنے کے لئے تیار ہو جاؤ - اس ایک واقعہ سے ناظرین دول یورپ کے طرز عمل کا اندازہ کر سکتے ہیں - اس لئے ترکوں میں ایک جماعت ایسی پیدا ہو چکی تھی جو یہ چاہتی تھی کہ ترکی، خلافت سے دست بردار ہو جائے، نہ بانس ہوگا نہ بانسری بجے گی -

اگرچہ سلطان عبدالحمید ثانی نے ۱۹۰۸ء میں دستوری حکومت کا اعلان کر دیا تھا - لیکن محمد علی شاہ والی ایران کی طرح وہ بھی درپردہ دستوری حکومت کے خلاف تھے، اس لئے ۱۹۰۹ء میں ترکوں نے انھیں معزول کر دیا - اور انجمن اتحاد و ترقی کے ارکان برسر اقتدار آ گئے - ان میں اور شاہ پسند جماعت میں خانہ جنگی شروع ہو گئی - اس سے

فائدہ اٹھا کر ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس پر حملہ کر دیا اور ۱۹۱۲ء میں بلغاریہ نے بھی اعلان جنگ کر دیا۔ غرضکہ ایران کی طرح ترکی بھی داخلی اور خارجی فتنوں کا شکار ہو چکا تھا۔ ان تمام باتوں کو دیکھکر اقبال نے پیش گوئی کی تھی کہ چاک کر دی ترک نادان نے خلافت کی قبا +
۱۹۱۱ء کا سال دنیائے اسلام کے لئے ایسا پر آشوب تھا کہ اکبر الہ آبادی نے یہ شعر لکھا تھا +

مراقش جا چکا ایران گیا اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ترکی کا مریضِ نیم جاں کبتک۔

شورش امروز سے موجودہ (۱۹۱۱ء) ہنگامہ مراد ہے + محوِ سرودِ دوش رہ یعنی اللہ کے فضل وکرم پر نگاہ رکھ شاید وہ بہتری کی کوئی صورت پیدا کر دے +

تبصرہ اقبال نے یہ معرکۃ الآرا، نظم اس زمانہ میں لکھی تھی جب دنیائے اسلام خصوصاً ترکی اور ایران پر چاروں طرف سے مصائب کی گھٹائیں چھا رہی تھیں شاعر نے اس نظم میں ہلال عید کو مخاطب کر کے اپنے جلے ہوئے دل کے پھپولے پھوڑے ہیں۔ اور اسمیں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کی زبوں حالی اور ان کی حکومتوں کے زوال پر، اس سے زیادہ درد انگیز نظم بانگِ درا میں مشکل ہی سے نکلے گی۔ اس نظم کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی ہو سکتا ہے کہ اکبر الہ آبادی مرحوم نے جب اس نظم کو پڑھا تو اقبال کو تحسین آمیز خط لکھا اور اپنے خط میں ان دو شعروں کی بہت تعریف کی تھی۔

دیکھ مسجد میں شکستِ رشتۂ تسبیحِ شیخ الخ

کافروں کی مسلم آئینی کا بھی نظارہ کر الخ

بظاہر اقبال نے ہلال عید سے خطاب کیا ہے لیکن دراصل قوم کو مخاطب کیا ہے۔ اس نظم کے دوسرے بند کے ہر مصرع میں نشتر پوشیدہ ہیں۔ نظم کا مطلب یہ ہے کہ اے مسلمانو! ہوش میں آؤ! آنکھیں کھولو! دیکھو کہ آج زندگی کی بساط پر تم ہر خانہ میں مات کھا رہے ہو۔ ہر جگہ ذلیل ہو رہے ہو! اس کے بعد اپنی حالت کا موازنہ غیر مسلموں کے ساتھ کرو اور دیکھو وہ کس طرح زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کر رہے ہیں۔ تم فرقہ بندی کی لعنت میں گرفتار ہو۔ بلکہ تمہاری قوم میں آئے دن نئے نئے فرقے پیدا ہو رہے ہیں جو اپنے سوا سب کو کافر سمجھتے ہیں۔ لیکن دوسری قومیں، فرقہ بندی کو مٹا رہی ہیں۔ دور کیوں جاؤ، اپنی ہمسایہ قوم سے سبق حاصل کرو۔ تم آپس میں بر سرِ پیکار ہو لیکن وہ (مثلاً ہنود) "سنگھٹن" میں معروف ہیں۔ غیر مسلم تو اسلامی اصول اختیار کر رہے ہیں لیکن تم مسلمان ہو کر اسلام سے منحرف ہوتے جاتے ہو۔ جس قوم کو تم نے تہذیب سکھائی، وہ قوم آج ہر محفل میں گرمیٔ گفتار کا ثبوت دے رہی ہے[1]۔ لیکن تم صرف "سرکار" کی خوشامد کو اپنے درد کی دوا سمجھے بیٹھے ہو۔ یورپ کی اقوام عیش وطرب میں معروف

---

[1] ترجمان القوم حضرت مولانا ظفر علی خاں نے بھی اس شعر میں اسی تلخ حقیقت کو واضح کیا ہے:۔

جب زباں نارنگ کی چلتی ہے قینچی کی طرح
پھر سکوتِ مرگ کیوں طاری ہوا ہے "ن" پر

ہیں۔ لیکن تم رات دن ماتم میں مشغول ہو، مثلاً آج مراقش کا ماتم ہے تو کل طرابلس کا۔

آخر میں شاعر اپنے غمزدہ دل کو یہ کہکر تسلی دیتا ہے کہ قوم کا مرض، علاج کی حدود سے تجاوز کر چکا ہے، اب اس کے سوا کچھ چارہ نہیں کہ میں آئینہ کی طرح سب کچھ دیکھوں اور خاموش رہوں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کروں کہ اپنے فضل وکرم سے مسلمانوں کی مصیبتوں کو دور کر دے۔

نظم بر صدا ۲۰۱

حلِ لغات دوش۔ گزری ہوئی رات + شمعِ منزلِ ویرانِ خویش وہ شمع جو کل رات میرے ویران گھر میں جل رہی تھی + نصیب بمعنی قسمت یا حصہ + بائے۔ ایک پر، یا کوئی پر + امل۔ امید + جانِ امل فرسود + وہ زندگی جو آرزوؤں ہی میں بسر ہو گئی ہو + کرمک بے مایہ۔ حقیر کیڑا مراد ہے پروانہ + سوز کلیم۔ حضرت موسیٰ کا سوز یعنی محبت کا وہ رنگ جو حضرت موسیٰؑ میں پایا جاتا تھا +

نوا پیرا۔ لغوی معنیٰ میں نغمہ وسرود کو آراستہ کرنے والا یعنی گانے والا مضمر پوشیدہ + سوزِ عشق کی آگ + فروزاں بمعنی روشن یا جلتا ہوا + گریہ ساماں یعنی رونے والا + گل بدامن سے سرخی مراد ہے + سوزِ دروں محبت کی آگ + صہبا۔ شراب + شعار۔ طریقہ + زشت روئی۔ بدصورتی سودائی بتخانہ۔ بت پرستی کا دیوانہ + شوریدہ سر۔ بے اصول + قیس سے عاشق مراد ہے + محفل سے قوم مراد ہے + تنگ ہے صحرا ترا۔ یعنی جذبات عاشقی میں شدت نہیں ہے یا حوصلہ بلند نہیں ہے + محمل ہے

بے لیلیٰ ترا۔ یعنی تیرے دل میں سرکار دو عالم صلعم کی محبت نہیں ہے + دُرِ تابندہ۔ چمکتا ہوا موتی + مراد ہے مسلمان فرد + پروردۂ آغوشِ موج۔ جسے موج نے اپنی گود میں پالا ہے + صرف کو شعرا پروردۂ آغوشِ موج باندھتے ہیں + لذتِ طوفان سے عاشقی کی دشواریاں مراد ہیں + دریا سے قوم مراد ہے + نوا پیرا سے مراد ہے قوم کو پیغام دینے والا + گلشن سے قوم مراد ہے + ذوقِ تماشا۔ معشوق کا جمال دیکھنے کی آرزو + شعلہ آشام سے شراب نوش مراد ہے + آتش بجام۔ پیالے میں شراب لے کر + گلشن کی جمعیت۔ اتحاد قومی + بجھ گیا وہ شعلہ۔ عشقِ رسولؐ کی آگ ٹھنڈی ہو گئی + سوزِ تمام یعنی کامل محبت یا حقیقی عشق + پھول بے پروا ہیں۔ مسلمان بے حس ہیں۔ ان کے اندر نہ عشقِ رسول ہے نہ جذبۂ ملی + کاروان بے حس ہے۔ قوم غافل ہے، یا عمل سے بیزار ہے + آوازِ درا ہو یا نہ ہو۔ عمل کا پیغام دو یا نہ دو، دونوں باتیں یکساں ہیں + تسبیح کے دانوں سے افرادِ قوم مراد ہیں + شوقِ بے پروا۔ وہ عشق جو انسان کو موت سے بے پروا بنا دیتا ہے + فکرِ فلک پیما وہ عقل جو آسمان سے تارے توڑ کر لاتی ہے +

تیری محفل میں نہ دیوانے نہ فرزانے رہے

یعنی مسلمان قوم میں نہ دین کے عاشق باقی رہے، نہ علم کے۔ نہ کوئی ولی پیدا ہوتا ہے نہ منطقی فلسفی پھر کیا جو گردِ شمع پروانے رہے، جب عشق رسول ہی نہیں تو اسلام کے گرد رہنے یعنی اسلام کا نام لینے سے کیا فائدہ؟

ٹوٹی ہوئی مینا سے ذاتِ شاعر مراد ہے، جو قوم کی زبوں حالی کا

مرشیہ پڑھ رہی ہے + متاعِ کاررواں جاتا رہا۔ قوم کے دل سے عشقِ رسول کا جذبہ فرو ہوگیا + کارواں۔قوم + سطوت۔ شوکت + موج کو آزادیاں سامانِ شیون ہوگئیں۔ یعنی جب قوم آئینِ اسلام کی پابندیوں سے آزاد ہوگئی تو یہ آزادی (جو دراصل گمراہی ہے) قوم کے حق میں باعثِ ذلت و رسوائی ہوگئی + وہ نگاہیں ناامیدِ نورِ ایمن ہوگئیں۔ یعنی مسلمان اپنے ضعفِ ایمان کی وجہ سے اللہ کی رحمت سے ناامید ہوگئے + اڑتی پھرتی تھیں الخ مسلمان دنیا کے ہر گوشے میں اسلام کا علم بلند کرتے تھے + پابندِ نشیمن یعنی گوشہ نشین + مطلب یہ ہے کہ خدا جانے مسلمان کو کیا ہوگیا۔ کہ وہ اب پاؤں توڑ کر گھر میں بیٹھ گیا + بجلیاں آسودۂ دامانِ خرمن ہوگئیں۔ یعنی مسلمان عمل سے بیگانہ ہوگئے + دیدۂ خونبار ہو منت کشِ گلزار کیوں یعنی میں پھولوں کا نظارہ کرنے کے لئے باغ میں کیوں جاؤں؟ جبکہ میرے سرخ آنسوؤں سے میرا دامن رشکِ گلزار بنا ہوا ہے +

پیمانہ بردارِ خمستانِ حجاز سے سرکارِ دو عالم صلعم کے غلام (اسلام کے شیدائی) مراد ہیں یعنی وہ لوگ جو حضورؐ کے جانشین ہیں (علمائے حق) یا سچے خادمانِ قوم جو مسلمانوں کی ترقی کے آرزومند ہیں + نقدِ خودداری یعنی خودداری یا عزتِ نفس + بہا بمعنی قیمت + بادۂ اغیار۔ غیروں کی عطا کردہ شراب یعنی خطابات اور سرکاری عہدے جن کے حصول کے لئے انسان کو اپنی عزتِ نفس سے ہاتھ دھونا لازمی ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر یہ "انعام" حاصل نہیں ہوسکتے + لبریزِ صدائے نائے نوش۔ شراب پینے والوں کے شور غل سے معمور ہے +

مینا بدوش۔ اپنے کندھے پر شراب کی بوتل رکھے ہوئے + حدیث بمعنی بات + سروش۔ فرشتہ + رہزن۔ ہمت۔ ہمت کو زائل کر دیا + تن آسانی۔ آرام طلبی + جو بمعنی نہر + اصلیت سے اسلام مراد ہے + جمعیت بمعنی قومی وحدت یا اتحاد + گل سے اسلام مراد ہے + کارواں پریشاں ہوگیا۔ مسلمان منتشر ہوگئے + دل بیگانۂ پہلو ہوا یعنی اگر (فرد) قوم سے بیگانہ ہوگیا تو زندہ رہنا محال ہے + مستور۔ پوشیدہ + وادیٔ سینا۔ وہ وادی جہاں حضرت موسیٰؑ نے خدا کی تجلی دیکھی تھی + صرفِ تعمیرِ سحر یعنی نئی دنیا پیدا کر یا ترقی کی نئی راہیں تلاش کر + خاکسترِ پروانہ سے وہ مسلمان مراد ہیں جنہوں نے حضورؐ کے عشق میں یا اسلام کی خدمت میں اپنی زندگی قربان کر دی + منت کشِ ساقی یعنی غیروں کا احسان مت اٹھا۔ نیا ویرانہ پیدا کر۔ نئی دنیا پیدا کر + تو عصا او، افتادہ سے پیدا، مثالِ دانہ کر اس مصرع میں تعقیدِ لفظی ہے نثر یوں ہوگی "تو مثالِ دانہ" اپنی افتادہ سے عصا پیدا کر" شاعرنے تخیل کی بدولت، پودے کے تنہ کو (جو شکل کے لحاظ سے عصا معلوم ہوتا ہے) عصا قرار دیا ہے + شاخِ کہن سے اسلامی روایات مراد ہیں + اس چمن میں یعنی دنیا میں + تلمیذ بمعنی شاگرد + خاشاکِ غیر اللہ سے دنیاوی تعلقات مراد ہیں + خاشاک بمعنی کوڑا کرکٹ + غیر اللہ تصوف کی اصطلاح میں دنیا کو کہتے ہیں + باطل حق کی ضد ہے + اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ قرآن سے باہر حق نہیں ہے۔ قرآن مجید اپنے آپ کو الحق کہتا ہے۔ باطل کے لغوی معنیٰ ہیں، مٹ جانے والا، مراد ہے کفر یا غیر اسلامی (قرآنی) تعلیمات +

لوٹ | اقبال اور جناب ابو الکلام آزاد میں بنیادی اختلاف یہ ہے کہ آزاد صاحب "حق" کو قرآن میں منحصر نہیں سمجھتے۔ ان کے نزدیک تمام مذاہب سچے ہیں۔

ملاحظہ ہو تفسیر سورہ فاتحہ مندرجہ ترجمان القرآن جلد اول صفحہ ۱۳۹ مطبوعہ دہلی ۱۳۵۰ھ

جوہرِ آئینۂ ایام یعنی دنیا کی زینت اور بقا کا باعث + اس کے لفظی معنیٰ یہ ہیں کہ اگر زمانہ کو آئینہ قرار دیا جائے تو ملتِ اسلامیہ اس آئینہ کا جوہر (صیقل) ہے اور یہ سب جانتے ہیں کہ اگر صیقل نہ ہو تو آئینہ بیکار ہے اسی طرح اگر مسلمان مٹ جائیں تو اس دنیا کا وجود اور عدم دونوں یکساں ہوجائیں + بے پایاں۔ غیر محدود یا وہ سمندر جس کی تہاہ (گہرائی) نہ مل سکے + گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری احساسِ کمتری میں مبتلا + اس کے پیامِ ناز کا یعنی خدا تعالیٰ جو ظاہر بھی ہے پوشیدہ بھی ہے + وہ ساماں بھی ہے۔ ساماں سے عشقِ رسول مراد ہے + تفنگ بمعنی بندوق + شاہد بمعنی گواہ + کوہ فاراں کا سکوت فاران، مکہ مکرمہ کے قریب ایک پہاڑ ہے + سکوت سے عظمت مراد ہے + چند کلیوں سے وہ چند ممالک مراد ہیں جن کو مسلمانوں نے ابتدائی دور میں فتح کیا تھا + کسوتِ مینا یعنی بوتل کے لباس میں یعنی بوتل میں + آتشِ لوائی سے عشقِ رسولؐ کا پیغام مراد ہے + زندگانی کا یہی ساماں بھی ہے۔ یعنی میری زندگی کا مقصد یہی ہے کہ قوم کو عشقِ رسول کا پیغام دوں + آئینہ پوش یعنی منور + سیماب پا یعنی غائب + سینہ چاکانِ چمن سے گل مراد ہیں + اس چمن کی ہر کلی یعنی ملت

اسلامیہ کا ہر فرد + سطوتِ رفتارِ دریا سے دنیا کی مخالف طاقتوں کی شوکت مراد ہے + زنجیرِ پا سے گرفتاری یا قید مراد ہے + مآل بمعنی نتیجہ + پیغامِ سجود سے شریعت اسلامیہ کی اتباع مراد ہے + خاکِ حرم سے مسجد مراد ہے + خونِ گلچیں اور نالۂ صیاد سے دشمنانِ اسلام کی آہ و زاری یا ذلت و خواری مراد ہے + دنیا کیا سے کیا ہوجائے گی یعنی اگر مسلمان عشقِ رسولؐ اختیار کرلیں تو دنیا میں انقلابِ عظیم رونما ہوجائیگا + شب گریزاں ہوگی یعنی کفر کی ظلمت مٹ جائے گی۔ جلوۂ خورشید سے اسلامی تعلیمات مراد ہیں + اقبال نے اسلام کو خورشید اور کفر کو شب سے تشبیہ دی ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ "حق" اسلام سے باہر کہیں موجود نہیں ہے اور جناب آزاد کا قول غلط ہے + چمن سے دنیا مراد ہے۔

تبصرہ | یہ نظم بانگ درا کی ان اہم نظموں میں سے ہے، جنکا جواب جدید اردو ادب میں نہیں مل سکتا۔ بعض نقادانِ فن اس کو بانگ درا کی بہترین نظم قرار دیتے ہیں۔ ممکن ہے سب لوگ اس خیال سے اتفاق نہ کرسکیں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر بانگ درا میں سے تین بہترین نظمیں منتخب کی جائیں تو یہ نظم اس انتخاب میں ضرور شامل ہوگی۔ اس کی خصوصیات یہ ہیں:

(۱) اس میں شاعری اور فلسفہ کا امتزاج ہے۔

(۲) ساری نظم رمزیہ انداز میں لکھی گئی ہے۔ الفاظ کچھ ہیں لیکن ان سے مراد کچھ ہے۔

(۳) یہ اُس دور کی نظم ہے جب اقبال کی اردو شاعری پر فارسی رنگ غالب آچکا تھا۔ چنانچہ اس کا پہلا بند اردو کے بجائے فارسی میں

(۴) چونکہ اس زمانہ (۱۹۱۲ء) میں اقبالؔ مسلمان ملکوں کی تباہ حالی سے بہت متاثر تھے اسلئے اکثر اشعار میں سوز و گداز کی کیفیت نمایاں ہے۔ مثلاً یہ مصرع

" تھا جنہیں ذوقِ تماشا وہ تو رخصت ہو گئے "

اُن جذبات کا ترجمان ہے جو عالمِ اسلام پر مصائب کا نزول دیکھکر، ان کے دل میں موجزن تھے۔

(۵) چونکہ یہ نظم اُنہوں نے "شعر گفتن" کے لئے نہیں، بلکہ دردِ دل کا اظہار کرنے کے لئے لکھی تھی اسلئے اسکے اکثر اشعار میں جوشِ بیان کی صفت پائی جاتی ہے۔

(۶) چونکہ اس نظم میں اُنہوں نے قوم کو عشقِ رسولؐ کا پیغام دیا ہے، اسلئے "شمع" کو واسطہ بنایا ہے، جو سوزِ دروں کا خارجی مظہر ہے۔ واضح ہو کہ "لالہ" کی طرح "شمع" بھی اقبالؔ کی شاعری میں ایک نشان یا علامت (SYMBOL) ہے جس طرح اکبرؔ کی شاعری میں شیخ یا سر سید یا صاحب۔

(۷) اگرچہ قوم کی مجرمانہ غفلت کی داستان انتہائی دردناک انداز میں بیان کی ہے لیکن اس تلخابہ کے بعد تریاق بھی مہیا کیا ہے، یعنی دوبارہ سربلندی کا طریقہ بھی بتایا ہے۔

(۸) اوّل سے آخر تک بندش بہت چست ہے، شوکتِ الفاظ اور زورِ بیان کی صفت تحسین سے بالاتر ہے۔ ہر مصرع شاعری کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے، آورد کا شائبہ نظر نہیں آتا۔ پروفیسر سروری نے بالکل سچ لکھا ہے، کہ یہ نظم "بانگِ درا" کا دل ہے۔

تجزیہ: چونکہ یہ نظم خاصی طویل ہے۔ اور اقبالؔ نے اپنے خیالات کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اسلئے ذیل میں اسکا تجزیہ درج کرتا ہوں، تاکہ طلبہ ہر بند کے بنیادی تصور سے آگاہ ہو کر پوری نظم کو بآسانی سمجھ سکیں۔

پہلے بند میں شاعر نے شمع سے یہ سوال کیا ہے کہ اگرچہ میں نے بھی تیری طرح اپنے آپ کو، مدتوں عشق کی آگ میں جلایا۔ لیکن اسکا سبب کیا ہے کہ میرے شعلہ کا طواف کرنے کیلئے کوئی پروانہ نہیں آیا، یعنی کوئی شخص میرے جلووں کا تماشائی نہیں بنا؟

دوسرے بند میں شمع نے پہلے تو ذاتِ خویش اور ذاتِ شاعر میں فرق بیان کیا ہے پھر سوال کا جواب دیا ہے کہ شاعر کے شعلہ کا طواف کوئی پروانہ کیوں نہیں کرتا پہلا سبب یہ ہے کہ قوم کے راہنما، نا اہل ہیں۔

تیسرے بند میں دوسرا سبب بیان کیا ہے کہ سچے مسلمان یعنی عاشقانِ رسولؐ ایک ایک کرکے رخصت ہو چکے ہیں۔ اور موجودہ مسلمانوں کے سینے اس جذبہ سے یکسر خالی ہیں، یعنی قوم مردہ ہو چکی ہے۔

چوتھے بند میں دوسرے سبب کی مزید توضیح کی ہے۔ یعنی تیسرے بند میں یہ کہا کہ "کارواں بےحِس ہے" تو چوتھے بند میں یہ بتایا کہ کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا، گویا بےحسی کی تشریح کردی۔

پانچویں بند میں قوم کی پستی اور زبوں حالی پر مرثیہ خوانی کی ہے۔ اگرچہ مضمون وہی ہے جو مسدسِ حالی میں نظم کیا گیا ہے۔ لیکن اندازِ بیان جداگانہ ہے۔ دُھن وہی ہے۔ مگر لَے ذرا تیز ہو گئی ہے۔

چھٹے بند میں اُس مایوسی کے اثر کو زائل کیا ہے جو پانچویں بند کے پڑھنے سے قدرتی طور پر دل میں پیدا ہو سکتا ہے۔ یعنی قوم کو امید کی جھلک دکھائی ہے۔ اور رہنمایانِ قوم کو کامیابی کا مژدہ سُنایا ہے۔

ساتویں بند میں مسلمانوں کو اُن کے انحطاط کے اسباب سے آگاہ کیا ہے۔ اس بند میں چونکہ اجتماعیت کا فلسفہ بیان کیا ہے۔ اسلئے اس بند کو شاعری، اور فلسفہ کا مقامِ اتصال یا سنگم کہہ سکتے ہیں۔ اسی صفت نے اقبالؔ کو ہندوستان کے شعرا کی صف سے بلند کرکے دنیا کے شعراء کی صف میں نمایاں جگہ عطا کردی۔

آٹھویں بند میں قوم کو عروج کی ترکیب بتائی ہے۔ یعنی محبت اور خودی، کا درس دیا ہے، جو سربلندی اور کامیابی کے لئے شرطِ اولین ہے۔

نویں بند میں مسلمان کو اسکی "حقیقت" سے آشنا کیا ہے۔ جوشِ بیان کے علاوہ اس بند میں شاعری اور موسیقی دونوں بغلگیر ہو گئی ہیں۔

دسویں بند میں مسلمان کو اسکی "اصلیت" سے آگاہ کیا ہے۔ اور اس بند کا ہر مصرع بلا مبالغہ "آبِ حیات" کا مصداق ہے۔ اور یہ مصرع تو سارے بند کی جان ہے۔ " تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے "۔ اس مصرع میں لفظ "وہ" کی معنویت اور بلاغت، الفاظ کے ذریعہ سے واضح نہیں ہو سکتی صرف ذوقِ سلیم ہی اس سے لذت اندوز ہو سکتا ہے۔

گیارھویں بند میں، جو اس نظم کا آخری بند ہے۔ اس نکتہ کو واضح کیا ہے کہ اگر قوم، مجوزہ نسخہ پر عمل کرلے، یعنی اگر عشقِ رسولؐ میں سرشار ہو کر، تبلیغِ اسلام پر کمربستہ ہو جائے تو کیا ثمرات مرتب ہونگے۔ یہ لکھنا تحصیلِ حاصل ہے کہ یہ بند اس ساری نظم کی جان ہے۔ کیونکہ اقبال کی تمناؤں کی جیتی جاگتی تصویر ہے، اسکے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو سکتی ہے کہ اقبالؔ اپنی قوم سے کیا توقع رکھتے تھے۔

نوٹ:- بڑے افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ ۱۹۱۲ء سے لیکر ابتک قوم نے اقبالؔ کی اس آرزو کی تکمیل کے لئے کوئی قدم نہیں اُٹھایا۔ چنانچہ مرنے سے کچھ دنوں پہلے مرحوم کو خود بھی اس تلخ حقیقت کا احساس ہو گیا تھا جس کا ثبوت اُن کے اس شعر سے مل سکتا ہے۔

من اے میرِ اُمم! داد از تو خواہم!
مرا یاراں غزلخوانے شمردند؎

؎ اے میرے آقا! میں حضور کی خدمت میں یہ فریاد لیکر آیا ہوں کہ میری قوم نے مجھے محض ایک

پہلا بند:- (۱) کل رات میں نے اپنے اجڑے ہوئے گھر کی شمع سے یہ کہا کہ تیرے گرد تو ہر وقت پروانوں کا ہجوم رہتا ہے۔

(۲) لیکن میں اس دنیا میں لالۂ صحرا کی طرح تنہائی میں جل رہا ہوں۔ میرے نصیب میں نہ کوئی محفل ہے نہ کوئی مکان۔

(۳) اگرچہ میں بھی تیری مانند، مدتوں سے عشق کی آگ میں جل رہا ہوں، لیکن تعجب ہے، کہ میرے گرد ایک پروانہ بھی طواف نہیں کرتا۔

(۴) میری روح سے سیکڑوں جلوے ظاہر ہوتے رہتے ہیں، لیکن کوئی شخص ان کا تماشا نہیں دیکھتا۔ یعنی قوم میرے پیغام کی طرف متوجہ نہیں ہوتی۔

(۵) اے شمع! تو نے یہ دنیا کو منور کرنے والی آگ کہاں سے حاصل کی؟ جسکی بدولت تو نے پروانوں کے اندر، کلیمؑ کا سوز پیدا کر دیا۔

دوسرا بند:- (۱) شمع نے جواب دیا کہ یہ تو سچ ہے کہ ہم دونوں قدرتِ خداوندی کے مظہر ہیں۔ جو موجِ نفس (سانس) میرے لئے پیغامِ موت ہے (پھونک مارنے سے شمع گل ہو جاتی ہے) وہی موجِ نفس تیرے لئے باعثِ زندگی ہے (آدمی کی زندگی سانس پر موقوف ہے) لیکن مجھ میں اور تجھ میں فرق بھی ہے۔

(۲) اسکی تفصیل یہ ہے کہ میں اسلئے جلتی ہوں کہ، جلنا میری ذات کا تقاضا ہے (پروانے آئیں یا نہ آئیں) جس طرح بہنا (روانی) پانی کی ذات کا تقاضا ہے، لیکن تو اسلئے جلتا ہے کہ تیرے گرد، پروانوں کا ہجوم ہو جائے۔ (یعنی تو شہرت کا طالب ہے) جلنا تیری ذات کا اقتضا نہیں ہے۔

(۳) میں تو اسلئے روتی ہوں کہ میرے دل میں آنسوؤں کا سیلاب اُمنڈ رہا ہے۔ لیکن تو پھولوں پر شبنم اسلئے برساتا ہے کہ باغ (قوم) میں تیری شہرت ہو جائے۔

شاعر سمجھا، اسی لئے مجھ سے "تاریخِ وفات" لکھنے کی فرمائش کرتی رہی ۱۲-

(۴) میں اگر رات بھر جلتی ہوں تو صبح ہوتے اسکا ثمرہ بھی میری نگاہ کے سامنے موجود ہوتا ہے۔ یعنی سیکڑوں پروانے میرے گرد سسکتے ہوتے ہیں۔ میں اپنی کامیابی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتی ہوں، (معشوق کے وجود کا مقصد یہی ہے کہ عشاق اُسپر نثار ہوجائیں) لیکن تو اپنے مستقبل اور اس میں کامیابی سے بالکل بے خبر ہے، بلکہ تیرے حال کو تیرے مستقبل سے کوئی ربط نہیں ہے۔

(۵) اگرچہ تو بھی میری طرح جل رہا ہے، لیکن تیرا سینہ "سوز دروں" سے خالی ہے۔ اور دنیا میں اصلی چیز یہی سوزِ دروں ہے یعنی دل کے اندر آگ لگی ہو۔ اور یہ حالت اُسوقت پیدا ہو سکتی ہے جب انسان سراپا شمع بن جائے۔ بس یہی وجہ ہے کہ تیرا شعلہ، لالۂ صحرا کی طرح ہے کہ چمک تو ہے لیکن جلن نہیں ہے۔

(۶) اے اقبالؔ تو خود غور کر! کیا رہنمائے قوم یا مصلح قوم کا لقب تجھے زیب دیسکتا ہے؟ جبکہ تیری قوم پیاس کے مارے مری جارہی ہے لیکن تیرا پیمانہ بالکل خالی ہے۔ یعنی جب تیرا سینہ خود عشق رسولؐ سے خالی ہے تو۔ تو اپنی قوم کو اس نعمت سے کیسے مالامال کر سکتا ہے؟

(۷) اے اقبالؔ! تیرا طریق کار، قوم کے طریق حیات سے بالکل مختلف ہے۔ تیری قوم تو عشق رسولؐ میں سرشار ہوکر، کامیاب ہو سکتی ہے، لیکن تو اسکو انگریزوں کی محبت کا سبق پڑھا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تیرا (یعنی قوم کے لیڈروں کا) چہرہ اسقدر بدنما ہوگیا ہے کہ آئینہ کو بھی اسکے دیکھنے سے شرم آتی ہے۔ بالفاظ دگر تیری بداعمالیوں سے تیری شخصیت (آئینہ) ساری دنیا میں ذلیل اور رسوا ہوگئی ہے۔

(۸) تیری زبان پر کعبہ کا نام ہے۔ لیکن دل میں بتخانہ (لندن) کی آرزو ہے۔ مجھے تو تیرے جذبۂ محبت (شوق) میں کوئی معقولیت نظر نہیں آتی۔ (شوریدہ سر یعنی دیوانہ)

(۹) جبکہ تیرے دل میں ترقی کی آرزو نہیں (واضح ہو کہ اقبالؔ کے واسطے سے شمع،

مسلمانوں کے لیڈروں سے خطاب کر رہی ہے) اور تیرا دل عشق رسولؐ کے جذبہ سے خالی ہے تو پھر قوم میں قیس (عشاق یا پروانے) کیسے پیدا ہو سکتے ہیں؟

(۱۰) اے مسلمان! اے چمکنے والے موتی! اے وہ کہ جسے اسلام نے اپنی آغوش میں پالا ہے، کس قدر افسوس کی بات ہے کہ تیرا دل، عشق رسولؐ سے بالکل خالی ہے!

(۱۱) اے اقبالؔ! تیری قوم تو اُجڑ گئی! تیرا گلشن تو برباد ہوگیا، اب تیری فریاد کون سُنے گا؟ تیرا نغمہ بے محل ہے بے موقع ہے، اور تیرا پیغام بے معنی ہے۔

تیسرا بند:۔ (۱) اسکی وجہ یہ ہے کہ جو مسلمان اپنے سینوں میں عشق رسولؐ کی آگ دبی رکھتے تھے، وہ تو ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں ختم ہوگئے۔ اور جو باقی بچے تھے، انہیں انگریزوں نے ۱۸۶۵ء میں مقدمہ سازش پٹنہ میں ماخوذ کرکے "کالے پانی" بھیجدیا۔ اور جب تک اپنی دانست میں، اس مہربان حکومت نے ایک ایک عاشق رسولؐ کو چُن چُن کے ختم نہیں کردیا، اُسوقت تک دار وگیر کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔

اے اقبالؔ! دیدار یار کے تمنائی تو سب ختم ہوگئے، اب تو خطاب اور جاگیر کے تمنائی باقی رہ گئے ہیں۔ اندریں حالات اگر تو دیدار عام کا وعدہ لیکر بھی آیا ہے تو کیا فائدہ؟ کس کے لئے؟ اب کون اسکے دیدار کا تمنائی ہے؟ اب تو سب لاٹ صاحب کے دربار میں کرسی کے تمنائی ہیں۔

(۲) تیری قوم میں جو لوگ عشق رسولؐ کے علمبردار تھے، وہ سب رخصت ہوگئے۔ اب اُس شراب کے پینے والے ہی نہیں تو اگر تو اب اپنی قوم کو عشق رسولؐ کا درس دے تو سنے گا کون؟ قوم تو کالجوں میں درس غلامی سُن رہی ہے۔

(۳) جب قوم کا شیرازہ ہی منتشر ہوچکا تو افراد (پھول) کو ترقی کا پیام کیا نفع دیسکتا ہے؟ جب قوم ہی مرگئی تو افراد کیسے زندہ رہ سکتے ہیں؟

(۴) اگر قوم کی خدمت منظور تھی تو ۱۸۵۷ء سے پہلے اسکا موقع تھا جب قوم مرگئی تو اب اسکو سرفروشی کا پیغام دینا بالکل بے سود ہے۔ اگر بسمل کا تماشا دیکھنا تھا تو رات کو کوٹھے پر آتے۔ جب وہ تڑپ تڑپ کر، صبح ہوتے ٹھنڈا ہوگیا تو اب (بوقتِ صبح) بالائے بام آنے سے کیا فائدہ؟ حقیقت یہ ہے کہ اس شعر کی معنویت تشریح سے بالاتر ہے۔ اگر میں صفحے سیاہ کرڈالوں تو بھی اُس سوز وگداز کی شرح نہیں کرسکتا، جو اس شعر میں پوشیدہ ہے۔

(۵) وہ جذبۂ عشق رسولؐ (شعلہ) جو ہر مسلمان (پروانہ) کا مقصود حیات تھا (کسی زمانہ میں) اب ختم ہوچکا ہے، لہذا اب اگر کوئی شخص قوم کو عشق کا پیغام دیتا ہے تو ریت میں سے تیل نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔

(۶) مسلمان، اسلام سے بالکل بیگانہ ہوچکے ہیں، بلکہ بے حس ہوچکے ہیں، اسلئے تو اب انہیں عشق رسولؐ کا درس دے یا نہ دے، دونوں باتیں اُنکی نظر میں یکساں ہیں۔ جب طلبہ، اسٹرائیک کرچکے ہوں تو گھنٹہ بجے یا نہ بجے، استاد کلاس میں آئے یا نہ آئے، اُنکی نظر میں یہ دونوں باتیں یکساں ہیں۔

چوتھا بند:۔ (۱) اے اقبالؔ! تو قوم کا رہنما ہے، تیرے پاس کافی دولت ہے، تجھے ہر قسم کی راحت نصیب ہے۔ تیرا تو ذکر ہی کیا ہے تیرے کتے اور باز بھی عیش کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ لیکن جب تیرا سینہ عشق رسولؐ سے خالی ہے تو پھر قدرتی بات ہے کہ تیری قوم بھی اس نعمت سے محروم رہتی۔ پھر تعجب کیا ہے اگر مسلمان اس لذت سے بیگانہ ہیں؟

(۲) تو کافی اثر اور رسوخ رکھتا ہے۔ تو اپنی قوم کو درس اتحاد دے سکتا تھا، تو اُن غریبوں کو جو تیری کوٹھیوں کے زیر سایہ رہتے ہیں، محبت کا سبق پڑھا سکتا تھا، (یعنی اُن سے محبت کرسکتا تھا) لیکن جب تو نے اُن کو اپنا بھائی سمجھنے کے

بجائے "کمیں" سمجھا، تو وہ کیوں غیروں کی آغوش میں نہ چلے جاتے؟

(۳) سچ تو یہ ہے کہ تیری قوم کے رہنماؤں میں نہ قوتِ ذکر (عشق) باقی رہی نہ قوتِ فکر۔ اسلئے قوم عاشقوں سے بھی معرا ہوگئی، اور حکماء سے بھی۔ یعنی اب قوم میں نہ کوئی محبوب الٰہیؒ ہے۔ نہ ابن رشد ہے۔

(۴) جب رہنماؤں کے سینے، عشق رسول کے جذبہ سے خالی ہیں تو اگر مسلمان انکی صحبت میں بیٹھیں بھی، تو کیا فائدہ حاصل کرسکتے ہیں؟

(۵) اس پر مستزاد یہ ہے کہ اگر کوئی رہنما، واقعی مخلص اور ہمدرد قوم ہو تو، نہ اب میکش باقی ہیں نہ میخانے۔ یعنی قوم تو بے حس ہوچکی ہے۔ اب اگر کوئی اللہ کا بندہ، عشق رسولؐ کا پیغام دے بھی، تو کس کو دے؟ عشق رسولؐ کی شراب پینے والے ہی دنیا سے اُٹھ گئے۔

نوٹ:۔ برکاتِ سلطنتِ انگلشیہ میں سب سے بڑی برکت یہ ہے کہ، قوم عاشقانِ رسولؐ کے وجود سے خالی ہوگئی!

ع جو اُس پر بھی نہ سمجھے وہ تو اُس بت سے خدا سمجھے

(۶) اسلام کے تمنائی اور رسولؐ کے شیدائی دونوں اس دنیا سے رخصت ہوچکے۔ اب نہ علما باقی ہیں، نہ صوفیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج وہ خانقاہیں بالکل سنسان پڑی ہوئی ہیں، جہاں آج سے سَو، سوا سَو سال پہلے عاشقان رسولؐ (لیلیٰ کے دیوانے) اشاعت اسلام کا عملی طریقہ (پریکٹیکل ٹریننگ) حاصل کیا کرتے تھے۔[1]

---

[1] انقلاب ۱۸۵۷ء سے کچھ عرصہ پہلے تک صرف دلی میں کئی خانقاہیں ایسی تھیں جو عاشقان رسولؐ کو تبلیغ واشاعت اسلام کے لئے تیار کرتی تھیں، انکا تذکرہ سرسید مرحوم نے اپنی کتاب موسومہ "آثار الصنادید" میں کیا ہے، جو دلی سے ۱۸۴۷ء میں شائع ہوئی تھی۔

پاش پاش ہوگئی - یعنی آزادی اسکے حق میں نالہ وفریاد کا سبب بن گئی (شعر میں حُسنِ تعلیل ہے جسکی تشریح حل لغات میں کرچکا ہوں)

(۴) شمع کہتی ہے کہ اے اقبالؔ! کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ اللہ کی رحمت کی تجلی، جن مسلمانوں کے دیدار کی خود مشتاق تھی، وہ مسلمان خود ہی، اللہ کی رحمت سے ناامید ہوگئے ہیں ؂ ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں۔

(۵) کل تک، یعنی گذشتہ صدی تک ہزاروں مسلمان ہندستان میں تبلیغ واشاعت اسلام پر کمربستہ تھے اور ہندوؤں کو قرآن کا پیغام سُناتے تھے۔ لیکن سخت حیرانی ہے کہ اب بیسوی صدی میں ساری قوم عمل سے بیگانہ اور اشاعت اسلام سے نفور ہوگئی ہے "دل میں کیا آئی کہ پابند نشیمن ہوگئیں" اس مصرع میں غالب کا انداز بیان جھلکتا ہے - جس کی وجہ سے بڑی دلکشی پیدا ہوگئی ہے۔

(۶) ایک زمانہ وہ بھی تھا، جب مسلمان ساری دنیا پر چھائے ہوئے تھے لیکن آج یہ کیفیت ہے کہ ہندستان سے مراقش تک "چناں خفتہ اند کہ تو گوئی مردہ اند" جو بجلی (قوم) کبھی ساری دنیا کو اپنی چمک دکھاتی تھی وہ آج اپنے خرمن کے گوشہ میں پڑی سورہی ہے، اُس نے چمکنا بالکل چھوڑ دیا (قوم نے سرفروشی چھوڑدی -)

(۷) اے اقبالؔ! میں باغ کی سیر کے لئے کیوں جاؤں؟ میرا دامن تو سُرخ آنسوؤں سے خود رشک گلزار بنا ہوا ہے۔

(۸) لیکن میری شامِ غم، صبح عید کی خبر دیتی ہے - کیونکہ رات کی تاریکی میں مجھے اُمید کی ایک کرن نظر آرہی ہے، اسلئے میں سمجھتا ہوں کہ مسلمان قوم کی مصیبتوں کا زمانہ عنقریب ختم ہوا چاہتا ہے۔

دشتِ جنوں پرور سے وہ خانقاہیں مراد ہیں جہاں جنوں (عشق رسولؐ) کا درس دیا جاتا تھا - اور رقص سے اشاعتِ اسلام کی مشق (ٹریننگ) مراد ہے۔ ۱۲

(۷) افسوس صد افسوس! قافلہ (مسلمانوں) نے اپنی ساری پونجی (جذبہ عشق رسولؐ) دھڑی دھڑی کرکے لٹوادی! اُسپر مستزاد یہ ہے کہ قوم کے دل سے اس نقصان عظیم کا احساس بھی جاتا رہا - اگر احساس باقی رہتا، تو ممکن تھا کہ قوم اس نقصان عظیم کی تلافی پر کمربستہ ہوجاتی - لیکن جس مریض کے دل سے مرض کا احساس نکل جائے، اسکی صحت کی توقع کیسے ہوسکتی ہے؟

پانچواں بند:- (۱) جس قوم کے کارناموں سے دشت وصحرا گونجتے تھے، آج اُس قوم کے شہر، ویرانوں میں تبدیل ہوچکے ہیں۔

(۲) جن مسلمانوں کے دم سے، ہندستان میں، توحید کی سطوت (عظمت اور شوکت، رعب اور دبدبہ) قائم ہوئی تھی - افسوس ہے کہ اُن مسلمانوں کے نام لیواؤں نے ہندوؤں کے مشرکانہ عقائد اختیار کرلئے - ظاہر ہے کہ اگر مسلمان خود ہی بت پرستی کرنے لگے، خود ہی برہمن (گاندھی) کے ہاتھ پر بیعت کرلے، اور اپنے خطبۂ صدارت میں مسلمانوں کو اُس کی رہنمائی پر اعتماد کرنے کی تلقین کرے (دیکھو کانگرس کا خطبۂ صدارت فرمودہ جناب ابوالکلام صاحب آزاد ۱۹۴۰ء) تو پھر وہ مسلمان کسی برہمن کو اسلام کی تبلیغ کیسے کرسکتا ہے؟

ہوئی نہ زاغ میں پیدا بلند پروازی
خراب کرگئی شاہیں بچہ کو صحبتِ زاغ

(۳) اگر کوئی قوم، دنیا میں عیش دوام (ابدی راحت) کی آرزومند ہے، تو اُسے قانون (فطرت) کی پابندی کرنی لازمی ہے - دیکھ لو! موج کو آزادی مل گئی اور اُس نے اپنی حدود سے تجاوز کیا تو کیا نتیجہ نکلا؟ ساحل سے ٹکرا کر

چھٹا بند:- مرثیہ یا نوحہ خوانی کے بعد، اقبالؔ، کمال قادر الکلامی کے ساتھ ڈرامائی انداز میں (تاکہ تاثیر پیدا ہوسکے) قوم کو امید کا پیغام دیتے ہیں کہتے ہیں کہ

(۱) اے حجاز کے میکدے سے جام شراب پینے والے! یعنی اے قوم کے سچے ہمدردو! تمہیں خوشخبری دیتا ہوں کہ سو سال کے بعد اب مسلمانوں کو اپنی زبوں حالت کا پھر کچھ احساس ہونے لگا ہے۔

(۲) اسلئے وہ مسلمان جو اپنی غیرت کی دولت کافروں کی شراب (عقاید ورسوم وعادات) خریدنے پر صرف کررہے تھے، اب پھر اسلام کی طرف مائل ہورہے ہیں۔

(۳) اُن کے دلوں سے غیر اسلامی تصورات رفتہ رفتہ نکلتے جارہے ہیں۔ اور وہ پھر اسلامی اُصول (مسلیٰ) کی طرف راغب ہوتے جاتے ہیں۔

(۴) شکر ہے کہ مسلمان پھر شراب خانہ ساز (ارشادات نبویؐ) کی طرف متوجہ ہورہے ہیں اور صاف لفظوں میں اعلان کررہے ہیں کہ مغربی تعلیم وتمدن نے ہمارے دل کو اسلام سے بیگانہ کردیا ہے - اسلئے ہم اب اس مغربی تہذیب سے متنفر ہیں۔

(۵) پس اے ہمدردانِ قوم! اب میدان عمل میں آجاؤ، اور اپنی قوم کو عشق رسولؐ کی شراب پلا کر متوالا بنادو - مایوسی کی رات گذر گئی - اور امید کی صبح طلوع ہوگئی۔

(۶) اب قوم کے غم میں اپنے آپ کو گھُلادو، اور دوسروں کو بھی گھُلادو - یعنی خود بھی قوم کو بیدار کرو، اور دوسروں کو بھی اسی کام کی ترغیب دو - میں نے تم سے ایک قیمتی بات کہدی ہے - اگر تم میں صلاحیت ہے، تو اُس کو سُنو اور سمجھو۔

(۷) مشہور مقولہ ہے کہ شاعری بھی پیغمبری کا ایک شعبہ یا حصہ ہے - اسلئے میں قوم کو فرشتہ کا وہ پیغام جو اُس نے مجھے سُنایا ہے، سنانا چاہتا ہوں۔

(۸) اور قوم کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ مجھ سے "کسیؑ" نے دیدار دکھانے کا وعدہ کرلیا ہے، اسلئے مسلمانوں کو چاہئے کہ ہر وقت بیدار رہیں، خدا جانے کس وقت اُنؐ کے دل میں آجائے، اور وہ محمل کا پردہ اُٹھادیں - نیز میں افراد قوم کے دلوں کو، اپنی شاعری کے سوز سے زندہ کرنا چاہتا ہوں۔

ؔع اب جگر تھام کے بیٹھو، مری باری آئی:-

ساتواں بند:- (۱) اس بند میں مسلمانوں کو ان کے زوال کے اسباب سے آگاہ کرتے ہیں - کہ اے مسلمان! تیرے اندر حکومت اور دولت، اور عشرت کی بنا پر تن آسانی کا مرض پیدا ہوگیا - جب تک تجھ میں صحرائی بدوی یا سپاہیانہ زندگی باقی رہی، تو جہانگیری کرتا رہا - لیکن جب تو گلشن (لال قلعہ) میں آگیا تو گھٹ کر چھوٹی سی نہر رہ گیا۔

(۲) جب تک مسلمان، اپنی اصلیت (اسلام) پر قائم تھا یعنی اسلامی تعلیمات پر عامل رہا تو اس میں اجتماعی شان (جو اسلام کا طغرائے امتیاز ہے) بھی موجود رہی - لیکن جب اُس نے اسلامی اُصول ترک کردیئے تو دنیا میں اسی طرح پریشان، منتشر اور آوارہ ہوگیا، جس طرح غنچہ سے خوشبو نکل کر پریشان ہوجاتی ہے۔

(۳) اے مسلمان! اگر تو رازِ حیات سے آگاہ ہونا چاہتا ہے، تو قطرہ کی زندگی کا مطالعہ کرلے - قطرۂ آب تو ایک ہی ہے - لیکن یہی پانی کا قطرہ کبھی گوہر (موتی) بنجاتا ہے، کبھی شبنم، کبھی آنسو، یہ بات کیا ہے؟ صرف یہ کہ وہ قطرہ اپنی اصل پر قائم رہکر اپنے آپ کو مختلف صورتوں میں تبدیل

کرتا رہتا ہے۔ اسی طرح اگر مسلمان اپنی اصل پر قائم رہے، اور ملت سے ربط استوار رکھے تو دنیا کی ہر جماعت میں جاکر کام کر سکتا ہے، اور ہر جگہ ظاہری حالت میں تبدیلی کے باوجود اپنے آپ کو زندہ رکھ سکتا ہے، اور دنیا کے لئے مفید مطلب بن سکتا ہے۔

(۴) اے مسلمان! ملت سے ربط و ضبط، فرد کے حق میں، اور اسکی انفرادی زندگی کی بقا کے لئے، اشد ضروری ہے (سب سے بڑی دولت ہے) اگر فرد اپنی قوم سے بیگانہ ہوجائے تو زندہ نہیں رہ سکتا۔

(۵) اے مسلمان! دنیا میں تیری جو کچھ آبرو باقی تھی، وہ محض اس بنا پر تھی کہ تیرے اندر ملت کا احساس موجود تھا، اور تجھ میں اجتماعی شان پائی جاتی تھی لیکن جب تونے "اپنی ڈفلی، اپنا راگ" پر عمل کرنا شروع کردیا، جب افراد ملت سے اور مفاد ملی سے بیگانہ ہوگئے تو، تو دنیا بھر میں رسوا ہوگیا۔

(۶) اے مسلمان! یاد رکھ کہ فرد کی زندگی ملت سے ربط قائم رکھنے پر موقوف ہے۔ جس طرح شاخ کی زندگی تنہ سے وابستہ رہنے پر منحصر ہے یا جس طرح موج کا وجود اُسی وقت تک باقی رہتا ہے، جب تک وہ دریا میں رہتی ہے۔ اگر موج اپنا تعلق دریا سے منقطع کرلے، تو ایک آن میں اُسکا وجود فنا ہوجائیگا۔ قوم سے جدا ہوکر، کسی مسلمان فرد کا کوئی وجود باقی نہیں رہتا۔ ہاں یہ ضرور ہوتا ہے، کہ غیر اقوام اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے اُس فرد کو تھوڑے دنوں کے لئے "راشٹرپتی" بنا دیتی ہیں۔

آٹھواں بند:- (۱) اب اقبالؔ، مسلمانوں کو دوبارہ سربلندی حاصل کرنے کی ترکیب بتاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اے مسلمان! ابھی تیرے اندر عاشقی کا جذبہ پورے طور سے پیدا نہیں ہوا ہے، اسلئے ابھی اس

جذبہ کو آشکارا مت کر، بلکہ خفیہ طریق پر اسکی نشوونما کر۔ شراب جس قدر زیادہ عرصہ تک مٹکے میں پڑی رہتی ہے۔ اُسی قدر زیادہ تیز ہوجاتی ہے اور جب بوتل میں آجاتی ہے، تو سب پر ظاہر ہوجاتی ہے۔ لہذا فی الحال یہ کام کر کہ

(۲) کلیمؑ کی طرح وادی ایمن میں آکر ڈیرے ڈالدے اور خدا سے دیدار کی التجا کر، یعنی پہلے صحیح خطوط پر اپنی سیرت کی تشکیل کر۔ اپنے اندر اسلامی رنگ پیدا کر۔ اپنا تزکیہ نفس کر، مختصر یہ کہ اپنے کریکٹر کی تکمیل کر، جسکے بغیر کوئی انسان زندگی کے کسی شعبہ میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ شعلۂ تحقیق سے اپنے آپ کو جلا کر خاک سیاہ کردے۔ یعنی قرآن اور حدیث کا صحیح علم حاصل کر۔ تقلید کورانہ، اور رسوم جاہلانہ سے اجتناب کر، جس بات کا تجھے صحیح علم حاصل نہ ہو اسکی پیروی مت کر[1]۔

(۳) جب تجھ میں باطل کا، یعنی اپنے دشمنوں کا مقابلہ کرنے کی طاقت پیدا ہوجائے تو پھر میدان عمل میں آجا۔ جن مسلمانوں کو دشمنوں نے اسلام کی سربلندی کی کوشش کے جرم میں تختہ دار پر چڑھایا، یا کالے پانی بھیجا، اُن سچے مسلمانوں کی زندگی (خاکستر پروانہ) سے سبق حاصل کر اور اپنی قوم کو اُن شمع حریت کے پروانوں کے نقش قدم پر چلنے کی تلقین کر، تاکہ مسلمان، اُن شہدا کی خاک (بلکہ خون) سے مسلمانوں کے لئے سربلندی اور سرداری کا نیا قصر تعمیر کرسکیں۔ اور قوم کے

[1] اقبالؔ نے اس مصرع میں قرآن مجید کی اس آیت کا ترجمہ کردیا ہے:-
وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (۱۷ : ۳۶)
اور جس بات کا تجھکو (صحیح) علم نہو، اسکی پیروی مت کر، یا اسکے پیچھے مت پڑ۔

دل میں ایسی آگ لگادے کہ وہ سربکف ہوکر دشمنوں کے مقابلہ میں آجائے۔ تاکہ اُنہیں (شمع) بھی اپنی طرزِ ستم (ظالمانہ طریق حکومت) کا انجام معلوم ہو، اور وہ اپنی اسلام دشمنی اور ملت کُشی کا مزہ چکھ سکیں!

(۴) اے مسلمان سب سے پہلے خودداری کا سبق پڑھ! ساقی کا احسان مت اُٹھا، بلکہ حباب سے سبق حاصل کر کہ وہ دریا میں رہتا ہے، لیکن اُس سے ایک بوند بھی طلب نہیں کرتا۔

(۵) اب ماضی کی غفلت پر نوحہ خوانی سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اگر طرابلس، ٹیونیشیا، مراقش یا صقلیہ ہاتھوں سے نکل گیا تو کوئی پروا نہیں ہے، نئے ممالک فتح کرنے کا انتظام کر۔

(۶) اگر مقدر (تقدیر الٰہی) نے تجھکو خاک میں ملا دیا ہے تو بھی کوئی پرواہ مت کر۔ جس طرح دانہ خاک میں مل کر، شگوفہ بن کر پھوٹتا ہے اور اُگ سکا تنہ، اسکے لئے عصا کا کام دیتا ہے، جس کے سہارے وہ کھڑا ہوسکتا ہے، اُسی طرح تو بھی اپنی مخفی صلاحیتوں کو بروئے کار لا۔ اور نئی زندگی حاصل کرلے۔

(۷) اے مسلمان! دشمنوں کے آشیاں سے کنارہ کرکے اسلام کے دامن میں پناہ لے۔ اور اُسی شاخ کُہن پر آشیاں بنا، جس پر خالدؓ جانباز نے اپنا آشیانہ بنایا تھا۔ پہلے خود شریعت پر عمل کر، پھر قوم (اہل گلشن) کو اتباع رسولؐ کا درس دے۔

(۸) اے مسلمان! یہ منافقانہ روش چھوڑدے کہ جب "صاحب" سے ملنے گیا، تو اپنی گفتگو سے، اپنے آپ کو میر جعفر، اور میر صادق کا صحیح جانشیں ثابت کردیا، اور جب عید کے دن "شاہی مسجد" میں

آیا تو قرآن سر پر رکھکر اپنی جان، قوم کے لئے قربان کرنے کا اعلان کردیا۔ اے مسلمان! یا تو مسلمان بن جا، یا علانیہ کفر اختیار کرلے۔ دورنگی چھوڑدے۔

(۹) اے مسلمان! تو کیوں خاموش ہے؟ تو کیوں قرآن کا پیغام لوگوں کو نہیں سُناتا؟ (شبنم گرتی ہے تو آواز نہیں ہوتی۔ اسی طرح مسلمان بھی کوئی ہنگامہ برپا نہیں کرتا) اے مسلمان تو میدان عمل میں آ تو سہی! زبان کھول تو سہی! تیرے پاس تو وہ نغمہ ہے کہ اگر تو اُسے سُنائے تو ساری دنیا محوِ حیرت ہوجائے۔

نواں بند:- (۱) اب مسلمان کو اسکی حقیقت سے آشنا کرتے ہیں:- "حقیقت" سے یہاں ذاتی خوبیاں یا اوصاف مراد ہیں۔ کہتے ہیں کہ اے مسلمان! تو ذرا اپنی حقیقت یعنی اُن مخفی صلاحیتوں پر بھی تو غور کر جو اللہ نے تیرے اندر ودیعت فرمادی ہیں یعنی تیرے اندر ترقی کی بے اندازہ صلاحیت پوشیدہ ہے، تو ساری دنیا کی خوبیاں اپنے اندر رکھتا ہے تیری شخصیت تمام کمالات کا خزانہ ہے، تو دانہ بھی ہے، باراں بھی ہے اور حاصل بھی ہے۔

(۲) تو کیوں دوسروں کی تقلید کا آرزومند ہے؟ تو غیروں کا سہارا کیوں تلاش کرتا ہے؟ جبکہ تو خود راہرو ہے، خود راہبر ہے، اور خود ہی اپنی منزل ہے۔

(۳) تو طوفان (مصائب) کے اندیشہ سے کیوں خوفزدہ ہے؟ اے نادان! تو خود ہی ناخدا ہے۔ خود ہی بحر ہے، اور خود ہی کشتی ہے۔

(۴) تو کبھی تنہائی میں بیٹھکر مراقبہ تو کر! تاکہ تجھے یہ معلوم ہوسکے کہ

تو جسکی تلاش میں سرگرداں ہے وہ خود تیرے دل میں پوشیدہ ہے۔

(۵) افسوس! تو کس قدر نادان ہے! تو اپنے آپ کو ساقی کا محتاج سمجھتا ہے، حالانکہ ساقی بھی تو ہی ہے، اور مینا بھی تو ہی ہے، اور محفل بھی تو ہی ہے۔

(۶) اے مسلمان عشق رسولؐ اختیار کرلے، پھر تو شعلہ بن جائیگا، اور تجھ میں اس قدر طاقت پیدا ہوجائیگی کہ تو کفر کا خاتمہ کردیگا۔ تجھے باطل (دشمنان ملت) سے کیا خوف ہوسکتا ہے، جبکہ تو بذات خود، غارتگرِ باطل ہے۔ تجھے تو اللہ نے پیدا ہی اسلئے کیا ہے کہ تو ہر نقشِ باطل کو دنیا سے مٹادے۔

(۷) اے بیخبر! (کس قدر برمحل خطاب ہے) اے غافل مسلمان! تو اس کائنات کے لئے باعثِ قیام ہے۔ اگر تو نہ ہو تو یہ دنیا بالکل مہمل اور بیکار ہے۔ کیوں؟ اسلئے کہ تو حامل قرآن ہے، اور قرآن، دنیا میں خدا کا آخری پیغام ہے۔ اسکے بعد اس دنیا کی اصلاح کے لئے کوئی قانون نازل نہیں ہوگا۔ اگر تو مٹ جائے تو قرآن مٹ جائیگا، اور قرآن مٹ جائیگا، تو نظام عالم، تہ و بالا ہوجائیگا۔ اسلئے تیرا وجود اس دنیا کے لئے لازمی اور ضروری ہے۔

دسواں بند:۔ اے غافل! ذرا اپنی اصلیت سے تو آگاہی حاصل کر! تو دیکھنے میں قطرہ نظر آتا ہے۔ لیکن تو سمندر کی طرح بے پایاں بھی تو ہے۔ یعنی تجھ میں خلافتِ الٰہیہ کے مقام پر فائز ہونے کی صلاحیت بھی تو مخفی ہے۔ اسلئے تیری روحانی طاقتیں سمندر کی طرح بے پایاں ہیں۔

واضح ہو کہ مسلمان جب "مومن" بنجاتا ہے، تو نیابتِ الٰہیہ کے مرتبہ پر فائز ہوجاتا ہے۔ لیکن اقبالؔ کا "مردِ مومن" بہت بلند مرتبہ ہے۔ اسکی نظیر آپ کو حضرت شیخ ہجویریؒ، حضرت خواجہ اجمیریؒ حضرت محبوب الٰہیؒ، حضرت مجددؒ الف ثانیؒ، یا حضرت میاں میرؒ کی زندگی میں مل سکتی ہے۔ واضح ہو کہ اقبالؔ کا مردِ مومن، زمان و مکان دونوں پر حکمران ہوتا ہے۔ یہ اسکی خصوصیات میں سے پہلی خصوصیت ہے۔ علامہ اقبالؔ نے ایک مرتبہ مجھ سے کہا تھا کہ " زمانہ کی حقیقت کو سمجھنا بہت مشکل ہے"۔ تو اس پر حکمران ہونا جس قدر مشکل ہے، ناظرین اسکا اندازہ خود کرسکتے ہیں، جب تک بقول اقبالؔ ایک مسلمان فنا فی الرسولؐ نہ ہوجائے اس وقت تک مومن (حقیقی معنیٰ میں) نہیں بن سکتا۔ افسوس کہ میں اس شرح میں اسکی تفصیل نہیں کرسکتا۔

(۲) اے مسلمان! تو کیوں احساس کمتری کے مرض میں مبتلا ہوگیا ہے؟ تو اگر کسی مرشد کی صحبت میں بیٹھکر دیکھنے کی طاقت پیدا کرلے تو تجھے صاف نظر آجائیگا کہ تجھ میں تو انقلاب برپا کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔

(۳) اے مسلمان! تو اس دنیا میں اللہ کے پاک کلام (قرآن حکیم) کا امین ہے، وہ اللہ جو اس دنیا میں، آنکھ سے تو بیشک نظر نہیں آتا، لیکن اس دنیا کا نظام اسکی ہستی پر گواہی دے رہا ہے۔

(۴) اے مسلمان! اگر تو غور کرے تو تیرے پاس وہ سامان بھی ہے جسکی بدولت تو ساری دنیا کو بے تیغ و تفنگ، فتح کرسکتا ہے۔ سامان سے مراد عشق رسولؐ ہے۔ یعنی اگر مسلمان تبلیغ و اشاعت اسلام پر کمربستہ ہوجائیں اور قرآن حکیم کی پاکیزہ تعلیمات کو دنیا میں پھیلانے کا تہیہ کرلیں تو ساری دنیا مسلمان ہوسکتی ہے۔ اور جب ساری اقوام مسلمان ہوجائیگی تو دوسرے لفظوں میں اسکا مطلب یہ ہے کہ مسلمان ساری دنیا کو فتح کرلیں گے۔

(۵) اے مسلمان! اُس عہد کو یاد کر جو تیرے آباؤ اجداد (صحابہ کرامؓ) نے مسلمان ہونے کے وقت سرکارِ دوعالم صلعم سے کیا تھا کہ ہم ساری دنیا میں اسلام کی تبلیغ کرینگے۔ کوہ فاراں (ظہور اسلام کا مادّی نشان) کی خاموشی آج تک اس عہد پر شہادت دے رہی ہے۔ پس تو بھی اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم پر چل کر ایفائے عہد کر۔

(۶) اے مسلمان! تو نے اپنی کم فہمی کی بنا پر دنیا کے چند ممالک میں تبلیغ اسلام کرکے یہ سمجھ لیا کہ فرض تبلیغ ادا ہوگیا۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام تو عالمگیر ضابطۂ حیات ہے۔ اس میں تو یہ صلاحیت ہے کہ ساری دنیا کو اپنے نور سے منور کرسکتا ہے۔

(۷) جس طرح بوتل میں شراب اس لحاظ سے پوشیدہ ہے کہ اسکے اندر ہے لیکن اس اعتبار سے ظاہر ہے کہ اس میں سے نظر آسکتی ہے اسی طرح میرے دل میں تبلیغ و اشاعت اسلام کا جذبہ پوشیدہ ہے۔ لیکن میری نظموں سے ظاہر ہوسکتا ہے۔

(۸) یہ سچ ہے کہ تو نے صبحگاہی نے میرا جگر خون کردیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ پہلے عشق رسولؐ نے مجھے جلایا ہے پھر میں نے قوم کے دل میں آگ لگائی ہے لیکن اس صورت حال کو میں اسلئے گوارا کرتا ہوں کہ میری زندگی موقوف ہے، مسلمانوں کو عشق رسولؐ کا پیغام دینے پر۔ اگر میں اس آگ کو ٹھنڈا کردوں تو اسکے ساتھ خود بھی ٹھنڈا ہوجاؤنگا۔ اس شعر کی خوبی اسکے اندازِ بیان میں مضمر ہے۔

(۹) اگر تو یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ میرے اشعار میں یہ سوز و گداز کہاں سے پیدا ہوگیا، تو میرے دل کی حالت کا معائنہ کر۔ میرا دل عشق رسولؐ کی آگ میں فنا ہوچکا ہے۔ اور اگر تو اپنی تقدیر کا جلوہ دیکھنا چاہتا ہے، تو وہ بھی تیرے دل کے آئینہ میں نظر آسکتا ہے۔ یعنی تو بھی عشق رسولؐ اختیار کرلے، تجھے اپنی تقدیر کا علم حاصل ہوجائیگا۔ یہ بڑا بلیغ شعر ہے۔ ایسے اشعار کا مطلب، چند سطور میں بیان نہیں ہوسکتا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر مسلمان، نوشتہ تقدیر سے آگاہ ہونا چاہتے ہیں، اپنے مستقبل سے واقف ہونا چاہتے ہیں کہ ہماری تقدیر میں کیا ہے؟ تو وہ عشق رسولؐ اختیار کرلیں۔ انہیں معلوم ہوجائیگا کہ کاتب تقدیر نے انکی تقدیر میں کامیابی ہی کامیابی لکھی ہے۔

آخری بند:۔ اے مسلمان! اگر تو عشق رسولؐ اختیار کرلے تو اسکا نتیجہ یہ نکلے گا کہ دنیا قرآن کے نور سے منور ہوجائیگی، اور کفر کی تاریکی مٹ جائیگی۔

(۲) اور دنیا میں اسقدر برکت راحت اور مسرّت پیدا ہوجائیگی کہ بے زبان چیزیں بھی برکات اسلام پر زبان حال سے گواہی دینے لگینگی۔

نوٹ:۔ اقبالؔ نے یہ ساری نظم رمزیہ انداز میں لکھی ہے، اسلئے میں نے لفظی ترجمہ نہیں کیا، کیونکہ اس سے شاعر کا مفہوم ادا نہیں ہوسکتا۔ بلکہ مرادی معنی درج کئے ہیں۔ مثلاً اس مصرع کا اگر یہ ترجمہ لکھدوں کہ "کلی میں جو خوشبو سورہی ہے یا پوشیدہ ہے، وہ غنچہ کی آواز بنجائیگی" تو مطلب واضح نہیں ہوسکتا۔

(۳) مسلمانوں کے اندر اتحاد اور اتفاق کا رنگ پیدا ہوجائیگا اور مخالف بھی دوست بنجائینگے۔

(۴) میرا کلام (پیغام) ایسا سوز و گداز پیدا کریگا، کہ ملت کا ہر فرد، دوسروں کا ہمدرد اور غمگسار بن جائیگا۔

(۵) آج جو قومیں اسلام کی تخریب کے درپے ہیں، ان قوموں میں خود بخود زوال کے آثار پیدا ہوجائینگے۔ اور انکی ریشہ دوانیاں، خود انہی کے حق میں

دبال ہوجائیگی۔

(۶) مسلمان پھر مساجد کو آباد کرینگے۔ اور غیر اللہ سے قطع تعلق کرکے، اللہ کے حضور میں سرِ نیاز خم کرنے لگیں گے۔ جس کی بدولت وہ فضل الٰہی کے مستحق ہوجائینگے۔

(۷) جب دشمنانِ ملت (صیاد) اسلام کے حلقہ بگوش ہوجائینگے تو مسلمانوں (طیور) کے قلوب، مسرت کے نغموں سے لبریز ہوجائینگے۔ اور ان دشمنانِ ملت (گلچیں) کے مسلمان ہوجانے سے اسلام کو شان وشوکت نصیب ہوگی۔

(۸) مختصر یہ کہ اگر مسلمان، تبلیغ اسلام پر کمربستہ ہوجائیں، تو دنیا میں ایسا انقلاب رونما ہوجائیگا کہ میں اسکی تفصیل بیان نہیں کرسکتا۔ جس طرح عربوں نے اسلام کی اشاعت کی بدولت، نئی دنیا پیدا کردی تھی، اُسی طرح اسلام کی حیات ثانیہ کے بعد اس دنیا کا نقشہ بالکل بدل جائیگا۔

(۹) انشاء اللہ وہ دن ضرور آئیگا، جب اسلام کا آفتاب ساری دنیا پر چمکیگا، اور کفر کی تاریکی دنیا سے یکسر مٹ جائیگی۔ اور ساری دنیا توحید کی دولت سے مالامال ہوجائیگی۔

نوٹ:۔ اقبالؔ نے اس بند کا مضمون قرآن حکیم کی اس آیت سے اخذ کیا ہے:۔ هُوَ الَّذِيْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ؕ اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ تاکہ وہ دین اسلام کو تمام ادیانِ عالم پر غالب کردے۔ پس اقبالؔ کا پیغام یہ ہے کہ مسلمان تبلیغِ

اسلام پر کمربستہ ہوجائیں، تاکہ ساری دنیا توحید کے نور سے منور ہوجائے ۱۲

نظم بر صـ۲۱۶

حلِّ لغات آہ میں مستور ہے۔ یعنی تو ہر وقت آہ و نالہ کرتا رہتا ہے + لیلیٰ سے اُمید مراد ہے + آوازِ سرودِ رفتہ، سے مسلمانوں کی عظمتِ ماضی کی داستان مراد ہے + ہنگامۂ حاضر سے حالات حاضرہ مراد ہیں + ہم نوایانِ چمن سے مسلمان افراد مراد ہیں + قصۂ گل سے مسلمانوں کی تاریخ ماضی مراد ہے + پیغامِ کہن سے اسلام مراد ہے + درائے کاروانِ خفتہ پا۔ لفظی معنی، اُس قافلہ کا گھنٹہ جو سورہا ہے مراد ہے ذاتِ شاعر۔ یعنی اقبالؔ اُس قوم کا شاعر ہے جو خوابِ غفلت میں گرفتار ہے + شمع سے روشن الخ یعنی تیرے کلام سے مسلمان بیدار نہیں ہوسکتے + شب دوشینہ۔ گذری ہوئی رات + توحید کا حامل۔ یعنی توحید کا علمبردار۔ شاہد عادل۔ معتبر گواہ + نبضِ موجودات، یعنی ساری کائنات + حرارت یعنی زندگی + تخیّل یعنی خیالات یا ارادے + جسارت۔ ہمت، حوصلہ، دلیری + صداقت سے توحید الٰہی مراد ہے + ناموس عزت + پیرہن سے زیب وزینت مراد ہے + کوکب تابندہ۔ چمکتا ہوا ستارہ + افسونِ سحر سے صبح کی روشنی مراد ہے + چشم بر عہدِ کہن، یعنی پُرانے دور کی واپسی کا منتظر۔ پُرانے دور سے پُرانا زمانہ مراد نہیں ہے، کیونکہ وہ تو واپس نہیں آسکتا، بلکہ اس سے مسلمانوں کا عروج مراد ہے، جیساکہ پُرانے دور میں ان کو حاصل ہوا تھا + اہل محفل، یعنی مسلمان قوم + پُرانی داستان یعنی صدر اوّل کے مسلمانوں کے عروج کی داستان + میری خاک کو اکسیر یعنی یادِ عہدِ رفتہ مجھے زندگی بخشتی ہے۔ میرے جذبات کو اُبھارتی ہے +

تبصرہ یہ نظم اقبالؔ نے ۱۹۱۲ء میں لکھی تھی، جبکہ وہ قرآن مجید کے مطالعہ میں منہمک تھے۔ اُن کے دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ اس زمانہ میں وہ تہجد کے وقت اُٹھکر قرآن حکیم کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ یعنی اسکے سمندر سے حقائق ومعارف کے موتی نکالتے تھے۔ اور اکثر اوقات ان پر اسقدر رقت طاری ہوتی تھی کہ کلام پاک کے صفحات اُن کے موتیوں سے تر ہوجاتے تھے۔ قرآن حکیم میں اسی تدبر کا نتیجہ ۱۹۱۴ء میں اسرارِ خودی، اور ۱۹۱۵ء میں رموزِ بیخودی کی شکل میں دنیا کے سامنے آیا۔ انہی دو کتابوں نے اقبالؔ کو دنیا کے حکماء کی صف میں جگہ دی۔ انکا سارا فلسفہ انہی دو کتابوں میں مدوّن ہے۔ اور تمامتر قرآن حکیم سے ماخوذ ہے۔

قرآن عزیز ہی کے مطالعہ سے اُن پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ "مسلم" کی صفت کیا ہے۔ اور اس نظم میں اُنہوں نے اسی لفظ کی وضاحت کی ہے اس نظم سے اُس انقلاب کا حال بھی معلوم ہوسکتا ہے، جو انکی ذہنیت میں پیدا ہوچکا تھا۔ اب وہ ہمالہ اور دنیا شوالہ کے بجائے "اسلام" اور "مسلم" کی حقیقت پر غور کررہے ہیں۔ اور مسلمانوں کو بیداری کا پیغام دے رہے ہیں۔

مطلب اقبالؔ کے ایک دوست نے یہ اعتراض کیا کہ اے اقبالؔ! تو ہر وقت نالہ وفریاد کرتا رہتا ہے۔ خود بھی روتا ہے، ہمیں بھی رُلاتا ہے، تو کبھی اُمید کا پیغام نہیں سُناتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ جذبہ تیرے دل (مجھی) میں کبھی پیدا ہی نہیں ہوتا۔ تیرے کان ہمیشہ مسلمانوں کی عظمت ماضیہ کی داستان سُننے کے منتظر رہتے ہیں اور تو موجودہ زمانہ کے واقعات سے بیخبر رہتا ہے۔ حالانکہ صورت حال یہ ہے کہ تیرے زمانہ کے مسلمان، پُرانی داستانیں سُننا پسند نہیں کرتے۔ لہذا میں تجھے مشورہ دیتا ہوں کہ تو اپنے طریق کار میں تبدیلی

پیدا کر یا خاموش ہوجا، آخر قوم کو مسلمانوں کی گذشتہ تاریخ سُنانے سے کیا فائدہ؟ تیری شاعری بہت یاس انگیز ہے۔ اسی لئے قوم اسے پسند نہیں کرتی۔ حقیقت حال یہ ہے کہ تیری قوم مردہ ہوچکی ہے۔ مسلمانوں کی عظمت کا دور گذشتہ، اب واپس نہیں آسکتا۔ جس طرح شمع جلانے سے گذری ہوئی رات واپس نہیں آسکتی۔

یہ اعتراض سُن کر اقبالؔ نے جواب دیا: کہ

(۱) اے دوست! میں مسلم ہوں، اور اللہ نے مسلم پر کچھ فرائض عائد کئے ہیں، جنکی تفصیل یہ ہے کہ

(أ) میں دنیا میں توحید الٰہی کا حامل، اور علمبردار، اور مبلغ، اور محافظ ہوں۔ اور میری زندگی کا مقصد اسکے سوا اور کچھ نہیں کہ میں توحید کی اشاعت اور حفاظت کروں۔

(ب) میں ابتدائے عالم سے توحید پر گواہی دیرہا ہوں (ہر نبی نے توحید ہی کی اشاعت کی تھی)

(۲) توحید کیا ہے؟ یہ روحانی زندگی کی اصل ہے۔ کائنات اسی کے دم سے زندہ ہے۔ اور مسلمان کے ارادوں میں جس قدر بلندی پائی جاتی ہے، یہ سب اسی کا طفیل ہے۔

(۳) خدا نے اس دنیا کو اسی لئے پیدا کیا ہے کہ اس میں توحید کی اشاعت ہو، اور مسلمان کا فرض منصبی (جس کے لئے وہ پیدا ہوا ہے) بس یہی ہے، کہ وہ دنیا میں توحید کی اشاعت کرے۔ اور جہاں یہ شمع روشن ہوجائے وہاں اسکی حفاظت کرے، تاکہ یہ شمع بجھنے نہ پائے۔ آج اگر مسلمان ذلیل وخوار ہے تو اسکی وجہ صرف یہ ہے کہ اُس نے اپنے فرض منصبی کی ادائیگی میں کوتاہی

کی۔ مثلاً وہ قاہرہ اور قسطنطنیہ میں حکومت کرتا رہا۔ اور اُسکی آنکھوں کے سامنے قرطبہ اور غرناطہ میں اسلام کی شمع بجھ گئی۔
(۴) میرا دوسرا فرض یہ ہے کہ دنیا سے کفر اور شرک کا خاتمہ کردوں۔ اور بنی آدم کی عزت نفس کی حفاظت کروں۔ اور یہ اُسی صورت میں ممکن ہے جب وہ توحید اختیار کرلیں۔ کیونکہ کوئی مشرک، معزز نہیں ہوسکتا۔
(۵) مسلمان کا وجود دنیا کی زینت کا باعث ہے۔ اگر دنیا مسلمان کے وجود سے خالی ہوجائے تو انسانیت ذلیل اور رسوا ہوجائیگی۔
(۶) مسلمان دنیا کی تقدیر کا روشن ستارہ ہے۔ یعنی دنیا کا عروج مسلمان کے عروج سے وابستہ ہے۔ یہ ستارہ صبح کی روشنی سے بھی زیادہ چمکیلا ہے۔
(۷) میں، مسلمان ہونے کی حیثیت سے، کائنات اور حیات دونوں کے اسرار ورموز سے آگاہ ہوں۔ یعنی میں اپنی اور اس دنیا کی حقیقت سے آگاہ ہوں اسلئے میں کشمکش حیات میں مسلمانوں کی کامیابی سے کبھی نا اُمید نہیں ہوسکتا۔
(۸) اگر آجکل مسلمان عارضی طور سے پستی میں ہیں یا غمگین ہیں تو میں اس سے بالکل ہراساں نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ ملت اسلامیہ مٹ جانے کے لئے پیدا نہیں ہوئی ہے۔ اگر ملت اسلامیہ مٹ گئی تو اسلام کی حفاظت کون کریگا؟ اور اسلام دنیا سے مٹ نہیں سکتا۔ لہذا مسلمان بھی نہیں مٹ سکتے۔
(۹) میرے دل میں نا اُمیدی کو کبھی جگہ نہیں مل سکتی۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ معرکۂ حیات میں مسلمان ضرور کامیاب ہونگے۔
(۱۰) ہاں یہ سچ ہے کہ میں اس بات کا آرزومند ضرور ہوں کہ مسلمانوں کو پھر

وہی شان و شوکت حاصل ہوجائے۔ جو کسی زمانہ میں (آج سے ۳-۴ سو سال پہلے) تھی۔ اسی لئے میں مسلمانوں کو ان کے عہد عروج (ہارون الرشید، اور سلطان محمد فاتح) کی داستانیں سناتا رہتا ہوں۔ تاکہ ان کے اندر ترقی کرنے کا جذبہ پیدا ہو۔
(۱۱) اُس دور کی یاد، میرے اندر عمل کی تحریک پیدا کرتی ہے اور میں سمجھتا ہوں بلکہ یقین کرتا ہوں کہ جو شوکت مسلمانوں کو ماضی میں حاصل تھی، وہ مستقبل میں بھی حاصل ہوگی۔
(۱۲) اسی لئے میں ہمیشہ مسلمانوں کے عروج کے زمانہ کو مدنظر رکھتا ہوں۔ اور گذشتہ کے آئینہ میں آئندہ کی تصویر دیکھتا ہوں۔ یعنی مسلمانوں کو یہ پیغام دیتا ہوں کہ تم بھی وہی شان و شوکت حاصل کرو۔ جو تمہارے اسلاف کو حاصل تھی۔

نظم برصفحہ ۲۱۸

حل لغات | گراں، یعنی ناگوار یا تکلیف دہ + ہنگامۂ زمانہ سے وہ مصائب مراد ہیں، جو اس بیسویں صدی کے آغاز سے مسلمانوں پر نازل ہونے شروع ہوئے + رختِ سفر۔ سامان یا اسباب جو مسافر اپنے ساتھ رکھتا ہے + قیودِ شام وسحر، یعنی انسانی زندگی کی پابندیاں مثلاً سانس لینا + نظام کہنۂ عالم سے خورد و نوش اور حوائج زندگی مراد ہیں + آیۂ رحمت، یعنی رحمت کا نشان۔ یہ ترکیب قرآن مجید کی اس آیت سے ماخوذ ہے:-
وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ، یعنی ہمنے آپ کو ساری کائنات کے لئے رحمت بناکر بھیجا ہے۔ عندلیب باغ حجاز، یعنی اے شاعر اسلام +

کلی کلی ہے تری الخ یعنی اسلام کی محبت تیری رگ رگ میں سمائی ہوئی ہے + سرخوش جام ولا۔ تو محبت کی شراب سے مست رہتا ہے + فتادگی بمعنی عاجزی + غیرت سجودِ نیاز ہو عاشق کے سجدہ سے بڑھکر + آبگینہ۔ جام بلوریں۔ اعلی قسم کے بلور کا پیالہ +

تبصرہ | یہ نظم اقبال نے اُس جلسہ میں سُنائی تھی جو ۱۹۱۲ء میں شاہی مسجد لاہور میں، فدائے ملت حضرت مولانا ظفر علی خاں صاحب کی کوششوں سے منعقد ہوا تھا، تاکہ جنگ بلقان کے سلسلہ میں ترکوں کی مالی امداد کے لئے چندہ جمع کیا جائے۔ واضح ہو کہ مولانائے موصوف نے ۱۹۱۱ء میں سب سے پہلے ترکوں کے لئے چندہ جمع کرکے، اُس میڈیکل مشن کی وساطت سے ترکوں کو بھجوایا تھا، جو ڈاکٹر مختار احمد انصاری (متوفی ۱۹۳۶ء) کی قیادت میں قسطنطنیہ گیا تھا، تاکہ مجروحین کی تیمارداری کرسکے۔ مولانا ظفر علی خاں کے اس احسان سے ملت اسلامیہ ہندیہ کبھی عہدہ برآ نہیں ہوسکتی کہ اُنہوں نے سب سے پہلے مسلمانوں کو انکا بھولا ہوا سبق یاد دلایا کہ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ یعنی تمام دنیا کے مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ بالفاظ دگر یوں سمجھ لیجئے کہ اقبال نے ساری عمر جو کہا، مولانا نے اس پر عمل کرکے دنیا کو دکھا دیا۔ مثلاً اگر اقبال نے یہ کہا کہ

مبر پیش فرنگی حاجتِ خویش!
نہ طاقِ دل فرو ریز ایں صنم را

تو مولانا ظفر علی خاں نے کبھی انگریز کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ بلکہ ساری عمر، اپنے ایمان کی پوری طاقت کے ساتھ، اسکی فرعونیت کا مقابلہ کیا۔ چنانچہ وہ خود کہتے ہیں۔

نشانی ہے اگر خاصانِ حق کی سختیاں سہنا
تو میری عمر بھی گذری ہے ابتک ابتلاؤں میں

مطلب | جب میں اُن مصائب کو دیکھنے کی تاب نہ لاسکا، جو مسلمانوں پر نازل ہورہے ہیں، تو میں نے سوچا کہ اس دنیا سے کسی اور دنیا میں چلا جاؤں تو بہتر ہے۔ چنانچہ میں یہاں سے روانہ ہوگیا۔ اور اگرچہ زمان و مکان کی قید میں رہا، لیکن حوائج زندگی سے بے نیازی اختیار کرلی۔ انجام کار فرشتے مجھے سرکار دوعالم صلعم کی مجلس مبارک میں لیکر حاضر ہوئے (یہ سب شاعرانہ تخیل ہے، جسکی کوئی اصلیت نہیں ہے) مجھے دیکھکر سرکار ابد قرار صلعم یوں گویا ہوئے کہ اے شاعر اسلام! اے وہ کہ تو ملت کے غم میں فنا ہوچکا ہے! ہماری محبت میں ہمیشہ مست رہتا ہے! اور تیری عاجزی میں عاشقوں کے سجدۂ نیاز سے بھی بڑھکر رنگ عبودیت نظر آتا ہے! تو فرشتوں کے ساتھ دنیا سے یہاں آیا ہے، کیا تو ہمارے لئے کوئی تحفہ لایا ہے؟
میں نے ہاتھ باندھ کر عرض کی کہ اے سرور کائنات اور اے فخر موجودات! اے میرے آقا! مجھے اس دنیا میں آسودگی یا راحت حاصل نہیں ہوئی، بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ جنس، اس بازار میں ملتی ہی نہیں۔ اگرچہ دنیا میں ہزاروں لاکھوں، بلکہ کروڑوں مسلمان آباد ہیں، لیکن اسلام کے نام پر سر کٹانے والے بہت کم ہیں۔ تاہم میں بڑی کوشش سے، حضورؐ کی نذر کے لئے ایک چھلکتا ہوا بلوریں جام لایا ہوں، اور اے میرے آقا! جو چیز اس میں ہے وہ کائنات کا تو ذکر ہی کیا ہے، جنت میں بھی نہیں مل سکتی۔ اس جام میں آپ کی امت کی آبرو جھلک رہی ہے۔ یعنی اس میں طرابلس کے شہیدوں کا خون بھرا ہوا ہے۔

نوٹ :- اطالیہ نے بلاوجہ، محض ترکی کی کمزوری سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر دشمنان اسلام، یعنی انگریزوں کے ایما سے ۱۹۱۱ء میں طرابلس پر حملہ کر دیا تھا۔ انگریزوں نے جو مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن ہیں، اطالیہ سے کہدیا تھا کہ ترکی کے پاس بحری فوج تو ہے نہیں۔ وہ صرف مصر کے راستہ سے فوجیں بھیج سکتا ہے۔ لیکن یہاں سے ہم اُن کو گذرنے نہیں دینگے، اسلئے تم بآسانی طرابلس پر قابض ہوجاؤ گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اسکے باوجود پاکستان کے بعض مسلمان انگریزوں کو اپنا دوست سمجھتے ہیں۔ ۱۲

نظم برصہ ۲۱۹

حل لغات | جدّہ - مکہ معظمہ کا بندرگاہ ہے جو اس مقدس شہر سے ۵۵ میل فاصلہ پر ہے + دار الشفا، یعنی شفاخانہ + حوائی بطحا - وادیٔ بطحا کے نزدیک - مکہ معظمہ وادیٔ بطحا میں واقع ہے - عیسٰی سے یہاں ڈاکٹر مراد ہے + مسیحا اگرچہ حضرت عیسٰیؑ کا لقب ہے، لیکن چونکہ وہ مردوں کو زندہ اور بیماروں کو اچھا کر دیتے تھے، اسلئے مسیحا سے یہاں معالج یا ڈاکٹر مراد ہے + اہل درد سے عشاق مراد ہیں +

مطلب | اقبالؔ کہتے ہیں کہ ایک دوست نے مجھ سے یہ کہا کہ جدّہ میں شفاخانہ قائم ہو رہا ہے۔ چونکہ تو سرزمین حجاز سے بڑی الفت رکھتا ہے، اسلئے اس کار خیر میں دل کھول کر چندہ دے۔ تاکہ وہاں ایک شاندار ہسپتال قائم ہوسکے۔

میں نے یہ سن کر جواب دیا کہ میں عاشق ہوں، اور عاشق، موت سے

نہیں ڈرتا۔ کیونکہ اسکی نگاہ میں موت، تجدید مذاقِ زندگی کا نام ہے۔ زندگی موت میں اُسی طرح پوشیدہ ہے، جس طرح حقیقت مجاز میں مخفی ہوتی ہے یہ مصرع تشریح طلب ہے۔ سُنئے! جب آپ زیدؔ کو شیر کہتے ہیں، تو یہاں لفظ شیر کا اطلاق مجازًا ہوا ہے۔ کیونکہ زید حیوان نہیں، بلکہ انسان ہے۔ لیکن شیر کی حقیقت کیا ہے؟ بہادری۔ اور یہ چیز یا صفت زید میں بھی پائی جاتی ہے۔ اسلئے حقیقت، مجاز میں پوشیدہ ہے۔ اسی طرح، حیات، موت کے پردہ میں پوشیدہ ہے۔ اسکی تفصیل یہ ہے کہ مرنے کے بعد جو زندگی شہید کو حاصل ہوگی، عاشق اُسی کا تمنائی ہوتا ہے۔ اور وہی حقیقی معنیٰ میں زندگی ہے (یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم فرماتا ہے کہ جو شخص اللہ کی راہ میں قتل ہوجائے، اُسے مردہ مت کہو، کیونکہ وہ زندہ ہے) لیکن یہ زندگی اُسی وقت حاصل ہوسکتی ہے، جب عاشق موت کا پیالہ خوشی خوشی پی جائے۔

اسلئے عاشق کو جو لذت، موت کے جام میں ملتی ہے، وہ خضر کو زندگی کے جام میں بھی نہیں ملتی۔ یعنی خضر کو زندگی میں وہ لذت محسوس نہیں ہوسکتی۔ جو عاشق کو موت میں محسوس ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ موت مجھے براہ راست، حریم ناز میں پہونچا دیگی۔ اسلئے آپ زندگی کا پیغام دوسروں کو دیں، کیونکہ میں تو موت ڈھونڈتا ہوں زمین حجاز میں۔ خوشا نصیب اُس عاشق کے جسے حجاز میں موت آجائے۔ آپ کسے شفا کا پیغام دیتے ہیں؟ بھلا عاشق بھی کہیں مسیحا (معالج) کے آرزومند ہوسکتے ہیں؟

نظم برصہ ۲۲۰

حل لغات | قدسی الاصل ہے۔ یعنی اپنی اصلیت کے لحاظ سے پاکیزہ ہے +

رضواں۔ یعنی داروغۂ جنت + تگ وتاز بھاگ دوڑ، کوشش + خاک کی چٹکی یعنی انسان + سُکّانِ زمین۔ دنیا کے باشندے + پستی کے مکیں۔ دنیا کے رہنے والے + شوخ، یعنی گستاخ + برہم۔ ناراض + مسجودِ ملائک، جسے فرشتوں نے سجدہ کیا تھا + عالم کیف ہے۔ لغوی معنی کیفیتِ اشیاء کا جاننے والا ہے + "کیف" منطق کی اصطلاح ہے۔ ارسطو نے موضوع کا بیان کرنے کے لئے دس صورتیں قائم کی تھیں، جنکو "مقولات عشر" کہتے ہیں۔ دنیا میں آپ کسی چیز کا ذکر کرینگے، تو انہی دس باتوں میں سے کوئی بات بیان کرینگے۔ ایک شئے یا جوہر ہوگی یا عرض۔ اگر عرض ہے تو اسکی نو صورتیں ممکن ہیں۔

کیفؔ، کمؔ، فعلؔ، انفعالؔ، ملکؔ، وضعؔ، اضافتؔ، اینؔ اور متیؔ طلبہ کی سہولت کے لئے اُن کا اُردو میں ترجمہ بھی لکھے دیتا ہوں۔[1]

(۱) کیسا (۲) کتنا (۳) کام کرنا (۴) اثر قبول کرنا (۵) قبضہ (۶) حالت۔ (۷) تعلق (۸) کہاں؟ (۹) کب؟

عالم کیفؔ ہے دانائے رموزِ کم ہے۔ اس مصرع کا مطلب یہ ہے کہ انسان منطق اور فلسفہ تو جانتا ہے، لیکن عاجزی (انکسار) سے ناواقف ہے۔

---

[1] اب مثالوں سے سمجھاتا ہوں:-

(ا) زید نیک آدمی ہے (کیف) (ب) زید کا وزن دو من ہے (کم) (ج) زید لکھ رہا ہے (فعل)، (د) لوگ زید پر پھولوں کی بارش کر رہے ہیں (انفعال) (ہ) زید کا گھوڑا بہت قیمتی ہے (ملک) (و) زید اپنے کمرے میں پلنگ پر لیٹا ہے (وضع) (ز)، زید، بکر کا بھائی ہے (اضافت)، (ح) زید، مکہ میں ہے (این) (ط) زید آج آئیگا۔ (متی)۔ مزید تشریح کے لئے منطق کی مشہور کتاب ایساغوجی کا مطالعہ کافی ہے ۱۲

پیمانہ ترا۔ یہاں پیمانہ سے آنکھیں مراد ہیں + جوہر قابل۔ یہ بھی منطق کی اصطلاح ہے۔ فطرت، فاعل ہے۔ اور اشیاء، قابل ہیں۔ قابل کہتے ہیں اصلاح، یا تربیت قبول کرنے والے کو۔ عرف عام میں "قابل" کہتے ہیں عقلمند کو۔ لیکن منطق میں قابل اُسے کہتے ہیں جو فاعل کے فعل کو قبول کرسکے + گِل یعنی مٹی + شانِ کئی۔ یعنی شوکتِ شاہانہ۔ کئی منسوب بکئے۔ کےٓ ایران کے قدیم بادشاہوں کا لقب ہے۔ مثلاً کیخسرو، کیقباد، کیکاؤس وغیرہ + الحاد۔ خدا کا انکار کرنا۔ جو افترا کیت کی پہلی تعلیم ہے + پسر، آذر ہیں یعنی بیٹے بت پرست ہیں + بادہ آشام یعنی شراب نوش + مایۂ رعنائی۔ باعث افتخار + نازش وہ بات جس پر ناز کرسکیں + لاُ صحرائی سے مسلمان مراد ہے + یکجائی۔ یہ ہرجائی کی ضد ہے۔ یعنی وہ شخص (محبوب) جو کسی خاص مقام میں محدود و منحصر ہو + ملتِ احمد مرسل الخ اس مصرع میں بلا کا طنز پوشیدہ ہے۔ ملت اسلامیہ کبھی مقامی، یعنی پابند مقام نہیں ہوسکتی + رمضان - وہ مہینہ جس میں گذشتہ صدی کے مسلمان، تقویٰ حاصل کرنے کے لئے، روزے رکھا کرتے تھے۔ چونکہ انگریزوں نے تقویٰ کے بجائے "عہدہ" کو مقصود حیات بنا دیا اسلئے اب روزہ رکھنا "رجعت پسندی" کی دلیل ہے۔ قوم مذہب سے ہے۔ یعنی مسلمان قوم کی بنیاد، وطن پر نہیں بلکہ مذہب پر ہے۔ اگر مذہب ختم ہوجائے تو قوم بھی ختم ہوجائیگی (جیسے کہ ہوگئی۔ اب صرف "ہجوم مومنین" باقی رہ گیا ہے۔ جو عید بقر عید کو شاہی مسجد سے نکلتا ہے، اور دس بیس مسلمانوں کو روندتا ہوا، اپنے گھروں کو واپس چلا جاتا ہے) نشیمن۔ گھونسلا جائے قیام + بجلیاں جس میں ہوں آسودہ الخ بہت بلیغ مصرع ہے۔ یعنی اگر کوئی شخص تمہارے دلوں میں عشق رسولؐ کی آگ جلائے تو وہ آگ فوراً سرد ہوجائیگی + اسلاف کے مدفن۔ یعنی بزرگوں کی قبریں (واضح ہو کہ راقم الحروف نے

گذشتہ ۲۵ سال میں بہت سے قبرستانوں کو "ٹکڑہائے زمین برائے فروخت" کی شکل میں بچشم خود تبدیل ہوتے ہوئے دیکھا ہے) نکو نام - ٹھیک نام، لیکن اس سے مراد ہے بدنام + صنم بمعنی بُت + منتظر فردا - یعنی بے عملی کی زندگی بسر کرتے ہو اور اسکے باوجود رحمت الٰہی کے اُمیدوار ہو + فاطر ہستی، کائنات کا پیدا کرنے والا + مسلم آئیں یعنی اگر کافر، اسلام کا دستور اختیار کرلے تو اُسے حور و قصور (محلات) مل گئے + موسیٰ یعنی آرزو مند + پنپنا - ہندی لفظ ہے بمعنی ترقی کرنا + تارکِ آئیں - یعنی شریعت اسلامیہ کا ترک کرنے والا + مصلحت یعنی جس بات میں ذاتی فائدہ نظر آئے اُسے اختیار کرلینا خواہ وہ بات شریعت کے خلاف ہی کیوں نہ ہو + معیار بمعنی کسوٹی + شعار اغیار - کافروں کی تہذیب، یا غیر مسلموں کا تمدن + طرز سلف یعنی اپنے بزرگوں کا طریقہ + برق طبعی، بمعنی ذہانت، دانشمندی + شعلہ مقالی، پُرجوش تقریر + روح بلالی، عشق رسولؐ + تلقینِ غزالی، یعنی عشق رسولؐ کا پیغام + وضع، یہاں اس لفظ سے لباس مراد ہے + تمدن - طریق معاشرت یا رہن سہن کے طریقے + لوثِ مراعات - یعنی مسلمان کسی کے ساتھ خواہ وہ اسکا بیٹا ہی کیوں نہ ہو، بیجا رعایت نہیں کرتا تھا - لوث بمعنی آمیزش، ملاوٹ، آلودگی + فوق الادراک - عقل سے بالاتر + جوہر سے یہاں صیقل مراد ہے - جسکے بغیر آئینہ بیکار ہوجاتا ہے + تن آسانی - بمعنی کاہلی + اوج ثریا سے بلندی مراد ہے + قلب سلیم، قرآن پاک کی اصطلاح میں اُس دل کو کہتے ہیں، جس میں تقویٰ اور ایمان اور عرفان تینوں چیزیں پائی جائیں + سریرِ کے، یعنی شاہان ایران کا تخت + حمیت، غیرت یعنی اپنی عزت پر سر کٹا دینے کا جذبہ + ثریٰ سے یہاں عزت اور حکومت مراد ہے + مہجور نشیمن آشیانہ یا وطن سے دور + تہذیب سے تہذیب مغرب مراد ہے + قیس سے مسلمان نوجوان مراد ہے + حجابِ رخ لیلیٰ نہ رہے - یعنی اب مسلمان نوجوان یہ چاہتا ہے کہ اسکی بہنیں بے پردہ بازاروں میں، کالجوں میں، ہوٹلوں اور کلبوں میں اسکے ساتھ جائیں + عہد نو سے مغربی تہذیب مراد ہے - جو اسلام کے خرمن کے حق میں بجلی ہے + شعلہ بر پیراہن ہے - یعنی تباہ ہو رہی ہے + مالی سے رہنمائے قوم مراد ہے + گل بر انداز ہے، یعنی پھول برسا رہی ہے + عنّابی، یعنی سرخ + ثمر چیدہ، یعنی کامیاب + کاہیدہ - کمزور مرجھائے ہوئے + بطن لغوی معنی پیٹ + برومندی کامیابی + چمن بندی + تربیت + ہر مصر ہے کنعاں تیرا، یعنی ہر ملک تیرا وطن ہے + عصر نو - موجودہ زمانہ + صہیل - گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز + فرس بمعنی اسپ + کوکب قسمتِ امکاں، یعنی دنیا کی تقدیر کا ستارہ + رخت بردوش - کنایہ ہے آمادگی سفر سے + پریشاں ہوجا - یعنی دنیا میں پھیل جا + تنک مایہ - حقیر + تپش آمادہ یعنی متحرک + وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ، یہ قرآن عزیز کی آیت ہے - اللہ فرماتا ہے کہ اے رسولؐ! (کیا) ہمنے آپ کا ذکر دنیا میں بلند (نہیں) کردیا؟ + مردُمِ چشم زمیں - زمین کی آنکھ کی پتلی (وجہ سیاہ ہوتی ہے) کالی دنیا سے ملک حبشہ مراد ہے + شہدا پانے والا - اشارہ ہے ابتدائی دور کے مسلمانوں کی ہجرتِ حبشہ کی طرف - جب کہ قریش کے ظلم و ستم سے تنگ آکر بہت سے مسلمانوں نے نجاشی کے دربار میں پہونچکر پناہ مانگی تھی - اور اس نے ان مسلمانوں کو اپنی بادشاہت میں پناہ دی تھی - گرمیٔ مہر کی پروردہ - مطلب یہ ہے کہ وہاں گرمی بہت شدید ہوتی ہے + بلالی دنیا سے اشارہ ہے اس طرف کہ حضرت بلالؓ کا اصلی وطن حبشہ، تھا + سپر بمعنی ڈھال + درویشی سے مسلمان کی حقیقی حیثیت کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ اللہ اُس مسلمان کو پسند کرتا ہے جس میں درویشی کی شان پائی جائے۔

جیسی فاروق اعظمؓ، عمر ابن عبدالعزیزؒ، نورالدین زنگی، محمود بیگڑا، اور عالمگیرؒ میں پائی جاتی تھی + ماسوی اللہ، تصوف کی اصطلاح ہے - اللہ کے سوا جو کچھ ہے، اُسے ماسوی اللہ کہتے ہیں - یہ زن زر اور زمین کا مجموعہ ہے اور چونکہ یہ تینوں چیزیں انسان کو اللہ سے غافل کردیتی ہیں، اسلئے تصوف کی پہلی تعلیم یہ ہے کہ انکی محبت پر اللہ کی محبت کو مقدم کرو + تقدیر ہے تدبیر تری - یعنی پھر جو تو چاہیگا وہی ہوگا + لوح و قلم سے ساری کائنات مراد ہے۔

تبصرہ اقبالؔ نے یہ نظم ۱۹۱۳ء میں لکھی تھی - اور موچی دروازہ لاہور کے باہر اُس جلسہ میں سُنائی تھی، جو حضرت مولانا ظفر علی خاں صاحب کے زیر اہتمام، جنگ بلقان کے سلسلہ میں منعقد ہوا تھا - تاکہ ترکوں کے لئے چندہ جمع کیا جائے - نظم کے اختتام پر اسکی ہزاروں کاپیاں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگئیں، اور وہ تمام رقم بلقان فنڈ میں دیدی گئی - شکوہ کی طرح یہ نظم بھی اقبالؔ کی اُردو شاعری کے نادر ترین نمونوں میں سے ہے - ذیل میں ہر بند کا مختصر مطلب درج کرتا ہوں:-

پہلا بند:- میں نے اللہ کی جناب میں جو شکوہ کیا تھا، چونکہ وہ میرے دل کی گہرائیوں سے نکلا تھا، اسلئے اس میں بڑی تاثیر پوشیدہ تھی اور اسی لئے وہ سب آسمانوں سے گذرتا ہوا عالم ملکوت میں پہونچ گیا - (جہاں فرشتے رہتے ہیں)

دوسرا بند:- فرشتے، سیّارے، ستارے، چاند، کہکشاں، سب حیران ہوگئے کہ یہ کون ہے؟ لیکن معلوم نہ کرسکے - ہاں رضوان سمجھ گیا کہ یہ وہی ہے (اُسی کی اولاد ہے) جسے کچھ عرصہ ہوا جنت سے نکالا گیا تھا -

تیسرا بند:- فرشتے اس شکوہ کے انداز بیان سے بہت حیران تھے۔ اور اس میں جو گستاخی اور شوخی کا رنگ پایا جاتا ہے، اُس پر بہت ناراض تھے۔ چنانچہ وہ کہنے لگے کہ یہ زمین کے لوگ بھی کتنے گستاخ اور سرکش ہوتے ہیں!

چوتھا بند:- حضرت انسان کی گستاخی تو دیکھو کہ اللہ سے بھی ناراض ہے! کیا یہ وہی آدم ہے جس پر خدا نے اس قدر انعام فرمایا کہ ہمیں سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا؟ اگر یہ وہی ہے تب تو واقعی بڑا ناشکرا ہے - یوں تو منطق اور فلسفہ دونوں میں طاق ہے لیکن بات کرنے کے سلیقہ سے محروم ہے -

پانچواں بند:- فرشتے یہ گفتگو (تبصرہ) کر ہی رہے تھے کہ عرش سے آواز آئی کہ اے انسان! بیشک تیرا افسانہ بہت درد انگیز ہے - اور تیرا دل غموں سے چور ہے - تو نے اپنے حسن بیان کی بدولت، شکوہ کو شکر کے لباس میں پیش کیا ہے - اور اس طرح بندوں کو خدا سے ہمکلامی کا شرف حاصل ہوگیا -

چھٹا بند:- اے انسان! تو نے شکر کے رنگ میں جو شکوہ ہم سے کیا - اب اُس کا جواب سُن! ہم تو ہر وقت کرم کرنے کے لئے آمادہ ہیں، لیکن کوئی سائل بھی تو ہو - ہم سب کی تربیت کرنے کے لئے تیار ہیں، لیکن جو شخص تربیت یا اصلاح قبول ہی نہ کرے تو ہم کیا کریں؟ اگر کوئی شخص بادشاہت کی قابلیت دکھائے تو ہم ضرور اُسے بادشاہ بنادیتے ہیں -

ساتواں بند:- لیکن اے مسلمانو! تمہاری حالت تو یہ ہے کہ تم دل میں ہمارے منکر ہوچکے ہو - اور ہمارے رسول (صلعم) کی تعلیمات سے بالکل برگشتہ ہوچکے ہو - تم میں جو لوگ بُت شکن تھے وہ تو رخصت ہوچکے، اب صرف بت پرست باقی ہیں - تم شریعت اسلامیہ پر قائم نہیں ہو، بلکہ، تمہارا کعبہ بھی نیا (مختلف) ہے، تمہارے بُت (مثلاً دولت، عہدے، خطابات، جاگیریں) بھی نئے ہیں - اور تم خود بھی نئے ہو۔

آٹھواں بند:- ایک زمانہ وہ بھی تھا جب ہر مسلمان اللہ کا عاشق تھا- اور وہ لوگ اُسی کو پوجتے تھے- اُسی سے محبت کرتے تھے- جیسے آج تم "ہرجائی" کہہ رہے ہو- (دیکھو شکوہ " بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہرجائی ہے) اچھی بات ہے، اگر ہم ہرجائی ہیں تو تم کسی "یک جائی" کو اپنا خدا بنا لو! اُس سے عہد وفا باندھ لو! اور اسکی صورت یہ ہے کہ ہمنے تو ملّتِ محمدیہ کو آفاق گیر بنایا تھا، یعنی جاپان سے مراقش تک، سب مسلمان ایک قوم ہیں- لیکن تم اب اپنے آپ کو مقامی کر لو- یعنی کسی ملک سے یا کسی نسل سے وابستہ کر لو! (مطلب یہ ہے کہ اسلام چھوڑ کر کفر اختیار کر لو، تاکہ کافروں کی طرح تم پر بھی فضل الٰہی نازل ہونے لگے-) واضح ہو کہ یہ طنزیہ شاعری کی بہترین مثال ہے- اقبالؔ نے دربردہ ہمیں یہ تلقین کی ہے کہ جب تک ہم ساری دنیا کے مسلمان عقیدۂ وحدتِ ملّی پر عمل نہیں کرینگے- یعنی ایک قوم نہیں بن جائینگے، اُسوقت تک سربلندی حاصل نہیں کر سکتے- کیونکہ تمام کافر اقوام عالم، ہمارے مقابلہ میں "ملّتِ واحدہ" بنی ہوئی ہیں-

نواں بند:- اے مسلمانو! تمہاری حالت یہ ہے کہ تم ہماری عبادت پر خوابِ شیریں کو ترجیح دیتے ہو- اور رمضان کے روزوں کو ایک مصیبت سمجھتے ہو، کیا یہی وفاداری کا طریقہ ہے؟ قوم تو مذہب سے بنتی ہے، جب تم نے مذہب کو چھوڑ دیا، تو قوم کس طرح زندہ رہ سکتی ہے؟ مثلاً یوں سمجھو کہ اگر ستاروں میں جذب باہمی باقی نہ رہے تو کیا کوئی ستارہ اپنی جگہ پر قائم رہ سکتا ہے؟

دسواں بند:- تم لوگ نہ کوئی فن جانتے ہو، نہ ہنر، نہ کوئی شے ایجاد کرتے ہو، نہ کوئی علمی تحقیق کرتے ہو- تمہیں اپنے اسلاف کی عزت کی کوئی پرواہ نہیں- بلکہ اُن کی قبروں کو بیچ کر کھا رہے ہو- جب تم قبر فروشی کر سکتے ہو تو بُت فروشی میں تمہیں کیا تامل ہو سکتا ہے؟

گیارھواں بند:- بیشک مسلمانوں نے دنیا سے کفر کو مٹا دیا اور انسانوں کو آزادی عطا کی- خانہ کعبہ کی حفاظت کی- اور قرآن مجید کی اشاعت کی- لیکن یہ کام تو تمہارے بزرگوں نے کیا تھا، سوال یہ ہے کہ تم نے اسلام کی کیا خدمت کی؟

بارھواں بند:- تم یہ شکایت کرتے ہو کہ مسلمان کے لئے صرف وعدہ حور ہے، حالانکہ یہ شکایت بالکل ناروا ہے- خدا تو ہمیشہ سے عادل رہا ہے- کافروں کو دنیا کی نعمتیں اسلئے ملیں کہ اُنہوں نے اسلام کے اُصول اختیار کر لئے- حق تو یہ ہے کہ تم میں کوئی مسلمان، حوروں کا آرزومند ہی نہیں- ہم تو آج بھی رحمت نازل کرنے کے لئے آمادہ ہیں، لیکن کوئی ہمارے فضل و کرم کا مستحق ہی نہیں-

تیرھواں بند:- مسلمانوں کا دین ایک ہے- اللہ ایک ہے، رسولؐ ایک ہے، خانہ کعبہ ایک ہے، قرآن بھی ایک ہے، اندریں حالات اگر سارے مسلمان بھی ایک ہو جاتے تو کتنا اچھا ہوتا؟ اسکے برعکس تمہارا حال یہ ہے کہ تم مختلف فرقوں اور ذاتوں اور قبیلوں میں منقسم ہو! کیا دنیا میں ترقی کرنے کی یہی صورت ہے؟

چودھواں بند:- تم شریعت اسلامیہ کے منکر ہو، تمہارا دین، صرف مصلحت وقت ہے کہ جس بات میں نفع نظر آئے اُسے اختیار کر لینا چاہئے تم کافروں کے رسوم اور طرز معاشرت کو پسند کرتے ہو، اور اپنے بزرگوں کے طریقوں سے بیزار ہو- نہ تمہارے دل میں اسلام کی محبت ہے، اور نہ ہمارے رسولؐ کے ارشادات کی کوئی قیمت ہے-

پندرھواں بند:- حالت یہ ہے کہ آج مساجد میں اگر نماز پڑھنے آتے ہیں

تو غریب، روزہ رکھتے ہیں تو غریب، ہمارا نام لیتے ہیں تو غریب، گویا تمہارا پردہ رکھتے ہیں تو غریب- دولتمند تو اپنی دولت کے نشہ میں ہم سے بالکل غافل ہیں- آج اگر اسلام زندہ ہے تو محض انہی غریب مسلمانوں کے دم سے-

سولھواں بند:- نہ مسلمان واعظین کے وعظ میں کوئی اثر باقی ہے- اور نہ اُن کے دل میں اسلام کی کوئی محبت ہے- اذان تو اب بھی ہوتی ہے- لیکن اُس میں نہ خلوص ہے- نہ اسلام کی محبت کا [illegible] رنگ ہے- مسلمان منطق فلسفہ تو پڑھتے ہیں، لیکن ہمارے رسولؐ سے محبت نہیں کرتے- یہی وجہ ہے کہ آج مسجدیں ویران پڑی ہوئی ہیں-

سترھواں بند:- ایک شور مچا ہوا ہے کہ مسلمان مٹے جا رہے ہیں، لیکن سچی بات یہ ہے کہ مسلمان ہیں کہاں، جو اُن کے مٹنے کا ذکر کیا جا رہا ہے؟ جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں انکی حالت یہ ہے کہ وہ اپنی وضع قطع کے لحاظ سے تو عیسائی معلوم ہوتے ہیں- اور تمدن کے اعتبار سے ہندو نظر آتے ہیں- اور معاملات کے اعتبار سے یہود سے بدتر ہیں- خاندانی لحاظ سے تم میں کوئی سیّد ہے، کوئی مرزا ہے، کوئی افغان ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ کوئی مسلمان بھی ہے؟

اٹھارھواں بند:- اگلے زمانہ کے مسلمانوں کی کیفیت تو یہ تھی کہ وہ سچ بولنے سے بالکل نہیں ڈرتے تھے وہ ہر شخص سے انصاف کرتے تھے- مسلمان اللہ کے عشق میں سرشار تھے اسلئے اسلام کی خاطر ہر قسم کی قربانی کرتے تھے اور دوسروں کی جان بچانے کیلئے اپنی زندگی بخوشی نثار کر دیتے تھے-

انیسواں بند:- ہر مسلمان، ہر وقت کفر کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہتا تھا- اور سرگرم عمل تھا- اُسے ہمارے اوپر اور اسکے بعد اپنی قوت بازو پر بھروسہ تھا- تم موت سے ڈرتے ہو- لیکن وہ ہم سے ڈرتا تھا- اگر تمہارے اندر، تمہارے بزرگوں کی صفات نہیں ہیں، تو تم کو وہ مرتبہ کیسے حاصل ہو سکتا ہے جو ان کو نصیب تھا؟

بیسواں بند:- تم میں سے ہر مسلمان، آرام طلب ہے- نہ کسی میں حضرت علیؓ کی سی شانِ فقر پائی جاتی ہے، نہ حضرت عثمانؓ کی سی دولت نظر آتی ہے اگر تمہارے بزرگوں کو عزت حاصل ہوئی تو اسلئے کہ وہ مسلمان تھے- اور اگر تم دنیا میں ذلیل ہو تو اسلئے کہ تم مسلمان نہیں ہو-

اکیسواں بند:- تم آپس میں ایک دوسرے کے دشمن ہو، لیکن تمہارے بزرگ آپس میں ایک دوسرے پر مہربان تھے- تم دوسروں کے عیب تلاش کرتے رہتے ہو- وہ دوسروں کے عیبوں پر پردہ ڈالتے تھے- تم انکی طرح سربلندی کے خواہشمند تو ضرور رہو، لیکن کیا تمہارے دلوں میں اسلام کی ویسی ہی الفت ہے جیسی اُن میں تھی؟

بائیسواں بند:- تم اپنے ہاتھوں اپنے کو تباہ کر رہے ہو، لیکن تمہارے اسلاف غیرت مند اور خوددار تھے- تم ایک دوسرے کے دشمن ہو، وہ ایک دوسرے پر جان فدا کرتے تھے- تم صرف باتیں بنانی جانتے ہو، لیکن وہ عمل کرتے تھے- تم آج دولت کے لئے ترس رہے ہو، لیکن دولت اُن کے پاؤں چومتی تھی- آج بھی تاریخ اُنکے کارناموں پر فخر کرتی ہے-

تیئیسواں بند:- تمہاری حالت یہ ہے کہ ہمنے تمہیں سرداری دی- لیکن تم نے اسلام کو چھوڑ کر، کفر اختیار کر لیا- رسولؐ کو چھوڑ کر بتوں سے محبت کرنی شروع کر دی- دنیاوی ترقی کی دُھن میں اپنی ملّی روایات سے بیگانہ ہو گئے- بے عمل تو تھے ہی، دین سے بھی کنارہ کر لیا- آج تمہاری قوم کی یہ حالت ہے کہ شریعت کی قیود سے بالکل آزاد ہو چکی ہے- اور مسجدوں کے بجائے ہوٹل اور کلب آباد کر رہی ہے-

چوبیسواں بند: ۔ مسلمان نوجوانوں کی حالت یہ ہے کہ اُنکے سینے عشقِ رسولؐ سے خالی ہو چکے ہیں اور مسلمان لڑکیاں پردہ سے بے نیاز ہوتی جاتی ہیں۔ نوجوان یہ کہتے ہیں کہ جب عاشق آزاد ہے تو معشوق کیوں پردہ میں رہے؟

پچیسواں بند: ۔ یہ موجودہ زمانہ جس میں مادیت برسرِ عروج ہے، تمام قوموں کے لئے یکساں تباہی کا موجب ہے، یہ وہ آگ ہے جس میں ملت اسلامیہ سرعت کے ساتھ فنا ہوتی جارہی ہے۔ لیکن اگر آج بھی مسلمانوں میں ایمان کا رنگ پیدا ہو جائے تو یہی آگ اُن کے حق میں "گلزارِ براہیمؑ" بن سکتی ہے۔

چھبیسواں بند: ۔ یہاں سے اس نظم کا انداز بدل جاتا ہے اور اقبالؔ قوم کو امید کا مژدہ سناتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ملت اسلامیہ کی زبون حالی سے مسلمانوں کو مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ مصائب کے بادل عنقریب چھٹنے والے ہیں۔ ملت اسلامیہ کی بہتری کے دن قریب آچکے ہیں۔ خون شہدا کی سرخی ہر طرف پھول برسا رہی ہے۔ یعنی مسلمانوں میں زندگی کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔

ستائیسواں بند: ۔ اگرچہ موجودہ مسلمان واقعی آجکل بہت پریشان ہیں لیکن مایوس ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جس طرح پہلے زمانہ میں مختلف قوموں نے اسلام لانے کے بعد، دین کی خدمت کی ہے، آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا۔

اٹھائیسواں بند: ۔ اے مسلمان! اس نکتہ کو ذہن نشین کرلے کہ مسلمان قوم کسی خاص وطن یا نسل سے وابستہ نہیں ہے۔ اور نہ کسی خاص ملک میں محدود ہے کہ اگر وہ ملک تباہ ہو جائے تو قوم تباہ ہو جائیگی۔ یہ ساری دنیا مسلمان کا وطن ہے۔ اسلئے اسلام کبھی دنیا سے مٹ نہیں سکتا۔

اے مسلمان! تو دنیا کے لئے شمع کی مانند ہے۔ شمع کے شعلوں میں تیری ہی حرارت کارفرما ہے (رگِ ریشہ چراغ سے وہ فتیلہ یا بتی مراد ہے جو شمع کے اندر رہوتی ہے) تو

اس شمع کی بتی ہے اگر تو نہ ہو تو شمع جل نہیں سکتی۔ یعنی اگر مسلمان قوم دنیا سے مٹ جائے تو یہ دنیا مٹ جائیگی۔ تیرا اندیشہ عاقبت سوز یعنی نتائج سے بے پروا ہے۔ اسلئے تو ضرور دنیا میں کامیاب ہوگا۔

اُنتیسواں بند: ۔ جب صورت حال یہ ہے کہ تیرا وجود، اس دنیا کی بقا کے لئے ضروری ہے تو اطمینان رکھ! ایران کے مٹ جانے سے تو نہیں مٹ سکتا۔ نشہ، شراب میں ہوتا ہے۔ نہ کہ پیمانہ میں۔ اسی طرح مسلمان تو ساری دنیا کے قیام کا باعث ہے۔ (اسلام کا وجود، ایرانؔ (پیمانہ) پر منحصر نہیں ہے۔ اگر تجھے تاریخی شہادت درکار ہو تو سلطنت عباسیہ کی تاریخ کا مطالعہ کر۔ کیا بغداد کے تباہ ہو جانے سے اسلام ختم ہو گیا؟ ہرگز نہیں۔ جن ترکوں نے سلطنت عباسیہ کا چراغ گل کیا تھا، وہی ترک مسلمان ہو کر، اسلام کے محافظین گئے۔ تو اسلام کی کشتی کا پاسبان ہے، اسلئے موجودہ زمانہ کی اقوام بھی تجھ ہی سے روشنی حاصل کرینگی۔

تیسواں بند: ۔ اگر آج (۱۹۱۳-۱۴ء) ریاستہائے بلقان نے ترکی پر چاروں طرف سے حملہ کر دیا ہے تو اسکا مطلب یہ نہیں ہے کہ ترک ختم ہو جائینگے یا مسلمان دنیا سے مٹ جائینگے۔ بلکہ یہ اسلئے ہے کہ مشیتِ ایزدی اسوقت تیرے ایثار اور حوصلہ کا امتحان لینا چاہتی ہے۔ تو دشمنوں کی کثرت سے کیوں خوفزدہ ہے؟ یقین رکھ کہ وہ اسلام کو فنا نہیں کر سکتے۔

اکتیسواں بند: ۔ اے مسلمان! دنیا کی وہ قومیں جو تجھے مٹانا چاہتی ہیں اس حقیقت سے ناآشنا ہیں کہ ابھی دنیا کو تیری ضرورت، باقی ہے۔ یہ دنیا محض تیرے وجود سے قائم ہے۔ دنیا میں اسلام کی حکومت تو مقدر ہو چکی ہے۔ اس تقدیر کو کوئی طاقت نہیں بدل سکتی بس تو اُٹھ اور دنیا کو توحید کا پیغام سُنا!

بتیسواں بند: ۔ اے مسلمانو! گھروں سے نکلو، اور اسلام کا پیغام لیکر دنیا میں پھیل جاؤ۔ اسلام میں وہ خوبی ہے کہ تمہاری کمزوری، طاقت میں اور تمہاری قلت کثرت میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ تم سرکار دوعالم صلعم کے عشق میں فنا ہو جاؤ۔ اور یقین رکھو کہ اس عشق کی بدولت تمہارے اندر یہ طاقت پیدا ہو جائیگی، کہ تم ساری دنیا میں سرکارؐ کا نام بلند کر دوگے۔

تینتیسواں بند: ۔ اے مسلمانو! یاد رکھو کہ اگر حضورؐ کی ذات اقدس نہ ہو تو دنیا تیرہ و تار ہو جائے۔ دنیا کی ساری رونق آپؐ ہی کے دم سے ہے۔ اگر آپؐ نہ ہوں تو پھر دنیا میں کوئی توحید کا نام لینے والا رہے نہ توحید رہے، اور نہ تم باقی رہو۔ بلاشبہ یہ کائنات حضورؐ ہی کے نام کی برکت سے قائم ہے۔ اور ہستی کی نبض میں آپؐ ہی کی بدولت حرکت اور زندگی نظر آتی ہے۔

چونتیسواں بند: ۔ حضور انور صلعم کا نام نامی، جنگلوں، پہاڑوں میدانوں شہروں اور گاؤں میں، غرضکہ ہر جگہ لوگوں کی زبان پر ہے۔ اور سب سے بڑھکر یہ کہ ہر مسلمان کے دل میں پوشیدہ ہے۔ انشاءاللہ آپؐ کا نام قیامت تک اسی طرح سربلند رہیگا، کیونکہ خود اللہ نے وعدہ فرمایا ہے کہ "اے رسولؐ! ہم نے آپکا نام ساری دنیا میں بلند کر دیا ہے"۔

پینتیسواں بند: ۔ مثلاً دیکھ لو کہ برِ اعظم افریقہ، جہاں سیاہ فام لوگ بستے ہیں، جسے وہاں کے باشندوں کی سیاہ رنگت کی بنا پر، چشم زمین کی پتلی سے تعبیر کر سکتے ہیں، جس بر اعظم میں نجاشی والی ملک حبشہ نے ابتدائی دور کے مسلمانوں کو اپنے یہاں پناہ دی تھی، جہاں شدید گرمی پڑتی ہے۔ جہاں مصر سے لیکر مراقش تک مسلمان ہی مسلمان آباد ہیں۔ جسے محبانِ اسلام، حضرت بلالؓ کی دنیا بھی کہتے ہیں (کیونکہ وہ حبشی الاصل تھے) یہ سرزمین تبلیغ اسلام کی بدولت روز بروز

نور اسلام سے منور ہوتی جاتی ہے۔ اور اس تاریک بر اعظم کے دور دراز گوشوں میں سرکار دوعالم صلعم کا نام مساجد کے میناروں سے بلند ہو رہا ہے۔

آخری بند: ۔ آخری بند میں اللہ مسلمانوں سے یوں خطاب فرماتے ہیں کہ اے مسلمان! ہم نے تجھے دونوں خوبیاں عطا کر دی ہیں۔ تیرے پاس عشق کی طاقت بھی ہے اور عقل کی دولت بھی ہے۔ تو عشق کو اپنی تلوار بنالے۔ یعنی ہمارے محبوبؐ کا نام دنیا میں بلند کر اور اس راہ میں جو مشکلات آئیں، اُن کو اپنی عقل کی مدد سے دور کر یعنی عقل سے ڈھال کا کام لے۔ اگر تو سچے معنی میں مسلمان ہو جائے (ہمارا مطیع ہو جائے) تو پھر تیری تدبیر، ہماری مشیت (تقدیر) سے ہم آہنگ ہو جائیگی یعنی ہم تیری ہر آرزو پوری کر دینگے۔ اور اگر تو ہمارے محبوبؐ سے وفا کریگا، یعنی آپؐ کی اطاعت کریگا، تو اس دنیا کی حقیقت ہی کیا ہے، ہم تجھے ساری کائنات کا مالک بنا دینگے۔

نظم ۲۳۳

مطلب: اس نظم میں "ساقی" سے مسلمانوں کے لیڈر، رہنما، یا مصلحین مراد ہیں۔ اقبالؔ نے رمزیہ انداز میں ان سب کو یہ مشورہ دیا ہے کہ جہانتک قوم کو ذلیل کرنے کا تعلق ہے۔ یہ کام تو ہر شخص کر سکتا ہے (اور ہوتا رہتا ہے) ہر خود غرض لیڈر قوم کو نشہ پلا کر گرا سکتا ہے۔ آپ حضرات کا کمال تو یہ ہے کہ آپ گمراہ لوگوں کو راہ راست پر لائیں، اور اُن کو ترقی کی راہیں سمجھائیں۔ اور اللہ اور اُسکے رسولؐ کی طرف بلائیں۔ اے رہنمائے قوم! اس حقیقت پر غور کر کہ سچے مسلمان تو دنیا سے اُٹھتے جاتے ہیں۔ لیکن کوئی شخص انکی خالی جگہ پُر کرنے کیلئے آگے نہیں بڑھتا۔ یعنی تیری محفل سونی ہوتی جاتی ہے۔ اور یہی عالم رہا تو ایک دن

میخانہ خالی ہو جائیگا۔ پس تو کہیں سے آب حیات مہیّا کر تاکہ تیری محفل قائم رہے۔ اور میخانہ کی رونق برقرار رہے۔ یعنی اے لیڈر! تو مسلمانوں کو "ووٹوں" اور "نوٹوں" کے چکر سے نکال کر قرآن اور حدیث کی طرف متوجہ کر۔ ورنہ تیرا اور تیری قوم دونوں کا خدا ہی حافظ ہے۔

اے لیڈر! تیری ساری عمر تو ووٹ، الیکشن، اسمبلی، اور جوڑ توڑ میں بسر ہوئی ہے۔ اب تو زندگی کی آخری منزل میں ہے۔ اسلئے اللہ اور اسکے رسولؐ کی اطاعت پر کمربستہ ہو جا! کچھ آخرت کی فکر بھی کرلے۔

نوٹ :۔ اقبالؔ نے جو کچھ کہا ہے، بالکل درست ہے، لیکن مومنؔ نے مدتوں پہلے حقیقتِ حال واضح کر دی ہے ؎

عمر تو ساری کٹی عشقِ بتاں میں مومنؔ
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہونگے

دوسری نظم بر نمبر ۲۳۳

حل لغات | لبِ خنداں سے تبسّم مراد ہے + فراغت، راحت و آسائش + الحاد سے خدا کا انکار مراد ہے جو موجودہ مغربی تعلیم کا منطقی نتیجہ ہے + پرویز، ایران کا مشہور بادشاہ، جسکی ملکہ شیریں پر فرہاد عاشق ہو گیا تھا۔ چونکہ یہ شخص پیشہ کے لحاظ سے کوہکن یا سنگ تراش تھا، اسلئے اقبالؔ نے تیشۂ فرہاد کی ترکیب استعمال کی ہے۔

تبصرہ | اقبالؔ نے اس نظم میں ملا عرشی کے مشہور شعر پر تضمین کی ہے۔ یعنی اسکو اپنے مقصد کی وضاحت کے لئے استعمال کیا ہے۔

ملا عرشی کا اصلی نام طہماسپ قلی بیگ تھا۔ وہ ایران کے مشہور شہر تبریز کا باشندہ تھا اور اسکی طبیعت دشوار گوئی کی طرف مائل تھی۔ اسکا دیوان خاصا ضخیم ہے جسمیں دس ہزار اشعار سے زائد ہیں۔ چونکہ اسکا لڑکا بہت بدصورت تھا، اسلئے ایک مجلس میں ایک ظریف نے یہ نکتہ پیدا کیا کہ ملا عرشی نے یہ شعر غالباً اپنے لڑکے ہی کو دیکھکر کہا ہے کہ

تخمِ دیگر بکف آریم و بکاریم ز نو الخ

اُس ظریف نے تو ظرافت کی راہ سے یہ بات کہی۔ دراصل اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ ابتک جو کچھ اعمال ہم سے سرزد ہوئے وہ مذموم تھے، جن سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا اسلئے اگر ہم اپنی عاقبت کو سنوارنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کرنا پڑیگا۔ اور از سرِ نو پاکیزہ زندگی بسر کرنی پڑیگی۔

اقبالؔ نے اسی حقیقی مطلب کو مدِنظر رکھکر اس پر تضمین کی ہے۔

مطلب | کہتے ہیں کہ قوم کے نوجوانوں کی علمی ترقی سے میں بھی خوش ہوں لیکن میری مسرت میں رنج کا عنصر بھی شامل ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ تعلیم حاصل کرکے، نوجوانوں کو سرکاری ملازمت تو بیشک ملجاتی ہے لیکن اس مغربی تعلیم کی وجہ سے انکے اندر الحاد کا زنگ بھی تو پیدا ہو جاتا ہے۔ مسلمان کے گھر میں دولت تو آرہی ہے، لیکن کفر کی لعنت بھی اسکے ساتھ ساتھ داخل ہو رہی ہے تو ایسی دولت کس کام کی؟ لہٰذا مناسب یہ ہے کہ ہم اس طرزِ تعلیم کو خیرباد کہکر اپنی قوم کے نوجوانوں کو ازسرِنو اسلامی تعلیم دیں۔ (بکاریم زنو) کیونکہ ابتک جو تعلیم ہمنے اُن کو دی ہے (جو کچھ بویا ہے) وہ تو اسقدر مضرت رساں ثابت ہوئی ہے کہ قوم کو نفع کے بجائے نقصان ہو رہا ہے۔

نوٹ :۔ واضح ہو کہ مغربی تعلیم کے مضر ہونے پر اقبالؔ نے یہ فیصلہ ۱۹۱۲ء میں صادر کیا تھا اور قوم اُسوقت سے لیکر تا ایندم اسی ستم قاتل کو نوشِ جانِ ناتواں فرما رہی ہے تو ناظرین خود اندازہ کرلیں کہ مریض اب کس منزل میں ہو گا! ۱۲

نظم بر صفحہ ۲۳۴

حل لغات | مجال کیا؟ یعنی ناممکن ہے + ہمدوش۔ ہمسر یا مدمقابل + خواجہ پرستی آقا کی غلامی کرنا، اسکی ہاں میں ہاں ملانا + پُرانا طرزِ عمل سے خواجہ پرستی مراد ہے + نئے اُصول سے حکومت پرستی مراد ہے + مرشدِ شیراز یعنی خواجہ حافظؔ جن کا دیوان شیخ سعدیؔ کی گلستاں کے بعد فارسی ادب میں سب سے زیادہ مشہور کتاب ہے + ترجمانِ ضمیر سروش۔ وہ راز جو فرشتہ کے دل کے پردوں میں پوشیدہ ہے۔ یعنی بہت قیمتی نکتہ +

مطلب | کہتے ہیں کہ اس دنیا میں حاکم اور محکوم میں جو امتیاز ہے، وہ کبھی نہیں مٹ سکتا۔ یہ ناممکن ہے کہ کوئی فقیر کسی بادشاہ کا ہمسر ہو جائے۔

(۲) غلامی کا کمال یہ ہے کہ انسان کسی بادشاہ یا آقا کی خوشنودیٔ مزاج حاصل کرلے اگر وہ اس میں کامیاب ہو جائیگا تو پھر بڑے عیش کے ساتھ زندگی بسر کر سکتا ہے۔ "بادشاہ کی غلامی کر ریشمی لباس پہن"۔

(۳) لیکن اگر آجکل کوئی شخص حکومت کی خوشنودی حاصل کرے تو لوگ اُسے جاہ پرست، عہدہ کا طالب یا قوم فروش کا لقب دیتے ہیں۔

(۴) پُرانے طرزِ عمل یعنی خواجہ پرستی میں تو دشواریاں بہت ہیں۔ اور نئے طرزِ عمل کو اختیار کرنے پر طبیعت مائل نہیں ہوتی۔

(۵) لہٰذا اسوقت مناسب یہی ہے کہ انسان دنیا میں اس طرح زندگی بسر کرے کہ اگرچہ اسکے دل میں ہزاروں باتیں اظہار کے لائق ہوں، لیکن وہ چپ رہے، یعنی گلستاں کے تیسرے باب پر عمل کرے۔

(۶) سچ کہا ہے سعدیؔ نے کہ خاموشی میں عافیت ہے اور حافظؔ بھی یہی فرماتے ہیں کہ اے حافظ! تو ایک گوشہ میں بیٹھنے والا فقیر ہے اسلئے تجھے خاموشی لازم ہے اگر انسان اس اصول پر کاربند ہو جائے تو زندگی بڑے سکون سے بسر ہو سکتی ہے۔

(۷) لیکن اگر کوئی شخص ہنگامہ پسند ہو، اور یہ چاہے کہ پبلک میں ہر جگہ اسکا چرچا ہو، اور "زندہ باد" کے نعرے ہوں تو بسم اللہ! شرابِ خالص حاصل کرے اور اربابِ نشاط کی صحبت میں بیٹھکر موسیقی کے ساتھ اپنے جام کو گردش میں لائے۔

(۸) یعنی بادشاہوں یا امیروں یا وزیروں کی محفل میں شریک ہو، اور ہوس کے پتھر سے اپنی عقل کے شیشہ کو چکنا چور کر دے۔ یعنی عقل کو خیرباد کہدے۔

(۹) لیکن حافظ کا یہ قول ضرور مدِنظر رکھے۔ کیونکہ اُس نے اس میں بڑا بلند پایہ نکتہ بیان کیا ہے۔

(۱۰) بادشاہ کی مبارک رائے، تجلی کے ظہور کی جگہ ہے۔ یعنی بادشاہ پر خدا کا سایہ ہوتا ہے۔ اگر تو اسکا قُرب چاہتا ہے تو اپنی نیت اور اپنے ارادوں کو پاک صاف رکھ تاکہ تو اُسے نیک صلاح دے سکے۔ اگر تیری نیت میں کھوٹ ہے تو اسکا تو کچھ نہیں بگڑیگا لیکن تو ضرور برباد ہو جائیگا۔

نظم بر صفحہ ۲۳۵

حل لغات | جوئے سرود آفریں۔ وہ ندی جسکی روانی سے نغمہ پیدا ہو۔ اقبالؔ نے پہاڑی ندیوں کی آواز کو عموماً نغمہ سے تعبیر کیا ہے + لالہ گوں، بمعنی سُرخ + میکدۂ بہار سے۔ یعنی مارچ اور اپریل میں جب پہاڑوں پر بارش ہوتی ہے، تو مئی میں پہاڑی ندیاں شور کرتی ہوئی وادیوں کو شاداب کر دیتی ہیں + مستِ مئے خرام۔ پہاڑی ندی سے کنایہ ہے + دخترِ خوش خرامِ ابر۔ یہ بھی ندی سے کنایہ ہے۔ اقبالؔ نے ندی کو بادلوں کی بیٹی قرار دیا ہے۔ اور عورت قرار دیکر، اسکے لئے دلکش چال بھی ثابت کر دی ہے + کرتی ہے عشق بازیاں۔ اس مصرع میں تغزل کا رنگ پایا جاتا ہے۔ عشق بازی سے محبت آمیز طرزِ عمل مراد ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ندی میدان میں آتی ہے تو اس کے فیض (عشق بازی) سے سبزہ لہلہانے لگتا ہے +

کوہ کے تکدے سے وہ بارش مراد ہے جو موسم بہار میں پہاڑوں پر ہوتی ہے کھیتوں کو پلاتی ہے یعنی پہاڑی ندیاں کھیتوں کو سیراب کرتی ہے + یہ تمام مناظر ہر اس شخص کے مشاہدہ میں آئے ہونگے جس نے پہاڑوں کی سیر کی ہے + مزرع بمعنی کھیتی + شانِ خلیلؑ - یعنی بت شکنی کا رنگ + آذری یعنی بت پرستی + زندگیٔ دوام - ہمیشہ کی زندگی + "خون جگر" یہ اقبال کی خاص اصطلاح ہے جیسے لالۂ صحرای یا شاہین - اس سے اقبال کی مراد ہے شاعر کا خلوص یا اس کے قلب کا سوز و گداز یا صداقت آمیز طریقِ زندگی - اقبال کہتے ہیں کہ شاعری، شاعری کے لئے مت کرو بلکہ قوم کی اصلاح کے لئے کرو - اور شعر اس وقت کہو جب طبیعت شعر گوئی کی طرف مائل ہو - اور جب شعر کہو تو صداقت کو مدِ نظر رکھو - جھوٹ اور خوشامد اور نفسانی خواہشات کو پاس نہ آنے دو - نیز اُس وقت شعر کہو جب دل و دماغ اُس واقعہ سے پوری طرح متاثر ہو چکے ہوں جس کو نظم کرنا چاہتے ہو + سخنوری بمعنی شاعری +

مطلب | اس نظم میں اقبال نے شاعری کا صحیح مقام واضح کیا ہے - کہتے ہیں کہ کوہسار سے جو ندی نغمہ سرای کرتی ہوئی وادیوں میں آتی ہے، وہ زبان حال سے انسان کو یہ پیغام دیتی ہے کہ دنیا میں زندہ رہنے کا حق اسی شخص کو حاصل ہے جو ہر وقت مصروفِ عمل رہتا ہے - چنانچہ ندی بھی ہر وقت اپنا فرض منصبی ادا کرتی رہتی ہے -

اسی طرح، شاعر کے کلام سے زندگی ترقی کرتی ہے جب قوم غلط راستہ اختیار کر لیتی ہے تو شاعر، اس کی اصلاح کرتا ہے اور اپنے کلام سے مردہ دلوں کو زندگی بخشتا ہے یعنی انہیں جد و جہد پر آمادہ کرتا ہے -

لیکن یہ کام صرف وہ شاعر انجام دے سکتا ہے جس کی شاعری میں

اس کے دل کا سوز و گداز (خون جگر) بھی شامل ہو، جس کی شاعری خلوص اور صداقت پر مبنی ہو - اگر دنیا میں سچی یعنی قوموں کو ابھارنے والی شاعری کا وجود باقی نہ رہے تو دنیا کی ساری رونق اور دلچسپی ختم ہو جائے -

نظم ۲۳۶ بر صفحہ

حل لغات | ہنگامہ در دامن - یعنی جب صبح ہوتی ہے تو دنیا میں ہر طرف زندگی (ہنگامہ) کے آثار نمایاں ہو جاتے ہیں + احرام باندھنا - احرام، فقہ کی اصطلاح میں اُن دو بغیر سلے ہوئے کپڑوں یا چادروں کو کہتے ہیں جن میں سے ایک کو حاجی لوگ کمر سے باندھتے ہیں اور دوسرے کو اوڑھ لیتے ہیں + گرم تقاضا ر یعنی مصروفِ عمل + داغِ سحاب - بادلوں کے داغ - مراد ہے کفر کے آثار + کرن کے خنجر سے اسلام کی خوبیاں مراد ہیں + سرگرم ستیز - کفر سے جنگ میں مشغول ہو جا + آداب گریز - بھاگنے کا طریقہ + عریانی سے یہ مراد ہے کہ تو اپنے ذاتی جوہر کو دنیا پر واضح کر دے یعنی اشاعتِ اسلام کر + خود افشانی سے یہ مراد ہے کہ تو اپنی تمام طاقتوں کو اسلام کی اشاعت کے لئے وقف کر دے یا اپنے آپ کو اسلام کی راہ میں فنا کر دے + خفاش بمعنی چمگادڑ - مراد ہے کفر +

مطلب | اس نظم میں اقبال نے مسلمانوں کو یہ پیغام دیا ہے کہ اٹھو! اور دنیا کو اسلام کے نور سے منور کر دو -

پہلا بند : اے مسلمانو! فطرت کے طرزِ عمل پر غور کرو - دیکھو جب صبح ہوتی ہے تو دنیا سے سکوت اور خاموشی رخصت ہو جاتی ہے اور ہر جگہ حرکت اور زندگی کے آثار ظاہر ہو جاتے ہیں - باغوں میں پرندے نغمہ سرای کرنے لگتے ہیں اور غنچے شگفتہ ہو کر پھول بن جاتے ہیں - اے مسلمانو! اسلام کا آفتاب طلوع ہو چکا ہے اس لئے تم بھی زندگی کا ثبوت دو اور ساری دنیا میں اسلام کی تبلیغ کرو -

دوسرا بند : اسلام چونکہ بجائے خود آفتاب ہے اس لئے تم آفتاب کی طرح ساری دنیا میں پھیل جاؤ، اسلام کے نور سے ساری دنیا کو منور کر دو - تاکہ دنیا سے کفر اور شرک کے داغ دھبے بالکل مٹ جائیں -

قرآن مجید سے دلائل کے ہتھیار حاصل کرو اور دلائل کی تلوار سے باطل کو ہر میدان میں شکست دے کر بھگا دو - اے مسلمان! تو چونکہ قرآن حکیم کا حامل ہے اس لئے تو خود بھی سراپا نور ہے اور قاعدہ یہ ہے کہ چراغ کو صندوق میں بند نہیں کرتے بلکہ بلند مقام پر رکھتے ہیں تاکہ لوگ اُس کی روشنی سے فائدہ اٹھائیں - اسی طرح تو بھی دنیا والوں پر قرآن کے نور کو واضح کر - گوشہ نشینی تجھے زیب نہیں دیتی اللہ نے تجھے حجروں میں زندگی بسر کرنے کے لئے پیدا نہیں کیا ہے - میدان عمل میں آ، اور اپنے آپ کو تبلیغ اسلام میں فنا کر دے - جو لوگ اسلام کی خوبیوں سے آگاہ نہیں ہیں اُن کو اس کی خوبیوں سے واقف کر - ان کی آنکھوں کو سرمۂ قرآنی سے روشن کر - اے مسلمان! تو، اس کائنات کا راز ہے یعنی اللہ نے یہ کائنات محض اس لئے پیدا کی ہے کہ تو اس میں اسلام کی اشاعت کرے اور اللہ کے نام کو بلند کرے پس تو دنیا والوں پر ظاہر ہو جا - یعنی اپنی ساری قوتوں کو تبلیغ اسلام کے لئے وقف کر دے - اور جو لوگ اسلام کی خوبیوں سے واقف نہیں ہیں، ان کو اس کے محاسن سے آگاہ کر دے -

نظم ۲۳۷ بر صفحہ

حل لغات | وادیٔ فاران سے یہاں حقائق و معارف اسلام مراد ہیں + ذوقِ تماشا سے تجلیاتِ انوار الٰہیہ سے فیض یاب ہونے کی آرزو مراد ہے + آہو سے مسلمان مراد ہے + وسعتِ صحرا سے بلند حوصلگی مراد ہے + دل ویراں سے وہ دل مراد ہے جو عشق رسولؐ سے خالی ہے + محمل خالی سے دل مراد ہے + شاہد لیلیٰ سے عشق رسولؐ مراد ہے +

داغ محبت سے وہی عشق رسولؐ مراد ہے + چاند کو شرما دے یعنی اپنی دلکشی، حسن و جمال اور کمال میں چاند سے بڑھ کر ہو + ہمدوشِ ثریا کر یعنی مسلمان کے ارادوں کو بہت بلند کر دے یعنی اس کے دل میں ساری دنیا کو اسلام کے نور سے منور کرنے کی آرزو پیدا کر دے + خودداریٔ ساحل سے ساحل کی سی خودداری مراد ہے یعنی دریا، ساحل کو بعض اوقات کاٹ دیتا ہے لیکن وہ کبھی دریا سے رحم کی التجا نہیں کرتا + نیز دریا سے وابستہ ہونے کے باوجود کبھی دریا سے پانی طلب نہیں کرتا +

مطلب | یہ نظم اس زمانہ کی ہے جب مسلمان ملکوں پر مصائب کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں اور اقبال کا دل چونکہ زکی الحس تھا اس لئے ہر وقت مسلمانوں کی پریشانی پر خون کے آنسو بہاتا رہتا تھا - جب بیتابی حد سے فزوں ہو گئی تو انہوں نے اللہ سے دعا مانگی کہ

(۱) اے خدا! مسلمان کے دل میں عشق رسولؐ کی ایسی آگ روشن کر دے جو اس کے دل کو گرما دے اور اس کی روح کو سراپا اضطراب بنا دے - یعنی وہ تبلیغ و اشاعت اسلام کے لئے آمادہ ہو جائے -

(۲) اس شعر کے دو معنی ہیں پہلے یہ کہ مسلمانوں کے دلوں میں حجاز کی محبت پیدا کر دے اور ان کے دلوں میں مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی زیارت کا شوق پیدا کر دے -

دوسرے معنی یہ ہیں کہ اسلام (قرآن) کے حقائق و معارف کو مسلمان کے قلوب پر واضح کر دے - ان کا سینہ فہم قرآن کے لئے کھول دے - انہیں مطالعہ کا شوق دے اور روحانیت حاصل کرنے کا (تجھ سے رابطہ پیدا کرنے کا) ذوق دے -

(۳) ان کے دل میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت پیدا کر دے اور جو آگ خدمت اسلام کی میرے سینے میں روشن ہے وہی اُن کے سینوں میں روشن کر دے -

(۴) گم کردہ راہ مسلمانوں کو پھر اسلام اور بانیٔ اسلامؐ کی محبت عطا فرما - مسلمان بڑا پست حوصلہ ہو گیا ہے اُسے پھر ہمت اور حوصلہ عطا فرما -

(۵) اس کے دل میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت پیدا کر اور حضورؐ کے عشق میں دیوانہ بنادے۔

(۶) اور اس کے عشق کو درجۂ کمال تک پہنچادے۔ اور اس کے دل کے داغ کو چاند سے بھی زیادہ دلکشی عطا کر۔[1]

(۷) مسلمانوں کے ارادوں میں بلندی عطا فرما اور ان میں غیرت، خودداری اور حریت کے جذبات پیدا کردے۔

(۸) ان میں سچی اور پاکیزہ اور خالص محبت پیدا کردے۔ ان کو سچ بولنے کی توفیق دے اور ان کے قلوب کو نورِ ایمان سے منور کردے۔

(۹) انہیں اتنی سمجھ عطا فرما کہ وہ آنے والی مصیبتوں کا احساس کرکے، ان کے دفعیہ کا انتظام کرسکیں۔ اور آج کے ہنگاموں میں وہ کل سے متعلق بھی کچھ سوچ سکیں؛ کیونکہ جو شخص آئندہ کے لئے پہلے سے تیاری نہیں کرتا وہ عین وقت پر کچھ نہیں کرسکتا۔ مثلاً جو طالب علم سالانہ امتحان کے لئے جو ایک سال کے بعد ہوگا، ابھی سے تیاری نہیں کرتا وہ کامیاب نہیں ہوسکتا۔

(۱۰) اے خدا! میں ایک ایسی قوم کا فرد (شاعر) ہوں جو برباد ہوچکی ہے۔ اس لئے تو میرے کلام میں ایسی تاثیر پیدا کردے کہ میرا کلام قوم کے دلوں کو گرما سکے

نظم بر صـ ۲۳۸

حلِ لغات | شالامار، لاہور کا وہ مشہور باغ جسے شاہجہاں کے حکم سے ۱۶۴۲ء میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اقبال نے اس باغ کو مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کا نشان قرار دیا ہے + برگِ زرد سوکھا ہوا پتہ + موسمِ گل سے مسلمانوں کی شان و شوکت کا زمانہ مراد ہے +

[1] دل کے داغ سے عشقِ رسولؐ مراد ہے اور اس کی دلکشی سے عاشقِ رسولؐ کی سیرت کی دلکشی مراد ہے ۱۲

زائرانِ چمن یعنی باغ کی سیر کرنے والے چونکہ باغ اقبال کی نظروں میں محترم ہے اس لئے انہوں نے "زائر" کا لفظ استعمال کیا ہے یعنی زیارت کرنے والا (کسی محترم یا مقدس مقام کی)، نشیمن سے حکومت مراد ہے + خزاں سے مسلمانوں کا دَورِ انحطاط مراد ہے + یادِ فصلِ بہار۔ عہدِ حکومت کی یاد + عہدِ کہن کے میخانے یعنی مسلمانوں کے عہدِ حکومت کی شان دار عمارتیں + بادہ پرستوں سے نامور مسلمان مراد ہیں +

مطلب | اس نظم کا مطلب، اس کے عنوان سے ظاہر ہے۔ اقبال کے کسی دوست نے ان سے عید پر چند اشعار لکھنے کی فرمائش کی ہوگی۔ چونکہ وہ اس زمانہ میں ترکوں کی زبوں حالی اور بیکسی سے بہت ملول تھے اس لئے اس درخواست پر ان کا دل بھر آیا اور انہوں نے قوم کی بربادی پر یہ مرثیہ سپردِ قلم کردیا کہ اے مسلمانو! مجھے اس زمانے میں عید کی کیا خوشی ہوسکتی ہے جبکہ مسلمانوں پر چاروں طرف تنزّل اور ادبار کی گھٹائیں چھا رہی ہیں۔

کہتے ہیں کہ ایک دن میں شالامار باغ میں گیا تو وہاں کے در و دیوار نے زبانِ حال سے مجھ سے کہا کہ ہم نے اپنی آنکھوں سے مسلمانوں کی شان و شوکت کا زمانہ دیکھا ہے۔ اسلئے جو لوگ یہاں آتے ہیں ان کو چاہیئے کہ وہ ہمیں عبرت کی نگاہ سے دیکھیں کیونکہ ہم اُن کے عہدِ حکومت کی یادگار ہیں۔

یہ بات سُن کر (یعنی جب یہ خیال میرے دل میں آیا تو) میں بے قرار ہوگیا۔ باغ میں آیا تو اس لئے تھا کہ تفریح کروں گا لیکن اس باغ کے در و دیوار دیکھ کر میرے دل میں مسلمانوں کی عظمتِ ماضیہ کا تصور پیدا ہوگیا جس کی وجہ سے میں بہت غمگین ہوگیا۔

اندریں حالات جبکہ میں اس دورِ انحطاط میں، مسلمانوں کے زوال پر آنسو بہا رہا ہوں، مجھے عید کی کیا خوشی ہوسکتی ہے۔ بلکہ جب میں ہلالِ عید کو دیکھتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ہمیں پیامِ مسرت نہیں دیتا بلکہ زخموں پر نمک چھڑکتا ہے

نظم بر صـ ۲۳۹

حلِ لغات | معصوم۔ پاک، بیگناہ + حورِ صحرائی سے فاطمہ مراد ہے + غازیانِ دین سے طرابلس کے وہ عرب قبیلے مراد ہیں جو شیخ سنوسی اور انور پاشا شہید کی زیرِ قیادت سر پہ کفن باندھ کر، اطالوی درندوں کا مقابلہ کرنے کے لئے میدانِ جنگ میں اپنی شجاعت کے جوہر دکھا رہے تھے۔ یہ انھی غازیوں کی سرفروشی کا نتیجہ تھا کہ اطالوی فوجیں ایک سال کی مسلسل کوشش کے باوجود ساحلی علاقوں سے آگے نہ بڑھ سکیں + سقائی۔ پانی پلانا + صحرا سے قوم مراد ہے + آہو سے سرفروش (اسلام کے عاشق) مراد ہیں + بجلیاں یعنی اسلام کے عاشق + برسے ہوئے بادل سے زبوں حال مسلمانوں کی قوم مراد ہے + وسعتِ مقصد سے ارادوں کی بلندی مراد ہے + آفرینش بمعنی پیدائش + تازہ انجم سے سرفروشوں کی وہ جماعت مراد ہے جو مسلمانوں میں پیدا ہو رہی ہے + پرتو بمعنی عکس +

تبصرہ | یہ جگر دوز مرثیہ، اقبال نے فاطمہ بنت عبداللہ کی یاد میں لکھا تھا، جو طرابلس کی جنگ میں غازیوں کو پانی پلاتی ہوئی شہید ہوئی تھی۔ اس شیر دل عرب لڑکی کی شہادت کا حال میں نے ۱۳ نومبر ۱۹۱۲ء کے الہلال میں پڑھا تھا جو اس زمانہ میں مسلمانانِ ہند کے محبوب اور ان کی امیدوں کے مرکز جناب ابوالکلام آزاد کی ادارت میں کلکتہ سے شائع ہوتا تھا۔ دل تو چاہتا ہے کہ اس موضوع پر بہت کچھ لکھوں لیکن یہ بانگِ درا کی شرح ہے نہ کہ ہندی مسلمانوں کی تاریخ۔

اس نظم سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ اقبال اس زمانہ میں ملت کے غم میں اشکبار رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے فاطمہ بنت عبداللہ کو زندگیٔ دوام عطا کردی۔

جب تک مسلمان بانگِ درا پڑھتے رہیں گے، اس بہادر عرب لڑکی کا نام بھی زندہ رہے گا۔ انشاءاللہ تعالیٰ

اطالیہ نے ستمبر ۱۹۱۱ء میں طرابلس پر حملہ کیا تھا۔ اس وقت ترکی سلطنت کے پاس صرف دو جنگی جہاز تھے وہ بھی مرمت طلب۔ رہی برّی فوج تو اس کا راستہ اطالوی شیاطین کے بھائیوں یعنی انگریزوں نے مصر کی ناکہ بندی کرکے روک دیا تھا۔ اس لئے شیخ سنوسی مرحوم نے جو طرابلسی عربوں کے دینی اور سیاسی قائد تھے، اسلام کی عظمت برقرار رکھنے کے لئے، جہاد فی سبیل اللہ کا اعلان کیا اور مسلمان اس بے سرو سامانی کی حالت میں سرفروشی کے لئے میدان میں آئے کہ نہ توپیں تھیں نہ گولہ بارود، نہ سپلائی تھی نہ سامانِ رسد، نہ کوئی طبی امداد تھی نہ کمک کی امید، نہ زندوں کو لباس تھا نہ مُردوں کو کفن۔ بیکسی کا کچھ اندازہ اس بات سے بھی ہوسکتا ہے کہ فاطمہ بنت عبداللہ میدانِ جنگ میں مشکیزہ کاندھے پر اٹھائے، زخمیوں کو پانی پلاتی پھر رہی تھی۔ اس لڑکی کی عمر صرف ۱۴ سال کی تھی لیکن اُس نے شیروں کا سا دل پایا تھا۔ فاطمہ بے شک شہید ہوگئی لیکن ہزاروں مسلمانوں کے دلوں میں آگ لگاکر، ان کو زندہ کر گئی۔ کاش ہمارے کالجوں کی مسلمان لڑکیاں اس جاہل مگر مسلمان لڑکی کی پاکیزہ زندگی سے کچھ سبق حاصل کرسکیں۔

مطلب | بلاشبہ اے فاطمہ! تو اس دور کے مسلمانوں کے لئے باعثِ فخر ہے! میں تیری خوش نصیبی پر رشک کرتا ہوں کہ تو نے غازیوں کو پانی پلاکر سعادتِ دارین حاصل کرلی ہے۔ سچ ہے، اگر کسی کے دل میں شہادت کی آرزو پیدا ہوجائے تو وہ اس قدر بہادر ہوجاتا ہے کہ بغیر تلوار، اللہ کے راستے میں جہاد کرتا ہے جس طرح فاطمہ نے کیا۔ اس لڑکی کے دل میں اسلام کی محبت موجزن تھی اس لئے اُس نے اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر جہاد میں حصہ لیا۔ اللہ اللہ! میری قوم میں ابھی تک

ایسی بہادر لڑکیاں موجود ہیں جو خدا کے راستہ میں جان دے سکتی ہیں! میں تو سمجھتا تھا کہ اب صرف راکھ ہی باقی رہ گئی ہے لیکن نہیں، میں غلطی پر تھا، اس راکھ (قوم) میں کچھ چنگاریاں (عاشقانِ اسلام) ابھی تک پوشیدہ ہیں۔

اے فاطمہ! یہ سچ ہے کہ میں تیری یاد میں آنسو بہا رہا ہوں لیکن میرے غم میں مسرت کا پہلو بھی شامل ہے۔ مجھے تیری شہادت سے بہت رنج ہوا، لیکن اس بات سے خوشی بھی ہوئی کہ تو نے اس گئے گذرے زمانہ میں ملّتِ اسلامیہ کی لاج رکھ لی۔ تیری شہادت سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ میری قوم دوبارہ سربلندی حاصل کرے گی۔ تیری خاک سے سرفروش مسلمانوں کی ایک ایسی جماعت پیدا ہوگی جو ازسرِنو اسلام کا نام دنیا میں بلند کر دے گی۔ میں دیکھتا ہوں کہ مسلمان اب خوابِ غفلت سے بیدار ہو رہے ہیں۔ اور قوم میں ایسے افراد پیدا ہو رہے ہیں جن کے اندر بزرگوں کا طریقہ (اندازِ کہن) بھی ہے اور اندازِ نو بھی ہے یعنی یہ سچے مسلمان حالات حاضرہ سے بھی آگاہ ہیں اور عصرِ حاضر کے تقاضوں کو بھی پہچانتے ہیں۔ نیز ان کے طرزِ عمل میں تیری سرفروشی کا رنگ بھی پایا جاتا ہے۔

نظم بر صـ ۲۴۱

حلِّ لغات | نرگسِ بیمار۔ شعراء گلِ نرگس کو آنکھ سے تشبیہ دیتے ہیں اور بیمار کہنے کی وجہ یہ ہے کہ شاعروں کی معشوقہ چونکہ ہر وقت شراب کے نشہ میں مخمور رہتی ہے اور اس حالت میں آنکھ پورے طور سے نہیں کھلتی۔ اور یہی کیفیت مریض (بیمار) کی ہوتی ہے کہ ضعف کی وجہ سے اس کی آنکھ بھی نیم وا رہتی ہے اس لئے نرگس کو حسن تعلیل کی بنا پر بیمار کہنے لگے + شمشاد کو آزاد اس لئے کہتے ہیں کہ وہ سدا بہار ہے، بہار اور خزاں کی قید سے آزاد ہے۔ شاعر نے تخیّل کی بدولت آزاد کو قیدی کی ضد

تصور کرکے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ شمشاد دراصل تو پابند (قیدی) ہے یعنی حرکت نہیں کر سکتا، لیکن اُسے برائے نام آزاد کہتے ہیں + میں گریہ گردوں ہوں الخ یعنی باغ کے رہنے والے اس قدر غم دیدہ ہیں کہ مجھے آسمان کے آنسو، تصور کرتے ہیں۔ یعنی چونکہ وہ ہر وقت روتے رہتے ہیں اس لئے ساری دنیا کو اپنی ہی طرح سوگوار سمجھتے ہیں + کاشانۂ عالم یعنی دنیا کا محل + بنیاد ہوا پہ ہے یعنی دنیا کا نظام لائقِ اعتماد نہیں ہے۔ مراد ہے دنیا کی بےثباتی + فریاد کی تصویر ہے۔ یعنی اس دنیا میں ہر شخص مصیبت میں مبتلا ہے + قرطاس بمعنی کاغذ۔ قرطاسِ فضا سے مراد یہ ہے کہ قدرت نے یہ دنیا نہیں بنائی ہے بلکہ فضا میں آہ و فریاد کی تصویر کھینچ دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ دنیا سراسر مصیبت کا گھر ہے۔ سچ کہا ہے کسی نے ہ

دنیا جسے کہتے ہیں بلا خانہ ہے + پامال ہے جو عاقل و فرزانہ ہے

مطلب | ایک رات، ستارے، شبنم سے کہنے لگے کہ تو ہر روز دنیا میں جاتی ہے اور نت نئے نظارے دیکھتی ہے۔ ہم نے ایک فرشتہ کی زبانی سُنا ہے کہ دنیا آسمان سے بہت دور ہے۔ تو ہمیں اس دلکش خطہ کا کچھ حال سُنا جس کا طواف چاند، کرتا ہے۔

شبنم نے کہا کہ اے ستارو! کرۂ ارضی کا حال کچھ نہ پوچھو۔ وہ تو سراسر نالہ و فریاد کا گھر ہے۔ ہر شئی پہ موت اور فنا طاری ہے۔ کلی اِدھر کھلی اُدھر پھول بنی اور دوسرے دن مرجھا گئی۔ بلبل کی بدقسمتی دیکھو کہ وہ گُل کے فراق میں رات دن آہ و فغاں کرتی رہتی ہے لیکن گُل آہ سماعت ہی سے محروم ہے۔ انسانوں کا ستم دیکھو کہ باغ میں جس قدر خوش آواز طائر پائے جاتے ہیں سب کو گرفتار کرکے پنجروں میں بند کر دیتے ہیں گویا ان بےچاروں کی خوبی، ان کے حق میں بلائے جان بن گئی ہے۔ پھر فطرت کا ستم یہ ہے کہ جہاں پھول ہے وہیں کانٹا بھی ہے،

جہاں پھول توڑا، کانٹا بھی ہاتھ میں چبھ گیا۔ نرگس کو آنکھ ملی لیکن اس میں بینائی نہیں ہے۔ شمشاد کا حال یہ ہے کہ یوں کہنے کو سب اسے آزاد کہتے ہیں لیکن ایک قدم نہیں چل سکتا۔

خلاصۂ داستاں یہ ہے کہ دنیا کے لوگ اس قدر گرفتارِ رنج و الم ہیں کہ وہ تاروں کو بھی کسی مصیبت کے مارے ہوئے کی آہوں کے شرارے سمجھتے ہیں اور مجھے یہ سمجھتے ہیں کہ میں آسمان کے آنسوؤں کا مجموعہ ہوں یعنی آسمان رات بھر جس قدر روتا ہے صبح کو سب آنسو، شبنم کی شکل میں، دنیا پر نازل ہو جاتے ہیں (کیسی دلکش صنعت حسنِ تعلیل ہے) اور چاند جو زمین کے گرد طواف کرتا ہے یہ دراصل اس کی نادانی ہے وہ یہ سمجھتا ہے کہ شاید کوئی اللہ کا بندہ میرے داغِ جگر کا علاج کر دیگا لیکن وہاں کے لوگ تو خود داغِ جگر میں مبتلا ہیں، وہ دوسرے کا کیا مداوا کریں گے؟

نظم بر صـ ۲۴۲

حلِّ لغات | حق و باطل کی چھڑ گئی۔ یعنی جب باطل پرست بلقانی ریاستیں (بلغاریہ، سرویہ، رومانیہ، اور یونان) ترکی کے خلاف صف آرا ہوگئیں + حق خنجر آزمائی پہ مجبور ہوگیا۔ یعنی ترک مجبوراً ان کے مقابلہ کے لئے نکلے۔ اقبال نے ترکوں کو حق پر لکھا ہے کیونکہ دشمنوں نے بلاوجہ ان پر حملہ کیا تھا + اس لئے وہ اپنی مدافعت کرنے میں حق پر تھے + گرد بمعنی غبار۔ گردِ صلیب یعنی عیسائی حکومتیں + گردِ قمر یعنی ترکی کے چاروں طرف + حلقہ زن یعنی چاروں طرف سے حملہ آور ہوئیں + شکری۔ جنرل شکری پاشا جو بلغاریہ اور سرویہ اور مانٹی نیگرو کی متحدہ یورش کا مقابلہ کرنے کے لئے ایڈریانوپل کے محاذ کا سپہ سالار تھا۔ جب ترکی افواج دشمن کے حملہ کی تاب نہ لا سکیں تو شکری پاشا، ایڈریانوپل کے قلعہ میں داخل ہوگیا اور دشمنوں نے قلعہ کا محاصرہ کر

لیا۔ سپہ سالار مذکور نے پانچ ماہ تک بڑی ہمت کے ساتھ مدافعت کی لیکن مجبور ہوکر فروری ۱۹۱۳ء میں ہتھیار ڈال دئے + روئے امید آنکھ سے الخ یعنی کمک یا سامانِ رسد آنے کی کوئی امید نہیں تھی + امیرِ عسکر۔ سپہ سالار + آئینِ جنگ یعنی مارشل لاء جاری ہوگیا + شاہین سے ترکی فوج مراد ہے + عصفور بمعنی چڑیا۔ گدائے دانۂ عصفور ہوگیا یعنی مسلمان، عیسائیوں کی خوراک کے محتاج ہوگئے + گرما کے یعنی جوش میں آگیا + صاعقہ طور ہوگیا۔ صاعقہ بمعنی بجلی یعنی غصہ میں آکر مسلمانوں پر برس پڑا + ذمّی۔ فقہ کی اصطلاح میں وہ غیر مسلم ہے جو مسلمانوں کی حکومت میں رہتا ہو اور باقاعدہ جزیہ دیتا ہو۔ حکومت اس کی جان اور اس کے مال کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ کوئی مسلمان شخص (فرد یا حکومت) ذمّی کا مال اس کی مرضی کے بغیر اپنے تصرف میں نہیں لا سکتا +

تبصرہ | یہ نظم اقبالؔ نے اس لئے لکھی تھی کہ ترکوں کی سیرت کا ایک روشن پہلو دنیا کے سامنے پیش کر سکیں۔ اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس گئی گذری حالت میں بھی ترکوں کے دل میں شریعتِ اسلامیہ کا کس قدر پاس ہے۔ ایڈریانوپل جسے ترکی میں ادرنہ کہتے ہیں (فتحِ قسطنطنیہ سے پہلے ترکی کا پایۂ تخت تھا) یہ شہر فروری ۱۹۱۳ء میں ترکوں کے ہاتھ سے نکل گیا تھا لیکن غازی انور پاشا نے اُسکو جولائی ۱۹۱۳ء میں دوبارہ فتح کیا تھا۔

اس نظم کا مطلب بالکل واضح ہے۔ ترکی سپہ سالار نے مجبور ہوکر شہر کے باشندوں کے سامان پر قبضہ کر لیا لیکن فقیہِ شہر نے فتویٰ دیا کہ ذمّی کا مال مسلمانوں کے لشکر پر حرام ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ فوج نے بھوک کی تکلیف برداشت کی لیکن غیر مسلم رعایا کے سامانِ خورد و نوش کو بجنسہٖ واپس کر دیا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ فوج نے مجبور ہوکر ہتھیار ڈال دیئے۔

نظم برص ۲۴۳

حلِّ لغات | شاہ تیموری سے شاہ عالم ثانی مراد ہے جو ۱۷۵۹ء میں تخت نشین ہوا اور طویل عرصہ تک ہر قسم کی مصیبت اور ذلت برداشت کرنے کے بعد ۱۸۰۳ء میں انگریزوں کا وظیفہ خوار بن گیا ۔ ۱۸۰۶ء میں وفات پائی + سمن بر ۔ سمن بمعنی چنبیلی کا پھول اور بر بمعنی سینہ ۔ کنایہ ہے جسم سے ۔ یعنی وہ عورت جس کا جسم پھول کی طرح نازک ہو + مغفر بمعنی خود آہنی جو پہلے زمانہ میں سر کی حفاظت کے لئے پہنتے تھے + سبق آموزِ تابانی الخ یعنی جس کی صیقل ستاروں کو شرماتی تھی + جوہر سے فولاد کی عمدگی مراد ہے + احمر بمعنی سرخ +

تبصرہ | نظم کا مطلب تو بالکل واضح ہے لیکن طلبہ اور ناظرین کی آگاہی کے لئے اس تاریخی واقعہ کو نہایت اختصار کے ساتھ لکھے دیتا ہوں ۔

واضح ہو کہ غلام قادر خاں، نواب ضابطہ خاں کا بیٹا اور امیر الامراء وکیل مطلق نواب نجیب الدولہ کا پوتا تھا جنہوں نے مرہٹوں کا اقتدار ختم کرنے کے لئے احمد شاہ ابدالی کو دعوت دی تھی چنانچہ پانی پت کی تیسری لڑائی کے بعد، ہندوستان میں مرہٹوں کا اقتدار بالکل ختم ہو گیا تھا اور اگر احمد شاہ ابدالی اس وقت دلی کے تخت پر خود بیٹھ جاتا تو آج ہندوستان کی تاریخ بالکل مختلف ہوتی ۔

جب تک نواب نجیب الدولہ زندہ رہے، مرہٹوں کو سر اٹھانے کی ہمت نہ ہو سکی لیکن جب ۱۷۷۰ء میں ان کا انتقال ہو گیا تو مرہٹوں نے مرحوم کے بیٹے ضابطہ خاں سے ۱۷۶۱ء کی شکست کا انتقام لینے کی غرض سے، پہلے شاہ عالم ثانی کے وزیر نجف علیخاں کو، جو روہیلوں سے قلبی بغض رکھتا تھا (جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے) اپنے ساتھ ملایا، پھر شاہ عالم کو ہموار کیا ۔ چنانچہ اس عقلمند بادشاہ نے سکھوں کے یا جاٹوں

کے خلاف اعلان جنگ کرنے کے بجائے اپنے محسن کے بیٹے اور اپنے بھائیوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا، یعنی ۱۷۷۲ء میں مرہٹوں کا آلۂ کار بن کر روہیلوں پر حملہ آور ہوا ۔ بادشاہ سلامت کی فوج نے پتھر گڑھ کے قلعہ کا محاصرہ کیا اور جب روہیلوں نے ہتھیار ڈال دئے تو مرہٹوں اور شاہی فوج، دونوں نے افغانی خواتین کی عرفی معنوں میں بے عزتی کی چنانچہ جادو ناتھ سرکار لکھتا ہے کہ "مغل اور مرہٹہ سپاہی، روہیلہ سرداروں کی عورتوں کا ہاتھ پکڑ پکڑ کے اپنے خیموں میں لے گئے اور ......" تفصیل کے لئے دیکھو زوالِ سلطنتِ مغلیہ جلد سوم ۔ غلام قادر خاں نے جس کی عمر اس وقت ۱۲ ۔ ۱۳ سال کی تھی، اپنی ماؤں اور بہنوں کی یہ بے عزتی اپنی آنکھ سے دیکھی تھی ۔

اس کے بعد ۱۷۷۴ء میں مرہٹوں نے شاہ عالم کو دوبارہ روہیلوں پر حملہ کرنے کے لئے ابھارا چنانچہ یہ عقلمند بادشاہ، سکھوں اور جاٹوں کی سرکوبی کے بجائے پھر اپنے بھائیوں کا خاتمہ کرنے کے لئے مرہٹوں کے ساتھ روہیلوں پر حملہ آور ہوا اور غوث گڑھ کا قلعہ فتح کرنے کے بعد اس نے روہیلوں کا خاتمہ کر دیا اور ضابطہ خاں کے اہل و عیال کو آگرہ کے قلعہ میں قید کر دیا ۔ گویا مرہٹوں نے شاہ عالم کی وساطت سے ۱۷۶۱ء کا انتقام پوری طرح روہیلوں سے لے لیا ۔ اور جب بادشاہ پٹھانوں کی امداد سے محروم ہو گیا تو انہوں نے اسے اپنا غلام بنا لیا ع چہ خوش بود کہ بر آید بیک کرشمہ دو کار ۔ ہر تاریخ داں جانتا ہے کہ ۱۷۸۸ء سے لے کر ۱۸۰۳ء تک شاہ عالم مرہٹوں کی قید میں رہا ۔

غلام قادر خاں نے، جسے انگریز اور ہندو مورخین ظالم اور جفا جو کہتے ہیں، نہ شاہ عالم پر ظلم کیا نہ ستم ۔ صرف اپنی ماؤں اور بہنوں کی بے عزتی کا انتقام لیا تھا اور وہ اس فعل میں بالکل حق پر تھا ۔ اگر یہ واقعہ راقم الحروف پر گذرتا تو موقع

حاصل ہو جانے کے بعد میں بھی یہی کرتا ۔ اس نے پھر بھی افغانی شرافت سے کام لیا یعنی کسی عورت کی بے عزتی نہیں کی ۔ انگریزوں نے تو ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں سے وہ انتقام لیا کہ تاریخ اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے ۔

میرا خیال ہے کہ ان تصریحات سے غلام قادر خاں کی پوزیشن بالکل صاف ہو سکتی ہے ۔ اس نے وہی کیا جو ہر غیرت دار انسان کو کرنا چاہیئے اس شرح میں اس سے زیادہ وضاحت نہیں کر سکتا ۔ اگر خدا نے مجھے ہندوستان کی تاریخ لکھنے کی توفیق ارزانی فرمائی تو جہاں اور بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ کروں گا، شاہ عالم ثانی کے "کارناموں" کو بھی تفصیل کے ساتھ بیان کروں گا ۔

نظم برص ۲۴۵

حلِّ لغات | مرغ سرا ۔ وہ پرندے جو گھروں کے آس پاس یا دیواروں پر بیٹھے رہتے ہیں جیسے کوا + مرغ ہوا ۔ وہ پرندے جو ہمیشہ فضا میں اڑتے رہتے ہیں جیسے شاہین + ہواگیر ۔ یعنی ہوا میں اڑنے والا + پندار ۔ غرور یا تکبر + حمیت مجروح ہوئی یعنی اس نے اس گفتگو کو اپنی توہین سمجھا + صدد بمعنی جستجو یا تلاش +

مطلب | ایک کوے نے ایک شاہین سے کہا کہ جس طرح تو آزاد ہے اور اڑ سکتا ہے اسی طرح میں بھی آزاد ہوں اور اڑ سکتا ہوں ۔ پھر تجھے مجھ پر کیا تفوق حاصل ہے؟ شاہین نے یہ سن کر جواب دیا کہ بے شک تو بھی اڑ سکتا ہے لیکن زیادہ سے زیادہ تیری پرواز صحن سے دیوار تک یا کسی درخت تک ہے ۔ اس کے علاوہ تو پست ہمت بھی ہے کہ اپنا رزق، زمین میں تلاش کرتا ہے لیکن میں ستاروں تک پہنچ جاتا ہوں ۔

مطلب یہ ہے کہ انسان کی بزرگی اس کی ہمت کی بلندی پر موقوف ہے ۔

نظم برص ۲۴۶

حلِّ لغات | مذاق دید سے تحقیق اور مطالعۂ فطرت کا جذبہ یا ذوق مراد ہے + رہن ۔ وہ چیز جسے گروی رکھ دیا جائے + مراد یہ ہے یعنی تیری خواہش کے مطابق ہے + سود بمعنی نفع + کاوش زیاں ۔ نقصان کی تکلیف + محروم بادباں، مراد ہے سکشتہ +

مطلب | (۱) اس دنیا میں ایک شخص کم علم اور نادان ہے، دوسرا بڑا محقق اور دانا ہے

(۲) ایک شخص ہر وقت مصیبتوں میں رہتا ہے دوسرا کامیابی کی زندگی بسر کر رہا ہے ۔

(۳) ایک شخص کو دنیا میں کہیں ٹھکانا نصیب نہیں ہوتا، دوسرا محلوں میں رہتا ہے

(۴) ایک شخص دولت کما رہا ہے، دوسرا نقصان اٹھا رہا ہے ۔

(۵) ایک شخص کو ترقی کے تمام وسیلے حاصل ہیں، دوسرا بے وسیلہ زندگی بسر کر رہا ہے

(۶) ایک قوی ہے، دوسرا ناتواں ہے لیکن ایسا ہے تو کیا ہوا؟ اور ویسا ہے تو کیا ہوا؟

(۷) اس دنیا میں کسی شخص کی زندگی ایک نہج پر بسر نہیں ہو سکتی ۔ جو شخص آج دولت مند ہے کل مفلس ہو جاتا ہے ۔ آج خوش ہے کل رنجیدہ نظر آتا ہے ۔ اس لئے اگر کوئی شخص آج کامیاب ہے تو کیا؟ اور دوسرا ناکام ہے تو کیا؟ انجام دونوں کا یکساں ہے یعنی یہ کہ نہ اسے ہمیشگی ہے نہ اسے ۔ آخر کار دونوں موت کی آغوش میں سو جائیں گے ۔

نظم برصؔ ۲۴۷

حلِ لغات | شعار صاحب یثرب - سنت یا شریعت نبوئی + حلقہ، خاتم - انگوٹھی کا دائرہ - مراد ہے مسلمان کی ذات یا شخصیت + گردوں اسیر تھا یعنی دنیا غلام تھی + سلیمان سے مسلمان مراد ہے + نگین سے مراد ہے طاقت + آشیاں سے ملت اسلامیہ مراد ہے + آباد کرنے سے تبلیغ دین مراد ہے + رام بمعنی مطیع +

تبصرہ | اقبال نے اس نظم میں ابوطالب کلیم کے ایک شعر پر تضمین کی ہے - کلیم کا وطن ہمدان تھا - جہانگیر کے عہد میں وارد ہندوستان ہوا - اور شاہنواز خاں صفوی کے دربار سے وابستہ ہوگیا - سنہ ۱۰۲۸ھ میں وطن واپس چلا گیا لیکن سنہ ۱۰۳۰ھ میں دوبارہ یہاں آیا - شاہجہاں نے جب تختِ طاؤس پر جلوس کیا تو کلیم نے ایک قصیدہ دربار میں سنایا، جس پر شاہجہاں نے اُسے چاندی میں تلوایا - جس کی قیمت ۵۵۰۰ روپے ہوئی - بادشاہ کے ساتھ کشمیر کی سیر کو گیا - یہ خطہ اسے اس قدر پسند آیا کہ بادشاہ کی اجازت سے یہیں مقیم ہوگیا - غنی کاشمیری سے دوستانہ تعلقات ہوگئے جو آخر وقت تک قائم رہے سنہ ۱۰۶۱ھ میں وفات پائی - سری نگر میں مزار الشعراء نامی قبرستان میں قدسی کے برابر محوِ خواب ہے - غنی نے تاریخ وفات کہی ع طور معنی بود روشن از کلیم -

مطلب | اقبال نے اس نظم میں مسلمانوں کو ان کی غفلت پر متنبہ کیا ہے کہ تم نے سُنتِ نبوئی کی پیروی اور اسلام کی اشاعت دونوں باتوں کو چھوڑ دیا ہے اس لئے تم دنیا میں غلام ہوگئے ہو - کہتے ہیں کہ تجھے سُنتِ نبوئی کی اتباع کا مطلق خیال نہیں رہا اور تیری زندگی بالکل غیر اسلامی ہوگئی ہے + جس گوہر کی بدولت تو دنیا پر حکمراں تھا، تو نے اپنی غفلت سے کھو دیا + اب تیری پیشانی پر مجھے سجدہ کا نشان بھی نظر نہیں آتا + اب تجھ میں وہ صداقت بھی نظر نہیں آتی جس کی بنا پر تو بادشاہوں کے سامنے کلمۂ حق، کہہ سکتا تھا + کتنے افسوس کی بات ہے کہ تیرے آباؤ اجداد تو کفر کو مٹاتے تھے لیکن تو خود کافروں کا دوست بنا ہوا ہے + اے مسلمان! از سرِنو دینِ اسلام سے اپنا رشتہ استوار کر - دیکھ! کلیم نے کیا عمدہ نکتہ بیان کیا ہے "مناسب ہے کہ تو اُس شخص (محبوب مراد ہے) کی پھر اطاعت شروع کر دے جس کے خلاف تو نے سرکشی کا شیوہ اختیار کر لیا ہے (یعنی حضورؐ کی غلامی اختیار کر) اور شعلہ کی طرح تو جہاں سے اٹھا ہے، دوبارہ اُسی جگہ بیٹھ جا - یعنی اسلام کی اطاعت کر +

نظم برصؔ ۲۴۸

حلِ لغات | مُسلم سے پوری قوم یا ملّت اسلامیہ مراد ہے + دیوان جُزو کل سے دنیا مراد ہے + یگانہ وجود فرد ہے یعنی دنیا میں ملّت اسلامیہ بے نظیر ہے + فرد بمعنی یکتا یا بے نظیر + علوم نو - جدید فلسفہ اور سائنس + سرو درفتہ سے مسلمانوں کے علوم و فنون مراد ہیں + گرد سے ثمرہ یا نتیجہ مراد ہے یعنی دنیا تیری بدولت تہذیب و تمدن سے آشنا ہوئی + مردانِ کار یعنی عقلمند آدمی جو خرابی کا تدارک کر سکتے ہیں + چمن سے ملت اسلامیہ مراد ہے + خزاں سے زوال مراد ہے + ہم نبرد - جنگ آزما + غمّاز بمعنی چغلخور یا راز فاش کرنے والا + چمنستان کے راز دار یعنی قوم کے غمگسار + نوائے درد - درد انگیز شاعری -

تبصرہ | اس نظم میں اقبال نے مولٰنا شبلی نعمانی اور مولٰنا حالی پانی پتی کی وفات پر اپنے رنج و الم کا اظہار کیا ہے - ان دونوں بزرگوں کی وفات میں صرف ۱½ ماہ کا فرق ہوا -

مولانا شبلی مرحوم، بلاشبہ ایک جامع حیثیات شخص گذرے ہیں؛ وہ بیک وقت منطقی فلسفی متکلم مورخ ادیب شاعر نقاد انشاپرداز مصنف لیکچرار استاذ منتظم مدبّر سیاست دان اور عالمِ دین تھے - میری نگاہ میں تو اُن کے یہی دو کارنامے ان کی بزرگی اور عظمت کے ثبوت کے لئے کافی ہیں ایک تو یہ کہ ان کے گوہر بار قلم سے سیرت النبیؐ جیسی محققانہ کتاب عالم وجود میں آئی دوسرا یہ کہ انہوں نے حضرت سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہٗ کو قوم کی خدمت کے لئے تیار کر دیا - ان کا تیسرا کارنامہ ندوۃ العلماء کا قیام ہے - جو ان کی عملی قوت اور علم دوستی کا ایک پائیدار نشان ہے - ۱۸ نومبر سنہ ۱۹۱۴ء کو ۵۷ سال کی عمر میں وفات پائی - (تفصیل کے لئے دیکھئے حیات شبلی مولفہ مولٰنا سید سلیمان ندوی)

مولانا حالی (خواجہ الطاف حسین شمس العلماء) سنہ ۱۸۳۷ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے تھے - غالب کی صحبت میں رہ کر ادب اور شاعری کے ذوق کی تکمیل کی - نہایت مخلص اور دردمند مسلمان تھے - سرسید کی فرمائش پر سنہ ۱۸۷۹ء میں مسدس لکھا جس کی بدولت ان کا نام سارے ہندوستان میں مشہور ہوگیا - جس طرح "سر" سید احمد خاں کے نام کا جزو بن گیا ہے اسی طرح "مسدس" حالی کے نام سے وابستہ ہوگیا ہے - مرحوم نے ساری زندگی قوم کی خدمت میں بسر کی - اس دور میں حالی اکبر اور اقبال ہمارے بہترین قومی شاعر گذرے ہیں - انہوں نے ۳۰ دسمبر سنہ ۱۹۱۴ء کو وفات پائی - ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اردو شاعری میں انقلاب پیدا کر دیا -

مطلب | ایک دن میں نے مسلمان یا (اپنی قوم) سے یہ کہا کہ تو اس دنیا میں بے نظیر ہے - جدید سائنس اور فلسفہ تیرا ہی پیدا کردہ ہے - اور دنیا تیری بدولت تہذیب سے آشنا ہوئی - لیکن تو جانتا ہے کہ انسان کی آبرو بہت نازک شی ہے - ذرا سی غفلت یا غلطی سے زائل ہو جاتی ہے - اس لئے عقلمند آدمی، یہ معلوم کرتے رہتے ہیں کہ قوم کیوں رو بزوال ہے؟ اور اس کے بعد اس کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوتے ہیں - اے مسلمان! تو اپنی قوم کے بزرگوں سے دریافت کر کہ تیری قوم کیوں پستی کی طرف جا رہی ہے؟ مسلم میری گفتگو سے بہت مضطرب ہوگیا اور کہنے لگا کہ اے اقبال! ؛ اور جب وہ یہ کہنے لگا تو ٹھنڈی سانس نے اس کے غم پوشیدہ کو ظاہر کر دیا، قوم پر ایسا زوال آیا ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں ضعف پیدا ہوگیا ہے - وہ لوگ جن کے کلام کی "تاثیر" سے دل میں قوم کی خدمت کا جذبہ پیدا ہوتا تھا - ایک ایک کر کے دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں - ابھی قوم شبلی کے ماتم سے فارغ نہیں ہوئی تھی - کہ حالی نے داغ مفارقت دے دیا - اندریں حالات کسے فرصت ہے کہ باغبان سے یہ پوچھے کہ بلبل نے کیا کہا، پھول نے کیا سُنا اور صبا نے کیا کیا؟

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ قوم کے امراض کا علاج کر سکتے تھے وہ تو رخصت ہوتے جاتے ہیں تو اب اصلاح کون کرے گا؟ علاوہ بریں جو لوگ باقی رہ گئے ہیں وہ اس وقت اُن کی وفات کے رنج میں ایسے مبتلا ہیں کہ اصلاح کی طرف توجہ نہیں کر سکتے -

نظم برصؔ ۲۴۹

حلِ لغات | ارتقاء، کسی چیز کا آہستہ آہستہ، مختلف منازل سے گذر کر مرتبۂ کمال کو پہونچنا - ترقی کرنا + ستیزہ کار - برسرجنگ + ازل سے ابتداء سے + چراغ مصطفوئی سے اسلام یا حق مراد ہے - مصطفٰےؐ، حضور سرورِ کائناتؐ کا لقب ہے - شرارِ بولہبی سے کفر یا باطل مراد ہے - بولہب، حضور اقدسؐ کے چچا کا لقب ہے - جو اسلام کا شدید ترین دشمن تھا + سرشت - ذاتی خصوصیات

جو کسی وقت جدا نہ ہو سکیں + زم بمعنی سردی + شیشۂ حلبی - وہ آئینہ جو حلب واقع ملک شام میں تیار ہوتا تھا + قطرہ نیساں سے مارچ اپریل کے مہینہ میں بارش مراد ہے - نیساں قدیم عبرانی اور سریانی زبان میں اس مہینہ کا نام ہے جس میں وہ بارش ہوتی ہے جس سے صدف میں موتی اور انگور کی بیل میں خوشۂ انگور پیدا ہوتا ہے + آتش عنبی - کنایہ ہے شراب سے جو انگور کے شیرہ سے تیار ہوتی ہے + تب و تاب ملت عربی یعنی مسلمانوں کی ترقی کا راز + ستارہ می شکنند یعنی ایک ادنی چیز کو اعلیٰ چیز میں تبدیل کر دیتے ہیں -

تبصرہ | اس نظم میں جس کا انداز بیان بہت مشکل ہے، اقبال نے اس نکتہ کو واضح کیا ہے کہ قومیں، اس دنیا میں صرف، کشاکش پیہم یا مسلسل جد و جہد ہی سے زندہ رہ سکتی ہیں - اس دعوی کے ثبوت میں انہوں نے نظام کائنات کو گواہ کے طور پر پیش کیا ہے - وہ کہتے ہیں کہ

(۱) غور کر کے دیکھو لو! ابتداء سے آج تک کفر، اسلام سے مسلسل جنگ کر رہا ہے رات دن، اس کو مٹانے کی فکر میں لگا ہوا ہے -

(۲) بات یہ ہے کہ زندگی کی ساخت ہی اس قسم کی ہے کہ وہ شعلہ مزاج ہے، غیور اور ہنگامہ خیز ہے - اور اپنی پیدائش کے اعتبار سے دشواری پسند اور جفا طلب ہے -

(۳) مثالاً غور کرو کہ جو نغمہ صبح کے وقت ظہور میں آتا ہے اس کی ابتدا شام کی خاموشی سے ہوتی ہے - وہ خاموشی ارتقائی منزلیں طے کرتی ہوئی، آدھی رات کی آہ و فغاں کی صورت سے گذرتی ہوئی کہیں صبح ہوتے نغمہ کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے -

(۴) اسی طرح وہ تاریک مٹی جو آخر کار آئینہ حلبی کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے، پہلے محض تاریک مٹی ہی ہوتی ہے - رفتہ رفتہ سردی اور گرمی کی کشمکش میں گرفتار ہو کر شیشہ بنتی ہے وہ شیشہ بھٹی میں پگھلایا جاتا ہے، میل کچیل صاف کرنے کے بعد اُسے صیقل کرتے ہیں پھر تراشتے ہیں تو آئینہ بنتا ہے -

(۵) اس طرح قطرۂ نیساں پہلے دانۂ انگور میں بستہ ہوتا ہے پھر خوشوں کو توڑتے ہیں، نچوڑتے ہیں، پھر شیرۂ انگور کو آگ پر چڑھاتے ہیں، پھر بھٹی میں کشید کرتے ہیں تو انگوری شراب بنتی ہے -

(۶) خلاصہ کلام یہ ہے کہ قومیں اسی کشمکش کی بدولت جسے اصطلاح میں تنازع للبقاء کہتے ہیں، دنیا میں زندہ رہ سکتی ہیں - اگر مسلمان زندہ رہنا چاہتے ہیں تو انہیں بھی دن رات جد و جہد میں مصروف رہنا لازمی ہے -

(۷) وہ شراب فروش جو انگور سے شراب بناتے ہیں: دیکھ لو! کیا کمال کرتے ہیں! وہ انگور کی بیل سے انگور توڑتے ہیں اور مسلسل جد و جہد سے انگوروں کو (جو ستاروں سے مشابہ ہیں) شراب کی شکل میں تبدیل کر دیتے ہیں (جو اپنی گرمی اور تیزی کی وجہ سے آفتاب سے مشابہ ہے) -

خلاصہ یہ ہے کہ ارتقاء، اس دنیا کا قانون ہے - کوئی چیز اس سے مستثنیٰ نہیں ہے - لیکن ترقی وہی چیز کر سکتی ہے جو ترقی کے لئے دن رات کوشش کرے - چارپائی پر لیٹ کر حقہ پینے سے نہ کوئی فرد ترقی کر سکتا ہے نہ قوم ترقی کر سکتی ہے + کاش پاکستان کا مسلمان اب بھی اس نکتہ سے آگاہ ہو جائے تو انشاءاللہ ۲۵ سال کے بعد، برطانیہ کو اپنا غلام بنا سکتا ہے -

نظم بر صفحہ ۲۵۰

حل لغات | فرط طرب: خوشی کے مارے + درہم - چاندی کا سکہ جو مسلمانوں کے ابتدائی دور میں رائج تھا، موجودہ چونی سے کچھ زیادہ + راہوار - گھوڑا + نخل ایمنؑ - امین وہ لقب ہے جو اہل مکہ نے، دعوی نبوت سے پہلے آپ کو دیا تھا + ایثار کی دست نگر الخ یعنی جب تک انسان قربانی نہ کرے، وہ کوئی کام شروع نہیں کر سکتا + اعتبار سے اس جگہ عزت مراد ہے + ملک یمین سے کنیز یا غلام مراد ہے - یہ عربی ترکیب ہے، اس کے لغوی معنی ہیں وہ شئی جس کا مالک داہنا ہاتھ ہو + جنس سے سامان خورد و نوش مراد ہے + اسپ قمر سم - ایسا گھوڑا جس کے سُم چاند کی طرح حسین ہوں + قاطر بمعنی خچر + حمار بمعنی گدھا + اے تجھ سے دیدۂ مہ و انجم الخ یعنی حضور کی بدولت چاند اور ستاروں میں روشنی ہے + اے تیری ذات باعث الخ یعنی حضور کے لئے یہ دنیا پیدا کی گئی - واضح ہو کہ صوفیائے کرام کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ نے یہ دنیا حضور کی خاطر پیدا کی - چونکہ اقبال خود اسی عقیدہ کو صحیح سمجھتے ہیں اس لئے انہوں نے اس شعر میں اس کو نظم کر دیا ہے - یہ عقیدہ اس حدیث سے مستنبط ہے لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاكَ - اس کی تشریح لکھ چکا ہوں +

تبصرہ | یہ نظم اقبال نے حضرت سیدنا صدیق اکبرؓ کی منقبت (فضیلت) میں لکھی ہے جو "ثانیٔ اسلام و غار و بدر و قبر" ہیں، افضل البشر بعد الانبیاء ہیں اور سرکار دو عالم صلعم کے سچے عاشق ہیں - مسلمانوں کے سرتاج اور سردار ہیں، اس جگہ ان کے مناقب تو بیان نہیں کر سکتا صرف ارشاد نبوی پر اکتفا کرتا ہوں کہ فرمایا حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ دنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کے احسانات کا نعم البدل میں نے نہ کر دیا ہو لیکن ابوبکر کے احسانات کا بدل نہیں کر سکا - صدیق اکبرؓ نے پانچ ہزار روپیہ تو ہجرت کے موقع پر حضورؐ کی نذر کیا اور دو مرتبہ سارا گھر، سارا اثاث البیت، اسلام کی اشاعت کے

لئے حضورؐ کے قدموں میں لا کر ڈال دیا - ایک مرتبہ تن کے کپڑے بھی دے دیئے اور صرف ایک کمبل اپنے لئے باقی رہنے دیا - جب نماز پڑھتے تھے تو ببول کا ایک بڑا سا کانٹا لگا لیتے تھے تاکہ حالت رکوع میں وہ کمبل شانوں سے نہ سرک جائے + زندگی بھر ساتھ رہے تو بعد وفات بھی محبوبؐ کی قربت نصیب ہوئی ع یہ نصیب! اللہ اکبر! لوٹنے کی جائے ہے +

فاروق اعظمؓ اگرچہ عشق و اخلاص و صدق و صفا میں صدیق اکبرؓ سے کمتر ہیں لیکن ان کو چھوڑ کر دنیا کی تاریخ میں، عدیم المثال ہیں - میری کیا مجال کہ شیخینؓ کی مدح کر سکوں - صرف اس واقعہ کے بیان پر اکتفا کرتا ہوں کہ جب ۱۹۳۷ء میں ہندوستان کو صوبجاتی خود مختاری ملی تو ہندوؤں کے رہنما اور دنیا کے تمام مذاہب کی تاریخ سے آشنا، مسٹر ایم کے گاندھی نے کانگریس کے لیڈروں کو یہ مشورہ دیا تھا کہ "اگر کسی آئیڈیل حکمراں کا نمونہ درکار ہو تو مسلمانوں کے محبوب پیشوا حضرت عمرؓ کی زندگی تمہارے لئے مشعل ہدایت ہے کیونکہ ان سے بہتر حکمراں آج تک دنیا میں نہیں ہوا"

واضح ہو کہ گاندھی جی کے اس قول میں مطلق مبالغہ نہیں ہے - واقعی دنیا میں آج تک کوئی حکمراں ایسا پیدا نہیں ہوا جس کے کرتے میں بارہ ۱۲ بارہ ۱۲ پیوند لگے ہوئے ہوں، جس کے پاس دوسرا جوڑہ بدلنے کے لئے نہ ہو، جو پھٹا ہوا تہ بند باندھ کر جمعہ کی صبح کو اپنے پیوند لگے ہوئے کپڑے خود دھوتا ہو لیکن قیصر و کسریٰ اس کے نام سے لرزہ بر اندام ہوں، اور ۳۶ ہزار شہر اور قلعے اس کے زیر نگیں ہوں اور خالد جانباز جیسا شہرۂ آفاق سپہ سالار جس کے نام سے شیروں کے پتے پانی ہوتے تھے اُس کا ادنیٰ غلام ہو، اور نصاریٰ بیت المقدس کی کنجیاں خود اس کے حوالہ کرنے میں اپنی عزت سمجھیں -

اتنی صراحت اور ضروری معلوم ہوتی ہے کہ جس واقعہ کو اقبالؔ نے نظم کیا ہے اُس کا تعلق غزوۂ تبوک سے ہے جو ۹ھ میں واقع ہوا تھا - اس موقع پر حضرت عثمانؓ نے اس قدر دولت اور سامان جنگ حضور کی خدمت میں پیش کیا تھا کہ آپؐ نے بھرے مجمع میں اُن کے جنتی ہونے کی بشارت دیدی تھی -

نظم کا مطلب تو بالکل واضح ہے، یعنی جب حضورؐ نے صحابہؓ سے جہاد کے لئے مال طلب فرمایا تو سب نے اپنی اپنی حیثیت کے مطابق نذرانہ پیش کیا - حضرت عثمانؓ نے موجودہ کرنسی کے مطابق ایک لاکھ سے زیادہ حاضر خدمت کیا تھا، حضرت عمرؓ نے اپنا آدھا مال پیش کر دیا لیکن صدیق اکبرؓ نے، جن کی ذات سے دنیا میں عشق کا وجود برقرار ہے، سارا اثاثہ حاضر خدمت کر دیا - کنیز غلام، چاندی، سونا، اثاث البیت، غلہ، سامانِ زندگی، لباس، اسباب خانہ داری، گھوڑے، اونٹ، خچر اور گدھے غرضیکہ جو کچھ اُن کے پاس تھا سب لاکر محبوب کے قدموں پر نچھاور کر دیا جب سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دریافت کیا کہ "اے ابابکر! اپنے عیال واطفال یعنی بیوی بچوں کے لئے کیا چھوڑ کر آئے ہو؟ تو اس سرخیل عاشقانِ عالم نے جو جواب دیا وہ رہتی دنیا تک، محفل عشاق کو اپنی روشنی سے جگمگاتا رہے گا یعنی یہ کہ میرے اور میرے عیال واطفال کے لئے اللہ اور اُس کا رسولؐ کافی ہے، ؎

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس ٭ صدیقؓ کے لئے ہے خدا کا رسول بس

نظم بر ص ۲۵۱

حلّ لغات | بھبھوکا - ہندی لفظ ہے یعنی آگ کا شعلہ + تاب مستعار - مانگی ہوئی چمک + آفتاب جلوہ فرما سے تہذیب مغرب مراد ہے + تدبّر یعنی

کسی معاملہ کے سارے پہلوؤں اور اس کے نشیب و فراز اور انجام پر غور کرنا کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا + تخیّل سے افکار و خیالات مراد ہیں + ہنسی سمجھی گئی گلشن میں، الخ بڑا بلیغ مصرع ہے یعنی قوم کے نوجوان اس قدر بےباک اور گستاخ ہو گئے ہیں کہ بزرگوں کی نصیحتوں پر غور کرنے اور عمل کرنے کے بجائے انہوں نے ان بزرگوں ہی کا مذاق اڑانا شروع کر دیا - (کالج کی اصطلاح میں اسے فول بنانا کہتے ہیں) تازہ پروازوں سے کالج کے وہ لڑکے لڑکیاں مراد ہیں جنہوں نے ابھی ابھی ڈراموں میں پارٹ لینا شروع کیا ہے + آشیاں گم کر دیا یعنی اپنی ملّی روایات فراموش کر دیں یا شعائر اسلامی ترک کر دیئے + ساحر سے انگریزی حکومت مراد ہے جس نے مسلمان قوم کو کمال چابکدستی کے ساتھ دین سے بیگانہ بنا دیا - کمالِ فن یہ ہے کہ جس قدر اسلامیہ کالجوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، مسلمان لڑکیاں اور لڑکے اسی قدر دین سے بیگانہ ہوتے چلے گئے + حیاتِ تازہ سے وہ تہذیب مغرب مراد ہے جس کی بدولت نوجوان لڑکیاں، غیروں کے ساتھ شام کے وقت، دریائے راوی کے کنارے، زندگی کے اسرار یعنی فرائڈ کے نظریات کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہیں - وہ اسرار تو اُن کی سمجھ میں کیا آتے (ان کے اساتذہ خود نہیں سمجھتے) ہاں، رقابت، خودفروشی ناشکیبائی اور ہوسناکی کی صفات ضرور پیدا ہو جاتی ہیں -

دل کی گہرائی سے صدائے آفریں بلند ہوتی ہے اقبالؔ کی ژرف نگاہی اور فراست اور دور بینی پر کہ انہوں نے ۱۹۱۵ء میں وہ منظر دیکھ لیا جس کے دیکھنے کا شرف راقم الحروف کو ۱۹۵۱ء میں حاصل ہوا - جب میں یہ شعر پڑھتا ہوں کہ

حیاتِ تازہ اپنے ساتھ لائی لذتیں کیا کیا -
رقابت، خودفروشی، ناشکیبائی، ہوسناکی

تو حیران رہ جاتا ہوں کہ اقبالؔ نے زمانہ آئندہ کی اس قدر صحیح تصویر کیسے کھینچ دی! جس کو شک ہو، وہ اپنی قوم کے افراد کی زندگی کا مطالعہ کر لے کم و بیش یہی صفات چہارگانہ، اُن کی زندگیوں میں نظر آئیں گی -

فروغِ شمع نو سے تہذیب مغرب کی ظاہری چمک دمک مراد ہے + بزم مسلم سے مسلمان قوم مراد ہے + پروانوں سے کالج کے نوجوان مراد ہیں + کہنہ ادراکی سے وہ عقل و فہم مراد ہے جو تجربہ کی بنا پر پایۂ تکمیل کو پہونچتی ہے +

تبصرہ | اقبالؔ نے اس نظم میں تہذیب مغرب کے مفاسد اور معایب سے قوم کے نوجوانوں کو آگاہ کیا ہے - یہ سچ ہے کہ کسی نے اس طرف توجہ نہیں کی لیکن انہوں نے تو اپنا فرض ادا کر دیا - اس نظم میں انہوں نے فیضیؔ کے مشہور شعر پر تضمین کی ہے اور حق یہ ہے کہ تضمین کا حق ادا کر دیا ہے -

فیضیؔ، اکبر مرتد کا درباری شاعر اور ندیم تھا - عربی فارسی ترکی اور سنسکرت چاروں زبانوں میں ید طولیٰ رکھتا تھا - جودتِ طبع اور ذہانت کے لحاظ سے اس کے زمانہ میں کوئی شخص اس کا ہمسر نہیں تھا - چنانچہ اس کی تفسیر سواطع الالہام آج بھی اس بات پر شاہد ہے - اس کے فارسی دیوان میں صدہا اشعار ایسے ہیں کہ ایک مصرع فارسی میں ہے، دوسرا نہایت فصیح عربی میں ہے - ۹۵۴ھ میں پیدا ہوا اور ۱۰۰۴ھ میں فوت ہوا -

مطلب | کہتے ہیں کہ مغربی تہذیب نے، جس کی بنیاد مادہ پرستی پر ہے، نوجوانوں کے جذبات کو اس قدر برانگیختہ کر دیا ہے کہ وہ دائرۂ اعتدال سے باہر ہو چکے ہیں -

(۲) اس تہذیب کا ظاہری پہلو یہ ہے کہ دیکھنے والوں کو، قوم کے نوجوانوں کی زندگیاں، بڑی کامیاب نظر آتی ہیں بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑی ترقی کر رہے ہیں، حالانکہ معاملہ بالکل دگرگوں ہے -

(۳) ان کی طبیعت میں انقلابِ عظیم پیدا ہو گیا ہے - چنانچہ ان کی زندگی میں جو یہ فیشن پرستی، آزادی، بیداری اور بےباکی نظر آتی ہے یہ سب اس تہذیب کا کا کرشمہ ہے

(۴) ان کے خیالات اور افکار میں اس قدر بے راہ روی پیدا ہو گئی ہے کہ وہ اب بزرگوں کی نصیحت کو خاطر ہی میں نہیں لاتے اور اپنی بربادی کو ترقی سمجھتے ہیں -

(۵) لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ اس تہذیب کی بدولت وہ اپنی ملّی روایات سے بالکل بیگانہ ہو چکے ہیں - اور اب انہیں اپنے اسلاف کے طریقوں سے کوئی وابستگی باقی نہیں رہی ہے -

(۶) اب ان کی زندگی میں ہمدردی کے بجائے رشک و حسد، غیرت کے بجائے خودفروشی، صبر و استقلال کے بجائے ناشکیبائی اور ضبطِ نفس کے بجائے ہوسناکی کارفرما ہے -

(۷) اگرچہ اس تہذیب کی بنا پر ہر طرف ترقی کا شور بپا ہے اور بیداری کے آثار نظر آ رہے ہیں لیکن اس کے باوجود میں اپنی قوم کے نوجوانوں سے یہ کہنا چاہتا ہوں

(۸) کہ اے مسلمان نوجوانو! یہ جو کچھ "ترقی" تم کر رہے ہو یہ تمہاری ذاتی خوبی کی بنا پر نہیں ہے - تم نے اپنے آپ کو مستعار لباس سے آراستہ کر رکھا ہے - اگر واقعی تم ترقی کے آرزو مند ہو تو غیروں کی تہذیب کے بجائے اپنی قومی روایات پر عامل ہو کر دنیا میں عزت حاصل کرو - یعنی مسلمان رہ کر دنیا میں چمکو تو یہ قابل فخر بات ہے -

نظم بر ص ۲۵۲

حلّ لغات | زندانیٔ تقدیر ہے یعنی مشیت ایزدی کا پابند ہے + شکست

انجام یعنی غنچہ کے سبو کا انجام، شکست (فنا) ہے + غنچہ کا سبو، یعنی غنچہ + زنجیر عالم گیر سے اللہ کا قانون مراد ہے جس میں ہر شی جکڑی ہوئی ہے + سیلِ رواں یعنی سیلاب + مایہ دارِ اشکِ عنابی یعنی سرخ آنسوؤں سے لبریز + آلام، الم کی جمع ہے + نیرنگِ دوراں یعنی وہ تبدیلیاں جو دنیا میں ہر وقت ہوتی رہتی ہیں + نیرنگ کے لغوی معنی ہیں دھوکہ، فریب یا طلسم + قاصد سے یہاں باعث یا محرک مراد ہے + آئینہ سے دل مراد ہے + گنج آب آورد سے آنسوؤں کی جھڑی مراد ہے + حیرتی بمعنی حیران + پابپا یعنی قائم یا وابستہ + اوج گاہ بمعنی بلندی + طفلِ سادہ - بے وقوف یا بھولا بچہ + کھوئے ہوئے فردوس سے بچپن مراد ہے + وہ جوان - اشارہ ہے اپنے بڑے بھائی کی طرف + ہم پہلو - رفیق یا مشیر + بازو بمعنی مددگار + مسا بمعنی شام + برنا و پیر - جوان اور بوڑھا + دخترانِ مادرِ ایام سے وہ آفات اور مصائب مراد ہیں جو دنیا میں رونما ہوتی رہتی ہیں + چونکہ آفات از مانہ کی بدولت پیدا ہوتی ہیں اسلئے اسکو مادر قرار دیا ہے + کلبہ بمعنی گھر یا مکان + طوق گلو افشار - گلے کو بھینچ دینے والا طوق - کنایہ ہے مصیبت سے + تہِ پردہ گردوں سے نو آسمان مراد ہیں + قدیم فلسفہ کی رو سے آسمان نو ہیں + خاک پے سپہر کے لغوی معنی ہیں وہ خاک جو ایک دن فنا ہو جائے گی - کنایہ ہے جسم خاکی سے + مشتِ غبار - کنایہ ہے جسم خاکی سے، جو روح کے لئے عارضی محمل ہے + ذوقِ حفظِ زندگی - زندگی کی حفاظت (ابقاء) کا جذبہ + نقش سے وہ صورتیں مراد ہیں جو دنیا میں بنتی رہتی ہیں + حجت بمعنی دلیل + شہیدِ آرزو یعنی آرزو میں مبتلا + سربزانو یعنی حیراں + آں سوئے افلاک - لغوی معنی ہیں افلاک کے اس طرف مراد ہے عالم لاہوت یا غیر مادی عالم + قدسیوں سے فرشتے مراد ہیں کیونکہ وہ گناہ سے پاک ہیں + کم بہا یعنی کم قیمت + اپنا آفتاب یعنی روح انسانی + شیرازہ بند - جمع کرنے والی + تجدیدِ مذاقِ زندگی یعنی زندگی کی کیفیت کو از سر نو پیدا کرنا + جز سنجیدن پر یعنی اڑنے کے لئے پر تولنے کے علاوہ + سرشک آباد - وہ جگہ جو آنسوؤں سے آباد ہو + جوہر انسان یعنی روح یا نفس ناطقہ + دلآسائی بمعنی راحت یا سکون یا تسکین + رودبار - دریا + عروس - دلہن + ہمکنار - ہم آغوش + دامِ سیمینِ تخیل - تخیل کا وہ جال جو چاندی کے تاروں سے بنایا گیا ہو - مراد ہے دلکش تخیل + آفاق گیر - ساری دنیا کو قابو میں لانے والا + جولانگاہ - میدانِ عمل + خاکی شبستان یعنی قبر + سبزۂ نورستہ - وہ سبزہ جو نیا (تازہ) اُگا ہوا ہو +

تبصرہ | اقبال نے یہ نظم، جس کا ہر شعر سوز و گداز میں ڈوبا ہوا ہے، اور جس کا ہر بند عبرت اور تفکر کا مرقع ہے، اپنی والدہ ماجدہ مرحومہ کی یاد میں لکھی ہے اور حق یہ ہے کہ اس میں انہوں نے الفت فرزندی کی تصویر کھینچ دی ہے - لیکن جذبات سے قطع نظر کرکے، اس نظم کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں انہوں نے موت و حیات کے فلسفہ کو نہایت عمدگی کے ساتھ بیان کیا ہے اور عام فہم مثالوں سے اس خشک موضوع کو بہت دلکش بنا دیا ہے۔ اس نظم میں تیرہ بند ہیں - پہلے ہر بند کا بنیادی خیال درج کرتا ہوں - اس کے بعد ہر بند کا مطلب لکھونگا۔

پہلے بند میں اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ کائنات میں ہر شی تقدیر الٰہی کی پابند ہے۔

دوسرے بند میں یہ بتایا ہے کہ جب انسان کو اس حقیقت کا علم ہو جاتا ہے کہ میں خدا کی مشیئت کے سامنے مجبور ہوں تو وہ سر تسلیم خم کر دیتا ہے

تیسرے بند میں یہ بتایا ہے کہ والدہ مرحومہ کے تصور سے مجھے اپنا بچپن یاد آگیا -

چوتھے بند میں یہ بتایا ہے کہ ماں کی نظر میں اس کا جوان بیٹا بھی بچہ ہی ہوتا ہے -

پانچویں بند میں اپنی مادرِ مشفقہ کو یاد کیا ہے اور اپنے دردِ دل کا اظہار کیا ہے -

چھٹے بند میں یہ بتایا ہے کہ دنیا مصائب کا گھر ہے اور موت سے کسی کو مفر نہیں -

ساتویں بند میں یہ بتایا ہے کہ موت، انسانی زندگی کو فنا نہیں کر سکتی۔

آٹھویں بند میں یہ بتایا ہے کہ قدرت خود زندگی کی محافظ ہے -

نویں بند میں یہ بتایا ہے کہ روحِ انسانی، فنا سے پاک ہے -

دسویں بند میں یہ بتایا ہے کہ موت، تجدیدِ مذاقِ زندگی کا دوسرا نام ہے - یعنی موت وہ دروازہ ہے جس میں سے گذر کر ہم زندگی کی دوسری اور بلندتر منزل میں داخل ہوتے ہیں -

گیارہویں بند میں سابقہ مضمون کو واضح کیا ہے کہ جوہر انسان عدم سے آشنا نہیں ہوتا -

بارہویں بند میں یہ بتایا ہے کہ مرقدِ انسان کی شب کا انجام بھی صبح ہوتا ہے - یعنی انسان بھی مر کر دوبارہ زندہ ہو جاتا ہے -

تیرہویں بند میں والدہ مرحومہ کے لئے دعائیں کی ہیں -

پہلا بند | کائنات میں ہر چیز مشیئتِ الٰہی کی پابند ہے اور انسان جو تدبیریں اپنی بہتری کے لئے کرتا ہے وہ اُسی وقت کامیاب ہوتی ہیں جب اللہ تعالیٰ بھی چاہے اگر وہ نہ چاہے تو کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو سکتی - یعنی تدبیر، تقدیر کے سامنے عاجز ہے -

(۲) کائنات میں ہر شی مجبور ہے - آسمان، سورج، چاند اور ستارے، حرکت کرنے پر مجبور ہیں -

(۳) غنچہ مجبور ہے کہ پھول بن کر مرجھا جائے - اسی طرح سبزہ و گل بھی اُگنے پر مجبور ہیں -

(۴) بلبل کا نغمہ اور ضمیر کی آواز یعنی ہر شی خواہ ظاہر ہو یا پوشیدہ، تقدیر الٰہی کی پابند ہے -

دوسرا بند | جب انسان اس حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے کہ ذرہ ذرہ کا زندانی تقدیر ہے تو وہ مشیئت ایزدی کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتا ہے اور اس پر کوئی مصیبت وارد ہوتی ہے تو خاموشی کے ساتھ برداشت کرتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہ سب مشیئت ایزدی کے مطابق ہے

(۲) پھر حالت یہ ہوتی ہے کہ انسان عیش اور غم دونوں سے بیگانہ ہو جاتا ہے نہ جینے کی خوشی نہ مرنے کا غم - زندگی تو رہ جاتی ہے لیکن لطف زندگی جاتا رہتا ہے -

(۳) یہ علم و حکمت، یہ احساس کہ میں مشیئت ایزدی کے سامنے مجبور ہوں، انسان کو رونے دھونے اور نالہ و فریاد کرنے سے باز رکھتا ہے - بالفاظ دگر جو شخص اس حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے اس کا دل پتھر کا ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ دولت کے ملنے سے خوش نہیں ہوتا اور دولت کے چلے جانے سے رنجیدہ نہیں ہوتا -

(۴) اگرچہ میری آنکھوں میں آنسو نہیں ہیں - یعنی میں اپنے غم کو ضبط کر رہا ہوں -
(۵) اور چونکہ میں انسانی مصائب کا راز جانتا ہوں کہ جو خدا چاہتا ہے وہی ہوتا ہے۔ انسان خدا کی مشیئت کے سامنے بالکل مجبور ہے، اس لئے میں کسی مصیبت پر شکوہ نہیں کرتا۔
(۶) اس لئے میں کسی سے زمانہ کی شعبدہ بازی کا تذکرہ نہیں کرتا - اس لئے اگر کوئی تکلیف یا مصیبت مجھ پر آتی ہے تو نہ میں حیران ہوتا ہوں نہ پریشان نہ خنداں نہ گریاں -
(۷) لیکن اے مادر مہربان! جب میں تیری تصویر دیکھتا ہوں تو دل پر قابو نہیں رہتا بے اختیار میری آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے ہیں - یعنی تیری تصویر (تصویر سے میری رائے میں والدہ مرحومہ کا تصور مراد ہے) میرے اس عقیدہ کی تردید کر دیتی ہے -

تیسرا بند | کسی کی یاد میں آنسو بہانے سے زندگی کی بنیاد مضبوط ہو جاتی ہے - یعنی محبت کے سامنے عقل کی کوئی حقیقت نہیں ہے - واضح ہو کہ اقبال نے عقل کو سنگدل اس لئے کہا ہے کہ عقل ہمیں رونے سے باز رکھتی ہے
(۲) آہ و فریاد سے انسان کا دل منور ہو جاتا ہے - اسی لئے میں ہر وقت روتا رہتا ہوں -

واضح ہو کہ اس مصرع میں "گنج آب آورد سے معمور ہے دامن مرا" صنعتِ مبالغہ پائی جاتی ہے - لفظی ترجمہ اس مصرع کا یہ ہوگا کہ آنسوؤں کے خزانے سے میرا دامن معمور ہے یعنی میں ہر وقت روتا رہتا ہوں -
گنج آب آورد کی ترکیب بھی غور طلب ہے - اقبال نے اپنی ندرت طبع سے کام لیکر گنج باد آورد کے مقابلہ میں گنج آب آورد کی ترکیب وضع کی ہے - گنج باد آورد خسرو پرویز کے آٹھ خزانوں میں سے ایک خزانہ کا نام تھا جو ادب فارسی میں بہت مشہور ہے - حضرت اقبال نے، شدت گریہ کے اظہار کے لئے گنج آب آورد کی ترکیب وضع کر کے، اردو ادب کا دامن بہت وسیع کر دیا۔
(۳) مادر مرحومہ سے عالم خیال میں خطاب کر کے کہتے ہیں کہ میں تیری تصویر یا تیرے تصور کے اعجاز پر حیران ہوں! اس میں ایسی قوت پائی جاتی ہے کہ اُس نے زمانہ کی رفتار کا رُخ بدل دیا یعنی آگے بڑھنے کے بجائے زمانہ پیچھے کی طرف لوٹنے لگا۔ وہ اس طرح کہ
(۴) اُس نے ماضی کو حال کے ساتھ وابستہ کر دیا یعنی میں جوانی کے عالم میں ہوں لیکن بچپن کا دور میری آنکھوں کے سامنے آ گیا۔
(۵) وہ زمانہ، جب میں تیری آغوش میں پرورش پا رہا تھا اور اچھی طرح بول بھی نہیں سکتا تھا۔
(۶) اور اب وہی میں ہوں کہ ساری دنیا میں میری گفتگو (شاعری) کا شہرہ ہے اور میرا کلام اہل نظر کی نگاہوں میں، موتیوں سے بڑھ کر ہے -

چوتھا بند | یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے کہ انسان خواہ کتنا ہی عالم فاضل کیوں نہ ہو، اور کتنا ہی عمر رسیدہ کیوں نہ ہو، دنیاوی اعتبار سے کتنا بلند مرتبہ کیوں نہ ہو، جسمانی اعتبار سے کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو، لیکن جب وہ اپنی ماں کے سامنے آتا ہے تو از سرِ نو وہی طفل ناداں بن جاتا ہے جو کبھی تھا - وہی ہنسی وہی بے فکری۔

پانچواں بند | اب اقبال اپنی مادر مشفقہ کی یاد میں اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں کہ اب کون میرا انتظار کیا کرے گا؟ کون میرے خط نہ ملنے سے بیقرار ہوا کرے گا؟ اب کون آدھی رات کو اٹھ کر میرے لئے دعا کیا کرے گا؟

اس کے بعد تصور میں اپنی ماں سے، جس کے پاؤں کے نیچے جنت ہے، خطاب کرتے ہیں کہ اے مادر مہربان! یہ آپ ہی کی تربیت کا فیض تھا کہ میں ستاروں کا ہمنشیں بن گیا - آپ ہی نے میرے دل میں اسلام کی محبت کا چراغ روشن کیا - آپ ہی نے مجھے اولیا، اللہ سے محبت کرنا سکھایا - آپ ہی کی نگاہ سے میرے اندر قوم کا عشق پیدا ہوا جس کی بدولت میرے باپ دادا (خاندان) کا نام دنیا میں روشن ہو گیا - اے مادر مہربان! دنیا میں آپ کی زندگی نہایت قابل قدر تھی اور میں نے آپ سے دینی اور دنیاوی دونو قسم کی نعمتیں حاصل کیں -
افسوس یہ ہے کہ آپ نے ساری عمر میری خدمت کی، لیکن جب میں آپ کی خدمت کے لائق ہوا تو آپ رخصت ہو گئیں -
میرا بڑا بھائی جو میرا محسن بھی ہے رفیق بھی، مشیر بھی ہے، اور غمگسار بھی، آپ کی وفات پر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتا ہے۔
اگرچہ ہم دونوں میں پہلے بھی بہت محبت تھی لیکن شرکت غم سے وہ محبت اور بھی محکم ہو گئی -

چھٹا بند | یہ دنیا کیا ہے؟ ایک ماتم خانہ ہے جس میں ہر شخص مصروف ماتم نظر آتا ہے خواہ جوان ہو یا بوڑھا۔
(۲) یہاں زندگی بسر کرنا تو دشوار ہے لیکن موت نہایت ارزاں ہے اور ہر جگہ مل سکتی ہے - ہوا کی طرح موت بھی ہر جگہ پائی جاتی ہے -
(۳) دنیا میں امراض کے علاوہ موت کی اور صورتیں بھی تو ہیں مثلاً زلزلے، بجلیاں قحط سیلاب اور جنگ وغیرہ
(۴) موت ہر جگہ ہے - فقیر کے "کلبۂ احزاں" سے لے کر بادشاہ کے عشرت کدہ تک ہر جگہ -
(۵) اس کی حکومت ہے - خشکی کے علاوہ سمندر میں بھی اسی کا راج ہے -
(۶) نہ کوئی شخص موت سے بچ سکتا ہے اور نہ اُسے ٹال سکتا ہے - اور نہ کوئی شخص کسی سے یہ پوچھ سکتا ہے کہ فلاں شخص کو بیٹھے بٹھائے موت کیوں آ گئی؟ غور سے دیکھو تو زندگی کیا ہے، سراسر مصیبت ہے -
(۷) یہ دنیا ایک پلیٹ فارم ہے جہاں سے ہر وقت ہر لمحہ موت کی گاڑی روانہ ہوتی رہتی ہے - گویا ہر وقت چل چلاؤ لگا ہوا ہے - اور ہر شخص اپنے عزیزوں کی جدائی میں آنسو بہاتا رہتا ہے -

ساتواں بند | لیکن آخر کار، امتحان کا دور (موت کا سلسلہ) ختم ہو جائے گا اس دنیاوی زندگی کے بعد دوسری زندگی ضرور نصیب ہو گی -
(۲) یہ مانا کہ اس دنیا میں ہر شخص غمگین ہے لیکن جب موت کے بعد ہمیشگی حاصل
(۳) ہوگی تو زندگی کے باغ میں از سرِ نو بہار آ جائے گی -
(۴) اگر اس مٹی کے جسم میں ہماری روح مقید ہے تو کوئی گھبرانے کی بات نہیں ہے
(۵) زندگی (روح انسانی) کا انجام فنا یا نیستی نہیں ہے -

آٹھواں بند | اب اقبال زندگی کا فلسفہ بیان کرتے ہیں:-
(۲) زندگی (اصول حیات) فطرت کی نظر میں اس قدر قیمتی ہے کہ اس نے ہر شی کے اندر اس کی حفاظت کا جذبہ پیدا کر دیا ہے - اگر موت، زندگی کو فنا کر دینے پر قادر ہوتی تو فطرت موت کو اس قدر عام نہ کرتی۔
(۳) چونکہ موت عالمگیر ہے اس لئے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس کی حقیقت خواب سے زیادہ نہیں ہے جس طرح خواب سے زندگی میں خلل واقع نہیں ہو سکتا اسی طرح موت بھی زندگی کو ختم نہیں کر سکتی -
(۴) اے مخاطب! تو موت سے ڈرتا ہے کیونکہ تو موت کی حقیقت سے واقف نہیں ہے

نقش انسان (کی ناپائیداری) کا مطلب وہ نہیں جو تو سمجھتا ہے (تو یہ سمجھتا ہے کہ موت انسان کو فنا کر دیتی ہے۔ یہ غلط ہے۔ صرف نقش فنا ہوتا ہے انسان بدستور باقی رہتا ہے۔

(۵) ہوا کو دیکھو وہ ہر وقت پانی کے بلبلوں کو توڑتی رہتی ہے، لیکن وہ اس بیدردی سے اسی لئے توڑتی ہے کہ وہ ان کو دوبارہ پیدا کر سکتی ہے اور واقعی پیدا کرتی رہتی ہے۔

(۷) اسی طرح قدرت (خداوندی) اگر انسان کو موت دیتی ہے تو اسی لئے کہ وہ دوبارہ اُسے پیدا کر سکتی ہے اور کرتی ہے۔

(۸) ہوا کے طرز عمل سے ثابت ہے کہ وہ بلبلوں کی تعمیر پر قادر ہے۔ اسی طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ فطرت دراصل "شہید آرزو" ہے۔

(۹) یعنی اُسے یہ آرزو ہے کہ میں بہتر سے بہتر انسان پیدا کروں، اس لئے وہ خوبتر پیکر کی تلاش میں، پیکر موجودہ کو مٹاتی رہتی ہے (ادنیٰ کو مٹا کر اعلیٰ بناتی رہتی ہے)

<u>نواں بند</u> اب بقائے روح کو دوسری مثال سے سمجھاتے ہیں۔

(۱) ذرا آسمان کے ستاروں پر غور کرو جو رات کو حُسن عطا کرتے ہیں۔

(۲) انسان کی عقل حیران ہے، وہ نہیں بتا سکتی کہ ستارے کب پیدا ہوئے تھے؟

(۳) تو حضرت انسان جو اسقدر بلند مقاصد رکھتا ہے، جو مقاصد کی پاکیزگی میں فرشتوں سے بھی بڑھ کر ہے جو محفل قدرت میں، شمع کی حیثیت رکھتا ہے، اگر وہ نہ ہو تو ساری کائنات میں اندھیرا ہو جائے یعنی ساری کائنات بیکار ہو جائے۔

(۴) جس کے تخیلات میں اسقدر وسعت ہے کہ اسکے سامنے آسمان ایک نقطہ سے زیادہ نہیں ہے۔

(۵) جو دنیا میں اللہ کے نام کو بلند کرنا چاہتا ہے اور جس کا وجود اس کائنات کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا ستار کے لئے مضراب کا۔ یعنی دنیا کی رونق اسکی ذات پر موقوف ہے "جس کی نادانی صداقت کیلئے بیتاب ہے" بہت بلیغ مصرع ہے۔ اس میں لفظ

"نادانی" قرآن مجید کی اس آیت سے ماخوذ ہے اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا۔ یعنی انسان ظالم ہے اور جاہل بھی۔ اقبال نے اس حقیقت کو اس مصرع میں بھی نظم کیا ہے۔

ع ہائے کیا اچھی کہی ظالم ہوں میں، جاہل ہوں میں

یعنی انسان صداقت (توحید) کے اظہار کے لئے ساری دنیا سے قطع تعلق کر سکتا ہے

(۶) تو کیا یہ انسان، اپنی ذات کے لحاظ سے، آسمان کے ستاروں سے بھی کمتر ہے؟

<u>دسواں بند</u> اسی سابقہ مضمون کو تیسری مثال سے سمجھاتے ہیں:۔

(۱) ذرا پھول کی زندگی پر غور کرو۔ آپ تخم گل کو زمین میں بوتے ہیں۔ وہ مٹی میں چھپ جاتا ہے لیکن مٹی میں مل کر بھی ظہور کے لئے بیتاب رہتا ہے۔

(۲) یعنی مٹی میں پوشیدہ ہو جانے سے اُس کی زندگی کا شعلہ تو فنا نہیں ہو جاتا۔

(۳) وہ بدستور اُبھرنے کے لئے آمادہ رہتا ہے۔

(۴) چنانچہ کچھ دنوں کے بعد وہ تخم اپنی "تربت" سے نکل کر پھول کی شکل میں دنیا میں ظاہر ہو جاتا ہے۔

(۵) مطلب یہ نکلا کہ گُل کی لحد خود اسکی حیاتِ ثانیہ کا انکشاف کرتی ہے۔ کتنا عجیب قانون قدرت ہے

(۶) کیا انسان کی لحد، اس کی دوسری زندگی کا باعث نہیں ہو سکتی؟ ضرور ہو سکتی ہے کیونکہ موت، دراصل روح کے فنا کا نام نہیں ہے۔ بلکہ زندگی کی کیفیت میں ایک خاص انقلاب کا نام ہے۔

(۷) اندریں حالات (جب یہ ثابت ہو چکا کہ موت، فنائے کُلی کا نام نہیں ہے) انسان کو مرنے سے مطلق ہراساں نہیں ہونا چاہئے۔ کیوں؟ اس لئے کہ موت تو دوسری دنیا میں جانے کے لئے "پر تولنے" یعنی تیاری کرنے کا نام ہے۔

<u>گیارھواں بند</u> (۱) لوگ کہتے ہیں کہ "موت کا کوئی علاج نہیں، اور مرنے والوں کی جدائی کا صدمہ، کچھ عرصہ کے بعد زائل ہو جاتا ہے۔"

(۲) لیکن جذباتی قسم کے انسان کا دل، جس میں مرنے والوں کا غم آباد ہے، صبح و شام یعنی زمانہ کی قید سے آزاد ہے۔ اس لئے وقت کا مرہم اس کے زخم کو شفا نہیں دے سکتا۔ واضح ہو کہ اس شعر کے پہلے مصرع میں تعقید لفظی پائی جاتی ہے۔ اسکی نثر یوں ہوگی "مگر (وہ) دل، جہاں (جس میں) مرنے والوں کا غم آباد ہے" وقت (زمانہ) اُن کے غم کو زائل نہیں کر سکتا، وہ ہمیشہ اپنے محبوب کو یاد رکھتے ہیں اور اس کے غم میں روتے رہتے ہیں۔ چنانچہ اگلے شعر میں اقبال نے خود اس کی وضاحت کر دی ہے۔

(۳) طویل زمانہ گذر جانے کے بعد بھی اُن کا غم زائل نہیں ہوتا۔ یعنی وقت، جدائی کے زخم کو اچھا نہیں کر سکتا۔

(۴) جب انسان پر کوئی مصیبت پڑتی ہے تو وہ رونے لگتا ہے۔

(۵) اور رنج و غم اسکی عادت بنجاتا ہے۔ اسکے دل کو نالہ و فریاد سے ایک مستقل وابستگی ہو جاتی ہے۔

(۶) اگرچہ انسان، اس صدمہ کی تاب نہیں لا سکتا لیکن اسکے دل میں یہ احساس

(۷) ضرور پوشیدہ طور پر موجود ہے کہ انسان مرنے کے بعد، فنا نہیں ہو جاتا۔

(۸) اگرچہ غم (انسان کو) زندہ درگور کر دیتا ہے اور بسا اوقات وہ لطفِ ہستی سے محروم ہو جاتا ہے لیکن یہ احساس، کہ میرا محبوب فنا نہیں ہوا ہے، اُسکے غم کو کسی حد تک کم کر دیتا ہے۔ یعنی یہ احساس، گویا وہ پانی ہے، جس سے غم کی آگ ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔

(۹) یاد رکھو! یہ ضبطِ فغاں یعنی اگر انسان، اپنی فغاں کو ضبط کر لیتا ہے، تو اسکی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے محبوب کی یاد سے غافل ہو جاتا ہے بلکہ یہ آگہی (شعور) اسکے غمزدہ دل کو تسلی دے دیتی ہے کہ میرا محبوب فنا نہیں ہُوا۔

<u>بارھواں بند</u> اب ایک مثال سے اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں:۔

(۱) غور کرو! جب صبح ہوتی ہے تو وہ تمام چیزیں جو رات کے وقت "مُردہ" تھیں، دوبارہ زندہ ہو جاتی ہیں۔

(۲) لالۂ افسردہ، دوبارہ تر و تازہ ہو جاتا ہے۔ پھول شگفتہ ہو جاتے ہیں۔ چڑیاں چہچہانے لگتی ہیں۔

(۳) بلبل گانے لگتی ہے۔ قصہ مختصر فضا طائروں کے نغموں سے گونج اٹھتی ہے۔ ہر طرف زندگی کے آثار نمودار ہو جاتے ہیں

(۴) باغوں میں پہاڑوں میں دریاؤں اور خشکی میں جتنے جاندار رات کو سوئے ہوئے تھے سب بیدار ہو جاتے ہیں۔ یعنی دوبارہ زندگی حاصل کرتے ہیں۔

(۵) پس اگر ہستی کا قانون یہ ہے کہ ہر شام کے بعد صبح ہے یعنی ہر موت کے بعد زندگی ہے تو انسان مرکر، دوبارہ زندہ کیوں نہیں ہوگا؟

<u>تیرھواں بند</u> آخری بند میں پھر والدہ مرحومہ سے خطاب کرتے ہیں:۔

(۱) اے مادر مہربان! میرا تخیل اسقدر زبردست ہے کہ ساری دنیا اسکے قبضہ میں ہے چنانچہ اسکی بدولت میں نے تیری یاد کو بھی اپنے قبضہ میں کر لیا ہے۔

(۲) اور جسطرح کعبہ کی فضا، دعاؤں سے معمور ہے اسی طرح میرے دل کی فضا تیری یاد سے معمور ہے

(۳) زندگی فرائض کے ایک طویل سلسلہ کا نام ہے۔ چنانچہ اسکا سلسلہ صرف اسی جہاں میں محدود نہیں ہے بلکہ اس کی جلوہ گاہیں بہت سی ہیں۔

(۴) اور زندگی ہر جلوہ گاہ (دنیا) میں مختلف طور طریقے رکھتی ہے۔ جسے ہم آخرت کہتے ہیں وہ کیا ہے؟ نئی قسم کی زندگی کا دوسرا نام ہے۔ یعنی مرنے کے بعد، انسانی زندگی، ایک نئی منزل میں داخل ہوتی ہے اور وہاں اس کی رسم و راہ (طریق عمل) اس دنیا سے مختلف ہو گی۔

(۵) اگر وہاں انسان کے پاس اس دنیا کے اعمال صالح کا حاصل (سرمایہ) نہیں ہوگا یعنی اگر انسان نے اس دنیا میں، اُس دنیا کے لئے کوئی سرمایہ جمع نہیں کیا تو وہاں وہ انسان اجل کا لقمہ بن جائیگا۔ اور جو لوگ یہاں سے عمل صالح کا سرمایہ اپنے ساتھ لے جائینگے وہ وہاں ہمیشگی کی زندگی حاصل کرینگے۔ بالفاظ دگر، اگر اس دنیا میں عمل صالح کا تخم بو دیا ہے تو اس دنیا میں اس کا پھل کھا سکتے ہیں۔ (۶) یاد رکھو! تمہاری روح (نور فطرت) ہمیشہ کے لئے جسم کی قید میں

نہیں ہے۔ وہ اس دنیا میں بیشک جسم سے وابستہ ہے لیکن اسکے معنی یہ نہیں کہ وہ ہمیشہ اسی جسم کی تاریکی میں مقید رہیگی۔ انسانی قوت فکر مادیات سے بالاتر بھی ہوسکتی ہے یعنی عقل کا تقاضا ہے کہ انسان اس عالم میں

(۷) اب اقبال اپنی والدہ مرحومہ کے حق میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں ۔اے مادر مشفقہ! آپ کی زندگی، نور اسلام اور ضیائے ایمان کی بدولت چاند سے بھی زیادہ روشن تھی۔ اور آپ کی رحلت نجم السحر سے بھی زیادہ قابل ستائش تھی یعنی آپ کا انجام بھی بخیر ہوا کیونکہ آپ کا خاتمہ ایمان پر ہوا۔

(۸) خدا کرے آپ کی قبر ہمیشہ نور سے معمور اور منور رہے۔ (۹) اور آسمان ہمیشہ آپکی قبر پر ہمیشہ رحمت الٰہی کا نزول ہوتا رہے۔

نظم بر ص ۲۶۷

حل لغات | سودائی نظارہ تھی یعنی جب میں طلوع آفتاب کا نظارہ کر رہا تھا + لذت تنویر۔ دوسروں کو روشن کرنے کی آرزو + مستوں سے غافل انسان مراد ہے +

مطلب | کہتے کہ صبح کے وقت میں نے ایک شعاع کو دیکھا کہ وہ بہت مضطرب تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تو اس قدر مضطرب کیوں ہے؟ کیا تو کوئی بجلی ہے جس کو آسمان قوموں کی بربادی کے لئے تیار کر رہا ہے؟

یہ سُن کر اس شعاع نے جواب دیا کہ میری زندگی میں بڑے ہنگامے پوشیدہ ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے صبح کی آغوش میں پرورش پائی ہے۔ لہٰذا میں دوسروں کو منور کرنے کیلئے بیتاب ہوں۔ اگرچہ میں ناری ہوں لیکن بجلی نہیں ہوں۔ میرا کام دوسروں کو جلانا نہیں بلکہ بیدار کرنا ہے میں چاہتی ہوں کہ انسانوں کو بیدار کر دوں۔ اس لئے میں تجھ سے یہ دریافت کرتی ہوں کہ تیری قوم میں کوئی شخص، اسرار کائنات کے سمجھنے اور فطرت کا مطالعہ کرنے کا بھی آرزومند ہے تاکہ میں اسکی آنکھوں میں سرمہ بن کر سما جاؤں؟ اس نظم میں اقبال نے مسلمانوں کو سحر خیزی کی تلقین کی ہے۔

نظم بر ص ۲۶۸

حل لغات | عُرفی۔ ایران کے اُن شعرائیں سے ہے جنھوں نے ہندوستان میں شہرت حاصل کی۔ وہ ۱۵۵۵ء میں پیدا ہوا تھا۔ اکبر مرتد کے عہد میں یہاں آیا اور ۳۶ سال کی عمر پاکر ۱۵۹۱ء میں فوت ہوگیا۔ لاہور میں دفن ہوا۔ تمام تذکرہ نگار متفق ہیں کہ اسکی طبیعت میں غضب کی جدت تھی اور طرز بیان میں بے پناہ زور تھا۔ تخیل کی بلندی کے لحاظ سے، فارسی کے صرف چند شعراء اس کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ مجھے اسکی شاعری میں انسانی تخیل کی معراج نظر آتی ہے چنانچہ علامہ اقبال نے خود اس نظم کے پہلے شعر میں اس حقیقت کا اعتراف فرمایا ہے + حیرت خانہ سینا۔ یعنی حکیم ابو علی ابن سینا کا فلسفہ۔ یہ شخص اپنے زمانہ میں طب ریاضی منطق فلسفہ اور کلام میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ بعض لوگوں کی رائے میں اس سے بڑا فلسفی مسلمانوں میں پیدا نہیں ہوا۔ وہ ۹۸۰ء میں بخارا کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوا تھا اور اُسنے ۱۰۳۷ء میں وفات پائی۔ اسکی تصانیف میں اشارات شفا اور قانون بہت مشہور ہیں۔ فارابی۔ اس کا نام محمد بن طرخان ابو نصر فارابی تھا۔ ابن خلکان کی رائے میں کوئی مسلمان فلسفی اس کے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکا۔ غالباً ۸۷۰ء میں بمقام فاراب ترکستان میں پیدا ہوا اور ۹۵۰ء میں دمشق میں وفات پائی۔ اُس نے دنیا کے تمام علوم و فنون پر کتابیں لکھی تھیں۔ ابن سینا نے ارسطو کی مابعد الطبیعات کے مطالب پر فارابی ہی کی شرح کی بدولت عبور حاصل کیا تھا یہی وجہ ہے کہ مسلمان حکماء اسکو معلم ثانی کہتے ہیں +

تبصرہ | اقبال نے اس نظم میں عرفی کے ایک مشہور شعر پر تضمین کی ہے اور ضمناً اس کی خدمت میں خراج تحسین بھی پیش کر دیا ہے۔

(۱) عرفی کا شاعرانہ تخیل اس قدر بلند ہے کہ ابن سینا اور الفارابی کا فلسفہ بھی اُسپر نثار ہے واضح ہو کہ یہ شاعرانہ انداز بیان ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ عرفی کا تخیل بہت بلند ہے۔ ورنہ

اقبال سے بہتر کون جان سکتا ہے کہ شعراء اور حکماء کا دائرہ ایک دوسرے سے جدا ہوتا ہے۔ اس لئے ان دونوں میں منطقی اعتبار سے موازنہ نہیں ہو سکتا۔

(۲) اسکے کلام میں عاشقانہ سوز و گداز اس درجہ پایا جاتا ہے کہ پڑھنے والا بیتاب ہو جاتا ہے

(۳) ایک دن میں نے اس سے یہ کہا کہ اب مسلمانوں میں جد و جہد کا جذبہ سرد ہو گیا ہے۔

(۴) اور ان میں وہ تڑپ نظر نہیں آتی جو ان کے اسلاف کا امتیازی نشان تھی۔

(۵) چونکہ قوم خواب غفلت سے بیدار ہونا نہیں چاہتی اس لئے میرا پیغام بیداری انہیں پسند نہیں آتا یعنی وہ میرے پیغام کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔

(۶) اور وہ متوجہ بھی کیسے ہو سکتے ہیں؟ جب کوئی قوم (تاریکی غفلت) کو مقصد حیات بنالے تو روشنی (اسلام) کی طرف کیسے مائل ہو سکتی ہے؟

(۷) عرفی نے یہ سُن کر جواب دیا کہ اے اقبال اپنی قوم کی شکایت مت کر بلکہ اگر تو یہ دیکھتا ہے کہ تیری قوم گہری نیند سو رہی ہے (بہت زیادہ غافل ہے) تو اپنی لے اور اونچی کر دے اور اگر قوم شریعت کی پابندی (محمل) کو گراں خیال کرتی ہے تو اپنا پیغام (حدی) زیادہ جوش و خروش کے ساتھ اُس کو سُنا۔ حدی۔ وہ نغمہ ہے جو عرب لوگ اونٹوں کو سناتے ہیں اور وہ اس نغمہ سے مست ہو کر اونٹ تیز چلنے لگتے ہیں۔

نظم بر ص ۲۶۹

حل لغات | ہوس سے اس جگہ آرزو مراد ہے + تگ و تاز۔ جد و جہد یا کوشش + تلاش سے کوشش (خوشامد) مراد ہے + ریزہ کار۔ صنعت و حرفت کی اصطلاح میں اس کاریگر کو کہتے ہیں جو بہت باریک یا مہین کام کر سکتا ہو۔ یہاں مراد ہے دقیقہ سنج یا وہ شاعر جو بہت مشکل مضامین باندھ سکے + فتنہ تراش سے مراد ہے وہ شخص جو جوڑ توڑ میں ماہر ہو۔ یہ فن موجودہ زمانہ میں ترقی کے لئے شرط اولین ہے +

مثال سحاب۔ بادل کی طرح + دریا پاش۔ یعنی بہت زیادہ فیض پہونچانے والا + عقد ہائے سیاست سے وہ سیاسی گتھیاں مراد ہیں جنکو سلجھائے بغیر آدمی آگے نہیں بڑھ سکتا + فیض عشق سے ناخن ہے میرا سینہ خراش۔ اس نظم میں بہترین مصرع ہے یعنی میں اپنی قوم کے عشق میں رات دن تڑپتا رہتا ہوں + ہوائے بزم سلاطین سے حکمران طبقہ کی صحبت مراد ہے + دلیل مردہ دلی یعنی صرف وہ لوگ بادشاہوں (حکمرانوں) کی صحبت کے آرزومند ہوتے ہیں جنکا دل "مردہ" ہو چکا ہو +

مطلب | اقبال کے ایک دوست نے (جنکا نام انہوں نے مصلحتاً ظاہر نہیں کیا) ایکدفعہ اپنے خط میں یہ مشورہ دیا تھا، کہ کبھی کبھی حکام کو اپنے یہاں کھانے پر مدعو کر لیا کیجئے اور چیف جسٹس کو کسی ترکیب سے "رام" کیجئے۔ مثلاً کسی ہندو کے یہاں "شادی" کے موقع پر اُس سے ملکر، اپنے اشعار کے "لعل" اُس پر نثار کیجئے۔ کیا عجب کہ اس شادی اور لعل کے سنجوگ سے آپ کا کام بھی بنجائے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس خط کے جواب میں یہ نظم سپرد قلم کی جو اُن کی افتاد طبع کی سچی تصویر ہے

(۱) کہتے ہیں کہ اے دوست! اول تو مجھے عہدوں، خطابوں اور جاگیروں کی آرزو نہیں اور اگر ہو بھی تو مجھ میں دوڑ دھوپ کی ہمت نہیں۔ اور تم جانتے ہو کہ دنیاوی عزت حاصل کرنے کیلئے، بھاگ دوڑ پہلی شرط ہے، جیسا کہ لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی نے اس شعر میں واضح کر دیا ہے:-

شوق لیلائے سول سروس نے مجھ مجنوں کو، اتنا دوڑایا، لنگوٹی کر دیا پتلون کو

(۲) میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اُس نے مجھے دقیقہ سنج طبیعت عطا فرمائی ہے اور مجھ میں جوڑ توڑ کا مادہ بالکل نہیں ہے جو حصول جاہ کیلئے دوسری شرط ہے۔

(۳) میں تو اپنے کلام سے اپنی قوم کو زندہ کرنا چاہتا ہوں بلکہ میرا کلام اس بادل کی طرح ہے جو ساری دنیا کو سیراب کرتا ہے۔

(۴) چونکہ میں اپنی قوم کی زبوں حالی سے سخت رنجیدہ ہوں بلکہ اس کے غم میں دن رات گھل رہا ہوں اس لئے سیاست کی گتھیاں سلجھانا میرے بس کی بات نہیں۔

(۵) میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ حکّام کی صحبت کا آرزومند وہی ہوتا ہے جس کا دل مُردہ ہو جاتا ہے۔ جب تک کسی کے دل میں زندگی کی رمق باقی ہے وہ انگریز سے ملنے کا متمنی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ عارف شیرازیؒ نے اس حقیقت کو یوں واضح کیا ہے کہ اے مسلمان!

(۶) اگر تو برگزیدہ اور پاکباز لوگوں (خضر) کی صحبت کا آرزومند ہے تو بادشاہوں اور حکّام (سکندر) کی آنکھوں سے اسی طرح پوشیدہ ہو جا جیسے آبِ حیواں پوشیدہ ہو گیا تھا۔ کیونکہ وہ اُس کے لائق نہیں تھا۔ یہ نعمت تو خضر کیلئے مخصوص تھی۔

نوٹ | اس نظم میں اقبال نے قوم کو اس نکتۂ زرین سے آگاہ کیا ہے کہ اگر ہمیشہ کی زندگی چاہتے ہو تو بادشاہوں کی صحبت سے دور رہو۔ ان کے پاس بیٹھ کر نفسِ امارہ تو بیشک زندہ ہو جاتا ہے لیکن دل مردہ ہو جاتا ہے ۱۲

نظم بر صٓ ۲۷

حلّ لغات | قوم سے ہندو قوم مراد ہے۔
گوہر یکدانہ۔ بےنظیر موتی + قابل۔ جسمیں کسی بات کے قبول کرنے کی صلاحیت یا استعداد ہو + شودر۔ ہندؤں کی چوتھی اور سب سے نیچی ذات جس کے افراد اونچی ذات والوں کی خدمت کرتے ہیں + مئے پندار۔ تکبر، گھمنڈ + شمع گوتم سے گوتم بدھ کی تعلیمات مراد ہیں + محفل اغیار سے ہندوستان کے علاوہ دوسرے ممالک مراد ہیں مثلاً تبت چین برما اور لنکا + بتکدہ سے ہندوستان مراد ہے + نورِ ابراہیمؑ سے توحیدِ الٰہی مراد ہے + آذر کے گھر سے ہندو قوم مراد ہے +

تبصرہ | اقبال نے اس نظم میں گورونانک مہاراج کی خدمت میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے کیونکہ وہ خود بھی موحد مسلمان تھے اور انہوں نے ساری عمر توحید ہی کی تبلیغ و اشاعت میں لبسر کی۔ افسوس کہ اس شرح میں اُن اسباب اور حالات کی تفصیل درج نہیں کی جا سکتی جن کی بنا پر، اُن کے پیرو "سکھ" اور مسلمانوں کے دشمن بن گئے۔

اسقدر لکھنا کافی ہے کہ حضرت نانک مسلمان تھے اور اُن کے اسلام پر اُن کا کرتا جسے سکھ "چولا" صاحب کہتے ہیں، آج بھی گواہی دے رہا ہے +

سدھارتھ گوتم جو دنیا میں مہاتما بدھ کے لقب سے مشہور ہے غالباً ۵۶۳ء ق م میں، شمالی ہند (بہار) کے ایک راجہ کے یہاں پیدا ہوا تھا جو کپل وستو میں راج کرتا تھا۔ تیس سال کی عمر میں اُس نے دنیا ترک کر دی اور دس سال کی ریاضت اور دماغی کاوش کے بعد اس نے یہ اعلان کیا کہ مجھے صحیح علم حاصل ہو گیا ہے۔ چنانچہ اُس نے اپنے خیالات کی تبلیغ شروع کی اور بہت جلد لاکھوں آدمی اس کے حلقہ بگوش ہو گئے، جنہوں نے اُسے بدھ کا لقب دیا یعنی وہ شخص جس کی روح منور ہو چکی ہے۔ اسکے مذہب کی تفصیل تو اس جگہ درج نہیں کر سکتا، اتنا لکھنا کافی ہے کہ اُس نے ہندو دھرم کی کامل طور سے تردید کر دی، اور انسانوں کو مساوات اور اعلیٰ درجہ کی اخلاقی زندگی بسر کرنے کا پیغام دیا۔ اسکا اخلاقی نظام آٹھ اصولوں پر مشتمل ہے جسکو اشٹنگ مارگ کہتے ہیں۔ یعنی صحیح خیال، صحیح عقیدہ، صحیح عمل، صحیح قول، صحیح کوشش، صحیح طریق معاش، صحیح گیان دھیان اور صحیح یادداشت۔ اس کے پیغام کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کو ایسی پاکیزہ زندگی بسر کرنی چاہیئے کہ کسی کو اس کی ذات سے کسی قسم کی تکلیف نہ پہونچے۔

مطلب | (۱) افسوس ہے کہ ہندوؤں نے گوتم بدھ کے پیغام کو رد کر دیا۔ یعنی انہوں نے اپنی کم فہمی کی بنا پر اپنی قوم کے بہترین فرد کی کوئی قدر نہیں کی

(۲) افسوس کہ ہندو، اُس بڑی سچائی سے غافل رہے جو بدھ نے اُنکے سامنے پیش کی تھی ان کا حال اس میوہ دار درخت کا سا ہوا کہ دوسرے اسکا پھل کھاتے ہیں لیکن خود وہ درخت اپنے پھل سے محروم رہتا ہے۔

(۳) اگرچہ گوتم بدھ نے ہندوؤں کو زندگی کی حقیقت سے آگاہ کیا کہ برہمن اور شودر دونوں بھائی بھائی ہیں۔ دونوں ایک آدم کی اولاد ہیں۔ ذات پات کا امتیاز بنی آدم کے حق میں سب سے بڑی لعنت ہے۔ اور نیک وہ ہے جو نیکی کرے اور پاکیزہ زندگی بسر کرے نہ کہ وہ جو نیکوں کے گھر میں پیدا ہو۔ لیکن افسوس کہ ہندو قوم، اپنے خیالی فلسفہ یعنی ذات پات کے جھوٹے امتیاز میں مبتلا رہی۔ اور گوتم کے پیغام کو نہ سمجھ سکی۔

(۴) افسوس کہ ہندو قوم میں حق کو قبول کرنے کی صلاحیت ہی نہ تھی۔

(۵) افسوس کہ ہندوستان، شودروں کیلئے مدتوں سے رنج اور مصیبت کا گھر ہے۔ کیونکہ ہندو دھرم کی رو سے ایک شودر، خواہ وہ کتنا ہی نیک کیوں نہ ہو، برہمن کا ہم پلہ ہونا تو کجا، وہ اس کے ساتھ ایک چارپائی پر بیٹھ بھی نہیں سکتا۔ اور اگر وہ وید کا کوئی منتر سن پائے تو بقول منوجی اس کے کان میں سیسہ پگھلا کر ڈال دینا چاہیئے۔

(۶) برہمن ابھی تک اس خام خیالی میں مبتلا ہے کہ میں سب سے افضل ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ گوتم کی تعلیمات دوسرے ملکوں میں تو مروج ہیں لیکن ہندوستان اس نعمت سے محروم ہے بات یہ ہے کہ گوتم بدھ نے مساوات نسلِ انسانی کا درس دیا تھا اور یہ عقیدہ چونکہ برہمنوں کے اقتدار پر ایک کاری ضرب تھا، اس لئے انہوں نے بادشاہوں کو ترغیب دے کر، اس مذہب کو تلوار کے زور سے ختم کرا دیا۔ چنانچہ آج ہندوستان میں بدھ دھرم کا کوئی پیرو موجود نہیں ہے۔

(۷) لیکن صدیوں کے بعد ہندوستان میں پھر ایک شخص پیدا ہوا جس نے توحید کا علم بلند کیا اور ہندوؤں کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا۔

یہ اشارہ ہے گورونانک کی طرف جنہوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد ساری عمر ہندوؤں کو توحید اور مساوات کا سبق پڑھایا۔

نظم بر صٓ ۲۷

حلّ لغات | کلیم طور۔ حضرت موسیٰؑ جنہوں نے کوہِ طور پر خدا کی تجلی دیکھی تھی + وادی سینا۔ وہ خطہ جسمیں کوہ طور واقع ہے اسی لئے اسکو طور سینا بھی کہتے ہیں + آتش نمرود۔ نمرود، وہ کافر اور خدائی کا مدعی بادشاہ جس نے حضرت ابراہیمؑ کو جلانے کیلئے بہت بڑی آگ روشن کرائی تھی + آتش نمرود سے کفر یا بت پرستی مراد ہے + غائب سے ذاتِ باری تعالیٰ، جو نگاہوں سے پوشیدہ ہے یا ایمان بالغیب مراد ہے + حاضر سے کفر یا بت مراد ہے جو نظروں کے سامنے موجود ہوتا ہے + ذوقِ حاضر سے اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی آرزو مراد ہے + ایمانِ خلیلؑ سے حضرت ابراہیمؑ کا سا یقین (ایمان) مراد ہے + ورنہ خاکستر ہے الخ یعنی اگر تو نے ایمانِ خلیل پیدا نہ کیا تو تیرا وجود بیکار ہے + اگر تو دیوانۂ غائب ہے یعنی اگر تو ان دیکھے خدا سے محبت کرتا ہے + وادیِ فاران سے شریعتِ اسلامیہ مراد ہے +

تبصرہ | اس نظم میں اقبال نے میر رضی دانش کے ایک شعر پر تضمین کی ہے۔ یہ ایرانی شاعر مشہد کا رہنے والا تھا۔ عہد شاہجہانی میں، اپنے باپ کے ساتھ ہندوستان آیا۔ بادشاہ کی خدمت میں ایک قصیدہ لکھ کر پیش کیا جسکا مطلع یہ تھا:

بخواں بلند کہ تفسیر آیۂ کرم است　　خطے کہ از کفِ دستِ مبارکش پیدا است

شاہجہاں نے دو ہزار روپیہ انعام دیا۔ کچھ عرصہ کے بعد بادشاہ کو چھوڑ کر دارا شکوہ کی ملازمت اختیار کر لی۔ اس عقلمند شاہزادہ نے اس کو اس شعر پر ایک لاکھ روپیہ انعام دیا تھا۔

تاک را سرسبز کن اے ابرِ نیساں در بہار　　قطرہ تامے تواند شد چرا گوہر شود

(۵) لیکن مجھے اس کا یہ شعر بہت پسند ہے:-

متاب رخ نفسے تا بجائے خود باشیم　　چو عکسِ آئینہ، ما زندہ از نگاہ تو ایم

حضرتِ اقبال نے اسکے جس شعر کو تضمین کیلئے منتخب کیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ پروانوں کا محبوب تو سب کے سامنے محفل میں موجود ہے لیکن ہمارا محبوب، آتش سنگ کی طرح، لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ ہے اور اس کا نظروں سے اوجھل رہنا ہی اچھا ہے (تاکہ آتش شوق بھڑکتی رہے)

اقبال نے جب یہ شعر پڑھا تو انہوں نے اپنی خداداد ذہانت سے یہ مفہوم پیدا کیا کہ کفر (بت) ظاہر ہے لیکن ہمارا محبوب (خدا) پوشیدہ ہے "لوزیہا" سے شاعر کی مراد تو اس کا محبوب ہے لیکن اقبال نے اس سے خدا کی ذات مراد لی ہے اسی نکتہ نے شعر کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ یعنی اقبال نے اس پر تضمین کر کے شعر اور صاحبِ شعر دونوں کو زندہ جاوید بنا دیا۔

مطلب | اقبال کہتے ہیں کہ ایک دن میں نے حضرت موسیٰؑ سے پوچھا کہ کفر تو دنیا میں

(۱) ہر جگہ جلوہ گر ہے لیکن خدا کا جلوہ کہیں نظر نہیں آتا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

(۲) حضرت موسیٰؑ نے جواب دیا کہ اے اقبال! اگر تو مسلم ہے تو ایمان بالغیب کی تعلیم کو مدنظر رکھ۔ اللہ نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ وہ غائب پر ایمان لائیں۔ یعنی اُس خدا پر جو آنکھوں سے نظر نہیں آتا۔

(۴)(۵) لیکن اگر تو خدا کے دیدار کا طالب ہے تو پھر اپنے اندر حضرت ابراہیمؑ کا سا ایمان پیدا کر۔ لیکن اگر تو اس مرتبہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ تو ایمان بالغیب حاصل کر اور اگر تو ایمان بالغیب رکھتا ہے تو کفر کی مطلق پرواہ مت کر۔ اطمینان کے ساتھ شریعت کی پابندی کر۔ اور یوم قیامت کا انتظار کر جبکہ ہر سچے مسلمان کو اللہ تعالیٰ کا دیدار حاصل ہوگا۔

(۶) یاد رکھ! کفر کی شان و شوکت محض عارضی اور چند روزہ ہے: اور اسلام کی شوکت دائمی ہے۔ کفر ایک دن ضرور مٹ جائیگا لیکن اللہ چونکہ حق ہے اس لئے ہمیشہ قائم رہے گا۔ اس صداقت کو (کہ اللہ تعالیٰ حق ہے) محبت کے ساتھ وہی نسبت ہے جو روح کو جسم کے ساتھ ہے۔ یعنی اگر اللہ تعالیٰ سے محبت کا رنگ پیدا ہو جائے تو آدمی اس صداقت کو سمجھ سکتا ہے۔

(۷) اگر کفر یا بت پرستی (شعلہ نمرود) زمانہ میں ہر جگہ آشکار ہے تو ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ شمع کو دیکھو وہ انجمن میں سب کو اپنا جلوہ دکھاتی ہے یعنی اس میں شان ظہور پائی جاتی ہے لیکن یہ شان عارضی ہے کیونکہ صبح ہوتے شمع ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں ہمارا نور (خدا) شمع کی طرح دنیا والوں کو جلوہ تو نہیں دکھاتا بلکہ آتش سنگ کی طرح پوشیدہ ہے لیکن اس کا وجود دائمی ہے اُس پر کبھی فنا طاری نہیں ہوگی۔

نظم بر صفحہ ۲۷۲

حل لغات | مغربی حق شناس سے یورپ کا وہ مصنف مراد ہے جو عام یورپین مصنفین کے خلاف سچائی کا اعتراف کر سکتا تھا۔ سکندر رومی۔ دنیا کا مشہور فاتح جس نے ۳۳۱ ق م میں اربیلہ کے مقام پر ایران کے بادشاہ دارا کو اور ٹیکسلا کے مقام پر ۳۲۶ ق م میں راجہ پورس کو شکست دی تھی + مستنیر لغوی معنی ہیں روشنی طلب کرنے والا۔ یہاں "منور" مراد ہے + اُس صدا سے صدائے اذان مراد ہے + اسود۔ کالا + احمر۔ سرخ + اختلاط۔ میل ملاپ +

مطلب | اقبال نے بانگ درا کے پہلے حصہ میں بھی سیدنا حضرت بلال کی منقبت میں ایک نظم لکھی ہے۔ چونکہ انہیں حضرت موصوفؓ سے بہت زیادہ عقیدت تھی اس لئے اس نظم میں، بانداز دگر، ان کی خدمت میں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ اقبال کی عقیدت کا سبب صرف یہ ہے کہ سیدنا بلالؓ اسلام اور بانیٔ اسلام صلعم دونوں ہی کے عاشق زار تھے۔ حضرت موصوفؓ نے اسلام قبول کرنے کے بعد مدتوں تک اسقدر مصائب برداشت کئے کہ راقم الحروف جیسے نقلی مسلمان، ایک دن کیلئے بھی ان کی تاب نہیں لا سکتے + یہی وجہ ہے کہ سکندر رومی کا نام تو صرف تاریخوں میں باقی رہ گیا ہے لیکن حضرت بلالؓ کا نام آج بھی زندہ ہے اور قیامت تک زندہ رہے گا۔

نظم بر صفحہ ۲۷۳

حلِ لغات | مرشد کنایہ ہے انگریزی تعلیم کے حامی سے + شوریدہ وہ شخص جسکے دماغ میں "با غیا نجہ" خیالات کا ہجوم ہو + رہرو سے ہر وہ شخص مراد ہے جو دنیا میں شادی کر کے زندگی بسر کرنی چاہتا ہے + گراں قیمت سے علمائے دین مراد ہیں + اب ہیں متاع کس مخر یعنی ایسا "مال" ہیں جسکا بازار میں کوئی خریدار نہیں۔ یہ انگریزوں کی قابلیت کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے کہ انہوں نے کمال خوبصورتی کے ساتھ علم اور علماء دونوں کو ہندوستان سے ختم کر دیا + شعلۂ روشن سے ایمان مراد ہے + ظلمت سے کفر مراد ہے + شیدائے غائب سے اللہ کا پرستار مراد ہے + دیوانہ موجود سے مادہ پرست بلکہ اقتدار پرست مراد ہے یعنی وہ شخص جو اللہ کے بجائے ارباب اقتدار کو اپنا معبود سمجھتا ہو + معبود حاضر سے بھی دولت اور حکومت مراد ہے + باغ سے ہندوستان مراد ہے + پھندا، کنایہ ہے علم دین سے + مرغ تیز پر سے قوم مراد ہے + رہبر سے مرشد مذکور مراد ہے + سودا یعنی عشق + خضر سے رہنما مراد ہے + زبون بختی۔ بدقسمتی +

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر الخ اس شعر کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ میں قافلہ سے جدا ہو کر، سڑک کے کنارے بیٹھ کر، پاؤں میں سے کانٹا نکالنے لگا۔ لیکن جب کانٹا نکال چکا تو کیا دیکھتا ہوں کہ معشوق کا محمل نظروں سے غائب ہو چکا ہے۔ ہائے میں ایک لحظہ کے لئے غافل ہو کر، اپنی معشوقہ سے مدتوں کیلئے بچھڑ گیا۔ مطلب اس لاجواب شعر کا یہ ہے کہ مسلمان اپنی روایات ملی سے کنارہ کش ہو کر (علمائے حق کے گروہ سے نکل کر) کالج میں داخل ہو گیا تاکہ اپنی "روٹی" کا کچھ انتظام کر سکے۔ لیکن جب وہ کسی دفتر میں ملازم ہو گیا تو اُس میں اور اسلام میں بڑا فاصلہ پیدا ہو گیا بلکہ صاف لفظوں میں کیوں نہ کہوں کہ وہ اسلام سے بیگانہ ہو گیا۔

تبصرہ | اقبال نے اس نظم میں جو سراسر رمز و ایما سے معمور ہے، ملک قمی کے مشہور و معروف شعر پر تضمین کی ہے۔ اور حق یہ ہے کہ تضمین کا حق ادا کر دیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے یہ شعر اقبال ہی کے لئے لکھا تھا۔ ملک قمی کا مولد و منشاء ایران کا شہر قم تھا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد کاشان آیا، اس کے بعد چار سال تک قزوین رہ کر استفادہ کیا۔ ۹۸۷ھ میں دکن کا رخ کیا کیونکہ ابراہیم عادل شاہ والیٔ بیجاپور شعراء کا بہت قدردان تھا چنانچہ اس بادشاہ نے اس کو اپنا درباری شاعر مقرر کیا اور بہت عزت افزائی کی۔ ۱۰۲۵ھ میں وفات پائی۔ اس کا یہ شعر مجھے بہت پسند ہے

تا چند غمِ سود و زیاں پردہ برانداز　　تا ہر دو جہاں را بفر و شم بہ نگاہے

مطلب | اقبال نے اس نظم میں تعلیم جدید کی خرابیاں اور مفاسد رمز و ایما کے پردہ میں بیان کئے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ

(۱) مجھ سے مرشد نے یہ کہا کہ دنیا میں زندگی بسر کرنے کیلئے تجھ کو سامان آسائش

حاصل کرنا ضروری ہے۔
(۲) ہندوستان میں انقلاب آچکا ہے۔ علم دین اور علماء کی اس زمانہ میں کوئی قدر و منزلت باقی نہیں رہی ہے
(۳) تو کسی زمانہ میں یہاں حکمراں تھا لیکن اب تیرا دنیاوی اقتدار بالکل ختم ہو چکا ہے۔
(۴) اس لئے اب علوم دینی کے بجائے "جدید تعلیم" حاصل کر کیونکہ اس زمانہ میں سب لوگ جدید علوم (معبود حاضر) حاصل کرکے ترقی کر رہے ہیں (اس کے بغیر نوکری نہیں مل سکتی)
(۵) اب تو ہندوستان میں عربی فارسی اور دینی علوم پڑھ کر کامیابی حاصل نہیں کر سکتا یہ علوم پرانے ہوگئے اور تیری قوم اب ان علوم کی طرف مائل بھی نہیں ہوسکتی
(۶) اس دور میں اگر تو ترقی کرنی چاہتا ہے تو انگریزی تعلیم حاصل کر۔ اس کی بدولت تیرے دماغ میں جسقدر غلط خیالات (خونِ فاسد) ہیں سب دور ہو جائینگے۔
(۷) رہبر کی یہ نصیحت سن کر میرے (قوم) اندر انگریزی تعلیم حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوگیا۔ لیکن میری (قوم کی) بدبختی ملاحظہ ہو کہ

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر ؁ یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد

نظم بر صفحہ ۲۷۴

حل لغات | پھولوں کی شہزادی سے فطرت مراد ہے + باغ رضواں سے جنت مراد ہے + فردوس ؁ دامن یعنی گلستان کا منظر نہایت دلکش ہے + سریر آرا - حکمراں + رخشندہ یعنی چمکیلی + پیام عید - پیغام مسرت + اہل محرم - غمگیں - رنجیدہ +

تبصرہ | اقبال نے اس دلکش تمثیلی نظم میں اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ فطرت کی نگاہ میں "کسی دکھ درد کے مارے کا اشکِ آتشیں" سب سے زیادہ قیمتی ہے۔

مطلب | ایک دن شبنم نے کلی سے کہا کہ اگرچہ میں مدتوں تک جنت میں رہ چکی ہوں لیکن تمہارے باغ کا حسن تو اس سے بڑھ کر ہے۔ میں نے یہ سنا ہے کہ ایک شہزادی اس باغ کی حکمراں ہے اور اسمیں یہ خاصیت ہے کہ اگر وہ جنگل میں چلی جائے تو اسکے قدموں کی تاثیر سے پھول پیدا ہو جاتے ہیں۔ (یہ کتنا دلکش انداز بیان ہے اس حقیقت کے اظہار کیلئے کہ فطرت صحرا کو گلزار بنا دیتی ہے) چونکہ میں اس کے دیدار۔ کی طالب ہوں اس لئے تو کسی دن مجھے بھی اپنے ساتھ اپنے دامن میں چھپا کرلے چل۔ کلی نے یہ سنکر جواب دیا کہ اسمیں تو کوئی شک نہیں کہ ہماری شہزادی بڑی خوبیوں کی مالکہ ہے اگر اس کا قدم کسی پتھر پر پڑ جائے تو وہ نگیں ہوجاتا ہے۔ مگر دشواری یہ ہے کہ تو بہت شوخ اور چمکیلی ہے اور ہماری شہزادی (فطرت) بہت نازک مزاج ہے۔ اس لئے تو میری ہمنشیں بن کر تو نہیں پہنچ سکتی، لیکن اگر تو کسی غمزدہ کا آنسو بنجائے تو آسانی باریاب ہو سکتی ہے ہماری شہزادی کا دل محبت اور ہمدردی کے جذبات سے لبریز ہے۔ اس کی نگاہ رنجیدہ اور غمگین انسانوں کے حق میں مسرت کا پیغام ہے اور اگر اس کے سامنے کسی غمزدہ کی آنکھ سے آنسو نکل آتا ہے تو وہ اُسے گوہر بنا دیتی ہے۔

نظم بر صفحہ ۲۷۵

حل لغات | آشیان سے خدمتِ قوم کا جذبہ مراد ہے + نوا سے پیغام باغ سے قوم اور بلبل سے ذاتِ شاعر مراد ہے + اس زمین سے مسلمان قوم اور تخم سینائی سے اللہ کی محبت کا جذبہ مراد ہے + برنائی یعنی جوانی + دلِ آگاہ سے اسلام کا جذبہ یا سرکار دو عالم کی محبت مراد ہے + نوا گر سے مصلح قوم اور شکر خائی سے پاکیزہ شاعری مراد ہے +

تبصرہ | اس نظم میں اقبال نے مرزا صائبؔ کے ایک شعر پر تضمین کی ہے خلاصہ اس نظم کا یہ ہے کہ قوم مردہ ہو چکی ہے، اسلام سے بیگانہ ہو چکی ہے اس لئے وہ میرے کلام کی طرف کیسے متوجہ ہو سکتی ہے؟

مرزا صائبؔ کا نام محمد علی تھا۔ تبریز میں پیدا ہوا۔ اصفہان میں تعلیم پائی۔ بعد ازاں ظفر خان صوبہ دار کابل کی خدمت میں آیا اور قصیدہ لکھ کر پیش کیا۔ اُسنے اسکی بہت قدر کی اور فکر معاش سے بے نیاز کر دیا۔ آخر عمر میں اصفہان واپس چلا گیا۔ اور ؁ھ میں وفات پائی۔ ایران سے جو شعرا قسمت آزمائی کے لئے ہندوستان آئے ان میں غالباً صائبؔ ہی سُنی المذہب تھا۔ مجھے اس کا یہ شعر بہت پسند ہے :-

مرا بروز قیامت غمیکہ ہست اینست + کہ روئے مردمِ عالم دوبارہ باید دید

مطلب | شاعر اپنے نفس سے خطاب کرتا ہے کہ
(۱) اے اقبال! تو بھی کس قوم میں پیدا ہوا یا تو نے بھی کس قوم کی خدمت کا ارادہ کیا ہے! اس قوم میں تو تیرا پیغام، تیرے حق میں سامان رسوائی بنجائیگا۔
(۲) تو مسلمانوں کے دلوں میں اسلام کی محبت کا بیج تو بو رہا ہے لیکن یہ تخم بار آور نہیں ہوسکیگا۔ کیونکہ قوم بے حس ہو چکی ہے۔
(۳) جس قوم کے افراد بے حس ہوں، اور اپنی ترقی سے بالکل غافل ہوں وہاں اگر کوئی شخص حسن اتفاق سے اُبھرنا یا ترقی کرنا چاہے بھی تو کامیاب نہیں ہو سکتا۔
(۴) افسوس ہے کہ مسلمان بالکل مردہ ہو چکے۔ نہ اس قوم کے بوڑھوں کے اندر ایمان کا رنگ باقی ہے اور نہ جوانوں میں سرفروشی کا جذبہ ہے
(۵) جب کوئی قوم مردہ ہو جاتی ہے تو کسی مصلح (شاعر) کے لئے (قوم کی اصلاح کا فریضہ نہایت دشوار ہو جاتا ہے
(۶) یا تو تو خاموش ہو جا، اور اگر ضبط سخن ممکن نہ ہو تو پھر اس قوم سے قطع تعلق کرکے گوشہ نشینی اختیار کرلے۔ بلاشبہ مردہ قوم میں رہنے سے جنگل میں تنہا زندگی بسر کرنا زیادہ اچھا ہے۔
(۷) یہی مناسب ہے کہ لیلیٰ، کسی بیاباں میں اپنا جلوہ دکھائے کیونکہ شہر کے لوگ، حسن صحرائی کی قدر نہیں کر سکتے۔

نوٹ | اس شعر میں "حسن صحرائی" سے صائب کی مراد تو یہ ہے کہ لیلیٰ نے صحرائے نجد میں (نہایت عمدہ آب و ہوا میں) پرورش پائی تھی اس لئے اُسکے حسن میں بڑی دلکشی تھی۔ اُسکا حُسن بالکل فطری تھا۔ فطرت کا پروردہ تھا۔ شہری عورتوں کی طرح سامان آرائش کا محتاج نہیں تھا۔ لیکن اقبال کی مراد یہ ہے کہ اسلام چونکہ دین فطرت ہے اس لئے اس میں قدرتی طور پر دلکشی پائی جاتی ہے۔ لیکن مسلمان چونکہ مردہ ہو چکے ہیں اس لئے اسلام کے فطری محاسن کی قدر نہیں کر سکتے۔ لہذا یہی مناسب ہے کہ مبلغ اسلام (شاعر) کسی جنگل میں جاکر درختوں اور پرندوں کو اسلام کی تبلیغ کرے۔

مجھے یقین ہے کہ اس مفہوم میں طنز کا جو پہلو پوشیدہ ہے اگر ناظرین اُس کو مدنظر رکھ کر اس شعر کو پڑھیں گے تو اقبال کے جذبات کی شدت سے کسی قدر ضرور آگاہ ہو جائینگے۔

نظم بر صفحہ ۲۷۶

حل لغات | ہاتف - لغوی معنی پکارنے والا۔ مراد ہے وہ فرشتہ جو بعض

اوقات انسان کو مخفی امور پر مطلع کر دیتا ہے + واماندۂ منزل ہے یعنی راستہ ہی میں کہیں تھک کر رہ گیا ہے + معروف تگ وتاز - منزل مقصود تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہے + گرمیٔ آوازے نعرۂ تکبیر مراد ہے + اے صاحب اعجاز - اقبال نے سعدیؒ کو صاحب اعجاز" اس لئے کہا کہ ان کی گلستاں بلاشبہ فارسی نثر میں لاجواب کتاب ہے + تزلزل آگیا یعنی عقائد تہ و بالا ہو گئے + مقاصد یعنی ارادے یا نصب العین + زمین گیر - بہت پست + زمین تاز یعنی وہ صرف مادی فوائد کیلئے جد وجہد کر سکتے ہیں + زخمہ بمعنی مضراب + دیوار چمن سے قومیت کا احساس مراد ہے + گلستان سے قوم یا ملت مراد ہے + زمزم - اس چشمۂ شیریں کا نام ہے جو اللہ نے اپنی قدرت سے حضرت اسمٰعیلؑ کے لئے خانہ کعبہ کے قریب ظاہر فرمادیا تھا + زمزم ملت سے قومی روایات یا شعائر اسلامیہ مراد ہیں + الحاد بمعنی انکار خدا + غماز بمعنی چغلخور +

تبصرہ | اس نہایت مؤثر نظم میں اقبال نے کمال خوبی کے ساتھ، شیخ سعدیؒ کے مشہور شعر پر تضمین کی ہے - انہوں نے اپنے جذبات ملی کے اظہار کے لئے جن دو بزرگوں کو منتخب کیا ہے، یہ دونوں ہماری ملی تاریخ میں اس اعتبار سے بہت بلند مقام رکھتے ہیں - وہ کونسا تعلیم یافتہ مسلمان ہے جس نے حالی کی مسدس اور سعدی کی گلستاں نہیں پڑھی ؟

مطلب | ایک دن جنت میں حالی سے سعدی نے کہا کہ

(۲) تو نے اپنی نظموں سے چاند اور ستاروں کو منور کر دیا -

(۳) ہندی مسلمانوں کی حالت تو بیان کر کہ ان پر تیری نظموں کا کیا اثر مرتب ہوا؟ آیا وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں یا اپنی ترقی کے لئے کچھ کوشش کر رہے ہیں؟

(۴) جس قوم کے نعرۂ تکبیر سے کسی زمانہ میں بحر و بر میں لرزہ پڑ جاتا تھا، اب اس قوم کے مذہبی جوش کا کیا عالم ہے ؟

(۵) سعدی کا یہ سوال سن کر، حالی پر رقت طاری ہو گئی، اور وہ یوں گویا ہوا کہ

(۶) جب انگریزوں نے ہندوستان کو فتح کر لیا تو انہوں نے مسلمانوں سے یہ کہا کہ اگر تم عہدے حاصل کرنا چاہتے ہو تو اسلامی علوم ترک کر کے انگریزی تعلیم حاصل کرو -

(۷) مسلمانوں نے اس مشورہ پر عمل کیا - اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قوم میں ڈپٹی کلکٹر تو پیدا ہونے لگے لیکن عقیدوں میں ضعف نمودار ہو گیا یعنی دنیا تو ملگئی لیکن دین سے ہاتھ دھو بیٹھے

(۸) جس چیز سے مسلمان کے ارادوں میں بلندی پیدا ہو سکتی تھی وہ تو دین ہی تھا - چونکہ دین رخصت ہو گیا اس لئے اب قوم کے نوجوانوں کی فطرت بالکل پست ہو گئی ہے -

(۹) قوم کے اندر، مذہب ہی سے ہم آہنگی اور اتحاد پیدا ہو سکتا ہے - اگر دین سلامت نہ ہے تو ملت کا وجود بھی برقرار نہیں رہ سکتا -

(۱۰) اور اگر ملت کا احساس مٹ جائے تو ملت (قوم) کی بقا ناممکن ہے

(۱۱) چونکہ قوم کے نوجوانوں نے قومی روایات سے کنارہ کر لیا اس لئے اب انہیں کفر و الحاد کے آثار نمایاں ہوتے جاتے ہیں -

(۱۲) آپ اس بات کا تذکرہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں نہ کیجئے، مبادا ہندی مسلمان مجھے چغلخور سمجھ لیں - لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ

(۱۳) جو کانٹے ہم نے بوئے ہیں اُن سے کھجوریں کیسے حاصل ہو سکتی ہیں؟ اور جو اون ہم نے کاتی ہے اس سے مخمل کا تھان کیسے تیار ہو سکتا ہے یعنی جب ہم کافروں کا مقرر کردہ نصاب تعلیم پڑھ رہے ہیں تو ہمارے اندر مسلمانوں کا رنگ

(اسلام کا جذبہ) کیسے پیدا ہو سکتا ہے ؟

نظم بر صحت ۲۷۷

حل لغات | پیر فلسفۂ مغربی سے یورپ کے حکماء اور سائینسداں مراد ہیں + ہستی غائب سے ذات خداوندی مراد ہے + صنم تراش سے بت پرست مراد ہے + محسوس سے عالم مادی مراد ہے جو حواس خمسہ سے محسوس ہو سکتا ہے + جنون خام سے جنون کی ابتدائی حالت یا کیفیت مراد ہے + فلسفۂ زندگی سے فلسفۂ اسلام مراد ہے + مرشد کامل سے میرزا بیدل کی طرف اشارہ ہے + انتعاش بمعنی اٹھنا، بلند ہونا +

تبصرہ | اس نظم میں اقبال نے بیدل کے ایک مشہور شعر پر تضمین کی ہے اور مقصد انکا، اس تضمین سے اسبات کا اظہار ہے کہ مذہب (اسلام) کی بنیاد، خدا کی محبت پر ہے - بیشک مذہب کے لئے عقل بھی ضروری ہے لیکن جبتک مسلمان میں "جنوں" کا رنگ نہو، اس وقت تک وہ حقیقی معنی میں مسلمان نہیں بن سکتا - چونکہ بیدل کا یہ شعر اقبال کے مسلک کا مؤید ہے، اس لئے انہوں نے اسے تضمین کے لئے منتخب کیا +

میرزا عبد القادر بیدل، پٹنہ (عظیم آباد) میں پیدا ہوئے تھے - وہ اپنے دور کے سب سے بڑے شاعر گذرے ہیں - مشکل پسندی، مضمون آفرینی، اور رفعت تخیل کے لحاظ سے، غالب اور عرفی کے علاوہ اور کوئی شاعر ان کا ہمسر نہیں ہے - چنانچہ غالب نے اس شعر میں ان کی عظمت کا اعتراف کیا ہے :-

طرز بیدل میں ریختہ لکھنا + اسد اللہ خاں، قیامت ہے

میں جس وجہ سے بیدل کی عزت کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ انہوں نے ساری عمر اپنی زبان کو کسی دولتمند کی مدح سے آلودہ نہیں کیا - وہ حضرت عالمگیرؒ کے دوسرے بیٹے شاہزادۂ اعظم کی سرکار میں منشی کے عہدہ پر ممتاز تھے - ایک دن کسی مصاحب نے شاہزادہ سے کہا کہ حضور! آپ کے منشی، نثر کے علاوہ نظم میں بھی کمال رکھتے ہیں - شاہزادہ نے انہیں بلا کر کہا کہ اگر آپ میری تعریف میں قصیدہ لکھیں تو میں آپ کا مرتبہ کلیم سے بھی بڑھا دونگا - میرے دادا نے اُسے چاندی میں تلوایا تھا میں آپ کو سونے میں تلوا دوں گا - اس کے جواب میں بیدل نے استعفاء لکھ کر پیش کر دیا اور ملازمت ترک کر کے دلّی میں سکونت اختیار کر لی -

ساری عمر کسی امیر کے مکان پر نہیں گئے - اس شان استغنار کا نتیجہ یہ نکلا کہ نظام الملک بھی ملنے کے لئے مکان پر آتا تھا - اور جب اُس نے دکن میں اپنی حکومت قائم کی تو انہیں بلوایا، لیکن انہوں نے خط کے جواب میں یہ شعر لکھ کر بھیج دیا

دنیا اگر دہند نہ خیزم ز جائے خویش | من بستہ ام حنائے قناعت بپائے خویش

بیدل کی اخلاقی جرأت کا یہ عالم تھا کہ جب حسین علی خاں نے سلطان فرخ سیر کو قتل کرایا تو انہوں نے بادشاہ کی تاریخ وفات اس مصرع سے نکالی -

"سادات بوے نمک حرامی کردند" ۱۱۳۱ھ

حضرت عالمگیرؒ کو بیدل کا یہ شعر بہت پسند تھا -

من نمی گویم زیاں کن یا بفکر سود باش

اے ز فرصت بے خبر در ہر چہ باشی زود باش

بیدل نے ۳ صفر ۱۱۳۳ھ کو دلّی میں وفات پائی - خود داری کا یہ عالم تھا کہ مرتے وقت دوستوں کو وصیت کی کہ جب میرے مکان میں صحن موجود ہے تو مجھے کسی قبرستان میں دفن نہ کرنا غیر کا احسان کیوں اٹھاؤں؛ چونکہ مجھے بیدل سے محبت ہے اس لئے ان کے سوانح حیات میں قدرے تفصیل سے کام لیا ہے - علاوہ بریں ان کا مطالعہ ہر شخص کے لئے اپنے اندر سامان عبرت رکھتا ہے -

مطلب اقبال کہتے ہیں کہ آج کل جو فلسفہ یورپ میں مروج ہے اسکی تعلیم یہ ہے کہ وہ لوگ سراسر نادان ہیں جو مادّہ کے علاوہ کسی غیر محسوس ہستی کی تلاش کرتے ہیں۔
(۲) چنانچہ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ مسلمان بھی اس نظریہ کے قائل ہوتے جاتے ہیں اور برہمن کی طرح وہ بھی بت پرستی کی طرف مائل نظر آتے ہیں۔
(۳) بلاشبہ آج کل یورپ، مادہ پرستی میں غرق ہے اور اُسنے علوم جدیدہ کی بنیاد مادہ پرستی یا محسوسات ہی پر رکھی ہے۔ واضح ہو کہ اس شعر میں اقبال نے فرانس کے مشہور فلسفی، آگسٹے کانگٹ (AUGUSTE COMTE) کے فلسفہ کی طرف اشارہ کیا ہے، جس نے اس نظریہ کو باضابطہ فلسفہ کی شکل میں جسکا نام POSITIVISM ہے، انیسویں صدی کے وسط میں یورپ کے سامنے پیش کیا تھا۔ اُس نے ۱۸۵۷ء میں وفات پائی۔
(۴) لیکن مرزا بیدل نے مجھے اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ اسلام کا فلسفہ اس کے برعکس یہ کہتا ہے کہ ہر کمال کے ساتھ کسی قدر محبت کا رنگ بھی ہو تو بہت
(۵) اچھی بات ہے۔ اس لئے اے مخاطب! اگر تو "عقل کل" کے مرتبہ کو پہنچ گیا ہے تو بھی اپنے اندر کسی قدر جنون کا رنگ ضرور پیدا کرلے تاکہ تو اپنی حقیقت سے آگاہ ہو سکے۔ یعنی جبتک کوئی شخص عشق اختیار نہیں کرے گا وہ اپنی اور اس کائنات کی حقیقت سے واقف نہیں ہو سکتا۔
نوٹ واضح ہو کہ عقل کل کے دو معنی ہیں (۱) عرفی معنی تو بہت عقلمند کے آتے ہیں چنانچہ اردو زبان میں بہت دانشمند آدمی کو 'عقل کل' کہدیتے ہیں
(۲) فلسفۂ اشراق کی اصطلاح میں عقل کل وہ روحانی (غیر مادّی) جوہر ہے جو ذاتِ واحد سے صادر ہوا، اور اس کے واسطہ سے یہ دنیا عالم وجود میں آئی اسی لئے اس کو عقل فعال بھی کہتے ہیں۔

خلاصہ اس نظم کا یہ ہے کہ اقبال کی رائے میں محض عقل، کائنات کی گتھی کو نہیں سلجھا سکتی۔ اس لئے انسان، خواہ وہ کتنا ہی عقلمند کیوں نہ ہو، عشق کا محتاج ہے۔ کیونکہ عشق میں یہ طاقت ہے کہ وہ انسان کو حقیقت سے آگاہ کر سکتا ہے۔

نظم بر ص ۲۷۸

حل لغات حنا سے خون مراد ہے + امیر عساکر = سپہ سالار افواج + صورت سیماب مضطرب، یعنی شوق شہادت میں بیتاب + صبر کا جام لبریز ہوگیا، یعنی میں اب بالکل صبر نہیں کر سکتا + صفتِ تیغ بے نیام۔ ننگی تلوار کی طرح + غیور غیرت مند +
تبصرہ اس پرجوشِ نظم میں اقبال نے ایک مومن کے شوق شہادت کا تذکرہ قلمبند کیا ہے، جس سے ان کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ اُس دور کے مسلمانوں کو اللہ کے وعدوں پر کس قدر پختہ یقین حاصل تھا۔ یہ الفاظ کہ "میں بہت جلد سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہونے والا ہوں اس لئے اگر آپ (ابو عبیدہؓ) کو کوئی پیغام دینا ہو تو دے دیجئے میں بارگاہِ رسالت میں پہنچا دونگا" وہی مسلمان کہہ سکتا ہے جس کو اس بات کا یقین کامل ہے کہ شہادت کے بعد مجھے حضوری کی نعمت حاصل ہو جائیگی۔
جنگ یرموک عہد فاروقیؓ کی فیصلہ کن جنگوں میں سے ہے۔ یہ جنگ ۱۵ھ میں ہوئی تھی جس میں بتیس ہزار (۳۲۰۰۰) مسلمانوں نے دو لاکھ رومیوں کو شکستِ فاش دی تھی جس طرح قادسیہ کے جنگ کے بعد ایرانیوں کا زور ختم ہوگیا، اس جنگ کے بعد رومیوں کے حوصلے پست ہوگئے، اور تھوڑے ہی عرصہ میں سارا

ملک شام مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا۔ یرموک کا میدان اردن کے علاقہ میں دمشق سے کچھ فاصلہ پر ہے۔
حضرت ابو عبیدہ ابن جراحؓ کی جلالت شان کا اندازہ اسبات سے ہو سکتا ہے کہ وہ "عشرۂ مبشرہ" میں سے ہیں۔ یعنی اُن دس مبارک اصحاب رسولؐ میں سے ہیں جنکے جنتی ہونے کی بشارت ان کی زندگی ہی میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے دے دی تھی۔
حضرت ابو عبیدہؓ کا شمار شجاعانِ عرب میں ہے۔ ہر معرکہ میں حضورؐ کے ساتھ رہے لیکن جنگ احد میں انہوں نے اپنی شجاعت کے جوہر پورے طور سے دکھائے اور حضورؐ کی خوشنودی حاصل کی۔ حضرت عمرؓ نے انہیں سپہ سالار بنا کر شام بھیجا چنانچہ تاریخ میں ان کا لقب فاتح شام ہے۔ ۱۸ھ میں بعمر ۵۸ سال عمواس میں بعارضہ طاعون وفات پائی۔
مطلب جنگ شروع ہونے سے پہلے ایک نوجوان نے سپہ سالار سے یہ عرض کی کہ میں شوق شہادت میں اس قدر بیتاب ہوں کہ آغاز جنگ کا انتظار نہیں کر سکتا، اس لئے آپ مجھے یکہ و تنہا دشمنوں کی صفوں میں گھس جانے کی اجازت دیجئے۔ اور اگر آپ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی پیغام بھیجنا چاہتے ہیں تو فرما دیجئے تاکہ میں شہادت کے بعد آپ کا پیغام حضورؐ کی خدمت میں پہنچادوں۔ یہ سن کر حضرت ابو عبیدہؓ پر رقت طاری ہوگئی اور اُن کی ان آنکھوں میں، جن کے سامنے باطل ٹھہر نہیں سکتا تھا، آنسو آگئے اور یوں گویا ہوئے کہ اے نوجوان! عشق رسولؐ کی بدولت تیرا مرتبہ اسقدر بلند ہوگیا کہ بوڑھوں کو بھی تیری عزت کرنی لازم ہے۔ اللہ تیری آرزو پوری کرے۔ جب تو حضور اقدسؐ کی خدمت میں پہنچے تو میری طرف سے یہ عرض کرنا کہ خدا تعالیٰ کا فضل و کرم ہمارے شامل حال ہے۔ حضورؐ نے جسقدر وعدے فتح و نصرت کے فرمائے تھے وہ سب ہماری آنکھوں کے سامنے پورے ہو رہے ہیں۔

نوٹ مقصد اس نظم سے اقبال کا یہ ہے کہ اگر موجودہ دَور کے مسلمان، اپنے اندر، ایمان کا یہی رنگ پیدا کرلیں تو نصرت الٰہی ان کے شامل حال بھی ہو سکتی ہے۔
ع ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں

نظم بر ص ۲۷۹

مطلب اس نظم میں اقبال نے یہ حقیقت مسلمانوں پر واضح کی ہے کہ اسلام دنیا میں نرالا دین ہے۔ اس لئے اے مسلمانو! تم قومیت کا اصول، اہل مغرب سے مت سیکھو کیونکہ ان کی رائے میں قوم، وطن یا نسب یا نسل یا رنگ یا زبان سے بنتی ہے، لیکن اسلام نے ان خودساختہ امتیازات کو مٹا کر تمہاری قومیت کا انحصار، عقیدۂ توحید (اسلام)، پر رکھا ہے۔ لہذا تمہاری جمیعت (جماعت) کا دارومدار، دین پر ہے۔ اگر تم اس اصل کو ترک کر دوگے تو تمہاری جمیعت فنا ہو جائیگی اور جب یہ اصل ہاتھ سے نکل گئی تو پھر ملّتِ اسلامیہ بھی ختم ہو جائیگی۔
بیشک دنیا کی دوسری تمام قومیں، اوطان سے بنتی ہیں۔ لیکن مسلمانوں کی قوم، کسی وطن سے وابستہ نہیں ہے۔ تمام دنیا کے مسلمان چین سے لیکر مراقش تک، ایک قوم ہیں۔ محض اس لئے کہ ان کی قومیت کی بنیاد وطن نہیں ہے بلکہ دین ہے۔
۱۹۳۸ء میں حضرت اقبال نے مولانا حسین احمد صاحب مدنی سے جو اختلاف کیا تھا اس کا سبب یہی تھا کہ مولانا نے ۹ر جنوری ۱۹۳۸ء کو دلّی میں اپنی تقریر کے دَوران میں یہ فرمایا تھا کہ "موجودہ زمانہ میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔ اس لئے ہندو اور مسلمان دونوں مل کر ایک قوم بن سکتے ہیں"۔

نظم برصفحہ ۲۸۰

حلِّ لغات | گلستاں سے قوم مراد ہے + فصلِ خزاں کا دورہے یعنی قوم رو بہ زوال ہے + جیبِ گل سے مسلمان کا دل مراد ہے + زرِ کامل عیار سے ایمان مراد ہے + نغمہ زن تھے یعنی مصروفِ جہاد تھے + طیور سے علمائے حق مراد ہیں + شجرِ سایہ دار سے قوم مراد ہے + بریدہ یعنی کٹی ہوئی + قاعدۂ روزگار سے قانونِ فطرت مراد ہے + پیوستہ رہ شجر سے یعنی ملت سے وابستہ رہ +

تبصرہ | اقبال نے اس نظم میں اس حدیث کا مفہوم واضح کیا ہے کہ "لا اسلام إلا بالجماعة" یعنی جماعت سے الگ ہوکر، کوئی شخص اپنے اسلام کو برقرار نہیں رکھ سکتا۔ دوسری حدیث یہ ہے "علیکم بالجماعة، من شذّ، شذّ فی النار" (اے مسلمانو! تم پر اجتماعی زندگی بسر کرنا فرض ہے جو شخص جماعت سے علیحدہ ہوجائے وہ دوزخ میں ڈالدیا جائیگا۔ ع فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
علامہ مرحوم نے اسلام کے اس بنیادی اصول کو اپنی کتاب "رموزِ بیخودی" میں بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

مطلب | خزاں کے زمانے میں جو شاخ درخت سے ٹوٹ جاتی ہے وہ موسمِ بہار میں بارش سے ہری نہیں ہوسکتی۔ اس پر ہمیشہ کے لئے خزاں طاری ہوجاتی ہے اور پھر کبھی اس پر نہ پتے لگتے ہیں نہ پھل۔ اے مسلمان! تیری قوم بھی آجکل خزاں (پستی یا زوال) کی زد میں آئی ہوئی ہے۔ اس وقت تو زوال کے دور میں سے گذر رہا ہے یعنی مسلمانوں میں ضعفِ ایمانی پیدا ہوگیا ہے۔ سچے مسلمان انیسویں صدی میں ختم ہوچکے ہیں چونکہ تو قوانینِ فطرت سے ناآشنا ہے اس لئے ٹوٹی ہوئی شاخ سے سبق لے، قانونِ قدرت یہ ہے کہ پھل اسی شاخ پر لگ سکتا ہے جو درخت سے وابستہ ہو۔ اس قاعدہ کی رو سے، تو بھی دنیا میں اسی وقت اور اسی صورت میں ترقی کرسکتا ہے (کامیاب ہوسکتا ہے) جب تو ملت سے وابستہ اور پیوستہ رہے اگر تو ملت سے جدا ہوکر کسی غیر اسلامی جماعت میں شامل ہوگیا، تو جس وقت ملت پر بہار آئیگی اس وقت تو فیضِ بہار سے محروم رہ جائیگا۔

نظم برصفحہ ۲۸۱

حلِّ لغات | اخترِ شام۔ وہ خاص ستارہ جو شام کے وقت طلوع ہوتا ہے لیکن یہاں اس سے نظامِ کائنات مراد ہے + سحر سجدہ کرتی ہے یعنی شبِ معراج کی عظمت کا اعتراف کرتی ہے + رہِ یک گام ہے یعنی صرف ایک قدم کا فاصلہ ہے + ہمت۔ یہ لفظ اس قطعہ کی جان ہے۔ اس سے مراد ہے جد و جہد جو قرآنی تعلیمات کی روح ہے + عرشِ بریں سے قربِ الٰہی مراد ہے + معراج کے لغوی معنیٰ ہیں سیڑھی + عرش کے لغوی معنیٰ ہیں تختِ شاہی +

مطلب | اس بلاغت آفریں قطعہ میں اقبال نے معراجِ نبوی سے، جو نبوت کے بارھویں سال میں واقع ہوئی تھی، یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ اگر مسلمان کوشش کرے اور ہمت سے کام لے تو اُسے بھی قربِ الٰہی حاصل ہوسکتا ہے، بالفاظِ دگر، اگر مسلمان، سرکارِ دوعالم صلعم کی کامل اتباع کرے تو وہ بھی خدا تک پہنچ سکتا ہے۔

اقبال نے یہ نکتہ حضور انورؐ کے اس ارشادِ گرامی کی بدولت پیدا کیا ہے "الصلوٰة معراج المؤمنین" یعنی نماز مومنوں کے لئے (معراج) قربِ الٰہی کا ذریعہ ہے اس قطعہ کو پڑھتے وقت معراج کے دو معنی مدِّ نظر رکھئے۔

(۱) معراج کے اصطلاحی معنی یعنی حضورؐ کی معراج (جس میں کوئی شریک نہیں)

(۲) معراج کے مرادی معنی یعنی قربِ خداوندی (جو ہر مومن کو نصیب ہوسکتا ہے)

نظم برصفحہ ۲۸۱

حلِّ لغات | گل سے مسلمان (فرد) مراد ہے + دلِ صد چاک بلبل سے قوم مراد ہے + پیرہن کے چاک سے سیرت کی خرابیاں مراد ہیں + کانٹوں سے مصائب اور دشواریاں مراد ہیں + پابگل یعنی گرفتار + تنگ بخشی سے فطرت کی بے اعتنائی مراد ہے + مطلب اس کا یہ ہے کہ فطرت، بعض آدمیوں کو، اُن کی خواہش یا ضرورت کے مطابق ترقی کے وسائل عطا نہیں کرتی + استغنا بمعنی بے نیازی، لاپروائی + نہ رہ منت کشِ شبنم یعنی غیر کا احسان مت اٹھا + چمن سے توڑ کر یعنی ملت سے جدا کرکے + دستار میں رکھ لے۔ تجھے اپنا آلۂ کار بنالے یا تجھ سے ناجائز فائدے حاصل کرے + مذاقِ جورِ گلچیں ہو یعنی اگر تو گلچیں کے ظلم و ستم کا آرزو مند ہو مطلب یہ کہ اگر تو دنیا کی مصائب میں مبتلا ہونا چاہے + تو پیدا رنگ و بو کرلے، یہاں رنگ و بو سے ذاتی خوبیاں مراد ہیں + خزاں نا آشنا سے دنیا کی مصیبتوں سے نجات مراد ہے + جہانِ رنگ و بو سے دنیا کی مختلف بلکہ گوناگوں دلفریبیاں مراد ہیں مثلاً عورت، دولت، جاگیر، باغات، محلات اور مناصبِ عالیہ زینتِ دامن کرے یعنی مقربِ بارگاہ بنالے + آئینہ رو یعنی محبوب +

تبصرہ | یہ ایک عجیب و غریب نظم ہے۔ نہایت دلکش مگر نہایت سنجیدہ اس میں اقبال کی رمزیہ شاعری اپنی معراج کو پہنچ گئی ہے۔ اس کا عنوان ہے "پھول" جسے بظاہر نفسِ مضمون سے کوئی علاقہ نظر نہیں آتا۔ لیکن غور کرو تو زبردست علاقہ مضمر ہے۔ پھول سے مراد ہے "مردِ مسلمان" اقبال نے مسلمان کو پھول اس لئے قرار دیا ہے کہ جس طرح باغ کی زینت پھول سے ہے، دنیا کی زینت مسلمان سے ہے۔ جس طرح پھول باغ میں سب سے زیادہ دلکش ہوتا ہے، مسلمان بھی دنیا میں سب سے زیادہ دلکش ہے۔ پھول میں حسن پایا جاتا ہے۔ مسلمان میں بھی حسن پایا جاتا ہے فرق اتنا ہے کہ پھول کا حسن ظاہری ہے مسلمان کا حسن باطنی ہے۔ پھول، فطرت کا مادی شاہکار ہے مسلمان فطرت کا روحانی شاہکار ہے۔ پھول سے دنیا کی فضا مہک اٹھتی ہے، مسلمان کا وجود بھی دنیا کے لئے برکت کا موجب ہے۔ پھول کبھی سرنگوں نہیں ہوتا۔ مسلمان بھی غیر اللہ کے آگے سر نہیں جھکاتا۔

دوسری خوبی اس نظم میں یہ ہے کہ اس میں اقبال نے باغ کا تلازمہ باندھا ہے۔ چنانچہ ہر شعر میں مُراعات النظیر کی صنعت پائی جاتی ہے اور ساری نظم باغ کے لوازم سے معمور ہے مثلاً پھول، گل، بلبل، چاک، رفو گلزار، کانٹے، صنوبر، آزاد، پابگل، شبنم، جام و سبو، چمن، غنچہ، گلچیں رنگ و بو، خزاں، زینتِ دامن اور آئینہ رو + کیا یہ تلازمہ اقبال کی قدرتِ شاعری پر شاہدِ عادل نہیں؟

مطلب | (۱) اے مسلمان! اگر تو اپنی قوم کی خدمت یا اس کے مفاسد کی اصلاح کرنی چاہتا ہے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے تو اپنی سیرت کی تکمیل کرلے یعنی قوم کی اصلاح وہ شخص کرسکتا ہے جس نے کسی مرشدِ کامل کی صحبت میں بیٹھکر، پہلے اپنی اصلاح کرلی ہو۔

نوٹ | ممکن ہے اقبال نے جب یہ نظم لکھی تھی اسوقت یعنی ۱۹۱۵ء میں اصلاحِ قوم کی یہی شرط مروج ہو۔ مگر اب ۱۹۵۰ء میں یہ طریقہ متروک ہوچکا ہے۔ اب ماشاءاللہ قوم کے جسقدر مصلحین ہیں وہ سب "صحبتِ مرشد" کو فضول سمجھتے ہیں: چنانچہ انمیں سے کوئی بھی صحبت یافتہ نہیں ہے، شیخ سعدیؒ نے ایسے ہی حضرات کے حق میں یہ کہا تھا۔ ع او خویشتن گم است کرا رہبری کند

(۲) اے مسلمان! اگر تو دنیا میں عزت کے ساتھ زندگی بسر کرنی چاہتا ہے، تو زندگی کی مصیبتوں کو برداشت کرنے کی عادت پیدا کرلے۔ جو شخص مصائب سے گھبراتا ہے وہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اگر تجھے شک ہو تو سرکارِ دو عالم صلعم کی تیرہ برس کی مکی زندگی کا مطالعہ کرلے۔

(۳) اگر تو آزادی حریت کا آرزو مند ہے تو اس کا طریقہ یہ نہیں کہ تو تمام قواعد وضوابط شرعی وعقلی کو بالائے طاق رکھدے (جیسا کہ اس زمانہ میں اشتراکی ادیب مسلمان نوجوانوں کو تلقین کر رہے ہیں) بلکہ صنوبر سے سبق حاصل کر کہ اس نے قانونِ فطرت کی پابندی کر کے آزادی حاصل کی ہے۔ یعنی حقیقی آزادی قانونِ "شریعت" کی پابندی سے نصیب ہو سکتی ہے۔

(۴) اگر تو سمجھتا ہے کہ فطرت یا مشئیت تیری مرضی کے مطابق نہیں ہے تو، لازم ہے کہ تو اپنے اندر شانِ استغنا پیدا کرلے۔ بہر حال تو دنیا میں کسی غیر کا احسان مت گوارا کر۔ جام کو نگوں کرنے سے مراد ہے بے نیازی کی شان پیدا کرنا جو مومن کا طغرائے امتیاز ہے۔

(۵) اے مسلمان! خودداری (عزتِ نفس) اسلام کا پہلا سبق ہے۔ اس لئے تو ہرگز اس بات کو گوارا مت کر کہ اغیار تجھے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے استعمال کریں۔ مثلاً جب انھیں تیری ضرورت ہو تو تجھے "راشٹریتی" بنا دیں لیکن جب مطلب نکل جائے تو تجھے "فرقہ پرست" کہکر ذلیل وخوار کر دیں۔ یا جب سلہٹ میں استصوابِ رائے عامہ کا مرحلہ درپیش ہو تو مسلمانوں کو ہندوؤں کی غلامی کا سبق پڑھانے کے لئے، تجھے خاص اہتمام کے ساتھ کافی سے زیادہ "زادِ راہ" دیکر وہاں کا دورہ کرنے کے لئے بھیجدیں، لیکن جب مقصد حاصل ہو جائے تو پھر تیرے "دار العلوم" کی تلاشی کے وقت تجھ سے بات بھی نہ کریں۔

ع کوئی دستار میں رکھ لے، کوئی زیبِ گلو کرلے

(۶) اے مسلمان! اس دنیا کا قانون یہی ہے کہ یہاں راست بازوں اور مخلص انسانوں کو جن میں راستی اور کمال (رنگ وبو) پایا جاتا ہے۔ دنیا کے لوگ (گلچیں) ہر قسم کی تکالیف پہنچاتے ہیں۔ دیکھ لو! گلچیں سوکھے سڑے اور مرجھائے ہوئے پھولوں کو تو ہاتھ نہیں لگاتا۔ بلکہ انہی پھولوں کو چن چن کے توڑتا ہے جو حسین (رنگ) اور خوشبودار (بو) ہوتے ہیں۔

دیکھ لو! مامون (سلاطین عباسیہ میں ایک جابر سلطان گذرا ہے جس کا دامن مسلمانوں کے خون سے داغدار ہے) نے کسی ضمیر فروش مسلمان کو تو نہیں ستایا۔ اس ظالم کے ظلم کا تختۂ مشق تو حضرت احمد حنبلؒ ہی بنے جنہوں نے، صداقت اور حق گوئی کو شعارِ زندگی بنا لیا تھا۔ ان کے علاوہ تاریخ میں صدہا مثالیں اس قسم کی مل سکتی ہیں مثلاً جہانگیر نے نوش نے حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کو گوالیار کے قلعہ میں کیوں محبوس کیا؟ محض اس لئے کہ انہوں نے اس "زن مرید" کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کیا

گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمئ احرار (بالِ جبریل)

(۷) اور اگر تو دنیا کی آفات سے محفوظ رہنا چاہتا ہے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے دل کو آفاتِ ثلاثہ یعنی۔ زن۔ زر اور زمین کی محبت سے پاک کرلے اور دنیا والوں سے کسی قسم کی توقع مت رکھ۔ پھر تیرے اوپر خزاں (مصیبت) طاری نہیں ہو سکے گی۔

(۸) اے مسلمان دنیا میں ہر قوم اور ہر مذہب نے کمال کا جداگانہ معیار مقرر کیا ہے مثلاً

وطنیت کے نزدیک کمالِ زندگی یہ ہے کہ آدمی وطن پر نثار ہو جائے
سرمایہ داری کے اعتبار سے کمالِ زندگی یہ ہے کہ آدمی قارون بنجائے
ملوکیت کے زاویۂ نگاہ سے کمالِ زندگی یہ ہے کہ آدمی "کے سی ایس آئی" بنجائے
جمہوریت کی نگاہ میں کمالِ زندگی یہ ہے کہ آدمی "وزیر اعظم" بنجائے
اشتراکیت کی رائے میں کمالِ زندگی یہ ہے کہ آدمی منکرِ خدا ہو کر لینن کا پرستار بنجائے
اسلام کی رو سے کمالِ زندگی یہ ہے کہ آدمی سرکارِ دو عالم صلعم کا عاشقِ زار بنجائے

پس اے مسلمان! تو اس طرح زندگی بسر کر کہ حضور انور صلعم قیامت کے دن تجھے اپنے غلاموں کی صف میں جگہ عطا فرما دیں۔

نظم بر صـ ۲۸۳

حلِ لغات آئینہ سے وہ آلہ مراد ہے جو کسی شے کو یا اس کی خوبیوں کو واضح کر دے یا اس شے کے وجود کو ثابت کر دے، یا اس کی طرف انسانی ذہن کو منتقل کر دے ۔ مثلاً برگِ گل، بہار کے عارضِ زیبا کے لئے آئینہ کا کام دیتا ہے یعنی (۱) برگِ گل یا گل کا دنیا میں، بہار کے وجود کا مظہر ہے (۲) اس کو دیکھکر دنیا کے لوگ یہ جان لیتے ہیں کہ بہار آگئی، اس کو دیکھکر ہمارا ذہن بہار کی طرف منتقل ہو جاتا ہے (۳) برگِ گل سے بہار کی کیفیت اور نوعیت آشکارا ہو سکتی ہے۔ یعنی یہ سمجھ میں آجاتا ہے کہ بہار کسے کہتے ہیں۔

میں نے لفظ آئینہ کی وضاحت اس لئے کر دی ہے کہ اس نظم کے پہلے تین شعروں کا مطلب اسی لفظ کے سمجھنے پر موقوف ہے۔ آئینہ کے چوتھے اور عرفی معنی ہیں وہ شے جس میں کسی دوسری شے کا عکس یا جلوہ نظر آئے۔ آئینہ بمعنی مظہر یا واضح کرنے والا + مآلِ ہستی ہستی کا انجام۔ شاعرانہ مبالغہ ہے یعنی تیری فطرت، ہستی کا مقصد تھی سے تجھے پیدا کرنے کے لئے فطرت نے یہ کارخانۂ عالم پیدا کیا تھا + دیدۂ دیدار طلب۔ وہ انسان جو حقیقت کا طالب ہے + چشمِ عالم سے تو ہستی الخ اس مصرع میں بھی مبالغہ کا رنگ ہے مطلب یہ ہے کہ تیرے کلام کو سمجھنا بہت دشوار ہے +

تبصرہ اقبال نے اس نظم میں شیکسپیئر کی خدمت میں خراجِ تحسین وعقیدت پیش کیا ہے اور کئی جگہ شاعرانہ مبالغہ سے اپنے کلام میں زور اور اثر پیدا کیا ہے۔

راقم الحروف بھی ۱۹۲۵ء تک شیکسپیئر کے پرستاروں میں رہا چنانچہ اس زمانہ میں اس کے ساتھ وابستگی کا یہ عالم تھا کہ انگریزی تحریر اور تقریر میں اس کے ڈراموں کے جملے استعمال کرنے کو کمالِ زندگی سمجھتا تھا۔ لیکن جب مثنوی پڑھی تو دنیا ہی بدل گئی۔ نہ شیکسپیئر کا کہیں نشان، رہا نہ بارکلے کا، نہ اسپنسر سے کوئی تعلق رہا نہ ہیوم سے + وہ دن ہے اور آج کا دن ہے۔ کوئی حسین نظروں میں نہیں سماتا +

دراصل اقبال اس زمانہ میں انگریزوں کی اس شیفتگی سے متاثر ہو گئے تھے جو اس زندہ قوم کو اپنی زبان کے سب سے بڑے ڈرامہ نویس کے ساتھ ہے جس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ انگریز اکثر اوقات یہ کہا کرتے ہیں کہ اگر ہمیں سلطنتِ انگلشیہ اور شیکسپیئر ان دونوں میں سے ایک چیز کے انتخاب پر مجبور کیا جائے تو ہم بلا تامل شیکسپیئر کو انتخاب کریں گے۔

واضح ہو کہ انگریز ادیبوں اور نقادوں کا یہ قول محض شاعرانہ اندازِ بیان ہے جو سراسر مبالغہ پر مبنی ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ انگریز، بہر حال انگریز ہے جو قوم مرو نہر سوئیز سے دست بردار نہیں ہو سکتی وہ اپنی پوری سلطنت سے کیسے دست بردار ہو سکتی ہے؟ ایں خیالست ومحالست وجنوں

شیکسپیئر جسے انگریز، جوشِ عقیدت میں دنیا کا سب سے بڑا شاعر سمجھتے ہیں

۱۵۶۴ء میں پیدا ہوا تھا اور ۱۶۱۶ء میں فوت ہوا۔ ۱۵۸۲ء میں اسکے والدین نے اسکی شادی ایسی لڑکی کے ساتھ کردی جو اس سے عمر میں صرف آٹھ سال بڑی تھی پانچ سال تک اس نیک بخت کی رفاقت سے بہرہ اندوز ہونے کے بعد وہ لندن چلا گیا تاکہ قسمت آزمائی کر سکے۔ یہاں آکر اُس نے "تھیٹریکل کمپنی" کیلئے ڈرامے لکھنے شروع کئے پہلا ڈرامہ ۱۵۹۲ء میں لکھا جو بہت مقبول ہوا۔ یہ سلسلہ ۱۶۱۱ء تک جاری رہا اس کی وفات کے بعد ۱۶۲۳ء میں اسکے ڈراموں کا پہلا مجموعہ شائع ہوا جس میں ۳۶ ڈرامے شامل تھے۔

شیکسپیئر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اُسنے اپنے ڈراموں میں انسانی فطرت کے اُن تمام پہلوؤں کو کسی نہ کسی طریقہ سے واضح کردیا ہے جو ہمارے ذہن میں آسکتے ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ فطرتِ انسانی کا سب سے بڑا نباض یا ماہر تھا۔ اس لئے ایک شاعر نے بایں الفاظ اس کی شخصیت پر تبصرہ کیا ہے "اُس میں انسانی خوبیوں کا ایسا عمدہ امتزاج پایا جاتا تھا کہ فطرت بھرے مجمع میں کھڑی ہو کر کہہ سکتی ہے کہ اگر میرا شاہکار دیکھنا ہو تو شیکسپیئر کو دیکھو"

اگر اس نظم کو غور سے پڑھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کے لکھتے وقت شاید یہی مقولہ اقبال کے پیش نظر تھا۔ کیونکہ انھوں نے بھی اسی سے ملتے جلتے خیالات ظاہر کئے ہیں۔

پہلا بند۔ جس طرح صبح کا حُسن، دریا کی روانی میں نظر آتا ہے۔ شام کی دلفریبی، شام کے وقت نمایاں ہوتی ہے۔ بہار کا حسن، برگ گل میں دکھائی دیتا ہے، شراب کا حسن اور اسکی دلکشی، جامِ شراب سے ظاہر ہو سکتی ہے۔ اسی طرح، شیکسپیئر کا حُسنِ کلام اور اسلوب بیان (فطرت انسانی کی عکاسی) دل کا آئینہ ہے یعنی اس کے کلام میں انسان کے واردات وجذبات قلبی کا مکمل عکس نظر آتا ہے اور انسان کا دل، حسن وجمال کا آئینہ ہے۔ یعنی کائنات کا حسن، انسان کے دل میں منعکس ہوتا ہے اور حُسن، حق کا آئینہ ہے یعنی حسین شے کے اندر خالقِ فطرت کا جلوہ نظر آتا ہے، لہٰذا شیکسپیئر کا کلام آئینۂ حق ہے یعنی اس کے کلام میں خدا کی قدرت کا جلوہ نظر آتا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے:۔

(۱) تیرا حُسنِ کلام، دل انسان کیلئے آئینہ ہے۔ (۲) دل انسان، حُسن کیلئے بمنزلہ آئینہ ہے (۳) حُسن، حق کے لئے آئینہ ہے (۴) یعنی تیرا کلام، حق کے لئے آئینہ ہے۔

تیرا تخیل آسمانوں سے باتیں کرتا ہے۔ اور اسکی رفعت میں مجھے ہستیٔ انسانی کا کمال نظر آتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تیری فطرت (شخصیت) ہستی کا مقصود تھی۔

دوسرا بند۔ جب کسی نقادِ فن نے تیری شخصیت کا اندازہ کرنا چاہا تو تیری تصانیف (تابِ خورشید) میں تیری شخصیت (خورشید) پوشیدہ نظر آئی۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا والے تو تجھے کما حقہٗ نہ سمجھ سکے (یہ مبالغہ ہے) لیکن تونے دنیا والوں کو کما حقہٗ سمجھ لیا۔ (یہ اشارہ ہے اسکی قابلیتِ فن کی طرف جس کی تشریح، تبصرہ میں کرچکا ہوں)

ع اور عالم کو تیری آنکھ نے عریاں دیکھا" یہ مصرع اس نظم کی جان ہے کیونکہ شیکسپیئر کا کمالِ فن یہی ہے کہ دنیا میں انسانی سیرت کے جتنے پہلو ذہن میں آسکتے ہیں، اُس نے ان سب کی عکاسی کردی ہے۔

چونکہ فطرت، اپنے اسرار ورموز کی بہت حفاظت کرتی ہے اس لئے میرا خیال ہے کہ وہ شیکسپیئر کے بعد اپنے اسرار کا دوسرا "راز دان" پھر پیدا نہیں کرگی۔ یعنی اسرارِ فطرت کا ایسا ماہر اب پیدا نہ ہوگا۔

نظم بر صفحہ ۲۸۴

حل لغات | کلیم کا سلیقہ۔ اس سے مراد ہے حضرت موسیٰؑ کا سا اشتیاق دید + خلیل کا قرینہ اس سے مراد ہے حضرت ابراہیمؑ کا سا رنگِ ایمان + سامری اس شخص کا اصلی نام موسیٰ ابن ظفر تھا لیکن وہ اپنے قبیلہ کے نام سے مشہور ہوگیا۔ اُسنے بنی اسرائیل کو گمراہ کرنے کے لئے سونے کا بچھڑا بنایا تھا جس میں سے آواز نکلتی تھی۔ رفتہ رفتہ لفظ "سامری" ساحر کے معنی میں استعمال ہونے لگا + قتیل بمعنی مقتول + آذری سے بت پرستی مراد ہے + نوائے سوختہ در گلو سے نامرادی اور ناکامی مراد ہے + پریدہ رنگ۔ کنایہ ہے رنج وغم سے + حدیث سے داستان مراد ہے + سم بمعنی زہر + بود بمعنی ہستی یا شخصیت + ہم نفسِ عدم یعنی میرا ہونا اور نہ ہونا دونوں برابر ہیں + گرو عجم۔ یعنی غیر اسلامی خیالات میں گرفتار + دمِ زندگی رمِ زندگی یعنی ہر سانس عمر کو کم کرتی چلی جاتی ہے + قلندری۔ بانگِ درا میں اقبال نے پہلی مرتبہ اس لفظ کو اس نظم میں استعمال کیا ہے۔ آیندہ تصانیف میں یہ لفظ اقبال کی خاص اصطلاح بن گیا۔ ضربِ کلیم اس کے ذکر سے معمور ہے اس سے مراد ہے مومن کی طرز حیات + خاک سے یہاں جوہر خودی یا شخصیت یا دل مراد ہے + شررِ عشق رسولؐ مراد ہے + نانِ شعیر۔ جو کی روٹی + چراغ حرم سے رہنمائے قوم مراد ہے + پتنگ سے مسلمان مراد ہے + سرشتِ سمندری۔ سمندر، وہ کیڑا جو آگ میں رہتا ہے۔ روایت یہ ہے کہ پارسیوں کے جس آتش کدہ میں مسلسل صدیوں تک آگ روشن رہے تو ایک کیڑا پیدا ہو جاتا ہے جو آگ ہی میں رہتا ہے اور اگر آگ سے باہر نکال لیا جائے تو مر جاتا ہے بعضوں کا یہ خیال ہے کہ کیڑا نہیں بلکہ چوہے کی شکل کا ایک جانور پیدا ہو جاتا ہے اس باب میں قول راجح یہ ہے کہ یہ ایک غیر معروف چھوٹا سا جانور ہے۔ آتش کدہ یا آگ سے اسکا کوئی تعلق نہیں ہے۔ سرشتِ سمندری سے آتشیں مزاج مراد ہے + طرز طواف سے اسلامی زندگی مراد ہے + جفائے وفا نما سے ایسی جفا یا بیوفائی مراد ہے جو بظاہر وفا معلوم ہو + حرم سے دینِ اسلام مراد ہے + اہل حرم سے مسلمان مراد ہیں + ہری یہ وشنو کا مشہور لقب ہے اور وشنو ہندی ترمورتی کا دوسرا رکن ہے۔ ہندو دھرم میں پرماتما (خدا) کے تین سروپ مانے گئے ہیں برہما، وشنو اور شو + ستیزہ گاہ۔ میدانِ جنگ + حریفِ پنجہ فگن۔ زبردست دشمن + فطرتِ اسداللّٰہی سے حضرت علیؓ کی سیرت مراد ہے جو حضرت علیؓ اسلام کے محافظ اور وکیل ہیں۔ اسداللّٰہ یعنی اللّٰہ کا شیر یہ حضرت علیؓ کا مشہور لقب ہے + مرحبی یعنی فطرتِ مرحبی۔ مرحب۔ عرب کا مشہور بہادر تھا جو خیبر میں قلعہ قموص کا محافظ تھا۔ غزوۂ خیبر میں حضرت علیؓ کے ہاتھ سے مارا گیا۔ مرحب کے مرادی معنی ہیں کفر کا علمبردار یا وکیل + عنتری۔ عنتر بھی عرب کا مشہور بہادر تھا اور مرحب کا بھائی تھا اور اُسکے قتل کے بعد حضرت علیؓ سے انتقام لینے کے لئے میدان میں آیا تھا لیکن انھوں نے اس کو بھی قتل کردیا۔

تبصرہ۔ یہ بانگِ درا کی مشکل نظموں میں سے ہے مضامین کی بلندی کے علاوہ اسمیں شاعرانہ خوبیاں بھی بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ بندش کی چستی، الفاظ کا انتخاب اور صوتی ہم آہنگی اسکی نمایاں خصوصیات ہیں بحیثیت مجموعی یہ نظم اقبال کی قادر الکلامی کا ایک بہت عمدہ نمونہ ہے اسکے عنوان میں بھی ندرت پائی جاتی ہے۔ میں، سے ذاتِ شاعر اور "تو" سے نظم پڑھنے والا مراد ہے۔ میں اور تو سے پوری قوم بھی مراد ہو سکتی ہے۔ کہتے ہیں کہ

(۱) نہ مجھ میں حضرت موسیٰؑ کی طرح اللّٰہ تعالیٰ سے ملاقات کی آرزو پائی جاتی ہے اور نہ مجھ میں حضرت ابراہیمؑ کا سا ایمان پایا جاتا ہے۔ اگر میں سامری کا پیرو ہوں تو، تو آذر کا متبع ہے مطلب یہ ہے کہ پوری قوم اسلام سے منحرف ہو چکی ہے۔

(۲) میری حالت اس ناکام اور نامراد عاشق کی سی ہے جو عرضِ مطلب یا حالِ دل بیان کرنے کی بھی طاقت نہیں رکھتا اور تو مسلسل شکستوں اور مصیبتوں کی وجہ سے نیم جاں ہو چکا ہے

میرے پاس رنج وغم کی داستان کے علاوہ اور کچھ نہیں اور تو اپنی بدنصیبی اور محرومی کا رونا روتا رہتا ہے ۔مطلب یہ ہے کہ پوری قوم تباہ ہو چکی ہے۔

(۳) میری کیفیت یہ ہے کہ مجھے عیش میں کوئی لُطف محسوس نہیں ہوتا۔ اومیری خوبی بھی دنیا کو برائی نظر آتی ہے ،مختصر یہ ہے کہ میرا وجود اور عدم دونوں یکساں ہیں۔ اور تیری حالت یہ ہے کہ تیرا دل جو دراصل حرم تھا وہ کفر کا غلام ہو چکا ہے۔ اور تو نے اپنے ایمان کو کافروں کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے۔

(۴) اے مسلمان تیری دنیاوی زندگی کو ہمیشگی حاصل نہیں ہو سکتی، یہ دنیاوی زندگی محض کھیل تماشا ہے، چند روزہ ہے اگر تو مرنے کا غم کرے گا تو یہ غم تیرے حق میں زہر بنجائیگا۔ تیری زندگی بیکار ہو جائے گی اسلئے زندگی کے گزرنے پر غم نکر اور غم کا زہر مت کھا بلکہ ہر حال میں راضی برضا رہ ، کیونکہ مسلمان کا شیوہ یہی ہے کہ وہ مشیئتِ ایزدی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہے۔

(۵) اگر تیرے دل میں عشقِ رسولؐ کی چنگاری موجود ہے تو پھر یہ پرواہ مت کر کہ تو دولتمند ہے یا مفلس ہے۔ کیونکہ کامیابی کے لئے دولت ضروری نہیں ہے۔ کیا، تجھے علم نہیں کہ حضرت علیؓ جَو کی روٹی کھاتے تھے لیکن عشقِ رسول کی بدولت انہیں یہ طاقت پیدا ہو گئی تھی کہ انھوں نے خیبر کا دروازہ اپنی قوتِ بازو سے اکھیڑ دیا تھا۔ یعنی کفر کا مقابلہ کرنے کے لئے دولت نہیں بلکہ عشق درکار ہے۔

(۶) اے رہنمائے قوم! تو مسلمانوں کو ایسی زندگی بسر کرنے کی تلقین کر کہ ان میں یعنی ان کے دلوں میں عشقِ رسول کی آگ بھڑکنے لگے اور وہ سراپا آگ بنجائیں۔

(۷) اے مسلمانو! تم نے اسلام کی ساتھ ایسی بے وفائی کی ہے کہ بظاہر وہ وفا ہے لیکن دراصل جفا ہے یعنی تم زبان سے توحید کا دعویٰ کرتے ہو لیکن تمہارا عمل اس کے خلاف ہے۔ تمہاری اس دورنگی سے اسلام کو اسقدر ضعف

پہنچتا ہے کہ اگر میں تمہاری منافقت کی داستان، کافروں کو سناؤں تو وہ بھی "ہری ہری" پکار اٹھیں یعنی تمہارے طرزِ عمل سے شدید نفرت کا اظہار کریں۔

اس شعر کے دوسرے مصرع میں بڑی شان بلاغت پائی جاتی ہے اس کا ایک مطلب تو وہ ہے جو اوپر بیان کیا گیا دوسرا مطلب یہ ہے کہ اگر میں کسی صنم (بت) کے سامنے یہ بات بیان کروں کہ اسلام نے مسلمانوں پر کس قدر احسانات کئے لیکن اس کے جواب میں مسلمانوں نے اسلام جیسے پاکیزہ دین کے ساتھ کس قدر بیوفائی کی تو گمان غالب یہ ہے کہ بت بھی اس خدا پر ایمان لے آئیگا جس نے اہلِ دنیا کو اسلام جیسا پاکیزہ دین عطا فرمایا۔

اس کے علاوہ اس مصرع کے اسلوب میں بڑی دلکشی پائی جاتی ہے۔ اقبال نے اسکی بندش میں ایسی قابلیت صرف کی ہے کہ شاعری میں ساحری کا رنگ پیدا ہو گیا ہے صنم جیسا کہ سب جانتے ہیں، ہری (خدا) کی ضد ہے۔ اقبال نے کمالِ فن کا مظاہرہ یہ کیا ہے کہ صنم کو خدا کا پرستار بنا دیا۔ اس مصرع کو پڑھکر بلاشبہ مسلمان کی احسان فراموشی کی تصویر سامنے آجاتی ہے کہ اسکی بیوفائی کی داستان اسقدر عبرت انگیز ہے کہ انسان تو کیا اگر پتھر بھی سُن پائے، تو کانوں پر ہاتھ رکھ لے اور خدا کو یاد کرنے لگے حقیقت تو یہ ہے کہ صنم اور ہری میں جو تضادِ معنوی پایا جاتا ہے اسنے اس مصرع کو تحسین سے بالاتر کر دیا ہے

(۸) اے مسلمانو! اگر موجودہ زمانے میں کفر یا طاغوتی طاقتیں تمہارے خلاف متحد ہو کر صف آرا ہو گئی ہیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے (اسلئے تم بالکل ہراساں مت ہو) ذرا صدرِ اسلام کی تاریخ تو اٹھا کر دیکھو کیا حضرت علیؓ کے مقابلہ میں مرحب اور عنتر نہیں آئے تھے؟ پھر جسطرح عشقِ رسولؐ کی بدولت حضرت موصوف اپنے زمانے کے کافروں پر غالب آئے تھے اُسی طرح تم بھی غالب آسکتے ہو۔

اسی مضمون کو اقبال نے ایک جگہ یوں باندھا ہے:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

(۹) اب اقبال سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم سے استمداد کرتے ہیں کہ آقائے کائنات اے سرورِ موجوداتؐ! اسوقت آپؐ کی نگاہِ کرم درکار ہے۔ ذرہ پردہ اٹھا کر تو دیکھئے! آپؐ کے دیوانے پر وہ لوگ دست بستہ منتظرِ کرم کھڑے ہوئے ہیں جو بظاہر۔ یعنی آپؐ کے سامنے تو بیشک گدا ہیں لیکن آپؐ سے نسبتِ غلامی کی وجہ سے انکے اندر یہ شان پیدا ہو گئی ہے کہ وہ بادشاہوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتے۔

نظم بر صـ ۲۸۶

حلِ لُغات اعتبار افزا۔ عزت بڑھانے والی + بلند پاکیزہ یا شریف + ارجمند معنی حقیقی بیشک ازفر۔ بہترین قسم کا مشک + نافۂ آہو یعنی ہرن کی ناف + بہرہ مند یعنی حصہ پانے والے +

تبصرہ: دسمبر ۱۹۱۹ء میں جب علی برادران (مولنا شوکت علی اور مولنا محمد علی) قیدِ فرنگ سے آزاد ہوئے تو امرتسر میں ان کی تشریف آوری کے موقع پر، خلافت کمیٹی کے زیرِ اہتمام ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا جس میں علامہ اقبال مرحوم نے یہ نظم ان کو مخاطب کر کے پڑھی تھی۔

مطلب کہتے ہیں کہ اگر کسی انسان میں ذاتی پاکیزگی اور شرافت کا جوہر موجود ہو تو اسیری سے اسکی عزت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ دیکھ لو! ماہ نیساں (اپریل) میں جب ایک خاص قسم کی بارش ہوتی ہے تو اُس بارش کی بوندوں میں چونکہ ذاتی جوہر موجود ہوتا ہے اس لئے اس کے قطرے جب صدف کی

قید میں چلے جاتے ہیں تو وہاں سے موتی بنکر نکلتے ہیں۔ اسی طرح خطا و ختن کے علاقوں کے ہرنوں کے خون میں چونکہ ذاتی جوہر پوشیدہ ہوتا ہے اس لئے جب وہ خون، ان ہرنوں کی ناف میں مقید ہو جاتا ہے تو بہترین قسم کا مشک بنجاتا ہے لیکن فطرت ہر شے کی اسطرح تربیت نہیں کرتی یعنی ہر شخص جیلخانہ میں جانیسے محترم نہیں بن سکتا دنیا میں بہت کم پرندے ایسے ہیں جنکو گرفتاری سے عزت حاصل ہوتی ہے مثلاً دیکھ لو کوّے اور چیل کو کوئی شخص قید نہیں کرتا یہ سعادت صرف باز اور شاہین کے حصے میں آتی ہے۔

نظم بر صـ ۲۸۶

حلِ لُغات دریوزہ۔ بھیک + بیوفائی بمعنی سرتابی یا نافرمانی + ننگ بمعنی شرم یا عزت، نیز بے شرمی اور بے عزتی + شکستن لغوی معنی ٹوٹنا، مرادی معنی افلاس یا محتاجی + مومیائی ایک مشہور مگر کمیاب دوا ہے جس سے ٹوٹی ہوئی ہڈی جڑ سکتی ہے +

تبصرہ اس نظم کا عنوان ہے "خلافت کی بھیک" اسلئے جب تک مسئلہ خلافت کی مختصر تاریخ نہ لکھی جائے یہ نظم سمجھ میں نہیں آسکتی۔ واضح ہو کہ پہلی جنگ عظیم میں ترکوں کو عربوں کی غداری کی بدولت شکست فاش نصیب ہوئی۔ چنانچہ ۳۰ نومبر ۱۹۱۸ء کو انھوں نے غیر مشروط طریق پر ہتیار ڈالدئے۔ اور مسلمانانِ عالم کے سب سے بڑے دشمن یعنی انگریز کی دلی تمنا پوری ہو گئی۔ چنانچہ انگلستان کے وزیرِ اعظم نے جب جنرل ایلنبی فاتح فلسطین کے سینہ پر تمغہ لگایا تو اس کی فتح کو ہلال پر صلیب کی فتح قرار دیا اور کہا کہ سلطان صلاح الدین کے ہاتھوں جو شکست ہمیں نصیب ہوئی تھی اس کا انتقام اب ہم نے لیا ہے

انگریزوں نے ہندوستانی مسلمان کے ساتھ جو جھوٹے وعدے کئے تھے، ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ خواہ کچھ بھی ہو، ترکی کی سالمیت برقرار رکھی جائیگی،

یعنی اسکے حصّے بخرے نہیں کئے جائیں گے۔ لیکن جب دشمنانِ اسلام کو اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل ہوگئی تو انھوں نے شرافت اور انسانیت ہر چیز کو بالائے طاق رکھکر ترکی کے خاتمہ کا فیصلہ کر دیا اور ۱۹۱۹ء سے اسپر عمل درآمد بھی شروع ہوگیا۔

جب ہندی مسلمانوں نے یہ دیکھا کہ سلطنت ترکی صفحۂ ہستی سے نابود ہونیوالی ہے تو مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ پشاور سے لیکر مدراس تک اور کراچی سے لیکر ڈھاکہ تک سارے ہندوستان میں صفِ ماتم بچھ گئی تھی ضمنی طور پر یہ بھی لکھے دیتا ہوں کہ مسٹر ایم کے گاندھی نے اس موقع پر مسلمانوں کی ذہنیت کا مطالعہ کرنے کے بعد نہایت عیاری اور مکاری سے کام لیکر، اپنے آپ کو "خلافت اسلامیہ" کا ہمدرد ثابت کر دیا اور نہایت آسانی کے ساتھ ہندی مسلمانوں بلکہ بڑے بڑے علماء کے دل و دماغ پر قبضہ کر لیا۔ کسی نے یہ نہ سوچا کہ کجا ایک متعصب بنیا، کجا خلافت اسلامیہ

مسلمانوں نے سارے ملک میں جلسے منعقد کر کے اپنی ناراضگی کا اظہار کیا اور ان میں انگریزوں کو ترکوں کی سابقہ "حماقتوں" کا واسطہ دیا مثلاً

(ا) ۱۷۹۹ء میں سلطنت ترکی نے، سلطان ٹیپو کی امداد کرنے کے بجائے سلطنت برطانیہ کی امداد کی تھی یعنی سلطان شہیدؒ کو بھی غلامی قبول کر لینے کا مشورہ دیا تھا

(ب) ۱۸۵۵ء میں کریمیا (روس) کی جنگ میں ترک۔ اور انگریز دونوں دوش بدوش لڑے تھے

(ج) ۱۸۵۷ء میں ترکوں نے انگریزوں کو اجازت دی تھی کہ وہ ہندوستانی مسلمانوں کا بعث تمام قلع قمع کرنے کے لئے اپنی فوجیں مصر کے راستے سے ہندوستان پہنچا سکتے ہیں۔

ان جلسوں کے بعد دسمبر ۱۹۱۹ء میں امرتسر میں خلافت کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا اور اس میں یہ طے پایا کہ جنوری ۱۹۲۰ء میں انگلستان کو ایک وفد روانہ کیا جائے جو حکومت برطانیہ سے درخواست کرے کہ خلافت کا خاتمہ نہ کیا جائے۔ چنانچہ یہ وفد آٹھ مہینے انگلستان رہکر ۶۵ ہزار روپیہ ضائع کرنے کے بعد بے نیل مرام واپس آیا تھا۔

علامہ اقبال کی نگاہ دوربین نے پہلے ہی محسوس کر لیا تھا کہ حکومتِ برطانیہ جو خود زوالِ خلافت کی سب سے زیادہ آرزومند ہے اور اس تمام فتنہ کی بانی ہے، وہ بھلا کب ارکان وفد کی باتوں پر غور کریگی اسلئے انھوں نے یہ بلیغ نظم سپرد قلم کی کہ

(۱) اے مسلمان! اگر ترکی ختم ہوتی ہے تو بلا سے ہو جائے لیکن تو شریعتِ اسلامیہ سے بیوفائی مت کر یعنی دشمنان ملت کے سامنے دستِ سوال دراز مت کر۔

(۲) کیا تو دنیا کی تاریخ سے آگاہ نہیں ہے کہ حکومت یا سلطنت بھیک کا ٹکڑا نہیں ہے جو کوئی کسی کی جھولی میں ڈالدے حکومت اپنے زورِ بازو سے حاصل ہو سکتی ہے نہ کہ دوسروں کی مہربانی سے۔

(۳) مسلمانوں کے لئے تو وہ حکومت سراسر باعثِ ذلت ہے جو تلوار کے زور سے حاصل نہ کی جائے بلکہ کسی کی مہربانی سے حاصل ہو جائے۔ یقیناً ایسی حکومت غلامی کی دلفریب شکل ہوگی، دگر ہیچ۔ یہ شعر اردو ادب میں ضرب المثل ہو گیا ہے۔

(۴) مجھے اپنے جسم کی کسی ہڈی کے ٹوٹ جانے سے اسقدر صدمہ نہیں پہنچے گا جسقدر اس بات سے کہ میں اسکو جوڑنے کے لئے غیروں کے آگے ہاتھ پھیلاؤں۔ شیخ سعدی کہتے ہیں

حقا کہ با عقوبت دوزخ برابر است ✢ رفتن بپائے مردیٔ ہمسایہ در بہشت

نظم بر صد ۲۸۷

حلِ لغات | سراپا سوز تھی یعنی تجھ میں قوم کی ہمدردی کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا ✢ چنگاری سے شخصیت مراد ہے ✢ انجمن افروز یعنی قوم کی عزت کا باعث تھی ✢ شعلۂ گردوں نورد۔ یہ ممدوح کے دل کی صفت ہے۔ ایسا شعلہ جو آسمان کو اپنی لپیٹ میں لے سکتا تھا۔ مشتِ خاکستر سے جسم مراد ہے ✢ شب کی خاموشی سے مرقد کی خاموشی کی طرف اشارہ ہے ✢ ہنگامۂ فردا، کنایہ ہے روزِ حشر سے ✢

تبصرہ | یہ اثر آفریں اور معنی خیز نظم، اقبال نے اپنے محترم دوست مسٹر جسٹس میاں شاہ دین صاحب مرحوم کی وفات پر لکھی تھی۔ میاں صاحب موجودہ صدی کے ابتدائی دور میں ہندوستان کے نامور مسلمانوں میں سے تھے۔ اور علامہ مرحوم انکی بڑی عزت کرتے تھے

میاں صاحب ۱۸۹۰ء میں ولایت سے بیرسٹری پاس کر کے آئے تھے اور اپنی ذاتی قابلیت کی بدولت جج ہائیکورٹ کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہوئے۔ ۱۹۱۸ء میں وفات پائی علامہ مرحوم نے انکی تاریخ وفات اس شعر سے برآمد کی تھی،

می جست عندلیب خوش آہنگ سال فوت
"علامۂ فصیح" زہر چہار سو شنید

علامۂ فصیح کے عدد ۳۳۴ ہوتے ہیں انکو ۴ سے ضرب دیجائے تو ۱۳۳۶ھ سال وفات بنجاتا ہے میاں صاحب مرحوم ہمایوں تخلص کرتے تھے۔ مرحوم کے نامور فرزند عزت مآب میاں بشیر احمد صاحب سفیر دولت پاکستان متعینۂ جمہوریہ ترکیہ نے ۱۹۲۲ء میں اپنے والد کی یادگار قائم کرنے کے لئے رسالہ ہمایوں جاری کیا تھا جسکا شمار پاکستان کے ممتاز ترین جرائد میں ہوتا ہے میاں بشیر احمد علم دوستی اور خدمت قومی کے اعتبار سے اپنے نامور والد کے صحیح جانشین ہیں۔ انکی عمر بھی قوم کی خدمت ہی میں بسر ہوئی ہے۔

مطلب اے ہمایوں! تو نے اپنی ساری عمر قوم کی خدمت میں بسر کی اور تیری ذات ملتِ اسلامیہ کے لئے باعثِ صد عزّ و افتخار تھی۔

(۲) اگرچہ جسمانی اعتبار سے تو نحیف الجثہ تھا لیکن خدا نے تجھے بہت اعلیٰ درجے کا دماغ عطا کیا تھا

(۳) اور تیرے کمزور جسم میں نہایت طاقتور دل پوشیدہ تھا جو کسی مخالف سے مرعوب نہیں ہوا۔

(۴) عقلمند آدمی موت سے نہیں ڈرتا کیونکہ جسطرح رات کے بعد دن کا آنا یقینی ہے اسی طرح موت کے بعد دوبارہ زندگی بھی یقینی ہے۔

(۵) نادان لوگ، موت کو زندگی کا خاتمہ سمجھتے ہیں لیکن در اصل موت کے بعد ایسی زندگی نصیب ہوگی جسکو کبھی فنا نہ ہوگی۔

نظم بر صد ۲۸۸

حلِ لغات | محو نظر۔ فطرت کا مطالعہ کر رہا تھا ✢ سکوت افزا۔ خاموشی بڑھانیوالا ✢ آسودہ۔ ہوا ساکن تھی ✢ نرم سیر۔ آہستہ چلنے والا ✢ آشیانوں میں اسیر یعنی گھونسلوں میں سو رہے تھے ✢ کم ضو جسکی روشنی بہت کم تھی ✢ خضرؑ۔ ایک بزرگ کا نام ہے جو بھولے بھٹکوں کو راستہ دکھاتے ہیں ✢ جویائے اسرار ازل یعنی وہ شخص جو خدا کے ارادوں یا نظام کائنات سے آگاہ ہونا چاہتا ہو ✢ تقدیر عالم یعنی نظام کائنات کے پوشیدہ قوانین ✢ تمہیدِ جستجو یعنی اسرار کائنات سے آگاہ ہونا چاہتا تھا ✢ دریا سے کائنات مراد ہے ✢ کشتیٔ مسکین و جانِ پاک و دیوارِ یتیم۔ اس مصرع میں تلمیح ہے ان تین واقعات کی طرف جو قرآن حکیم میں مذکور ہیں۔ کشتیٔ مسکین سے ان غریب ملاحوں کی کشتی مراد ہے جسمیں خضرؑ نے سوراخ کر دیا تھا۔ جانِ پاک سے وہ لڑکا مراد ہے جسے خضرؑ نے قتل کر دیا تھا۔ اور دیوارِ یتیم سے ایک گاؤں کے یتیموں کی وہ دیوار مراد ہے جو گرنے والی تھی، خضرؑ نے اسکو درست کر دیا تھا۔

(ان واقعات کی تفصیل کے لئے دیکھو سورۂ کہف آیات ۶۴ تا ۸۲)

حیرت فروش۔ یعنی حضرت موسیٰؑ پر بھی تیرے علم کی وسعت دیکھکر حیرت طاری ہوگئی تھی ✢ اقوام نَو دولت سے وہ اقوام مراد ہیں جو موجودہ زمانے میں بر سرِ عروج آئی ہیں مثلاً امریکہ، روس، انگلستان وغیرہ۔ پیرایہ پوش یعنی پیرو یا مقلد ✢ فطرتِ اسکندری سے ملوکیت مراد ہے ✢ گرم۔ ناؤ نوش سے ترقی اور فروغ مراد ہے ✢ ہاشمی سے عربوں کی قوم مراد ہے، علی الخصوص شریف مکہ جس نے ۱۹۱۶ء میں ترکوں سے غداری کر کے انگریزوں سے دوستی کی تھی یعنی اس غدار نے جسکا نام حسین

تھا، اسلام کی عزت کفار کے ہاتھوں نہایت ارزاں قیمت پر فروخت کردی • آگ
سے ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کی طرف اشارہ ہے • اولادِ ابراہیم سے مسلمانوں کی حکومتیں
مراد ہیں • مزودے یورپین اقوام مراد ہیں • تگاپوئے دمادم - ہر وقت مصروف عمل رہنا •
رہین خانہ سے کاہل اور آرام طلب انسان مراد ہے یعنی مسلمان • بانگِ رحیل روانگی
کے گھنٹے کی آواز • سیماب پا - تیز رفتار • جس سے روشن تر ہوئی الخ اس مصرع میں
تلمیح ہے آیات قرآنی کی طرف جن کا مطلب یہ ہے کہ جب شام ہوئی اور اختر شام
طلوع ہوا تو حضرت ابراہیمؑ نے کہا کہ شاید یہ میرا رب ہے۱ کیونکہ بہت
چمکدار ہے پھر جب وہ غروب ہوگیا اور چاند کو دیکھا تو کہا شاید یہ میرا رب ہے
کیونکہ یہ روشن تر ہے پھر جب وہ غروب ہوگیا اور دوسرے دن سورج کو دیکھا
تو کہا شاید یہ میرا رب ہے کیونکہ یہ سب سے بڑا ہے لیکن جب وہ غروب ہوگیا تو کہا
میں غروب ہونیوالوں سے محبت نہیں کرسکتا بلکہ میں تو اس اللہ کو اپنا رب تسلیم
کرتا ہوں جو غروب نہیں ہوتا • زنجیری یعنی قیدی • گردش پیہم سے مسلسل جد و جہد
مراد ہے • تسلیم جاں سے ایثار، قربانی، سرفروشی اور جاں نثاری مراد ہے • سرِ آدم یعنی آدم کی
حقیقت • ضمیرِ کن فکاں - کن فکاں سے اشارہ ہے قولِ خداوندی کیطرف کہ خدا جب کسی
شی کو پیدا کرنا چاہتا ہے اسوقت کہتا ہے "کُن" یعنی ہو جا "فیکون" پس وہ ہو جاتی ہے •
ضمیرِ کن فکاں سے رازِ آفرینش مراد ہے • کُن امر کا صیغہ ہے کانَ فعلِ ناقص ہے معنی ہے
یا تھا یا ہوگیا • کوہکن - فرہاد کا لقب ہے جو شیریں ملکہ ایران پر عاشق ہوگیا تھا • جوئے شیر و
تیشہ و سنگِ گراں سے کوہکن کی زندگی کی طرف اشارہ ہے۔ اسکی تفصیل یہ ہے کہ بادشاہ نے
اپنا پیچھا چھڑانے کے لئے میاں فرہاد سے یہ کہا کہ اگر تم کوہ بیستون کاٹکر وہ نہر جو اسطرف
بہہ رہی ہے اسطرف میرے محل تک لے آؤ تو میں اپنی ملکہ تمہارے حوالے کردونگا۔ فرہاد اپنے
تیشے سے پہاڑ کاٹکر جوئے شیر، محل کی طرف لے آیا۔ اردو میں جوئے شیر لانے کا مطلب

۱ سورۂ انعام آیات ۷۶ تا ۷۸

ہے کسی بڑے دشوار کام کو انجام دینا - ع صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا۔
بندگی یعنی غلامی • جوئے کم آب - وہ نہر جسمیں بہت تھوڑا پانی ہو • بحرِ بیکراں - نہایت
وسیع سمندر، جسکا کنارا نظر نہ آئے • قوتِ تسخیرِ اشیائے کائنات کو مغلوب کرنے قوت
قلزم سمندر • زیاں خانہ سے یہ دنیا مراد ہے • خام سے سیرت کی خامیاں مراد ہیں •
پختہ سے سیرت کی تکمیل مراد ہے • شمشیرِ بے زنہار سے وہ تلوار مراد ہے جو کسی شے کے
کاٹنے میں تامل نکرے یعنی ہر چیز کو کاٹکر رکھدے۔ زنہار یعنی پناہ یا امان • صداقت
سے اسلام مراد ہے • مستعار مانگی ہوئی چیز • شرر چنگاری - کنایہ ہے خودی سے • فروغِ
جاوداں - شانِ دوام، یا ہمیشگی کی صفت • خاکِ مشرق سے ایشیائی ممالک مراد
ہیں • بدخشاں خراسان کے قریب ایک خطہ ہے جہاں کے لعل مشہور ہیں ع

لعل قیمت کو پہنچتا ہے بدخشاں چھوڑ کر

یہاں بدخشاں سے ملتِ اسلامیہ مراد ہے • لعلِ گراں یعنی بیش قیمت لعل مراد ہے مسلمان
نالۂ شبگیر سے مراد ہے پچھلی رات کو اٹھکر خدا کی عبادت کرنا اور اسکی جناب میں آہ و
زاری کرنا • رازداں پیدا کرے یعنی عالم ملکوت سے رابطہ پیدا کرے • رمزِ آیۂ اِنَّ
الملوک تلمیح ہے اس آیہ شریف کی طرف "اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا
اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ" (۲۷ : ۳۴) یعنی دنیا کے بادشاہوں کا یہ دستور ہے
کہ جب وہ کسی گانو! یا بستی (ملک) میں داخل ہوتے ہیں (فتح کرتے ہیں) تو اسکو خراب
(برباد) کردیتے ہیں۔ اور اسکے معزز لوگوں کو ذلیل و خوار کردیتے ہیں۔ اور یہ بادشاہ لوگ
(ملوکیت کے زعم میں) ہمیشہ ایسا ہی کیا کرتے ہیں • بیدار ہوتا ہے یعنی اگر اپنی آزادی کیلئے کوشش
کرتا ہے • جادوئے محمود سے نظامِ ملوکیت مراد ہے • چشمِ ایاز سے غلاموں کی آنکھ مراد ہے
حلقۂ گردن سے غلامی کی لعنت مراد ہے • سازِ دلبری سے عزت کا نشان مراد ہے • خونِ
اسرائیل سے غلام قومیں مراد ہیں • موسیٰ سے حریت کا علمبردار مراد ہے • طلسمِ سامری

سے غلامی کی زنجیر مراد ہے • وہی ساز کہن - وہی مطلق العنانی، وہی شخصی حکومت • دیو
استبداد یعنی ظلم و ستم • پائے کوب - ناچنے والا • نیلم پری - اندر سبھا میں ایک حسین پری
کا نام تھا جو راجہ اندر کی محبوبہ تھی اور اسکے پروں میں نیلم اور دوسرے جواہرات لگے
ہوئے تھے • مجلس آئین یعنی لیجسلیٹو اسمبلی • اصلاح سے وہ REFORMS یا اختیارات
مراد ہیں جو انگریزوں نے ۱۹۰۹ء اور ۱۹۱۹ء میں ہندیوں کو عطا کئے تھے • رعایات سے
وہ رعایات مراد ہیں جو اقلیت کو دیجاتی ہیں مثلاً ایک فرقہ کو اسکی آبادی کے تناسب
سے کچھ زیادہ حصہ دینا • حقوق سے امتیازی سلوک مراد ہے مثلاً قبل تقسیم ہندوستان
میں ایک سفید رنگ کے مجرم کو کالے رنگ کا سپاہی گرفتار نہیں کرسکتا تھا • گرمیِ
گفتار سے زور دار تقریریں مراد ہیں • اعضائے مجالس - اسمبلی کے ارکان • سرمایہ دار
یہ بھی جدید سیاسی اصطلاح ہے۔ اس کے معنی محض دولتمند کے نہیں ہیں
کیونکہ دولتمندی تو کوئی جرم نہیں ہے۔ اقبال نے اگر سرمایہ داری کی مذمت
کی ہے تو اس کے سیاسی مفہوم کو مدِ نظر رکھکر کی ہے (جسطرح وطنیت کا سیاسی مفہوم
مذموم ہے) سیاسی اصطلاح میں سرمایہ دار وہ شخص ہے جو
(۱) دولت جمع کرنے کو مقصدِ حیات سمجھتا ہے۔ (۲) اسکے حصول کے لئے
ہر طریقہ کو جائز سمجھتا ہے خواہ وہ طریقہ اخلاق اور مذہب کی رو سے ناجائز ہی کیوں ہو
(۳) رات دن اپنی دولت میں اضافہ کرتا ہے یا کرنیکا آرزومند رہتا ہے۔
(۴) چونکہ وہ دولت کو مقصودِ حیات سمجھتا ہے اسلئے کسی کاشتکار یا مزدور کے ساتھ
ہمدردی کرنا اسکے مذہب میں سب سے بڑا جرم ہے - وہ اللہ کی مخلوق کا
رات دن خون چوستا رہتا ہے۔ لیکن اسکی تسکین نہیں ہوتی وہ یہ چاہتا ہے کہ
مزدور رات دن میرے کارخانہ میں کام کرتا رہے لیکن کم از کم اجرت پائے اور راحت
کا خیال بھی دل میں نہ لائے۔ کیونکہ دنیا کی راحت تو صرف سرمایہ دار کیلئے مخصوص ہے

(۵) وہ اپنی دولت کو اللہ کے لئے (اللہ یا مذہب کا سرمایہ دار کے یہاں گذر نہیں
ہوسکتا) یا قوم کے لئے (سرمایہ دار کی نگاہ میں قوم کا وجود ہی نہیں ہوتا) خرچ نہیں
کرتا۔ سرمایہ دار کسی غریب کو، انسان ہی نہیں سمجھتا۔ بلکہ وہ اس دولت کو اپنے اقتدار
کو قایم کرنے کے لئے یا اس میں اضافہ کے لئے استعمال کرتا ہے۔ اسکے محل کے برابر
ایک فاقہ کش مزدور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرجائے لیکن اس کو اس بیکس کی وفات
کے مقابلہ میں اپنے شکاری کتے کے مرجانیکا زیادہ افسوس ہوتا ہے۔
چونکہ سرمایہ داری، ملوکیت کے بعد دنیا میں سب سے بڑی لعنت ہے
اسی لئے اسلام نے ان دونوں کی صاف لفظوں میں مذمت کی ہے۔ اور
اسی لئے اقبال چونکہ وہ قرآن حکیم کے علمبردار ہیں، سرمایہ داری کے خلاف ہیں •
جنگِ زرگری - دکھاوے کی لڑائی یعنی تصنع یا دوسروں کو دھوکہ دینا • سرابِ
رنگ و بو سے جمہوری نظام مراد ہے • سرمایہ دار حیلہ گر - مکر و فریب، مذہبِ
سرمایہ داری کا پہلا سبق یا اسکی بنیادی تعلیم ہے • شاخِ آہو الخ اقبال نے اس
مصرع میں مشہور فارسی ضرب المثل کا ترجمہ کردیا ہے۔ فارسی میں یوں کہتے
ہیں "براتِ عاشقاں بر شاخِ آہو" چنانچہ استاد ذوق نے اس محاورے کو یوں باندھا ہے

سوالِ وصل کو ٹالا جواب چینِ ابرو سے
براتِ عاشقاں بر شاخِ آہو اسکو کہتے ہیں

اسکا مطلب ہے کسی سے جھوٹے وعدے کرنا، حیلے بہانے کرنا، ٹال مٹول کرنا یا
بہکانا • دستِ دولت آفریں سے مزدور مراد ہے جو دولت پیدا کرتا ہے • مزد یعنی
مزدوری • ساحرِ الموط نے الخ یہ بہت بلیغ مصرع ہے۔ ساحر یعنی جادوگر لیکن اس
سے مراد ہے حسن صباح • الموط اس مستحکم قلعہ کا نام ہے جسکو مشہور دشمنِ اسلام
حسن صباح نے جو فرقۂ باطنیہ کا سب سے بڑا مبلغ گذرا ہے، اپنی ملت کش

سرگرمیوں کا مرکز بنایا تھا۔ یہ قلعہ کوہ البرز کی ایک چوٹی پر جو دس ہزار فٹ بلند تھی، واقع تھا۔ اسکے لغوی معنی ہیں آشیانۂ عقاب + حسن صباح دراصل اللہ کا عذاب تھا، جو اُسی طرح سلطنت عباسیہ پر مسلط ہوا، جسطرح "بندہ بیراگی" سلطنت مغلیہ پر۔ یہ شخص طوس کا باشندہ تھا۔ اسنے جوانی میں باطنی مذہب اختیار کیا اور ساری عمر اسکی تبلیغ میں بسر کردی۔ ۱۰۹۰ء میں اپنی قابلیت کی بدولت قلعہ الموط پر قابض ہوگیا اور جسطرح بندہ بیراگی نے فرخ سیر کے زمانہ میں پنجاب کے مسلمانوں کا قتل عام کیا تھا اسی طرح اسنے ایران اور عراق کے مسلمانوں کو قتل کرنیکا سلسلہ شروع کیا۔ افسوس کہ میں اس مختصر شرح میں نہ اسکی لائیف لکھ سکتا ہوں نہ اس کے مذہب کا حال بیان کرسکتا ہوں۔ لیکن لفظ باطنی کی تشریح لازمی ہے۔ واضح ہو کہ شیعوں کے ایک اہم فرقہ موسومہ اسمٰعیلیہ کا دوسرا نام باطنیہ بھی ہے۔ اسکی ابتدا، اس طرح ہوئی کہ شیعوں کے چھٹے امام جناب جعفر صادق کے دو بیٹے تھے۔ اسمٰعیل اور موسیٰ کاظم جو شیعہ یہ مانتے ہیں کہ جناب جعفر صادق کے بعد اُنکے صحیح جانشین موسیٰ کاظم ہوئے وہ تو اثنا عشری شیعہ کہلاتے ہیں۔ یعنی بارہ اماموں کے پیرو۔ اور یہی عام طور سے ایران اور پاکستان میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن بعض شیعوں نے یہ کہا کہ اسمٰعیل ہی صحیح جانشین ہے وہ اسمٰعیلی مشہور ہوگئے ان اسمٰعیلیوں نے اپنے مذہب کو مخفی طریقوں سے پھیلایا اور لوگوں سے یہ کہا قرآن کے دو معنی ہیں ایک ظاہری دوسرے باطنی چونکہ یہ قرآن کے ہر لفظ سے باطنی معنی نکالتے تھے اس لئے رفتہ رفتہ انکو باطنی کہنے لگے میری رائے میں ساری دنیائے اسلام کو اسقدر نقصان نہیں پہونچایا جسقدر صرف اس مٹھی بھر جماعت نے۔ لیکن میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں کہ عذاب الٰہی فرقۂ باطنیہ کی شکل میں متشکل ہوگیا تھا جسطرح ہندی مسلمانوں پر فرقہ سکھ کی شکل میں نازل ہوا۔ برگِ حشیش۔ بھنگ کا پتہ۔ اسکی تشریح یہ ہے کہ حسن صباح نے قلعہ الموط میں ایک

جنت ارضی بنائی تھی اسمیں چارجیہ اور سرکاشیہ (کوہ قاف) کی حسین عورتیں جمع کی تھیں۔ اہل علم جانتے ہیں کہ اس خطہ کی عورتیں اتنی حسین ہوتی ہیں کہ پہلے زمانہ میں انکو کوہ قاف کی "پریاں" کہا کرتے تھے۔ حسن صباح چونکہ مردم شناس تھا اسلئے حسن پرست نوجوانوں کو بھنگ پلاکر عالم بیہوشی میں، اس جنت میں بھیج دیتا تھا وہاں وہ نوجوان چند روز زندگی کا لطف اٹھاتے تھے۔ اسکے بعد ہر نوجوان کی محبوبہ اپنے دست نازک سے جام شراب پلاتی تھی جسمیں بھنگ شامل ہوتی تھی اور جب وہ بیہوش ہوجاتے تھے تو اس دنیا میں واپس آجاتے تھے۔ ان کی واپسی کے بعد مذہب حقۂ باطنیہ کا داعیٔ کبیر حسن صباح اُنسے کہتا تھا کہ اگر تم دوبارہ اپنی محبوبہ کے پاس جانا چاہتے ہو تو فلاں بادشاہ یا فلاں وزیر یا فلاں مسلمان عالم دین کو قتل کردو۔ چنانچہ یہ لوگ اپنے "مرشد" کے حکم کی تعمیل کرتے تھے اور فدائی کا لقب حاصل کرنے کے بعد دوبارہ اپنی محبوبہ سے شرف ملاقات حاصل کرتے تھے اور "حسن صباح زندہ باد" کا نعرہ بلند کرتے تھے۔ شاخِ نبات۔ مصری کی ڈلی + خواجہ حافظ نے اس اصطلاح کو کمالِ فن شاعری یا ملکۂ شاعری یا قلم کے معنی میں استعمال کیا ہے + خواجگی سے ملوکیت مراد ہے + مسکرات۔ نشہ آور چیزیں۔ واضح ہو کہ نسل، قومیت، نظام کلیسائی، سلطنت، تہذیب مغرب اور رنگ یہ سب باتیں نظام ملوکیت کی تائید کرتی ہیں اسی لئے اسلام نے ان سب کی نفی کردی ہے۔ واضح ہو کہ ان اصولوں سے وحدت ملی یا وحدت آدم، جو مقصود اسلام ہے، فنا ہوجاتی ہے اسی لئے اسلام نے ان تمام امتیازات کو مٹادیا + شکر۔ نشہ یا سرور + سادگی۔ بیوقوفی، نادانی + غنچہ ساں۔ کلی کی طرح + شبنم سے قلیل سرمایہ مراد ہے + اسکندر وجم سے ملوکیت مراد ہے + آفتاب تازہ سے اشتراکیت مراد ہے یا وہ نئے سیاسی تصورات جو یورپ میں پیدا ہورہے ہیں + ڈوبے ہوئے تاروں سے ملوکانہ

جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ یا شخصی نظام حکومت مراد ہے + کرمک ناداں سے مسلمان اقوام مراد ہیں + طوافِ شمع سے ملوک پرستی مراد ہے۔ اسلام شخصی حکومت کا جو باپ سے بیٹے کو ورثہ میں ملے، قائل نہیں ہے + تثلیث کے فرزندوں سے انگریز مراد ہیں اور میراثِ خلیل سے عربی ممالک مصر، حجاز، فلسطین، شام اور عراق مراد ہیں + کلاہ لالہ رنگ سے ایران مراد ہے۔ اسمٰعیل صفوی شاہ ایران نے سرخ ٹوپی اپنی فوج کے سپاہیوں کی وردی میں شامل کی تھی (قزل بمعنی سرخ اوباش بمعنی سر) + [illegible] سے غیر اسلامی تصورات مراد ہیں + مینا گداز ایسی شراب جو اپنی گرمی سے بوتل کو پگھلا دے + گاز یعنی قینچی + ربط و ضبط ملت بیضا سے تمام اسلامی ممالک کا اتحاد مراد ہے، جسے آجکل "مسلم ورلڈ بلاک" کہتے ہیں + حفظ حرم سے حفاظت و اشاعتِ اسلام مراد ہے + نیل مصر کا مشہور دریا ہے + کاشغر چینی ترکستان کا مشہور شہر ہے، اب یہ علاقہ روس کے قبضہ میں ہے + خرگاہ شاہی خیمہ + والاگہر عالی خاندان + اسلاف کا قلب و جگر، بزرگوں کی سیرت + آئینہ گفتار سے شاعر نے اپنی نظمیں مراد لی ہیں + آزمودہ فتنہ سے انقلاب مراد ہے + إِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ۔ بیشک اللہ اپنے وعدہ کا خلاف نہیں کرتا (۳ : ۸)

تبصرہ یہ بانگِ درا کی پانچ بہترین نظموں میں سے ہے جنکا ذکر قبل ازیں ہوچکا ہے اس نظم کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس سے اقبال کی انقلابی شاعری کا آغاز ہوتا ہے اور وہ پہلی مرتبہ اُس فاقہ کش اور بیکس طبقہ کے ہمدرد بنکر سامنے آتے ہیں جسے دنیا والے مزدور کے نام سے پکارتے ہیں اور بہت ذلیل سمجھتے ہیں، حالانکہ جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور نوابوں کے شکاری کتے بلکہ وہ خود اسی مزدور کے پسینے کی بدولت عیش کرتے ہیں، اسکا پسینہ آقائے کائنات صلعم کی نگاہوں میں اس قدر قیمتی ہے کہ آنحضرت صلعم نے ارشاد فرمایا ہے کہ مزدور کی مزدوری

اسکا پسینہ خشک ہوجانے سے پہلے ادا کردو "نیز" الکاسب حبیب اللہ (یعنی مزدور اللہ کا محبوب ہے) فرماکر اسکا مرتبہ نوابوں سے بھی بالاتر کردیا۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ اسلام نوابوں کا تو مذکور ہی کیا ہے، بادشاہوں کے وجود کو بھی تسلیم نہیں کرتا۔ اسلام دنیا کا پہلا اور آخری دین ہے جسنے بانگِ دہل اس صداقت کا اعلان کیا کہ "لاملوکیت فی الاسلام" یعنی اسلام ملوکیت کو تسلیم نہیں کرتا۔

اقبال نے یہ نظم ۱۹۲۱ء میں لکھی تھی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب مسلمانوں پر پیہم دس بارہ سال سے آفاتِ ارضی و سماوی کا نزول ہورہا تھا۔ انکا دل تو پہلے ہی سے مسلمانوں کی زبوں حالی پر خون کے آنسو رو رہا تھا ۱۹۱۹ء میں جب قسطنطنیہ سے خلیفہ اور خلافت دونوں کا خاتمہ ہوگیا تو اقبال کے دل پر کوہ غم ٹوٹ پڑا چنانچہ خضرِ راہ کا یہ شعر ان کے جذبات قلبی کا آئینہ دار ہے:

بیچتا ہے ہاشمی ناموس دین مصطفیٰ
خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش

ترکوں پر کیا منحصر ہے کہ ۱۹۱۹ء میں سلطنت ہی پارہ پارہ ہوگئی۔ ہندوستان سے لیکر مراقش تک تمام دنیائے اسلام پر نکبت اور ادبار کی گھٹائیں چھا رہی تھیں، مثلاً عربوں نے انگریزوں کے دام فریب میں آکر ترکوں سے عین وقت پر غداری کی لیکن ترکانِ جفا پیشہ کے پھندے سے نکلکر انگریزوں کے چنگل میں گرفتار ہوگئے۔ بیت المقدس پر صلیبی پرچم لہرانے لگا۔ دمشق اور بغداد پر اغیار کا قبضہ ہوگیا اور حجاز کا حکمراں، برطانیہ کا وظیفہ خوار بنگیا۔ ناظرین ان باتوں کو مدِ نظر رکھکر اس نظم کا مطالعہ کریں تاکہ اسکے مطالب سے بہرہ اندوز ہوسکیں۔ اقبال نے یہ نظم انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسہ منعقدہ ۱۹۲۲ء میں پڑھکر سنائی تھی اور سننے والوں کا بیان ہے کہ جب وہ اس نظم کو پڑھ رہے تھے تو فرطِ جذبات سے انکی طبیعت بالکل بے قابو تھی وہ اکثر پڑھتے پڑھتے رک جاتے تھے کیونکہ گریۂ پیہم ہر شعر کے بعد گلوگیر ہوجاتا تھا۔ آنکھوں سے،

آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ جب انھوں نے یہ شعر پڑھا ؎

آگ ہے، اولادِ ابراہیم ہے، نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

تو بیس ہزار کا مجمع بے اختیار رو رہا تھا۔ اور خود اقبال کا تو یہ حال تھا کہ روتے روتے ہچکی بندھ گئی تھی اور اقبال کے دوستوں کا بیان ہے کہ اس سے زیادہ رقت انپر کسی نظم کے پڑھتے وقت طاری نہیں ہوئی بلاشبہ ساری نظم سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی ہے۔

اس نظم میں گیارہ بند ہیں پہلے ہر بند کا خلاصہ لکھتا ہوں پھر مطلب بیان کرونگا

(۱) پہلے بند میں شاعر کی خضر سے ملاقات ہوتی ہے جو اس سے یہ کہتا ہے کہ

چشمِ دل وا ہو تو ہے تقدیرِ عالم بے حجاب

(۲) یہ سنکر شاعر اس سے حسب ذیل سوالات کرتا ہے۔ (ا) تو صحرا نوردی کیوں کرتا ہے؟ (ب) زندگی کی حقیقت کیا ہے (ج) سلطنت (ملوکیت) کیا چیز ہے؟ (د) سرمایہ اور محنت میں یہ کیسی آویزش ہو رہی ہے؟ (ہ) دنیائے اسلام پر مصائب کا نزول کیوں ہو رہا ہے؟ ع کیا کسی کو پھر کسی کا امتحان مقصود ہے۔

(۳) تیسرے بند میں خضر پہلے سوال کا جواب دیتا ہے ع ہے یہی اے بیخبر راز دوامِ زندگی (۴) چوتھے بند میں زندگی کی حقیقت واضح کرتا ہے (۵) پانچویں بند میں خضر جوہرِ زندگی پیدا کرنے اور صفتِ دوام حاصل کرنیکی ترکیب بتاتا ہے (۶) چھٹے بند میں خضر تیسرے سوال کا جواب دیتا ہے یعنی ملوکیت کے مفاسد بیان کرتا ہے (۷) ساتویں بند میں خضر نے چوتھے سوال کا جواب دیا ہے یعنی سرمایہ داری کی مذمت کی ہے (۸) آٹھویں بند میں خضر نے مزدور کو انقلاب برپا کرنے کی تلقین کی ہے (۹) نویں بند میں خضر نے پانچویں سوال کا جواب دیا ہے اور مغربی وطنیت کی خرابیاں بیان کی ہیں (۱۰) دسویں بند میں خضر نے مسلمانوں کو ترقی اور کامیابی کا گر بتایا ہے (۱۱) گیارھویں بند میں خضر نے شاعر کو تسلی دی ہے یعنی یہ پیش گوئی کی ہے کہ انجام کار ملوکیت اور سرمایہ داری دونوں عنقریب دنیا سے ختم

ہو جائینگی اور اسلام نے حریت، اخوت اور مساوات کا جو خواب دیکھا تھا عنقریب دنیا اسکی تعبیر دیکھ لیگی۔

پہلا بند رات کے وقت میں عالمِ اضطراب میں دریا کے کنارے ٹہل رہا تھا (۲) اس وقت ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ہوا بھی ساکن تھی اور دریا بھی ساکن تھا (۳) موجیں اس طرح سو رہی تھیں جیسے گہوارے میں کوئی بچہ سو رہا ہو (۴) پرندے اپنے آشیانوں میں بسیرا کر رہے تھے اور چاندنی کی روشنی میں ستارے ٹمٹما رہے تھے (۵) یکایک میری ملاقات خضر سے ہو گئی جو بڑھاپے میں بھی جوانوں سے زیادہ چاق و چوبند نظر آتے تھے۔ (۶) مجھے دیکھکر وہ کہنے لگے کہ میں جانتا ہوں کہ تو اس دنیا کے نظام سے آگاہی حاصل کرنیکے لئے بیتاب ہے اگر تو غور و فکر سے کام لے تو اسرارِ کائنات سے واقف ہو سکتا ہے (۷) یہ بات سنکر میرے دل میں حقائقِ کائنات معلوم کرنے کا زبردست جذبہ پیدا ہو گیا اور میں نے خضر سے یہ کہا۔

دوسرا بند تو دانائے رموزِ کائنات ہے۔ بلکہ ان باتوں سے بھی واقف ہے جو ابھی ظہور میں نہیں آئی ہیں (۲) تیرا علم اسقدر وسیع ہے کہ حضرت موسیٰؑ بھی اس باب میں تیری برابری نہیں کر سکتے۔ چنانچہ وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ تو نے ملاحوں کی کشتی میں سوراخ کیوں کر دیا؟ اور ایک بیگناہ بچے کو کیوں قتل کر دیا؟ اور یتیموں کی شکستہ دیوار بغیر اجرت کے کیوں بنا دی (۳) تو ہمیشہ صحرا نوردی میں کیوں مصروف رہتا ہے؟ تیرے اوپر زمانہ کا کوئی اثر کیوں مرتب نہیں ہوتا (۴) زندگی کی حقیقت کیا ہے ملوکیت کیا چیز ہے؟ اور سرمایہ اور محنت میں یہ جنگ کیوں ہو رہی ہے (۵) ایشیائی ملکوں پر یہ آفات کیوں نازل ہو رہی ہیں اور ہماری قوم کے نوجوان، اقوامِ مغرب کی تقلید کیوں کر رہے ہیں؟ (۶) یہ کیا بات ہے کہ اگرچہ بادشاہ آئے دن مرتے رہتے ہیں لیکن بادشاہت ہنوز زندہ ہے؟ (۷) عرب قومیں اسلام کی عزت کا فرنگی کے ہاتھ سودا کر رہی ہیں۔ اپنوں کے بجائے غیروں سے دوستی کر رہی ہیں اور ترکوں پر پیہم مصائب نازل ہو رہے ہیں (۸) اسوقت عالمِ اسلام کی یہ حالت ہے کہ مسلمان چاروں طرف سے آفات میں محصور ہیں۔ تباہی ان کے سروں پر منڈلا رہی ہے کیا خدا انکو پھر مسلمانوں کا امتحان لینا چاہتا ہے؟

تیسرا بند یہ سنکر خضر نے جواب دیا کہ (۱) تجھکو میری صحرا نوردی پر تعجب کیوں ہے؟ یہ مسلسل جد و جہد ہی تو زندگی کی دلیل ہے۔ اسی کی بدولت زندگی کا مفہوم انسان پر عیاں ہو سکتا ہے۔ اس کائنات کی بنیاد ہی حرکت اور عمل پر ہے۔

(۲) کیا تو نے نہیں دیکھا کہ قافلے رات دن مصروفِ سفر رہتے ہیں اگر وہ تیری طرح پاؤں توڑ کر گھر میں بیٹھ رہیں تو کبھی منزلِ مقصود تک نہیں پہونچ سکتے۔

(۳) ہرنوں کی زندگی پر نظر کر۔ کیا وہ ہر وقت سفر میں نہیں رہتے! غور کر! اگر وہ کہیں قیام بھی کرتے ہیں (حضر) تو کوئی ساز و سامان اپنے ساتھ نہیں رکھتے۔ اور جب سفر کرتے ہیں تو میلوں نکل جاتے ہیں۔

(۴) ستاروں کو دیکھ! وہ ہر وقت گردش کرتے رہتے ہیں، طلوعِ آفتاب سے پہلے انکو دیکھو تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جبرئیل کی پیشانی چمک رہی ہے۔

(۵) آفتاب کو دیکھو! ہر وقت مصروفِ سفر رہتا ہے۔ صبح کو طلوع ہوتا ہے تو شام کو غروب ہوتا ہے۔ اسی طلوع و غروب کا نظارہ دیکھ کر حضرت ابراہیمؑ نے اللہ کی معرفت حاصل کی تھی۔

(۶) کارواں کی حرکت پر غور کر! دن بھر چلتا ہے شام کو کسی چشمے پر پہونچ کر سب مسافر اس طرح اس چشمہ کے گرد جمع ہو جاتے ہیں جیسے جنتی لوگ سلسبیل کے گرد۔

(۷) خلاصۂ کلام یہ ہے کہ حرکت اور سفر (صحرا نوردی) سے زندگی کی پوشیدہ طاقتیں بروئے کار آتی ہیں، ہر وہ شخص جس کے سر میں سودا ہے۔ ہر وقت نئے مقامات تلاش کرتا رہتا ہے۔ لیکن جو لوگ آبادیوں میں بے مقصد (سودائے محبت کے بغیر) زندگی بسر کرتے ہیں وہ راحت کے طالب ہو جاتے ہیں اور یہ راحت پسندی ان کے حق میں پیامِ موت بنجاتی ہے۔

انسان تو اسی وقت تک زندہ رہتا ہے جب تک اسکے دل میں تڑپ ہو اور وہ تڑپ اسے صحرا نوردی (جستجو) پر مجبور کرتی رہے۔

(۸) یہی طلب اور جستجو اسے صفتِ دوام عطا کر دیتی ہے اور وہ موت کا شکار ہو جانے کے بجائے موت کو شکار کر لیتا ہے۔ یعنی زندہ جاوید ہو جاتا ہے۔ زندگی اگر دشِ پیہم ہی سے مستحکم ہوتی ہے۔

چوتھا بند اے اقبال! اس جگہ شاید تجھے یہ وسوسہ لاحق ہو کہ موت تو ہر وقت انسانوں کو فنا کرتی رہتی ہے تو زندگی کو صفتِ دوام کیسے اور کیونکر حاصل ہو سکتی ہے۔

(۱) زندگی مرنے اور جینے کے تصور سے بالاتر حقیقت ہے۔ زندگی دنیا میں محض زندہ رہنے یا نفس شماری کا نام نہیں ہے۔ بہت سے لوگ ہیں کہ زندہ ہیں لیکن در حقیقت مردہ ہیں (جیسے عثمان علی خاں آف حیدر آباد) اور بہت سے لوگ ہیں کہ مر گئے ہیں لیکن زندوں سے بڑھ کر ہیں (جیسے سلطان ٹیپو شہید رح) زندگی کبھی جینے کا نام ہے اور کبھی جان دینے کا نام ہے۔

(۲) تو زندگی کو دنوں اور مہینوں یا برسوں کے پیمانہ سے مت ناپ۔ زندگی روز و شب سے بالاتر ہے۔ وہ ایک دائمی حقیقت ہے پیہم حرکت کا نام ہے اور ہر دم جواں ہے زمانہ اس کو فنا نہیں کر سکتا۔

(۳) اگر تو ہمیشہ زندہ رہنے کا آرزومند ہے تو اپنی دنیا آپ پیدا کر یعنی عملِ صالح کی بدولت حیاتِ جاوید حاصل کر لے۔ زندگی سرِّ آدم ہے اور رازِ "کن فکاں" ہے یعنی زندگی کی اصل حقیقت ایک جوش اور ولولہ ہے جس کی بدولت وہ ظہور کے لئے بیتاب رہتی ہے۔ زندہ وہ ہے جو خدا کی طرح "کن" کہہ کر نئی دنیا پیدا کر سکے۔

(۴) زندگی کی حقیقت کوہکن کی زندگی کا مطالعہ کرنے سے عیاں ہو سکتی ہے اس نے جد و جہد کی بدولت ناممکن کو ممکن کر دکھایا یعنی پرویز کے سامنے

اپنی جد وجہد سے ایک نئی دنیا پیدا کردی۔ اگر تیرے اندر کوہکن کی طرح عمل کا جذبہ پیدا ہو جائے تو پھر تو بھی زندۂ جاوید ہو جائیگا۔

(۵) زندگی کی کیفیت یہ ہے کہ وہ غلامی میں فنا ہو جاتی ہے، لیکن جو شخص آزاد ہے، اسکی زندگی، بحر بیکراں ہوتی ہے، یعنی اسکی ترقی کی کوئی حد مقرر نہیں کی جاسکتی کیونکہ خدا نے انسان میں ترقی کی لامحدود استعداد ودیعت فرمادی ہے۔ غلامی اور زندگی ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ یہ دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔

(۶) اگرچہ زندگی (خودی) جسم میں پوشیدہ ہے، لیکن وہ کائنات کو مسخر کرنیکی طاقت رکھتی ہے۔ اور اسی عمل تسخیر سے وہ اپنے آپ کو عیاں کرسکتی ہے۔

(۷) تجھکو خدا نے اسی لئے پیدا کیا ہے کہ تو شریعت اسلامیہ کی اتباع کاملہ کی بدولت اپنی مخفی قوتوں کو بروئے کار لائے اور کائنات کو مسخر کر کے امتحان میں کامیابی حاصل کرے۔ یہ دنیا دار العمل (امتحان گاہ) ہے۔ جو شخص اپنی خودی کی صلاحیتوں کو بروئے کار نہیں لاتا وہ یقیناً فنا ہو جائیگا۔

(۸) جبتک تو اپنی خودی کی تربیت نکرے، تجھ میں اور تودۂ خاک میں کوئی فرق نہیں ہے۔ لیکن اگر تو عشق رسولؐ کی بدولت اپنی خودی کو مستحکم کرلے تو پھر تو تلوار بن جائیگا۔ یعنی باطل پر غالب آکر صفتِ دوام حاصل کرلیگا۔

پانچواں بند:۔ جو شخص اس جوہر زندگی کے حصول کا آرزومند ہو، جو شخص بقا کا طالب ہو، اسکا فرض یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنے اندر جان پیدا کرے یعنی عشق رسولؐ اختیار کرے، اسکے بغیر کوئی انسان حقیقی معنوں میں زندہ نہیں رہ سکتا۔

(۲) پھر اپنے آپ کو حضورؐ کے عشق میں فنا کردے۔ اس فنا کے بعد حقیقی زندگی حاصل ہوگی۔ اقبالؔ نے اس نکتہ کو بانگ درا سے لیکر ارمغان حجاز تک ہر کتاب میں بیان کیا ہے۔ اس جگہ زبور عجم سے صرف ایک شعر نقل کرتا ہوں:۔

صورت گری را از من بیاموز!
شاید که خود را باز آفرینی!

"باز آفرینی" یعنی دوبارہ زندگی حاصل کرنا ہی اقبالؔ کے فلسفہ کا خلاصہ ہے۔

(۳) عشق رسولؐ میں فنا ہو کر جب تو دوبارہ زندہ ہو جائیگا تو تجھ میں اسقدر طاقت پیدا ہو جائیگی کہ تو زندگی کی قوتِ پنہاں کو آشکار کر دیگا۔ یعنی تیری خودی کی تمام مخفی استعدادیں بروئے کار آجائینگی۔ اور تیری خودی (چنگاری) صفتِ دوام حاصل کریگی۔ ؎ ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق

(۴) پھر تو (تیری قوم) ایشیا (خاک مشرق) کو فتح کرلیگا۔ اور اقوام عالم کی نگاہوں میں وہی عزت حاصل کرلیگا جو تیرے اسلاف کو حاصل تھی۔

(۵) پس تو راتوں کو اٹھکر اللہ کے حضور میں خضوع اور خشوع کے ساتھ دعائیں کرتا کہ وہ تجھپر مہربان ہو۔ "نالہ شبگیر" کے بغیر روحانیت پیدا نہیں ہوسکتی۔

(۶) اے مخاطب! تو یہ مت سمجھ کہ حشر مرنے کے بعد برپا ہوگا۔ بلکہ یہ سمجھ کہ حشر برپا ہوچکا ہے، اسلئے تو اپنی زندگی پر غور کر کہ تو نے کوئی عمل کیا ہے یا نہیں؟ اے مخاطب! خواب غفلت سے بیدار ہو کر جد وجہد میں مصروف ہو جا!

چھٹا بند:۔ اب میں تجھے "ملوکیت" کے معنی سمجھاتا ہوں۔ جب کوئی قوم کسی دوسری قوم پر غالب آجاتی ہے تو مفتوح قوم کو ذلیل وخوار کردیتی ہے۔ اور یہ چاہتی ہے کہ وہ ہمیشہ کے لئے اسکی غلام بنجائے۔

(۲) اگر محکوم قوم، آزادی حاصل کرنے کے لئے کوشش کرتی ہے، تو حکمراں قوم، ہر ممکن طریقہ سے اسکو اپنے مقصد سے غافل کردیتی ہے۔

(۳) یہی وجہ ہے کہ غلام (ایاز) کی نظر میں غلامی کا طوق، جو اسکی گردن میں پڑا ہوتا ہے۔ عزت کا نشان (ساز دلبری) دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً حکمراں اسکو قابو میں رکھنے کے لئے جو خطاب یا عہدہ عطا کرتا ہے، وہ اُسے بہت قیمتی سمجھتا ہے حالانکہ دراصل وہ طوق لعنت ہے۔

(۴) کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی اللہ کا بندہ اپنی قوم کو آزاد کرنے کے لئے وہی کوشش کرتا ہے جو حضرت موسیٰؑ نے بنی اسرائیل کو آزاد کرنے کے لئے، کی تھی۔ یعنی اُس طلسم کو توڑ دیتا ہے جو ملوکیت نے باندھا تھا۔

(۵) حقیقت یہ ہے کہ بادشاہت صرف اللہ کے لئے زیبا ہے پس وہی سچا اور حقیقی حکمراں ہے، دنیا کے جتنے بادشاہ ہیں، جو دوسروں کو غلام بناتے ہیں، وہ سب بُت ہیں۔ اور مسلمان کا فرض ہے کہ ان بتوں کو توڑ دے۔

(۶) اے مسلمان! غلامی اختیار کر کے اپنی خودی کو جسے اللہ نے آزاد پیدا کیا ہے، رسوا مت کر۔ اگر تو مسلمان ہونے کے باوجود، کسی انسان کے سامنے سر جھکائے تو بلاشبہ تو برہمن سے بڑھکر کافر ہے۔

(۸) ملوکیت کی مذمت کے بعد، خضر، مغربی جمہوریت کی حقیقت بیان کرتے ہیں۔ کہ یورپ میں جس قسم کی جمہوریت رائج ہے وہ دراصل ملوکیت (قیصریت) ہی کی ایک بدلی ہوئی صورت ہے۔

(۸) ظلم وستم اور مطلق العنانی کا دیو، جمہوریت کے لباس میں لوگوں کے سامنے ناچ رہا ہے، لیکن عوام اُسے آزادی کی نیلم پری سمجھتے ہیں۔

(۹) یہ مجلس وضع آئین، اصلاحات (ریفارمس) اقلیت کو مراعات، اور حکمراں طبقہ کی طرف سے کسی جماعت کو حقوق کا عطا کرنا، یہ سب افیون کی گولیاں ہیں، جن پر شکر چڑھی ہوئی ہے۔ کھانے میں میٹھی ہیں، لیکن کھانے والوں کو غافل کردیتی ہیں، تاکہ وہ آزادی کے لئے جد وجہد نہ کرسکیں۔

(۱۰) جب مجلس آئین (اسمبلی) میں حکومت کے ارکان، عوام کے حق میں تقریریں کرتے ہیں تو عوام سمجھتے ہیں کہ سلطنت یا حکومت ہمپر بہت مہربان ہے۔ لیکن دراصل یہ بھی سرمایہ داروں کے وہ ہتھکنڈے ہیں، جن کی بدولت وہ رعایا کو بیوقوف بناتے ہیں۔

(۱۱) اے مسلمان! افسوس ہے کہ تو اس سراب (دھوکہ) کو گلستاں اور اس قفس کو آشیاں (آزادی) سمجھے بیٹھا ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ ملوکیت کی طرح موجودہ مغربی جمہوریت بھی ایک لعنت ہی ہے۔

ساتواں بند:۔ اب خضر، مزدور کو پیغام دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ، یہ میرا پیغام نہیں ہے، بلکہ کائنات کا پیغام ہے یعنی ایک حقیقت ثابتہ ہے۔

(۲) اے مزدور! ساری کائنات کو تجھ سے ہمدردی ہے۔ اور ساری دنیا جانتی ہے کہ سرمایہ دار کی عشرت کا دارومدار تیری محنت پر ہے لیکن اُس نے تجھکو تباہ کردیا۔ رات دن تیرا خون چوس رہا ہے۔ لیکن سیر نہیں ہوتا۔ اُس نے ہزاروں برسوں سے تجھ کو اپنا غلام بنا رکھا ہے۔ اور تجھے دھوکہ دیتا رہتا ہے۔ اسکی پوری زندگی، مکروفریب، عیاری اور دغابازی کی مسلسل داستان ہے۔

(۳) اسکی سنگدلی کا یہ عالم ہے کہ وہ تجھے مزدوری اس طرح دیتا ہے، جیسے کوئی دولتمند آدمی کسی محتاج کو بھیک یا زکوٰۃ دے۔

(۴) افسوس! سرمایہ دار نے تجھکو زہر کا پیالہ پلادیا۔ (تیرا خون چوس لیا۔) لیکن تو نے اپنی غلطی سے اس کو آب حیات سمجھا۔ یعنی تو یہ سمجھتا ہے کہ اگر سیٹھ صاحب مجھے تین روپیہ یومیہ عطا نہ کریں تو میں مرجاؤں گا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر تو اسکی فیکٹری میں کام نہ کرے تو اسکا خاتمہ ہو جائیگا

(۵) سرمایہ داری اور سرمایہ دارانہ نظام نے انسانوں کو اپنا غلام بنانے کے لئے مختلف قسم کے حربے اور آلات ایجاد کئے ہیں۔ مثلاً ذات پات کا امتیاز

جسکی بدولت برہمن، شودر پر حکومت کرتا ہے، یا قومیت اور وطنیت کا جذبہ جسکی بنا پر ایک قوم دوسری قوم پر حکومت کرتی ہے، یا کلیسائی نظام جسکی بدولت پوپ عوام کے ذہنوں پر حکومت کرتا ہے۔ یا سلطنت، جسکے پردہ میں بادشاہ عوام پر حکومت کرتا ہے۔ یا تہذیب جسکے پھیلانے کے بہانے سے مغربی قومیں، افریقہ اور ایشیا، پر حکومت کر رہی ہیں (جب انگریز کسی ملک کو فتح کرنا چاہتے ہیں تو یہ اعلان کرتے ہیں کہ ہم اس قوم کو مہذب بنانا چاہتے ہیں) یا رنگ نسل، جسکی بنا پر سفید رنگ کا آدمی کالے رنگ کے آدمی پر حکومت کرتا ہے۔

(۶) خضر، مزدور سے کہتے ہیں کہ یہ سب وہ نقلی معبود ہیں جنکی تو پرستش کر رہا ہے، بلکہ سرمایہ داری نے تجھے غلام بنانے کے لئے یہ مختلف قسم کے دیوتا وضع کر دیئے ہیں۔ اور تو انکی پرستش میں مقصد حیات سے غافل ہو گیا۔

(۷) یہ سرمایہ دار کی خالص عیاری کی دلیل ہے کہ اس نے تجھے اپنے جال میں پھانسنے کے لئے یہ مختلف قسم کے پھندے تیار کرتے ہیں۔ اور تو اپنی بیوقوفی سے ان پھندوں میں پھنس گیا۔

(۸) لیکن اب تو آنکھیں کھول کر دیکھ! دنیا میں انقلاب آچکا ہے۔ "اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے"۔ اس مصرع میں اس انقلاب کی طرف اشارہ ہے جو ۱۹۱۷ء میں روس میں برپا ہوا تھا۔ یعنی اے مزدور! اب تو اٹھ، اور سرمایہ داری کے طلسم کو پاش پاش کر دے۔ جنگ عظیم نے دنیا کا نقشہ ہی بدل دیا۔ زار روس کی حکومت ختم ہو گئی۔ اسکی جگہ لینن حکومت کر رہا ہے۔ جرمنی، فرانس، انگلستان اور اطالیہ، تمام ملکوں کی فضائیں "انقلاب زندہ باد" کے نعروں سے گونج رہی ہیں۔ اب وہ زمانہ آنے والا ہے کہ مشرق اور مغرب، غرضکہ ساری دنیا میں تیری ہی حکومت ہوگی۔ زار روس کا خاتمہ اس بات کی دلیل ہے کہ

گیا دورِ سرمایہ داری گیا!
تماشا دکھا کر مداری گیا!

آٹھواں بند:- اب خضر، مزدور کو انقلاب برپا کرنے اور زمام حکومت اپنے ہاتھوں میں لینے کی تلقین کرتے ہیں۔

(۱) اے مزدور! اگر تو ہمت اور حوصلہ سے کام لے تو ساری دنیا تیرے قدموں میں جھک سکتی ہے، تو ساری دنیا کے خزانوں کا مالک ہو سکتا ہے۔ تو کبتک روزانہ اُجرت (شبنم) پر دوسروں کی خدمت کرتا رہیگا؟

(۲) اب دنیا میں ہر طرف آزادی اور جمہوریت کا دور ہے، تو کبتک ملوکیت اور سرمایہ داری کی غلامی کرتا رہیگا؟

(۳) تجھے خبر نہیں کہ روس میں عظیم الشان انقلاب (آفتاب تازہ) رونما ہو چکا ہے۔ پس تو کبتک پرانے اور فرسودہ طریقوں (زمینداری، جاگیرداری سرمایہ داری اور ملوکیت) کے گیت گاتا رہیگا؟

(۴) میں تجھے خوشخبری سناتا ہوں کہ مزدوروں نے زار روس کا تختہ الٹ دیا۔ آخر چشم آدم (مزدور طبقہ) آسائش دنیوی (جنت) کے لئے کبتک روتی رہتی؟ سوال یہ ہے کہ کیا مزدور، انسان نہیں ہے؟ حضرت آدم کی اولاد نہیں ہے؟ اگر وہ بھی انسان ہے تو کیا وجہ ہے کہ ایک شخص تو اپنے کتوں کو بھی گوشت کھلائے لیکن دوسرا شخص (جو اُسی کی طرح انسان ہے) اپنی اولاد کو روٹی بھی نہ کھلا سکے؟ چونکہ اسلام اس ناانصافی کو روا نہیں رکھتا، اسلئے خضر نے مزدور کو انقلاب برپا کرنے کا پیغام دیا ہے۔ وہی انقلاب جو اسلام نے ساتویں صدی میں برپا کر دیا تھا!

(۵) اے مزدور! حالاتِ حاضرہ کا مطالعہ کر! سرمایہ دار تیری ہستی (رگ) کو

مدتوں سے زخمی کر رہے ہیں۔ تو کبتک مرہم کی تلاش کریگا؟ سرمایہ داری کا خاتمہ کیوں نہیں کر دیتا تاکہ زخم ہی نہ لگے جو مرہم کی ضرورت ہو؟

(۶) پس اے نادان مزدور! آنکھیں کھول! سرمایہ داروں کی غلامی (طواف شمع) سے باز آجا! اور اُن کے خلاف بغاوت کا علم بلند کر دے۔ تو اپنی فطرت کے اقتضاء پر غور کر، کیا خدا نے تجھے سرمایہ داروں کی غلامی کرنے کے لئے پیدا کیا ہے؟ ہرگز نہیں، پھر تو کیوں انکی غلامی کرتا ہے؟ اُٹھ اور اس باطل نظام کو فنا کر دے اور بنی آدم کو، ان کے ظلم و ستم سے آزاد کر دے۔

نواں بند:- اے اقبال! میں مسلمانوں اور اسلامی ملکوں کی زبون حالی سے بخوبی واقف ہوں۔

(۲) مسلمانوں کی حماقت کا یہ نتیجہ نکلا کہ مراقش، الجیریا، تونیشیا، طرابلس مصر، شام، فلسطین، عراق، اور ہندستان، سارے اسلامی ممالک، عیسائی اقوام کے غلام ہو گئے۔ اور خود حجاز کی سرزمین عربوں کی کوتاہ بینی کی بدولت کلیسا کے زیر اثر آگئی۔

(۳) ایران کی سرزمین، جو کسی زمانہ میں بہت باوقار تھی، آج آخری سانسیں لے رہی ہے۔ اور وہاں کے لوگ یورپ کی تہذیب اور معاشرت اختیار کر رہے ہیں۔

(۴)، اسلامی ممالک میں وطنیت کا غیر اسلامی نظریہ مقبول ہوتا جاتا ہے۔ یہ وہ اُصول (مے) ہے جسکی وجہ سے اسلام (مینا) کا وجود خطرہ میں پڑ جائیگا۔ جب بوتل ٹوٹ جائیگی تو شراب یقیناً ضائع ہو جائیگی۔

(۵) نیز، مسلمان مغربی فلسفہ کے زیر اثر، خدا اور رسولؐ سے منکر ہوتے جاتے ہیں اور ملت اسلامیہ کی وحدت، وطنیت کی بدولت اس طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی جس طرح قینچی سونے کے اوراق کو کاٹ کر پرزے پرزے کر دیتی ہے۔ اسلام نے تو یہ تعلیم

دی تھی کہ چین سے لیکر مراقش تک سب مسلمان ایک قوم ہیں۔ لیکن آج ترک اپنے آپکو عربوں سے اور عرب اپنے آپ کو ترکوں سے جدا سمجھتے ہیں۔ یہی حال دوسرے ملکوں کا ہے۔

(۶) اسکا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان کا خون، پانی سے بھی زیادہ ارزاں ہو گیا۔ اشارہ ہے عربوں کی بیوفائی کی طرف جنہوں نے دشمنوں کے ساتھ ملکر بھائیوں کے سینے گولیوں سے چھلنی کر دیئے۔ اگر مصطفےٰ کمال پاشا نے عربوں کی اس بیوفائی اور ملت فروشی کا انتقام اس طرح لیا کہ عربی زبان ترکی سے خارج کر دی، تو خواہ اسلام کے زاویۂ نگاہ سے اسکا یہ فعل غیر محمود ہو، لیکن عرب اقوام اُسے مطعون نہیں کر سکتیں۔

(۷) لیکن اے اقبال! تو ترکوں کی بربادی سے رنجیدہ مت ہو۔ کیا تجھے مرشد رومی کا قول یاد نہیں کہ جب ہم کسی پرانی عمارت کو دوبارہ تعمیر کرنا چاہتے ہیں تو پہلے اُسکو مسمار کرتے ہیں، پھر از سر نو عمارت بناتے ہیں۔

دسواں بند:- اگر بغداد، دمشق، اور دہلی پر اغیار کا قبضہ ہے تو مایوس ہونیکی کوئی وجہ نہیں ہے، یہ شہر دوبارہ ہمارے قبضہ میں آسکتے ہیں اے مسلمان! خدا نے تجھے عقل دی ہے پس تو غور کر کہ یہ ملک تیرے ہاتھ سے کیوں نکل گئے؟

(۲) اے مسلمان! تو اپنی مصائب کا علاج غیروں سے مت طلب کر، بیشک تو بیکس چیونٹی ہے لیکن حکمراں (سلیمان) کے پاس امداد طلب کرنے کے لئے مت جا۔

(۳) اسکے بجائے تمام مسلمانوں کو پاکستان سے لیکر مراقش تک ایک متحدہ محاذ قائم کرنا چاہئے۔ ایشیا کے مسلمان اس نکتہ سے ابتک بے خبر ہیں کہ اگر وہ متحد ہو جائیں تو سالے بر اعظم کو یورپ کی غلامی سے آزاد کرا سکتے ہیں۔

(۴) لہذا، میں تمام مسلمانوں کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ سیاسیات سے کنارہ کشی

ہوکر، اسلام کی تبلیغ واشاعت میں منہمک ہوجائیں۔ جنس حقیر (ملک و دولت) کیلئے وہ بیتاب ہیں وہ اسلام کی اشاعت (حفظِ حرم) کا ایک ادنیٰ ثمر ہے۔

(۵) تمام مسلمان، اسلام کی حفاظت کے لئے ملتِ واحدہ بنجائیں، اور نیل سے لیکر کاشغر (مصر سے لیکر چین) تک سارے اسلامی ممالک ایک ہوجائیں۔

(۶) جو مسلمان ملک، رنگ یا خون کا امتیاز تسلیم کریگا وہ مٹ جائیگا۔ خواہ وہ ترک ہو، یا عرب، ایرانی ہو یا پاکستانی۔

(۷) اگر مسلمانوں نے اپنی نسل کو اپنے دین (اسلام) پر مقدم کرلیا (یعنی اگر تم پاکستانی پہلے ہو اور مسلمان بعد میں ہو) تو وہ رفتہ رفتہ دنیا سے ختم ہوجائینگے۔

(۸) اگر تم دنیا میں اپنی خلافت دوبارہ قائم کرنا چاہتے ہو تو اپنے اندر وہی صفات پیدا کرو، جو حضرت فاروق اعظمؓ، اور حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ میں پائی جاتی تھیں۔

(۹) لیکن اے مسلمانو! مجھے افسوس ہے کہ تم خفی اور جلی میں یعنی پوشیدہ اور ظاہر میں فرق نہیں کرسکتے۔ تم کو یہ بھی نہیں معلوم کہ ضروری کیا ہے۔ اور غیر ضروری کیا ہے یعنی تم یہ نہیں جانتے کہ اُصولی باتیں کیا ہیں، اور فروعی اُمور کیا ہیں نیز یہ کہ جو قومیں دنیا میں ترقی کرنیکی آرزومند ہوتی ہیں، وہ جلی (واضح اصُول) کو چھوڑ کر خفی (فروعی یا مبہم اُمور) کا اتباع نہیں کیا کرتیں۔

نوٹ:۔ اقبال نے اس مصرع میں قوم کی سب سے زیادہ دکھتی ہوئی رگ کو چھیڑا ہے۔ لیکن میں اپنی قوم کی ذہنیت سے آگاہ ہوں، اسلئے دوسرے مصرع کی تشریح نہیں کرونگا۔ صرف اسکا مطلب بیان کئے دیتا ہوں:۔

اے نادانو! تم کب تک اس مسئلہ پر آپس میں لڑتے رہوگے کہ حضرت ابوبکرؓ، اور حضرت علیؓ میں سے کون افضل ہے؟ آگاہ ہوجاؤ کہ دشمن تمہاری اس خانہ جنگی سے حسب دلخواہ فائدہ حاصل کریگا، اور تم انجام کار تباہ ہوجاؤگے۔

گیارہواں بند:۔ آخری بند میں خضر، مسلمانوں کو خوشخبری سُناتے ہیں کہ:

(۱) مسلمانوں پر مصائب کا نزول ہوچکا، اور اس نے مسلمانوں کو بیدار کردیا چنانچہ انہوں نے اللہ کی جناب میں فریاد کی، اب اسکی تاثیر ظاہر ہونے والی ہے۔

(۲) یورپ کی قوموں کا عروج تم نے دیکھ لیا، لیکن اب یہ بھی دیکھو کہ انکی بیدینی اور مادہ پرستی ان کے حق میں وبال جان بنجائیگی۔

(۳) آج سے تیرہ سو سال پہلے اسلام نے، دنیا کو، اصول سہ گانہ، حریت اُخوت اور مساوات کی تعلیم دی تھی۔ اب وقت آگیا ہے کہ دنیا ان پاکیزہ اُصول پر عامل ہوکر، اسلامی تعلیمات کی صداقت پر شہادت دیگی۔

"عام حریت" سے اقبال کی مراد یہ ہے کہ ہر شخص اپنی ماں کے پیٹ سے آزاد ہی پیدا ہوتا ہے۔ آگے چل کر غیر اسلامی نظام (ملوکیت اور سرمایہ داری) کی بدولت وہ اس نعمت سے محروم ہوجاتا ہے۔ اسلئے اسلام دراصل ملوکیت اور سرمایہ داری کے حق میں پیام موت ہے۔

(۴) جب ملوکیت اور سرمایہ داری کا خاتمہ ہوجائیگا تو نئی دنیا پیدا ہوگی۔ گویا ان دونوں کی خاکستر سے نیا نظام (اسلامی نظام) عالم وجود میں آئیگا۔

(۵) میرے کلام میں تم کو آئندہ دنیا کی دھندلی سی تصویر نظر آسکتی ہے۔ یعنی آئندہ زمانہ میں، دنیا میں اسلامی نظام قائم ہوجائیگا۔

(۶) جس طرح اسلام پہلے دور میں دنیا کے حق میں پیام رحمت ثابت ہوچکا ہے اسی طرح آئندہ دور میں رحمت ثابت ہوگا۔

(۷) اگر تو مسلمان ہے تو اپنے سینہ کو آرزو سے آباد رکھ اور اس آیت کو ہمیشہ مدنظر رکھ کہ اللہ کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا، اسکا وعدہ ہے کہ اگر مسلمان ایمان لاکر نیک کام کرینگے تو وہ ضرور اُن کو دنیا میں عزت (خلافت) عطا فرمائیگا۔

نظم بر ص ۳۰۳

حلِّ لغات | تنک تابی۔ کم کم چمکنا + گراں خوابی۔ گہری نیند کی کیفیت + عروق عرق کی جمع ہے بمعنی رگ + مشرق سے اقوام مشرق مراد ہیں + طوفان مغرب سے پہلی جنگ عظیم مراد ہے + گوہر سے مسلمان مراد ہے + شکوۂ ترکمانی سے وہ غیر معمولی سطوت اور شوکت مراد ہے جو دنیا میں ترکی قوم کو نصیب ہوئی تفصیل کا تو موقع نہیں ہے۔ صرف ایک واقعہ لکھے دیتا ہوں۔ ملک شاہ سلجوقی (۴۶۵ھ تا ۴۸۵ھ) جسکی سلطنت دیوار چین سے لیکر قسطنطنیہ تک وسیع تھی، جب ۴۸۳ھ میں ترکستان فتح کرنے کے لئے روانہ ہورہا تھا تو قیصر روم کے سفراء سالانہ خراج لیکر حاضر خدمت ہوئے۔ اس باجبروت بادشاہ نے حکم دیا کہ میں خراج کی رقم کاشغر کے پھاٹک پر وصول کرونگا۔ یہ حکم سنکر سفرا نے سر تسلیم خم کردیا۔ اور اس شہر کو فتح کرنے کے بعد جب اُس نے دربار منعقد کیا تو ان لوگوں کو مخاطب کرکے کہا کہ میں نے تم سے خراج کی یہ رقم اسلئے پایۂ تخت کے بجائے یہاں وصول کی ہے کہ آئندہ مورخین یہ لکھیں کہ ملک شاہ سلجوقی کو اللہ نے یہ عزت عطا کی تھی کہ روم کے شہنشاہ نے کاشغر کے پھاٹک پر اُسے خراج کی رقم پہونچائی تھی۔ اسکے بعد سلطان نے خاقان چین کو اطاعت کا پیام بھیجا۔ جسکے جواب میں شہنشاہ چین دست بستہ حاضر خدمت ہوکر آداب بجالایا اور اظہار اطاعت کیا۔ اب ناظرین ملک شاہ کی سطوت کا خود اندازہ کرلیں کہ مشرق میں شہنشاہ چین اُس کا فرمانبردار تھا۔ اور مغرب میں شہنشاہ روم اسکا باجگذار تھا + ذہن ہندی سے ہندو قوم کی دانش و فہم مراد ہے۔ واضح ہو کہ ہندو قوم قدیم زمانہ سے حکمت اور فلسفہ میں ممتاز چلی آتی ہے، راقم الحروف کی رائے میں یہ قوم فلسفہ میں اہل یونان سے بھی چار قدم آگے ہے + نطق اعرابی سے عربوں کی سی فصاحت مراد ہے۔

واضح ہو کہ عرب قوم ہمیشہ سے فصاحت کے لئے مشہور ہے + تقدیر سیمابی۔ سیماب کی خاصیت یا اسکے خواص + برگستوان۔ ہندی میں اسکو پاکھر کہتے ہیں۔ یہ ایک قسم کا مضبوط چارجامہ ہوتا ہے جو گھوڑے کی پشت پر اسکی حفاظت اور زیبائش کے لئے ڈالدیتے ہیں + جگر تابی بمعنی شجاعت یا جوش جہاد + ضمیر لالہ سے مسلمان کا دل مراد ہے۔ واضح ہو، کہ اقبال کے یہاں "لالہ" اصطلاح ہے، اسکا ذکر انہوں نے شاہین کی طرح ہر جگہ، اور ہر کتاب میں کیا ہے + چمن سے مسلمان قوم مراد ہے + نیسان۔ اس سے ابر نیسان مراد ہے یعنی وہ بادل جسکے قطروں سے موتی پیدا ہوتے ہیں۔ نیسان۔ قدیم سریانی میں وہ مہینہ ہے، جو اپریل سے مطابقت رکھتا ہے + خلیل اللہ کے دریا سے ملت اسلامیہ مراد ہے + شیرازہ بندی ہے۔ کتاب کی رعایت سے شیرازہ کا لفظ لائے ہیں۔ اس سے استحکام مراد ہے + شاخ ہاشمی سے مسلمان قوم مراد ہے۔ ہاشم، سرکار دو عالمؐ کے پردادا کا نام ہے + تبریز، یہ ایران کا مشہور شہر ہے شمال مغرب میں واقع ہے۔ آبادی دو لاکھ سے کچھ زیادہ ہے + جہاں بینی۔ نظام کائنات کو سمجھنا یا قوموں کے عروج و زوال کے اسباب معلوم کرنا + جگر خوں ہو۔ بہت غور و فکر کی جائے + دیدہ ور۔ دانائے اسرار کائنات + بلبل سے ذات شاعر مراد ہے + کبوتر سے محکوم مسلمان مراد ہے + خدائے لم یزل، یعنی وہ خدا جسے کبھی زوال نہیں ہوگا + آنی۔ آن سے نکلا ہے۔ آن، وقت کا سب سے چھوٹا حصہ + مکیں سے انسان مراد ہے + حنا بند۔ آراستہ کرنے والا + امین بمعنی حامل + ممکناتِ زندگانی۔ انسانی ترقی کی تمام ممکن صورتیں + جوہر مضمر۔ کائنات کے پوشیدہ اسرار + ارمغان تحفہ یا سوغات + رمزِ مسلمانی، اسلام کی حقیقت + میان شاخساران۔ درختوں کی شاخوں میں + قہستان۔ خراسان میں ایک خطہ یا ضلع ہے + گماں آباد ہستی سے یہ دنیا مراد ہے + قندیلِ رہبانی سے وہ چراغ مراد ہے جو کسی راہب کی جھونپڑی میں جل رہا ہو + استبداد، بمعنی ظلم و ستم + فقر بوذر۔ صحابہ کرامؓ میں حضرت ابوذر غفاریؓ

اپنے فقر کے لئے مشہور ہیں۔ انکی زندگی فقر اسلامی کی بہترین تصویر ہے + صدق سلمانی سے حضرت سلمان فارسیؓ کی سچی اسلامی زندگی مراد ہے + المانی جرمنی کا باشندہ + تورانی سے ترکان عثمانی مراد ہیں۔ واضح ہو کہ دنیا میں ترکان عثمانی کے علاوہ اور کوئی قوم ایسی نہیں ہے، جس نے ان کے برابر جنگ وجدل میں حصہ لیا ہو۔ اور پھر زندہ موجود ہو بلکہ ابھی تک حکمران ہو + انگارہ۔ نقش ناتمام + انگارۂ خاکی سے انسان مراد ہے + روح الامین، حضرت جبرئیل کا لقب ہے + ذوق یقیں سے ایمان محکم مراد ہے۔ اقبال نے اکثر یقیں کو ایمان کے معنی میں استعمال کیا ہے + ولایت سے روحانیت یا قرب خداوندی مراد ہے۔ اگر واؤ کو زبر سے پڑھا جائے تو اسکے معنی ہونگے مدد کرنا۔ اقبال نے اسے پہلے معنی میں استعمال کیا ہے + براہیمی نظر سے شان یا رنگ توحید مراد ہے + حذر۔ بچنا یا ڈرنا + چیرہ دست۔ ظالم + تعزیر۔ سزا + کم نگاہی۔ غفلت + شرمندۂ ساحل۔ بڑی بلیغ ترکیب ہے۔ مراد ہے وہ شخص جس نے اپنے آپ کو محدود کر لیا ہو۔ مصاف بمعنی میدان جنگ + حریر و پرنیاں۔ اعلیٰ قسم کا ریشم + شہریاری سے ملوکیت مراد ہے + ریزہ کاری۔ مہین کام۔ نازک زیورات میں نگینے جڑنا + خروش آموز بلبل ہو یعنی انسانوں کو محبت کا سبق پڑھا + اطلس قبایان تتاری سے ترکان عثمانی مراد ہیں + مرغ زار سے بلبل مراد ہے + نگار بمعنی معشوق + خیمہ کشیدن۔ چھا جانا۔ اُمنڈ آنا + آبشار۔ جھرنا + سر گردم و میں تیرے قربان + قانون پیشین۔ پرانا دستور۔ قانون کے دو معنی ہیں (۱) دستور (۲) ایک باجہ کا نام ہے + خیل بمعنی لشکر + ہزار۔ بلبل + مشتاقان عشاق + حدیث۔ قصہ، بات، داستان + خواجۂ بدر و حنین۔ یہ سرکار دوعالم صلعم کا لقب ہے + بدر سے جنگ بدر مراد ہے جو ۲ھ میں اور حنین سے جنگ حنین مراد ہے جو ۸ھ میں ہوئی تھی + تصرف۔ لغوی معنی ہیں کسی شئے پر قبضہ یا اقتدار حاصل کرنا۔ اصطلاحی معنی ہیں، کسی نبی یا ولی کی روحانی طاقت جسکی بدولت وہ بغیر آلات و وسائل

کائنات پر حکومت کرتا ہے۔ یہاں اصطلاحی معنی مراد ہیں + شاخِ خلیل سے ملت اسلامیہ مراد ہے + کامل عیار۔ کھرا + نہال بمعنی پودا + سازگار۔ موافق + طرح دیگر انداختن، انقلاب برپا کرنا +

تبصرہ | یہ بانگ درا کی آخری نظم ہے۔ اور اپنی نوعیت کے لحاظ سے بے نظیر ہے۔ جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں۔ اس کتاب میں تین نظمیں بہت بلند پایہ ہیں "شمع اور شاعر" "خضر راہ" اور "طلوع اسلام" چونکہ ان میں سے ہر ایک کا موضوع جداگانہ ہے اسلئے ان میں موازنہ نہیں ہو سکتا۔ اپنی اپنی جگہ ہر نظم لاجواب ہے۔

"شمع اور شاعر" کا پس منظر یہ ہے کہ ۱۲-۱۹۱۱ء میں دنیائے اسلام پر نکبت، اور ادبار کے مسلط ہو جانے کی وجہ سے اقبال کا دل رنج و غم سے معمور ہو گیا تھا۔ اسلئے اس نظم میں انہوں نے مسلمانوں کی غفلت پر نوحہ خوانی کی ہے۔ اور اسکے بعد انہیں دوبارہ زندہ ہونے کی ترکیب بتائی ہے، جس پر انہوں نے ابھی تک عمل نہیں کیا اور نہ مستقبل قریب میں راقم الحروف کو اسکی کوئی امید نظر آتی ہے۔ ع

تھا جنہیں ذوقِ تماشا وہ تو رخصت ہو گئے

"خضر راہ" کا پس منظر یہ ہے کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد ۲۰-۱۹۱۹ء میں، دنیا میں ایک انقلاب عظیم رونما ہو رہا تھا۔ یعنی پرانے نظام کی جگہ، نیا نظام قائم ہو رہا تھا اس جنگ نے ملوکیت اور سرمایہ داری دونوں کے مفاسد آشکار کر دیے اسلئے اقبال نے اس نظم میں، زندگی کی حقیقت بیان کی ہے۔ حیات کے اسرار آشکار کئے ہیں سلطنت اور حکومت کی ماہیت واضح کی ہے۔ سرمایہ اور محنت کی آویزش کا نقشہ کھینچا ہے، ممالک اسلامیہ کی غیر اسلامی روش (قوم پرستی کی طرف میلان) پر تنقید کی ہے اور آخر میں مسلمانوں کو امید کا درس دیا ہے۔

"طلوع اسلام" کا پس منظر یہ ہے کہ یہ نظم انہوں نے ۱۹۲۳ء میں لکھی تھی۔ چونکہ اس زمانہ میں مصطفیٰ کمال پاشا نے سقاریہ کی جنگ میں یونانیوں کو شکست دیکر ساری دنیا پر یہ حقیقت آشکار کر دی تھی کہ ترک ابھی زندہ ہیں۔ اور سمرنا فتح کر کے مسٹر گلیڈسٹن کے خاندان میں صف ماتم بچھا دی تھی، اسلئے اقبال نے جس طرح مایوسی کے عالم میں "شمع اور شاعر" لکھی تھی، اسی طرح رجائیت کے عالم میں یہ نظم لکھی۔

اس نظم کا بنیادی تصور خود اسکے عنوان ہی میں مضمر ہے۔ اور اسکا پہلا بند، مسرت اور شادمانی کے جذبات سے لبریز ہے۔ بلکہ ساری نظم میں یہی رنگ نظر آتا ہے۔ اقبال نے مصطفیٰ کمال کی کامیابی کو طلوعِ اسلام سے تعبیر کیا ہے۔ "خضر راہ" میں کہیں کہیں نا امیدی اور مایوسی کا رنگ بھی جھلکتا ہے۔ لیکن اس نظم میں اقبال کا دل اس یقین سے معمور ہے کہ اگر مسلمان اپنے اندر ایمان پیدا کرلے تو وہ پھر ساری دنیا کو فتح کر سکتا ہے۔ ع ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی!

میری رائے میں بندش اور ترکیب، مضمون آفرینی، اور بلند پروازی، رمز و کنایہ کی فراوانی اور مشکل پسندی، شوکت الفاظ، اور فلسفہ طرازی، غرضکہ صوری اور معنوی محاسن شعری کے اعتبار سے یہ نظم بانگ درا کی تمام نظموں پر فوقیت رکھتی ہے۔ اقبال کی شاعرانہ عظمت کا نقش، میرے دل پر اسی نظم کے مطالعہ سے مرتسم ہوا۔ اور اسکی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ نظم انہوں نے اسوقت لکھی جب ترکوں کی کامیابی سے اُنکے دل میں مسرت کے جذبات موجزن تھے۔ ع

اُفق سے آفتاب اُبھرا، گیا دورِ گراں خوابی!

تجزیہ | اس شاہکار میں نو بند ہیں۔ ہر بند کا بنیادی تصور ذیل میں درج کرتا ہوں۔ اسکے بعد مطلب بیان کرونگا:۔

پہلے بند میں شاعر نے قوم کو ترقی اور کامیابی کا مژدہ سنایا ہے۔ یہ مصرع اس بند کی جان ہے ع مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے

اس بند کی وہ خصوصیت جسکی بدولت اسکو امتیازی شان حاصل ہو گئی، یہ ہے کہ جب ۱۹۲۳ء میں عمائد لاہور نے شاہدرہ (مقبرۂ جہانگیر) میں اقبال کو، خطاب کے سلسلہ میں، ایک شاندار "پارٹی" دی تھی، تو حاضرین کے اصرار پر (کہ کچھ سنائیے) انہوں نے اسی بند کو اپنی مخصوص وجد آفریں طرز میں پڑھکر سنایا تھا، اور مندرجہ ذیل شعر انہوں نے اپنی طرف اشارہ کر کے پڑھا تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ "سر" کا خطاب مجھے اعلائے کلمۃ الحق سے باز نہیں رکھ سکتا۔

تڑپ صحنِ چمن میں، آشیاں میں، شاخساروں میں
جُدا پارے سے ہو سکتی نہیں، تقدیرِ سیمابی

دوسرے بند میں مصطفیٰ کمال کی طرف ع ربود آں ترک شیرازی دل تبریز و کابل را (اشارہ ہے) اور پھر اس مصرع میں اسکی خدمت میں خراج تحسین پیش کیا ہے:۔

ع بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

تیسرے بند میں مسلمان کو اسکی پوزیشن (حیثیت) سے آگاہ کیا ہے اور اُسکو یہ تاکید کی ہے کہ تو مناسب حال تیاری کرلے، کیونکہ عنقریب تجھ سے دنیا کی امامت کا کام لیا جائیگا۔ چوتھے بند میں اسلام کی حقیقت بیان کی ہے اور مسلمان کو اسلاف کی تقلید کا درس دیا ہے۔ ع

وہ کیا تھا؟ زورِ حیدر، فقرِ بوذر، صدقِ سلمانی

پانچویں بند میں، جو شاعری، فلسفہ اور مذہب ان تینوں خوبیوں کا حامل ہے، انہوں نے قوم کو "ذوق یقیں" کے ثمرات سے باخبر کیا ہے۔

چھٹے بند میں ترکوں کی کامیابی کی طرف اشارہ ہے۔

ساتویں بند میں مسلمانوں کو اخوت اور محبت کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا ہے۔

آٹھویں بند میں ملوکیت کی مذمت کی ہے۔

نویں بند میں ساقی (قوم) سے خطاب کیا ہے۔

پہلا بند:۔ ستاروں کا ٹمٹمانا اس بات کی دلیل ہے کہ آفتاب طلوع ہونے والا ہے۔ مسلمان مدتوں غفلت کی نیند سوتے رہے بیشک ہے کہ مصطفےٰ کمال (آفتاب) نہیں بیدار کر دیا۔

(۲) مسلمانوں کی مردہ رگوں میں پھر زندگی کے آثار نمایاں ہوگئے۔ اس راز کو فلسفی یا منطقی لوگ بالکل نہیں سمجھ سکتے (کیونکہ یہ بات فضل ایزدی سے متعلق ہے)

(۳) سچ تو یہ ہے کہ جنگ عظیم (۱۸-۱۹۱۴ء) نے مسلمانوں کو اس حقیقت سے آگاہ کر دیا کہ اگر ہم جد وجہد نہیں کرینگے تو فنا ہو جائینگے۔ اگر دریا (دنیا) میں تلاطم برپا نہ ہو تو موتی (مسلمان) میں آب و تاب پیدا نہیں ہو سکتی یعنی مسلمان کے جوہر عیاں نہیں ہو سکتے

(۴) آثار بتا رہے ہیں کہ مسلمانوں کو دنیا میں دوبارہ سربلندی نصیب ہوگی۔ ترکوں کی سی شان و شوکت، ہندیوں کی سی دانائی اور عربوں کی سی فصاحت و بلاغت۔

(۵) اے اقبالؔ! (بلبل) اگر تو یہ دیکھے کہ قوم میں غفلت کا اثر ہنوز باقی ہے، تو اپنی شاعری میں مزید جوش و خروش کا رنگ پیدا کر دے۔ اگر لوگوں میں گانا سُننے کا ذوق نہیں ہے تو مطرب کو چاہئے کہ زیادہ دلکشی کے ساتھ گائے تاکہ لوگ متوجہ ہوں۔

(۶) اور ہر جگہ اور ہر مجلس، اور ہر جلسہ اور ہر تقریب میں مسلمانوں کو بیدار کر۔ جہاں موقع ملے اور جس طرح ممکن ہو سکے، قوم کو بیداری کا پیغام دے۔ تو (یعنی قوم) بو عاشق (سیماب) ہے۔ اور تڑپ، عاشق سے جدا نہیں ہو سکتی۔

نوٹ:۔ اقبالؔ لاکھ خطا کار سہی لیکن اُس اللہ کے بندے نے اپنے طرز عمل سے اس مصرع کو سچ کر دکھایا، وہ جبتک زندہ رہا (میں گواہی دیتا ہوں کہ) قوم کے عشق میں تڑپتا رہا۔ میرے علاوہ صدہا انسانوں نے اُسے بچشم خود تڑپتے دیکھا، بلکہ اُس نے بہت سے مسلمانوں کو تڑپنا سکھا دیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک مرتبہ

تڑپتے کی حالت میں یہ الفاظ اُسکے مُنہ سے نکلے تھے :۔ یاد رکھو! سرکارِ دو عالم صلعم کا عاشق دنیا میں کبھی ذلیل نہیں ہو سکتا۔

(۷) وہ شخص جو کسی مرد غازی کے ایمان کا نظارہ کر سکتا ہے، اسے یہ دیکھنے کی مطلق ضرورت نہیں ہوتی کہ اس غازی کے گھوڑے کی زین یا ظاہری آرائش کیسی ہے یعنی مسلمانوں کا اندازہ اُنکے ایمان سے کرنا چاہئے نہ کہ ظاہری ساز و سامان سے۔

(۸) اے اقبالؔ! تو قوم کے ہر فرد کے دل میں عشق رسولؐ کی آگ بھڑکا دے اور قوم کے افراد کے دل میں یہ آرزو پیدا کر دے کہ وہ اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو دوبارہ حاصل کر سکیں۔

نوٹ:۔ جستجو سے مراد ہے عظمتِ رفتہ کی جستجو اور آرزو سے مراد ہے سرکار دو عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نقشِ قدم پر چلنے کی آرزو ۱۲

دوسرا بند:۔ اگر مسلمان، اللہ کے حضور میں عاجزی اور گریہ و زاری کرے تو اسکے آنسو جناب باری کی نظر میں نہایت قیمتی ثابت ہو سکتے ہیں۔ یعنی اللہ ضرور اپنا فضل نازل فرمائیگا۔ اور مجھے امید ہے کہ فضل الٰہی نازل ہونے والا ہے۔

(۲) اور مسلمانوں کو دنیا میں پھر سربلندی حاصل ہوگی۔

(۳) چنانچہ اللہ نے مصطفےٰ کمال پاشا کو محض اپنے فضل و کرم سے یہ فتح مبین عطا فرمائی ہے جسکی بدولت اُسکو تمام دنیائے اسلام میں ہر دلعزیزی حاصل ہوگئی ہے۔ (ترک شیرازی سے مصطفےٰ کمال کی طرف اور تبریز و کابل سے دنیائے اسلام کی طرف اشارہ ہے) آج ترکوں کی کامیابی کی خوشبو تمام دنیائے اسلام میں پھیلی ہوئی ہے۔

(۴) اے مسلمانو! یہ سچ ہے کہ جنگ عظیم میں ترکوں نے نقصان عظیم برداشت کیا بلکہ انکی سلطنت، سیادت اور سطوت تینوں چیزوں کا خاتمہ ہوگیا۔ لیکن یہ آزردہ ہونیکی بات نہیں ہے، ہمیشہ مصائب کے بعد راحت نصیب ہوتی ہے۔ اور اگر فطرت سے انکی شہادت درکار ہے تو بحر غور کرو۔ لاکھوں ستارے فنا ہو جاتے ہیں تو ایک سحر پیدا ہوتی ہے۔

(۵) اے مسلمانو! حکومت تو ایک عارضی شئے ہے۔ آج چلی گئی تو کل آجائیگی۔ بڑی چیز "جہاں بینی" ہے۔ یعنی تمہیں قوموں کے عروج و زوال کے فلسفہ کا مطالعہ کرنا چاہئے، تاکہ تم وہ غلطی نہ کرو جس کا نتیجہ تباہی ہوتا ہے۔ "نظر" سے فراست مراد ہے۔

(۶) یاد رکھو! ایسا شخص جو کسی مردہ قوم کو زندہ کر دے کہیں صدیوں میں جاکر پیدا ہوتا ہے۔ "دیدہ ور" سے اشارہ ہے مصطفےٰ کمال کی طرف جس نے ۱۹۲۲ء میں اقبالؔ کے اس شعر پر عمل کر کے دکھا دیا۔

پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

دنیا شاہد ہے کہ اس نے نئی ترکی پیدا کر دی، جس میں نہ ملوکیت ہے نہ احباریت نہ حرم سرائے سلطانی ہے، نہ کنیزوں کی فوج ظفر موج، نہ گنڈا ہے، نہ تعویذ۔

(۷) اے اقبالؔ! اب وقت آگیا ہے کہ تو مسلمانوں کو اسلام کے محاسن سے آگاہ کر دے۔ تاکہ یہ محکوم قوم (کبوتر) یورپ کا مقابلہ کر سکے۔

(۸) تو چونکہ اسرار حیات سے آگاہ ہے، اسلئے مسلمان کو اسکے مقام اور کامیابی کے طریق سے آگاہ کر دے۔

تیسرا بند:۔ اے مسلمان! تو اللہ کی قدرت کا نشان اور تیرے ذریعے سے، وہ دنیا والوں سے ہمکلام ہونا چاہتا ہے۔ یعنی اُس نے تجھے اپنے کلام کا امین اور مبلغ بنایا ہے۔ تیرے پاس وہ ضابطہ حیات موجود اور محفوظ ہے، جو اللہ کی مشیت کا ترجمان ہے۔ پس تو اللہ کی ہستی پر یقین کامل پیدا کرلے۔

(۲) تیرا نصب العین اسقدر بلند ہے کہ آسمان کی بھی اسکے سامنے کوئی حقیقت نہیں ہے۔ تو اس کارواں سے مشابہ ہے، جسکی منزل مقصود کی رفعت ستاروں کو بھی شرماتی ہے۔

(۳) یاد رکھ! یہ دنیا فانی ہے۔ اور اس میں تیرا قیام (انسانی زندگی) عارضی ہے۔

لیکن تو اپنی ذات کے اعتبار سے غیر فانی ہے اور تیرے بعد کوئی قوم پیدا نہیں ہوگی۔

نوٹ ا۔ "ازل تیرا" یہ شاعرانہ انداز بیان ہے۔ ورنہ اقبالؔ انسان کو ازلی نہیں کہہ سکتے، کیونکہ یہ بات اسلام کی تعلیمات کے خلاف ہے ۱۲

چونکہ قرآن مجید، اللہ کا آخری پیغام ہے اور تو اسکا حامل ہے، اسلئے تو بھی قرآن حکیم سے رابطۂ قلبی کی بنا پر جاودانی ہے۔

(۴) تیرے اندر عشق رسولؐ کا جو وصف (خون جگر) پایا جاتا ہے، اسکی بدولت تیری ذات اس کائنات کی رونق کا سبب بنگئی۔

واضح ہو کہ اس بند میں یہ اور اگلے دو شعر بہت مشکل ہیں۔ مضامین نہایت بلند ہیں اور بندش بنہایت پیچیدہ ہے ع حنا بند عروس لالہ ہے خون جگر تیرا، بہت بلیغ مصرع ہے۔ اقبالؔ نے اس مصرع کو بال جبریل میں یوں باندھا ہے ع

مسلماں کے لہو میں ہے سلیقہ دلنوازی کا

"عروس لالہ" سے وہ افراد اور اشیا مراد ہیں، جن میں ترقی کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ یا جن کا وجود دنیا کے لئے زیب و زینت کا موجب ہے۔

تجھے حضرت ابراہیمؑ سے نسبت خصوصی حاصل ہے اسلئے تو بھی اس دنیا کا معمار ہے جس طرح اُنہوں نے خانۂ کعبہ تعمیر کیا تھا تو بھی نئی (اسلامی) دنیا تعمیر کر۔

(۵) اے مسلمان! اللہ نے تیری فطرت میں ترقی کی غیر محدود صلاحیتیں ودیعت فرما دی ہیں (ممکناتِ زندگانی، اقبالؔ کی وضع کردہ اصطلاح ہے) اسلئے تو اپنی اہمیت کا صحیح شعور پیدا کر، اگر تو نے اپنی صلاحیتوں کو برباد کر دیا، تو یہ کائنات گویا امتحان میں فیل ہو جائیگی، اللہ نے اس کائنات میں بہت سی نعمامخفی کر دی ہیں۔ اگر تو ان کو مسخر نہیں کریگا تو اس کائنات کی تخلیق کا مقصد ہی فوت ہو جائیگا۔

(۶) اے مسلمان! تو وہ تحفہ ہے، جس کو نبوت، اس دنیا سے عالم جاوید کی خاطر اپنے ساتھ

نے گئی۔ اس بلیغ شعر کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن، اگر اللہ تعالیٰ سرکار دو عالم صلعم سے دریافت فرمائیگا کہ ہمنے آپؐ کو دنیا میں نبی بنا کر بھیجا تھا۔ آپؐ نے وہاں کیا کارِ نمایاں انجام دیا؟ تو حضورؐ اقدس صلعم بارگاہ ایزدی میں عرض کر سکتے ہیں کہ میں نے تیرے مخلص بندوں کی ایک جماعت پیدا کر دی، مثلاً صدیق اکبرؓ فاروق اعظمؓ عثمان غنیؓ اور علی مرتضیٰؓ وغیرہم۔ لہذا اے مسلمان! تو اپنے اندر ایمان پیدا کرلے تاکہ قیامت کے دن تیرا شمار بھی اُن مسلمانوں میں ہو سکے جن پر حضور انور فخر کرینگے۔ میرا خیال ہے کہ اقبالؔ نے جب یہ شعر لکھا تھا تو اسوقت یہ حدیث اُنکے پیش نظر تھی۔ "اِنّی اُبَاھِی بِکُمُ الْاُمَمْ" یعنی میں تمہاری وجہ سے (قیامت کے دن) دوسری اُمتوں پر فخر کرونگا (کہ اے خدا میری اُمت نے سب اُمتوں سے بڑھکر تیرے نام کو بلند کیا)

(۷) اے مسلمان! اگر تو اپنے اسلاف کی تاریخ کا مطالعہ کرے تو تجھ پر یہ حقیقت عیاں ہو جائیگی کہ ایشیائی اقوام کی حفاظت صرف تو ہی کر سکتا ہے۔

(۸) لہذا تو اپنے اندر صداقت عدالت اور شجاعت کے جوہر پیدا کرلے، تاکہ اللہ تعالیٰ تجھکو دنیا کی قوموں کا سردار بنا دے۔ اس شعر میں اقبالؔ نے اس آیت کا مفہوم واضح کیا ہے۔ کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (اے مسلمانو!) تم بہترین امت ہو اور تم لوگوں کی اصلاح کے لئے پیدا کئے گئے ہو۔" یہی وجہ ہے کہ اقبالؔ نے مسلمانوں کو صفات سہ گانہ مذکورہ بالا اپنے اندر پیدا کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ کیونکہ انکے بغیر کوئی قوم امامت کی اہل نہیں ہو سکتی۔

چوتھا بند:- فطرت کا مقصد اور اسلامی تعلیمات کی روح یہ ہے کہ دنیا میں اخوت کا راج ہو، اور محبت کی بہتات ہو۔ یعنی ہر شخص دوسروں کو اپنا بھائی سمجھے۔ اور بھائیوں کی طرح اُن سے محبت کرے۔

(۲) پس اے مسلمان! تو ذات، پات، نسل، خاندان، اور قبیلہ کے امتیازات کو مٹا دے اور اپنے آپ کو افغانی، ایرانی، تورانی، یا پاکستانی کہنے کے بجائے ملت اسلامیہ کا فرد قرار دے۔ یعنی اپنے آپ کو کسی ملک یا نسل سے منسوب مت کر۔

(۳) جب تو دنیا کی بلند ترین فضا (ملت) میں پرواز کر سکتا ہے تو پھر کسی باغ کے درخت کی ڈالی (قبیلہ) پر بیٹھکر، بلبلوں (افراد) سے رسم و راہ کی کیا ضرورت ہے؟

دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ جب تو ساری دنیا کو فتح کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے تو کسی خاص خطۂ ارض پر کیوں قناعت کرتا ہے؟

(۳) یاد رکھ کہ اس دنیا میں، ایمان کا مرتبہ وہی ہے، جو صحرا میں کسی درویش کی جھونپڑی میں چراغ کا ہو سکتا ہے۔ جس طرح وہ چراغ بھولے بھٹکے مسافروں کو راہ دکھا سکتا ہے یا پناہ دے سکتا ہے اُسی طرح مسلمان اس دنیا میں گمراہ انسانیت کو راہِ راست دکھا سکتا ہے۔

(۴) اے مسلمانو! اس نکتہ پر غور کرو کہ تمہارے اسلاف نے اگر دنیا سے ملوکیت کی لعنت کو مٹایا تو اسکے لئے اُنہوں نے اپنے اندر مناسب حال صفات پیدا کرلی تھیں۔ اگر تم اپنے زمانہ میں ملوکیت کو مٹا کر اسلامی مساوات قائم کرنا چاہتے ہو تو اپنے اندر حضرت علیؓ کا زور، حضرت ابوذر غفاریؓ کا فقر، اور حضرت سلمان فارسیؓ کا صدق پیدا کر لو۔

نوٹ:- یہ شعر افادیت کے لحاظ سے، اس نظم کا حاصل ہے۔ اگر اقبالؔ صرف یہی ایک شعر لکھ اس نظم کو ختم کر دیتے، تو انکا مقصد پورا ہو جاتا۔ میری رائے میں مسلمانوں کی سب سے بڑی نادانی یہ ہے کہ وہ دنیا میں حکمرانی کی آرزو تو رکھتے ہیں لیکن ساری دنیا جانتی ہے کہ وہ اسکے اہل نہیں ہیں۔ اور وہ خود بھی اس تلخ حقیقت سے بیخبر نہیں ہیں۔ قرآن مجید یہ فرماتا ہے کہ پہلے حکمرانی کی اہلیت پیدا کرو پھر آرزو کرو۔ لیکن میری قوم کا طرز عمل یہ ہے کہ خود تو اسلام سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔ لیکن پاکستان میں اسلامی حکومت کے قیام کی آرزومند ہے ؟

(۵) مسلمانوں نے اس شان کے ساتھ دنیا میں حکومت کی یعنی بنی آدم کو حریت کا درس دیا کہ جو لوگ صدیوں سے انسانوں کی غلامی میں مبتلا تھے، وہ بیک جنبش نگاہ آزاد ہو گئے۔ مثلاً جب مصری، شامی، عراقی، ایرانی، اور ہندی اقوام اسلام لائیں تو وہ بتوں، برہمنوں، ذات پات اور توہمات کی غلامی سے آزاد ہو گئیں۔

(۶) یاد رکھو! صرف ایمان کی مضبوطی سے تمکو ثبات و استحکام حاصل ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جرمن قوم سے ترک قوم زیادہ مضبوط اور پائیدار ثابت ہوئی! اقبالؔ کا اشارہ اُن فتوحات کی طرف ہے جو ترکوں نے ۱۹۱۸ء کی شکست سے صرف چار سال کے بعد ۱۹۲۲ء میں دول متحدہ پر حاصل کیں۔

(۷) بات یہ ہے کہ جب انسان میں یقین (ایمان) کی صفت پیدا ہو جاتی ہے تو وہ جبرئیل (روح الامین) کی طرح قدسی نفس اور مقرب بارگاہِ خداوندی ہو جاتا ہے۔

پانچواں بند:- (۱) اے مسلمانو! تم اسوقت غلامی کی لعنت میں گرفتار ہو۔ اس سے نکلنے کا طریقہ۔ اسلامی طریقہ یہ ہے کہ تم فتنہ و فساد اور قتل و غارت کا سلسلہ شروع کرنے کے بجائے اپنے اندر ایمان کا رنگ پیدا کر لو۔ مثلاً سرکار دو عالم صلعم نے مسلمانوں کے اندر پہلے ایمان پیدا کیا پھر اللہ نے ان کو جنگ بدر میں کامیاب کیا۔ اکبر الہ آبادی لکھتے ہیں۔

خدا کے کام دیکھو بعد کیا ہے اور کیا پہلے
نظر آتا ہے مجھکو بدر سے غارِ حرا پہلے

یعنی پہلے ایمان، پھر جہاد۔ گویا یہ شعر اقبالؔ نے اسوۂ رسول مقبول صلعم کو پیش نظر رکھکر لکھا ہے۔ راقم الحروف کا بھی یہی مسلک ہے کہ اگر مسلمان اپنے دشمنوں سے انتقام لینا چاہتے ہیں تو پہلے ایمان پیدا کر لیں۔

(۲) اے مسلمانو! جب تمہارے اندر ایمان پیدا ہو جائیگا تو تم دنیا میں اسی طرح انقلاب برپا کر دو گے جس طرح تمہارے اسلاف نے پیدا کرکے دنیا کو محوِ حیرت بنا دیا تھا۔ اقبالؔ کہتے ہیں کہ نگاہِ مردِ مومن سے تقدیر تک بدل سکتی ہے جب مسلمان اس شعر کو سنتے ہیں تو بغیر سمجھے واہ وا اور سبحان اللہ کہنے لگتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ پچیس تیس سال سے کسی کو یہ توفیق حاصل نہ ہو سکی کہ وہ اسکا مفہوم سمجھتا، اور پھر اس پر عمل کرتا۔ بات یہ ہے کہ ہم لوگ کلام اقبالؔ کو محض سیاسی اغراض یا گرمئ محفل، یا قوالی، یا تقریر کی زینت کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

بیشک نگاہِ مردِ مومن سے "تقدیر" بدل سکتی ہے۔ لیکن پہلے کوئی مسلمان کسی مومن کی صحبت میں بیٹھکر، کچھ دنوں اسکی کفش برداری کرکے اپنے اندر نگاہ تو پیدا کرلے۔ افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ مغربی تعلیم کی بدولت مسلمان کی ذہنیت اسقدر مادہ پرستانہ ہوگئی ہے کہ وہ اس بات کو تسلیم ہی نہیں کرتا کہ (۱) تقدیر بھی کوئی چیز ہے یا (ب) نگاہ کی بھی کوئی اصلیت ہے یا (ج) صحبت سے یہ چیز پیدا ہو سکتی ہے یا (د) دنیا میں مجھ سے زیادہ قابل بھی کوئی شخص موجود ہے۔ خدا معلوم اقبالؔ کا تجربہ کیا تھا، راقم الحروف کا تیس سالہ تجربہ تو یہ ہے کہ میری قوم میں جہل مرکب کی کیفیت یہ ہے کہ معمولی لکھا پڑھا آدمی تو اپنے آپ کو ارسطو سے بڑھکر سمجھتا ہے اور شریعت کا برائے نام پابند مسلمان اپنے آپ کو مجدّد الف ثانی کا ہم پلہ یقین کرتا ہے اندریں حالات "نگاہ" پیدا ہو تو کیسے؟

(۳) اے مسلمانو! وہ تمام باتیں جو تمہیں مرغوب ہیں، مثلاً قربِ خداوندی، روحانیت حکومت یا دشاہی، فلسفہ، حکمت اور سائنس۔ یہ سب نعماء تم کو صرف ایک چیز کی بدولت حاصل ہو سکتی ہیں۔ اور وہ "ایمان" ہے تمہیں یقین نہو تو عربوں کی تاریخ کا مطالعہ کرلو انکو یہ سب نعمتیں حضور انورؐ کی غلامی (ایمان) کی بدولت حاصل ہو گئی تھیں۔

(۴) لیکن یہ ضرور ہے کہ ایمان بڑی مشکل سے پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ انسان کے اندر دنیا حاصل کرنے کی ہوس بڑی شدت کے ساتھ کارفرما ہے۔ اور اس ناپاک مگر واقعی صفت کی بدولت، انسان زبان سے تو اسلام کا ادعا کرتا ہے، لیکن دل میں خدا کے بجائے دنیا

جو اوہوس یعنی نفسانی خواہشات کی پرستش کرتا ہے۔ واضح ہو کہ کوئی شخص، مرشد کی صحبت کے بغیر اس دشمن پر غلبہ حاصل نہیں کر سکتا۔ حضرت علیؓ، حضرت ابوذر غفاریؓ اور حضرت سلمان فارسیؓ میں ایمان کا رنگ ذاتی کوشش سے پیدا نہیں ہوا تھا بلکہ یہ کسی مردِ مومن کی نگاہ، کا فیض تھا، پس اگر مسلمان "ہوس" کے بُت کو توڑنا چاہتے ہیں تو کسی مومن کی صحبت میں بیٹھکر اپنے بازو میں طاقت پیدا کرلیں۔ اگر اُستاد کی تعلیم اور اکھاڑے میں ورزش کے بغیر، کوئی شخص اپنے مادّی حریف کو چت نہیں کرسکتا، تو مرشد (استاد) کی نگاہ (تعلیم) اور خانقاہ (اکھاڑہ) میں مجاہدہ (ورزش) کے بغیر کوئی شخص اپنے روحانی دشمن کو کیسے شکست دیسکتاہے؟ اے مسلمانو! یاد رکھو جو شخص تمہیں بزرگانِ دین کی صحبت سے روکتاہے، وہ تمہارا بدترین دشمن ہے ؎

اے بسا ابلیس، آدم روئے ہست!

(۵) اے مسلمانو! ذات پات، قوم قبیلہ اور برادریوں کے امتیازات اور بندہ وآقا کی تمیز کو مٹا دو۔ یہ امتیازات انسانیت کے حق میں سمّ قاتل ہیں۔ یاد رکھو! قرآن کی رو سے، کوئی شخص کسی دوسرے شخص کا آقا نہیں ہو سکتا۔ تم سب کا ایک ہی آقا ہے اور وہ ـــ کیا اُسکا نام بتانے کی بھی ضرورت ہے؟

وہ دانائے سُبل، ختم الرسل، مولائے کُل، جسنے

غبارِ راہ کو بخشا فروغ وادیٔ سینا

دوسرے مصرع میں اقبالؔ نے اُن سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کو، جو مظلوم، بیکس اور بے زبان مزدوروں اور کاشتکاروں کو اپنا زرخرید غلام سمجھتے ہیں اور انکی عورتوں کی بے عزتی کرنا اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں، متنبہ کیاہے کہ اگر تم اپنی حرکات ملعونہ سے باز نہیں آؤگے تو فطرت تمہیں مٹا کر رکھدیگی۔ اقبالؔ نے اس مصرع کا مضمون قرآن مجید کی اس آیت سے اخذ کیا ہے اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ

تیرے رب کی گرفت (باز پرس) بہت ہی سخت ہوتی ہے۔

(۶) اے مسلمانو! بندہ وآقا کا امتیاز، ظالم، خودغرض اور بدکار انسانوں کا پیدا کیا ہوا ہے۔ اللہ نے تو سب کو یکساں بنایا ہے، بلکہ کائنات میں ہر شئے کی اصل دبنیاد ایک ہی ہے۔ بظاہر آفتاب اور ذرّہ میں بڑا فرق نظر آتا ہے۔ لیکن درحقیقت ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یا یوں سمجھو کہ ان دونوں کی حقیقت ایک ہی ہے۔ آفتاب بھی مادّی ہے، ذرّہ بھی مادّی ہے۔ وہ بھی مخلوق اور مجبور، یہ بھی مخلوق اور مجبور ہے۔

(۷) اے مسلمانو! اگر تم اپنے اندر یقینِ محکم، عملِ پیہم اور محبت، یہ صفات سہ گانہ پیدا کرلو تو تم ساری دنیا کو فتح کر سکتے ہو۔ اقبالؔ کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں کامیابی کے لئے، مادّی وسائل کے علاوہ بلکہ اُن سے بڑھکر، اخلاقی طاقت کی ضرورت ہے۔ اور یہ وہ نکتہ ہے جسے مادہ پرست قومیں بھی تسلیم کرتی ہیں۔ چنانچہ آجکل ہر سلطنت اپنی توجہ اس بات پر مرکوز کرتی ہے کہ اسکی فوجوں کا مورال (MORALE) پست نہ ہونے پائے۔

(۸) اے مسلمانو! جہاد میں ایک سپاہی (مرد) کو بندوق اور رائفل سے بدرجہا زیادہ طبع بلند، مشرب ناب، دلِ گرم، نگاہ پاک بیں، اور جانِ بیتاب کی ضرورت ہے۔ اقبالؔ کی فراست کی داد دینی پڑتی ہے کہ اُنہوں نے اس فہرست میں تمام وہی باتیں گنائی ہیں، جو ہماری قوم میں ناپید ہیں۔ مثلاً ہماری (ا) طبیعت کی بلندی کا یہ عالم ہے کہ چند روپیوں کے زیورات کے لئے ہم ایک معصوم لڑکی کو قتل کر سکتے ہیں۔ (ب) مشرب کی پاکیزگی کا یہ حال ہے کہ سرے سے ہمارا کوئی مشرب ہی نہیں ہے ؎

ایمان بیچنے پہ ہیں اب سب تُلے ہوئے

لیکن خرید ہو جو علی گڑھ کے بھاؤ سے

(ج) دل کی گرمی کا اندازہ اس بات سے ہو سکتاہے کہ اُس میں حضور انورؐ کے تصور کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ اور جب محبت ہی نہیں تو گرمی کا ذکر ہی خارج از بحث ہے۔

(د) نگاہ پاک بیں کی کیفیت یہ ہے کہ مسلمانوں نے اگست ۱۹۴۷ء سے پاک اور ناپاک کی تمیز ہی اُٹھادی ہے ؎ جو گنہ کیجئے ثواب ہے آج

(ہ) اب رہی "جان بیتاب" تو مجھے قوم کی زندگی ہی میں کلام ہے۔ بیتابی کا مسئلہ تو اسکے بعد زیر بحث آئیگا:۔

دیکھ آئے قوم سنتے تھے جسے!

چند لڑکے ہیں مشن اسکول کے (اکبر مرحوم)

چھٹا بند:۔ (۱) مقام شکر ہے کہ اہلِ یونان جو ترکوں پر برطانوی امداد کی بدولت بڑے طمطراق (عقابی شان) کے ساتھ حملہ آور ہوئے تھے، نہایت ذلت کے ساتھ پسپا ہوئے۔

(۲) جن لوگوں (یونانیوں) کو آبدوز کشتیوں پر ناز تھا، ترکوں نے بفضل خدا انہیں خود سمندر میں غرق کردیا۔ اور جو مفلوک الحال اور بے سروسامان تھے کامیاب ہوگئے۔

(۳) جن یونانیوں کو اپنی فوج اور برطانوی خفیہ کمک (کیمپ) پر ناز تھا، وہ آج ذلیل وخوار ہیں۔ اور جن لوگوں نے آڑے وقت میں اللہ کو یاد کیا وہ فتح کی خوشیاں منارہے ہیں۔

نوٹ:۔ راقم الحروف کو اچھی طرح یاد ہے کہ جب ۱۹۲۲ء میں فتح سمرنا کی خبر اخباروں میں شائع ہوئی تھی تو بریلی کی کوئی مسجد نہ تھی جس میں مسلمانوں نے گھی کے چراغ نہ جلائے ہوں۔

(۴) بیشک ترکوں کے پاس نہ لاسلکی کا انتظام تھا، نہ تلغراف کا نہ ٹیلیفون کا، لیکن اسکے باوجود انہوں نے اُن دشمنوں کے دانت کھٹے کر دیئے جو جدید ترین آلات حرب سے مسلح تھے۔

(۵) عربوں کے ماتھے پر اگر ملت سے غداری اور اسلام سے بیوفائی کا داغ لگا، تو یہ شریف مکہ (حجاز کا گورنر) کی کم نگاہی یعنی عاقبت نااندیشی اور خودغرضی کا نتیجہ تھا۔

لیکن اُن کے مقابلہ میں ترک نہایت صاحب نظر، دانشمند، اور اسلام کے شیدائی نکلے جنہوں نے اپنا سر ہتھیلی پر رکھکر کافروں کا مقابلہ کیا، حسین شریف مکہ نے تو لٹیا ہی ڈبو دی! اسلام کو رسوا کردیا۔ کہ کافروں کے ساتھ مل کر اُس قوم کا سینہ گولیوں سے چھلنی کردیا جس نے حرمین شریفین کی حفاظت کے لئے صدیوں تک اپنا خون پانی کی طرح بہایا۔

(۶) یہی وجہ ہے کہ دنیائے اسلام میں جس قدر سچے مسلمان موجود تھے، وہ سب، اور جس قدر فرشتے، زمین سے آسمان تک جاتے تھے، وہ سب یہی کہتے تھے کہ واقعی یہ ترک تو بڑے ثابت قدم، بڑے جانباز، اور بڑے حوصلہ مند نکلے۔

(۷) حقیقت بھی یہی ہے کہ جن لوگوں کے دلوں میں ایمان کی چنگاری پوشیدہ ہوتی ہے وہ دنیا میں آفتاب کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں، اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے یعنی اگر ۱۹۱۸ء میں شکست کھائی تو ۱۹۲۲ء میں شکست دیدی۔

(۸) اگر افراد کے دلوں میں یقین (ایمان) کا رنگ موجود ہو تو قوم اگر کسی معرکہ میں ناکام بھی ہو جائے تو دوبارہ کچھ عرصہ کے بعد کامیاب ہو سکتی ہے۔ یہ صفت یقین وہ قوت ہے، جسکی بدولت کسی قوم کی بگڑی ہوئی تقدیر بنجاتی ہے۔

ساتواں بند:۔ اے ہندی مسلمان! ترکوں کی زندگی سے سبق لے۔ اگر وہ آزاد ہوگئے تو، تو بھی آزاد ہو سکتا ہے۔ بس اسکی صورت یہ ہے کہ تو (ا) پہلے اپنی حقیقت سے آگاہی حاصل کر کہ تو مقصدِ تخلیق کائنات ہے (ب) اسکے بعد اپنی خودی کی صحیح طریق پر (اور عشق رسولؐ کے علاوہ اور کوئی طریقہ نہیں ہے) تربیت کر (ج) اور اسکے بعد دنیا میں حکومت الٰہیہ قائم کردے۔

نوٹ:۔ واضح ہو کہ یہ شعر بہت تفصیل طلب ہے۔ میں نے صرف مطلب بیان کردیاہے۔ اسکی وضاحت کروں تو بذات خود ایک کتاب مرتب ہو سکتی ہے

ہاں اگر قوم نے کبھی اشتیاق ظاہر کیا تو یہ خدمت بسر و چشم انجام دونگا۔

(۲) اے مسلمان! اسوقت تمام دنیا اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی کر رہی ہے ہر شخص نے اپنی خواہشات کو اپنا معبود بنا رکھا ہے اسلئے تو اس گمراہ انسانیت کو اخوت اور محبت کا پیغام دے۔ اور تمام امتیازات کو مٹا دے۔

(۳) آج خود مسلمانوں میں قومیت اور وطنیت کا نظریہ مقبول ہو رہا ہے مثلاً افغانستان کے مسلمان اپنے آپ کو افغانی سمجھتے ہیں، اور توران کے مسلمان، تورانی۔ اے مسلمان! تو ان کو وحدت ملی کا درس دے۔ اور جغرافیائی حدود و قیود سے بالاتر ہو کر انکے اندر آفاقیت (عالمگیریت) کی شان پیدا کر دے۔ واضح ہو کہ اسلام نے تمام جغرافیائی حدود کو باطل کر کے مسلمانوں کو ایک عالمگیر قوم بنا دیا ہے۔

(۴) اے مسلمان! چونکہ تیرے دماغ میں رنگ اور نسب کے غیر اسلامی تصورات پیدا ہو گئے ہیں۔ اسلئے مناسب ہے کہ دنیا میں ترقی کرنے سے پہلے ان تصورات کو اپنے دماغ سے نکال دے (پر فشاں ہو جا)

(۵) اے مسلمان! اپنی خودی کی معرفت حاصل کر لے۔ کیونکہ تیری "خودی" حیات کا راز ہے۔ زندگی کی حقیقت اسی میں پوشیدہ ہے۔ اور تیری زندگی کا مقصد ہی یہ ہے کہ تو اپنی خودی سے آگاہ ہو جائے۔ یاد رکھ، جب تو اپنی خودی کی معرفت حاصل کر لیگا تو اسوقت تجھ میں اتنی طاقت پیدا ہو جائیگی کہ تو زمان و مکان کی قید سے نکل سکیگا۔ اور جو شخص زمان و مکان سے بالاتر ہو جاتا ہے وہ (جیسا کہ سب جانتے ہیں) حیات جاوداں حاصل کر لیتا ہے۔

(۶) اے مسلمان! زندگی کی جنگ یا جد و جہد میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے تجھے اپنے آپ کو فولاد کی طرح مضبوط بنانا چاہئیے۔ یعنی مصائب برداشت کرنے کی طاقت پیدا کرنی چاہئیے۔ لیکن جب تو اپنے بھائیوں (مسلمانوں) سے ملے تو ریشم کی طرح

نرم ہو جا۔ یعنی اُن سے نرمی کا برتاؤ کر۔ یہ مضمون اس آیت سے ماخوذ ہے۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ بیشک (حضرت اقدس) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے (سچے) رسول ہیں۔ اور جو لوگ آپؐ کے ساتھ ہیں، یعنی (مسلمان) انکی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کافروں کے مقابلہ میں (فولاد کی طرح) سخت ہیں۔ (لیکن) آپس میں ایک دوسرے پر مہربان ہیں۔

(۷) اے مسلمان! اگر کوئی دشمن تیرے سامنے کوہ بنکر آئے تو اسکا مقابلہ کر، لیکن اگر کوئی شخص تجھ سے دوستی کرے تو اسکو فائدہ پہنچا۔ اسکے ساتھ حسن سلوک کر۔

(۸) اے مسلمان! تجھے اللہ نے دو قوتیں عطا فرمائی ہیں۔ فکر اور ذکر۔ قوت فکر کی بدولت تو علم حاصل کر سکتا ہے۔ اور قوتِ ذکر کی بدولت تجھ میں عشق رسولؐ کا رنگ پیدا ہو سکتا ہے۔ اور اس حقیقت کو مدنظر رکھ کہ نہ تیرے علم کی کوئی نہایت ہے، نہ عشق کی کوئی نہایت ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ تو کائنات میں اشرف المخلوقات ہے۔ تو اس کائنات کا حاکم اور سردار ہے۔ اسلئے اللہ نے تجھکو یہ دو طاقتیں ایسی عطا فرمائی ہیں، جو ذات کے اعتبار سے غیر محدود ہیں۔

آٹھواں بند: اے مسلمان! کیا یہ بات تیرے لئے باعث خجالت نہیں ہے کہ تو نے ابھی تک دنیا سے ملوکیت کا خاتمہ نہیں کیا؟ جب تک دنیا میں ملوکیت باقی ہے، انسان حقیقی معنوں میں آزاد نہیں ہو سکتا۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ انسان خود اپنے ہی بھائیوں کو اپنا غلام بناتا رہتا ہے۔

(۲) ملوکیت کے علاوہ تہذیب مغرب بھی بنی آدم کے حق میں لعنت ہے۔ اگرچہ بظاہر یہ تہذیب بہت دلکش ہے۔ لیکن یہ وہ زیور ہے جس میں جھوٹے نگینے لگے ہوئے ہیں، یعنی اس میں جس قدر خوبیاں نظر آتی ہیں وہ دراصل برائیاں ہیں۔

(۳) جس سائنس پر اہل یورپ فخر کرتے تھے، آج وہی سائنس اقوام مغرب کی ہوس پرستی اور استعمار پسندی کی وجہ سے بنی آدم کے حق میں لعنت بلکہ تباہی کا موجب بن گیا ہے۔ اس شعر میں اُن خوفناک اور مہلک آلات جنگ کی طرف اشارہ ہے جو سائنس کی بدولت عالم وجود میں آئے ہیں (اب ان میں "ایٹم بم" کا اور اضافہ ہو گیا ہے)

(۴) حقیقت یہ ہے کہ اہل مغرب، کتنی ہی کوشش کیوں نہ کریں، انکا تمدن (طریق زندگی) جسکی بنیاد سرمایہ داری اور ظلم و ستم پر ہے، کبھی پائیدار نہیں ہو سکتا۔ اقبال نے یہ خیال ۱۹۳۲ء میں ظاہر کیا تھا، اب ۱۹۵۱ء میں اسکی صداقت بالکل واضح ہو گئی ہے۔

(۵) انسان، اپنی فطرت کے اعتبار سے نہ نیک (نوری) ہے نہ بد (ناری) ہے۔ وہ اس دنیا میں جیسے اعمال کرتا ہے، ویسا ہی ہو جاتا ہے۔ جو قوم اللہ کے احکام کی پابندی کرتی ہے وہ نکوکار (جنتی) ہے اور جو نافرمانی کرتی ہے وہ بدکار (جہنمی) ہے۔

(۶) اے مسلمان! تیرا وجود اس دنیا کے حق میں سراسر باعث رحمت و برکت ہے اسلئے تو انسانوں کو محبت کا پیغام دے۔ اور اطاعت الٰہی کا سبق پڑھا۔ کیونکہ انسان کو صرف اللہ کی اطاعت سے اطمینان قلبی حاصل ہو سکتا ہے۔

(۷) ترکوں نے اپنے موجودہ طرز عمل سے ثابت کر دیا ہے کہ اگر وہ کمربستہ ہو جائیں تو دنیا کو اسلام کا امن آفریں پیغام سنا سکتے ہیں۔

(۸) اے مسلمانو! اٹھو! ستم رسیدہ انسانیت (جانِ ناتواں) تمہارے پیغام کو سننے کے لئے بیتاب ہے۔ بڑی مدت کے بعد تمہیں یہ موقع نصیب ہوا ہے، کہ اسلام کی خوبیاں دنیا پر ظاہر کرو۔ آج یورپ، جس مصیبت میں گرفتار ہے، اسکا ازالہ صرف اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے سے ہو سکتا ہے۔

نواں بند:۔ واضح ہو کہ یہ بند اقبالؔ نے فارسی میں لکھا ہے۔ نہ تو اسکے ترجمہ سے اسکا جوش بیان یا اسکی سرمستی اور کیفیت واضح ہو سکتی ہے۔ اور نہ مفہوم ظاہر ہو سکتا ہے۔ اسلئے ترجمہ کے بجائے میں اسکا مطلب اپنے لفظوں میں بیان کرتا ہوں، لیکن اس حقیقت کا اعتراف ضروری ہے کہ جو بات اقبالؔ کے اشعار میں ہے وہ میں اپنے لفظوں میں ادا نہیں کر سکتا۔ اے اسلام کے علمبردار اُٹھ اور دنیا کو اسلام کا پیغام سنا! کیونکہ عصر حاضر، اسلام کی تعلیمات کو قبول کرنے کے لئے آمادہ ہے۔ دنیا میں تبلیغ و اشاعت اسلام کا اسوقت زریں موقع ہے۔ اہل دنیا مصائب کی وجہ سے پریشان ہیں، تو قرآنی تعلیمات کو شائع کر کے اُن کے مصائب کا ازالہ کر سکتا ہے۔

اے مسلمان میں تیرے قربان جاؤں! اب عین موقع ہے کہ تو اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چل کر دنیا کو اسلام سے روشناس کرا دے۔ تمام قومیں زخموں سے چور ہیں، تو اسلام کے مرہم سے ان کو صحت عطا کر۔ حجروں سے نکل! میدان عمل میں آ! ہمت سے کام لے اور نڈر ہو کر اسلام کی تبلیغ کر۔ بڑی مدت کے بعد یہ زریں موقع نصیب ہوا ہے۔ دنیا والوں کو جو مادّہ پرستی کا خمیازہ بھگت رہے ہیں، سرکار دو عالم صلعم کے جمال کا نظارہ دکھا! حضورؐ کی سیرت مبارکہ کو لوگوں کے سامنے صحیح رنگ میں پیش کر۔ میں چونکہ حضورؐ کی روحانی طاقت سے آگاہ ہوں، اسلئے تجھے یقین دلاتا ہوں کہ اگر تو حضورؐ کی سیرت (اسوۂ حسنہ) اسوقت دنیا کے سامنے پیش کریگا تو یقیناً کامیابی ہوگی۔

اگر ہم اسوقت اسلام کی تبلیغ کے سلسلہ میں ایثار سے کام لیں تو ہماری کوشش (خون) سے ملت اسلامیہ (شاخ خلیل) کو چار چاند لگ جائینگے۔ وجہ یہ ہے کہ ہمارے پاس قرآن مجید (زر کامل عیار) ہے۔ اور یہ وہ کتاب ہے جو ہر مرض کی دوا ہے۔ میں ہر اُس مسلمان کے لئے، جو اسوقت میدان عمل میں آجائے، قرآن حکیم کی تبلیغ کے لئے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ لے، صدق دل سے دعائیں کرونگا۔ کیونکہ وہ اپنے عمل

(خون) سے نہالِ ملت کو تر و تازہ کر دیگا۔ پس اے مسلمانو! آؤ! سب مل کر اسلام کی تبلیغ کریں اور غیر مسلموں کو قرآن کا پیغام سنائیں۔ کفر کا خاتمہ کر دیں۔ اور نئی دنیا پیدا کر دیں۔ جس طرح تیرہ سو سال پہلے فاروق اعظمؓ نے پیدا کر دی تھی۔

نوٹ:۔ میں نے فاروق اعظمؓ کا اسم گرامی اسلئے پیش کیا ہے کہ

(۱) دنیا میں اللہ کی حکومت اسوقت قائم ہو سکتی ہے جب بنی آدم کو حریت کاملہ (یعنی حریت نفس، حریت ضمیر اور حریت فکر) نصیب ہو جائے۔

(۲) اور تاریخ گواہ ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد، فاروق اعظمؓ سے بڑھکر کسی شخص نے دنیا میں حریت کاملہ کو مستحکم نہیں کیا۔

نہ میں اس شرح میں اسلام کے اصول حریت کی وضاحت کر سکتا ہوں، نہ فاروق اعظمؓ کی سیرت قلمبند کر سکتا ہوں، صرف ایک واقعہ لکھتا ہوں:۔

جب ایک قبطی (مصری) نے فاروق اعظمؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ شکایت کی کہ مصر کے گورنر کے بیٹے نے مجھے بلا وجہ زدوکوب کیا ہے تو انہوں نے گورنر کو لکھا کہ "اللہ نے تو ہر انسان کو حریت کی نعمت سے نوازا ہے، تم کو یہ حق کہاں سے حاصل ہو گیا کہ لوگوں کو اس عطیۂ الٰہی سے محروم کر دو؟ اپنے بیٹے کو فوراً میرے پاس روانہ کرو، تاکہ مظلوم کی دادرسی ہو سکے۔"

حجۃ اللہ علی الارض حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے بالکل صحیح لکھا ہے، کہ (انبیاء کو چھوڑ کر، دنیا ابھی تک فاروق اعظمؓ کا جواب پیدا نہیں کر سکی ہے یہی وجہ ہے کہ مسٹر گاندھی نے ۱۹۳۷ء میں کانگریسی لیڈروں کو ہدایت کی تھی کہ فاروق اعظمؓ سے حکومت کا طریقہ سیکھو۔

غزلیاتِ حصّہ سوم

پہلی غزل بر صفحہ ۳۱۶

(۱) اے بادِ صبا! تو مدینہ جائے تو سرکار دو عالم صلعم سے عرض کیجیو کہ آپؐ کی امت نے چونکہ آپؐ کی اطاعت سے منہ موڑ لیا، اسلئے دین کے علاوہ حکومت بھی ان کے ہاتھ سے نکل گئی۔ بات یہ ہے کہ مسلمان کا مقصدِ حیات حکومت نہیں ہے، بلکہ تبلیغ اسلام ہے۔ مسلمانوں نے یہ غلطی کی کہ فرض منصبی سے غافل ہو کر دنیا طلبی میں منہمک ہو گئے نتیجہ یہ نکلا کہ نہ دین ملا نہ دنیا ملی۔ اگر وہ دین اختیار کر لیں تو دنیا خود بخود مل جائیگی۔

ع ملک و دولت ہے فقط حفظِ حرم کا اک ثمر

(۲) اقبالؔ مسلمانوں کو پیغام دیتے ہیں کہ خدا کی راہ میں تو بڑی بڑی دشواریاں لاحق حال ہوتی ہیں اے مسلمانو! تم صرف حکومت نکل جانے ہی سے پریشان ہوگئے۔

(۳) اے مسلمان! اسلام کی عزت، یعنی تیری عزت تو شعائرِ اسلامیہ کی پابندی پر منحصر ہے۔ جب تو نے اسلامی اصول کی پابندی ترک کر دی تو نہ حکومت رہی، نہ عزت رہی، اور نہ آبرو رہی۔

(۴) اے مسلمان! اگر تو کمال (آبرو) حاصل کرنا چاہتا ہے تو دنیاوی عزت کے لئے دوڑ دھوپ ترک کر دے اور کسی صاحب کمال کی صحبت اختیار کر۔ اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ تیری فطرت کی خامیاں بھی دور ہو جائینگی، اور تو لوگوں کے دروازوں کا طواف کرنے کی ذلت سے بھی محفوظ ہو جائیگا۔

---

(۵) بیشک یہ نظمیں اور غزلیں تو میں نے ہی لکھی ہیں، لیکن میرے تمام خیالات، قرآن و حدیث سے ماخوذ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میرے کلام کا مطالعہ روحانی تسکین بھی بخشتا ہے۔ اور دلوں کو بھی گرماتا ہے۔

دوسری غزل بر صفحہ ۳۱۷

(۱) انسان جب اپنے چاروں طرف نظر کرتا ہے تو اسے مختلف قسم کے ہنگامے نظر آتے ہیں۔ اور وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ یہ ہنگامہ، دنیا کی ذات میں داخل ہے۔ اقبالؔ کہتے ہیں کہ یہ سب فریب نظر ہے۔ در اصل کائنات فانی ہے۔ یہ چمن بظاہر ہنگاموں سے آباد ہے۔ لیکن اس کا باطن خاموش ہے۔ یعنی اسکی حقیقت فنا ہے۔ یہ بلبل اور قمری کے نغمے، یہ عیش و عشرت کی محفلیں سب آنی اور فانی چیزیں ہیں۔

(۲) تہذیب مغرب اختیار کرنے کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ ہم مشرقی لوگ تو تباہ ہو گئے اور اقوام مغرب ہماری حماقت پر ہنس رہی ہیں۔

(۳) اقبالؔ نے اس شعر میں ایک دلکش شاعرانہ نکتہ پیدا کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اے خدا! یہ دنیا جو بلا مبالغہ ایک غم خانہ ہے، اس میں تو کہیں نظر نہیں آتا۔ کیا دنیا کو پیدا کرنا بھی کوئی جرم تھا جو تو اس طرح روپوش ہو گیا؟ یہ شعر شاعرانہ شوخی کی عمدہ مثال ہے۔

(۴) انسان کا دل، دل نہیں ہے بلکہ "نگار خانہ ہے آرزو کا" یہی وجہ ہے کہ اسمیں ہر وقت ایک نیا ہنگامہ بپا رہتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان ہنگاموں میں شور و غل نہیں ہوتا۔ یہ شعر اسلوب بیان کی عمدہ مثال ہے۔

(۵) اے انسان! زندگی بسر کرنی کوئی آسان بات نہیں ہے، بچوں کا کھیل نہیں ہے بس یہ سمجھ لے کہ شراب کی بوتلیں تیرے کاندھوں پر رکھی ہوئی ہیں۔ ذرا سی لغزش سے سب ٹوٹ جائینگی۔ یعنی معمولی سی غلطی سے پوری زندگی تباہ ہو جاتی ہے۔ اقبالؔ نے اس شعر میں زندگی کی بہت بڑی حقیقت واضح کر دی ہے۔

(۶) اس شعر میں اقبالؔ نے مرزا ارشد گورگانی دہلوی کی وفات کی طرف اشارہ کیا ہے، جو دلی کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ نہایت شریف اور سخن سنج تھے، کچھ عرصہ لاہور میں رہے۔ اسکے بعد فیروز پور ہائی اسکول میں فارسی کے مدرس ہو کر چلے گئے تھے۔ انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسوں میں شریک ہو کر اپنی نظموں سے سامعین کو محظوظ کرتے تھے۔ چونکہ انکی وجہ سے لاہور کے بعض اشخاص میں شعر و سخن کا ذوق پیدا ہو گیا تھا، اسلئے اقبالؔ نے یہ مصرع لکھا کہ "جس کے دم سے دلی و لاہور ہم پہلو ہوئے"

تیسری غزل بر صفحہ ۳۱۸

(۱) مطلب یہ ہے کہ مسلمان کو اُسوقت میدان عمل (جہاد) میں آنا چاہئے جب سیرت میں پختگی پیدا ہو جائے۔ تاکہ وہ دنیا کے مصائب کا مقابلہ کر سکے۔

(۲) یہ مشہور شعر ہے جسمیں اقبالؔ نے عشق اور عقل کے بنیادی فرق کو واضح کیا ہے۔ عقل میں جبتک مصلحت اندیشی کا رنگ پیدا نہ ہو، کامل نہیں ہوتی، لیکن عشق کی نوعیت اسکے برعکس ہے، اگر اسمیں مصلحت اندیشی کا رنگ باقی ہے تو وہ کامل نہیں ہے یعنی عقل کا تقاضا یہ ہے کہ وہ انسان کو اپنی جان خطرات میں ڈالنے سے روکتی ہے، اسکے خلاف عشق انسان کو میدان جنگ میں سرفروشی کی تعلیم دیتا ہے۔

(۳) چنانچہ دیکھ لو! حضرت ابراہیمؑ بلا تامل اُس آگ میں داخل ہو گئے جو نمرود نے اُن کو جلانے کے لئے تیار کرائی تھی۔ لیکن اربابِ عقل (فلاسفہ) ابھی تک تذبذب میں گرفتار ہیں کہ خدا ہے یا نہیں، اور ہم اسکی خاطر جہاد کریں یا نہ کریں۔

(۴) یہ شعر بھی دوسرے شعر کی وضاحت کرتا ہے۔ کہتے ہیں کہ صدیق اکبرؓ نے سرکار دوعالم صلعم کی زبان مبارک سے جو وقت یہ الفاظ سُنے کہ میں اللہ کا رسولؐ ہوں تو فوراً ایمان لاکر، اتباع رسول شروع کردی۔ لیکن ابوجہل جو مکہ میں عقل و خرد کے لئے مشہور تھا، ساری عمر، رسالت کا مفہوم ہی نہ سمجھ سکا۔

نوٹ:۔ جب لوگوں نے حضرت ابوبکرؓ سے پوچھا کہ تم نے نہ کوئی معجزہ دیکھا نہ گفتگو کی، پھر کیسے آنحضرتؐ کی رسالت پر ایمان لے آئے؟ تو اُس عاشق صادقؓ نے یہ جواب دیا کہ "مجھے حضور کا روئے انور ہی دیکھکر یقین ہوگیا تھا —اور یہ قول داستان عشق میں قیامت تک بے نظیر رہیگا — کہ یہ دلکش چہرہ کسی جھوٹے انسان کا نہیں ہوسکتا"۔ مرشد رومیؒ نے اسی حقیقت کو مثنوی میں یوں بیان کیا ہے ؎

در دلِ ہر اُمتی کز حق مزہ است
روئے و آواز پیمبرؐ معجزہ است

(۵) اے مسلمان! اگر تو شیوۂ عشق اختیار کرلے، تو تجھے زمان و مکان کی قیود سے بھی آزادی نصیب ہوجائیگی اور تو دنیا میں انقلاب بھی پیدا کرسکے گا۔ لیکن افسوس ہے کہ تو ابھی تک زمان و مکان کی قید میں گرفتار ہے۔ اس لاجواب شعر میں اقبالؔ نے زمانہ (ایّام) کو بُت خانہ قرار دیکر انسان کو پجاری (زُنّاری) باندھا ہے۔ اس ترکیب سے شعر میں غضب کی دلکشی پیدا ہوگئی ہے۔

(۶) اس شعر کا اسلوبِ بیان نہایت دلکش ہے۔ کہتے ہیں کہ جب میں کثرتِ مئنوشی سے انکار کرتا ہوں تو ساقی بگڑ کر کہتا ہے کہ اقبالؔ! تو ابھی تک اس شغل (مئنوشی) کے انجام کے تصوّر سے خائف ہے۔ یہ بُزدلی تجھے ہرگز زیب نہیں دیتی۔ مطلب یہ ہے کہ جب میں جہاد سے جان چُراکر، کسی گوشۂ عافیت میں پوشیدہ ہوجاتا ہوں

تو سرکار دوعالم صلعم (ساقی) کی روح مجھ سے کہتی ہے کہ افسوس! تو مسلمان ہوکر موت (انجام) سے ڈرتا ہے!

(۷) کم و کیف۔ منطق کی ان دونوں اصطلاحوں کو قبل ازیں واضح کرچکا ہوں۔ کم و کیفِ حیات، بہت بلیغ ترکیب ہے۔ اسکی وضاحت یہ ہے کہ ہم زندگی کی قیمت کا عموماً دو طرح اندازہ کرتے ہیں۔ پہلی صورت یہ ہے کہ ایک انسان نوّے سال کی عمر میں فوت ہوتا ہے۔ مرتے وقت ایسا صندوقچہ، تمغوں، اور سندات سے لبریز چھوڑتا ہے۔ جس میں جنرل نکلسن سے لیکر سرمائیکل اوڈوائر تک تمام "خداوندان لندن" کی خوشنودیٔ مزاج کا جلوہ نظر آتا ہے۔ اسکے علاوہ بہت سے باغات اور مربعے، بہت سی کوٹھیاں اور جاگیریں۔ اس مبارک اور سکندر بخت انسان کی زندگی "کم حیات" کی تصویر ہے۔

اسکے مقابلہ میں، دوسرا انسان، صرف ۴۸ سال زندہ رہتاہے، لیکن جبتک زندہ رہتاہے، دین و ملت کے دشمنوں سے جنگ کرتا رہتاہے۔ چاروں طرف سے محصور ہوجاتاہے۔ لیکن ہمت نہیں ہارتا اور ۴ رمئی ۱۷۹۹ء کو مردانہ وار جامِ شہادت نوش کرلیتاہے۔ یہ مردِ مومن "کیفِ حیات" کی تفسیر ہے۔

زانکہ در عرضِ حیات، آمد ثبات
از خدا کم خواستم طولِ حیات (جاویدنامہ)

اب اسکا خلاصہ لکھتا ہوں (ا) کم حیات کا مطلب ہے کتنی مدت زندہ رہا اور کتنا عیش کیا؟ (ب) کیف حیات کا مطلب ہے، جتنی مدت بھی زندہ رہا، (خواہ بیس برس ہی جیا) کیسے اور کس انداز سے زندہ رہا؟ غلامی کی حالت میں یا سروری کے عالم میں؟ اگر کسی کی زندگی میں کم اور کیف دونوں شانیں جمع ہوجائیں تو وہ سلطان محمود بیگڑہ، یا سلطان اورنگزیب عالمگیرؒ بنجاتاہے۔

اوّل الذکر نے پچپن سال اور آخر الذکر نے پچاس سال حکمرانی کی، اور کسی معرکہ میں ناکامی کا مونہہ نہیں دیکھا۔

اقبالؔ کہتے ہیں کہ زندگی کی کامیابی کا اندازہ، طولِ حیات (شمارِ سحر و شام) سے مت کر، یہ دیکھ کہ جتنے دن جیا، کیونکر جیا، اور کیسے جیا؟ بھیک مانگتا رہا، یا دولت لٹاتا رہا؟ غلامی کرتا رہا، یا آزاد رہا؟

(۸) اے خدا! میری قوم کے افراد (لالے) تیری نگاہِ کرم کے محتاج ہیں۔ ان میں ابھی تک کفر کا مقابلہ کرنے کی طاقت پیدا نہیں ہوئی ہے، اسلئے تو اُن کے دلوں میں ہمت اور حوصلے کے دریا بہادے۔ اوسوں سے پیاس نہیں بُجھ سکتی۔

(۹) میری قوم کے نوجوان، کالجوں میں غیر اسلامی علوم پڑھتے ہیں۔ اور میرے کلام میں اوّل سے آخر تک قرآن اور حدیث کا رنگ پایا جاتا ہے۔ اسلئے قدرتی طور پر وہ ابھی میرے پیغام (ساغر) سے گریز کرتے ہیں۔

(۱۰) جس طرح یہ غزل لاجواب ہے۔ یہ مقطع بھی بے نظیر ہے۔ اگر رنگِ تغزل سے قطع نظر کرکے، اس میں تاویل کی جائے تو یہ مطلب ہوگا کہ جب کوئی مسلمان، جسکی سابقہ زندگی سرکار پرستی میں گذری ہو، کسی مرشد کی خدمت میں اصلاحِ نفس کے لئے حاضر ہوتاہے تو شروع شروع میں بہت گھبراتا ہے۔

چوتھی غزل بر ص ۳۱۹

(۱) اے مسلمان! اگر تجھ میں اسلام جلوہ گر ہے، اگر تو واقعی مسلمان ہے تو پھر گوشۂ گمنامی میں کیوں پڑا ہے؟ حجرے میں کیوں چھُپا ہوا ہے؟ میدانِ عمل میں آ، اور دنیا کو اسلام کی خوبیوں سے آگاہ کر!

(۲) اس میں خالص تغزل کا رنگ پایا جاتا ہے۔ یعنی شاعر اپنے محبوب سے کہتا ہے کہ

تو سراپا حُسن ہے۔ بلکہ مظہرِ کمالِ حُسن ہے۔ اسلئے یہ پردہ یعنی چہ؟ مجھے زحمتِ انتظار کیوں دیتاہے؟ کھل کر سامنے آ اور دیوانہ بنا دے! عاشق یہ چاہتاہے کہ معشوق اُسے دنیا اور مافیہا سے بیخبر کردے۔

(۳) اے مسلمان! اگر تیرے دل میں عشقِ رسولؐ (نفسِ گرم) کی آگ بھڑک رہی ہے، تو بلاشبہ تو لوگوں کو زندہ کرسکتاہے۔

(۴) مطلب یہ ہے کہ اگر انسان سچّے دل سے خدا کی محبت اختیار کرے تو طور پر جانیکی ضرورت نہیں ہوگی۔ عاشق خود مہبطِ انوارِ الٰہی بنجائیگا، اور اُسکی شخصیت خود دوسروں کے لئے "خدانما" بنجائیگی۔ اقبالؔ نے اس پامال مضمون کو بڑے دلکش طریقہ سے باندھا ہے۔

(۵) اے مسلمان! تہذیبِ مغرب (اندازِ کلیسائی) سے اجتناب کلی اختیار کر، کافرانہ طریقِ زندگی بالکل ترک کردے۔ تاکہ تو اپنی زندگی کی تمام طاقتوں کو اسلام کی خدمت (تعمیرِ حرم) کے لئے وقف کرسکے۔

(۶) دنیا میں کامیاب زندگی بسر کرنے کے لئے انسان کو اعتدال کا رنگ اختیار کرنا لازم ہے۔ اُسی قدر ناز کرے جس قدر حُسن و جمال (رعنائی) ہو۔ یعنی جس مقام یا مرتبہ کی اہلیت ہو اُسی کی آرزو کرے۔

(۷) جو شخص دنیا میں عزت اور سروری کا خواہشمند ہو، اُسے لازم ہے کہ پہلے اپنے اندر خودداری (عزتِ نفس) کی صفت پیدا کرے۔ جو شخص دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلاتا ہے، وہ کبھی دنیا میں معزز نہیں ہوسکتا۔

(۸) کامیابی (منزلِ لیلیٰ) کے لئے مسلسل جد و جہد شرط ہے۔

پانچویں غزل بر ص ۳۱۹

(۱) مطلب یہ ہے کہ جب فطرت اپنا فیض عام کردے تو ہر شخص کو لازم ہے کہ

اُس سے بقدر ظرف فائدہ حاصل کرے۔ اگر غفلت کریگا تو موقع ہاتھ سے نکل جائیگا اور دوسرے لوگ آگے بڑھ جائینگے۔

(۲) انسان کو فطرت نے ترقی کی صلاحیت عطا کی ہے اسلئے اسکا فرض ہے کہ اپنی مخفی صلاحیتوں کو بروئے کار لائے۔ اور ساری دنیا پر چھا جائے۔

(۳) اے مسلمان! یہ سچ ہے کہ تو اپنی ذات کے اعتبار سے بہت قیمتی ہے۔ لیکن اہل دنیا چونکہ جواہرات اسلام کی صحیح قدر نہیں کر سکتے۔ (قیمت کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے) اسلئے تو کفرستان میں اپنے فیض کو عام کردے یعنی ہر شخص کو محبت (عشق رسولؐ) کا پیغام پہونچا۔

(۴) تو اسلام کا علمبردار ہے (نغمہ رنگین ہے) اور اسلام دنیا میں بہترین ضابطۂ حیات ہے۔ تمام خوبیوں کا مجموعہ ہے۔ اسلئے تو ماسکو سے لیکر نیویارک تک ہر شخص کو اسلام کا پیغام سُنا!

نوٹ:- کاش! مسلمان اقبالؔ کے اس پیغام کو سمجھ سکیں ۱۲

(۵) اے مسلمان! تو اس طرح زندگی بسر کر کہ اگر دوستوں سے سابقہ ہو تو اُن کو فیض پہونچا، اور دشمنوں سے مقابلہ ہو تو اُن کو تباہ کردے۔

(۶) اے مسلمان! اس حقیقت کو مدنظر رکھ کہ عیش وعشرت کے لوازم، انسان کو کاہل اور بزدل بنا دیتے ہیں۔ اگر تو میدان جنگ میں کامیاب ہونا چاہتا ہے تو ان تمام لوازم عیش سے قطع نظر کرلے۔

نوٹ:- اٹھارہویں صدی میں سکھوں کو مسلمانوں پر جو غلبہ حاصل ہوا اُسکی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ گوبند سنگھ نے سامان عیش کی محبت اُنکے دل سے نکالدی تھی ۱۲

چھٹی غزل بر صفحہ ۳۲

نوٹ:- یہ بانگ درا کی سب سے زیادہ مشہور ومعروف غزل ہے، لیکن اسکی شہرت کا باعث یہ نہیں ہے کہ قوم نے اسکے مفہوم سے آشنا ہوکر اسکو قبول عام کی سند عطا کردی، بلکہ اسکا مطلع اور مقطع بدقسمتی سے قوّالوں کو پسند آگیا۔ اور اُنہوں نے اس غزل کو پشاور سے لیکر کلکتہ تک ہر محفل میں، اور ہر درگاہ میں گانا شروع کردیا۔ راقم الحروف نے ۱۹۲۵ء میں اس غزل کو سب سے پہلے ایک قوال ہی کی زبان سے سُنا تھا، جو "مقتظر کو منتظِر" الاپ رہا تھا۔ اسکے باوجود سامعین اپنا سر دُھن رہے تھے۔ کیونکہ مسلمانوں کا مقصدِ حیات سر دُھننا ہے، نہ کہ علم حاصل کرنا۔

اب میں یہ واضح کردوں کہ قوّالوں کو یہ غزل کیوں پسند آگئی؟ وجہ یہ ہے کہ اس غزل میں تصوّف کی زبردست چاشنی موجود ہے، اور خصوصًا یہ الفاظ تو بہت دلکش ہیں، حقیقت اور مجاز، آئینہ اور آئینہ ساز، سوز اور گداز، غزنوی اور ایاز، صنم آشنا اور نماز۔ یوپی کے ایک شاعر نے (جس کا نام مجھے اب یاد نہیں رہا) اُسی زمانہ میں، اسکے جواب میں ایک غزل لکھی تھی، اُس غزل کا چراغ تو آفتاب کے سامنے کیا جلتا، ہاں قوالوں نے، دونوں غزلوں کو ترکیب دیکر ایک معجون مرکب ضرور تیار کرلی تھی۔ اُس غزل کا صرف ایک شعر یاد رہ گیا ہے:-

مرا سجدہ سہو میں پڑ گیا، اب اسے قضا کہوں یا ادا
تری یاد نے یہ غضب کیا، کہ ستایا آکے نماز میں

پہلا شعر:- حقیقتِ منتظر، وہ حقیقت، جس کا یا جسکے ظہور کا انتظار کیا جائے "حقیقت" فلسفہ اور تصوّف دونوں کی اصطلاح ہے۔ اور بہت وسیع مفہوم

کی حامل ہے۔ یہاں اس سے محبوب یا ذاتِ خداوندی مراد ہے۔ حقیقت کے لغوی معنی ہیں، وہ ذات جسے فنا نہ ہو، لباس مجاز سے مادی شکل مراد ہے جو حواس خمسہ سے محسوس ہو سکے۔

عاشق یہ کہتا ہے کہ اے خدا! میں تجھے سجدہ کرنا چاہتا ہوں، اسلئے تو کسی مادی شکل میں میری آنکھوں کے سامنے عیاں ہوجا۔ سجدہ تو اب بھی کر رہا ہوں لیکن میں انسان ہوں، اسلئے اس میں وہ لطف نہیں آتا جسکو میرا دل ڈھونڈتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ شاعر نے خدا کو مجازی محبوب فرض کرکے یہ درخواست کی ہے کہ میں تیرے دیدار کے لئے مدتوں سے ترس رہا ہوں۔ سامنے آجا تاکہ تیرے قدموں میں سر رکھدوں۔

دوسرا شعر:- اے مسلمان! اپنے عشق کی بدولت دنیا میں ہنگامہ برپا کردے۔ تیرے سینہ میں قرآن (نوا) مخفی ہے اُسے دنیا پر ظاہر کردے۔ اسکے دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ تو اپنی خودی کو دنیا پر آشکار کردے۔ اللہ نے یہ جوہرِ خودی (سرود) اسلئے عطا نہیں کیا کہ ساز (شخصیت) کے پردوں میں چھُپا رہے۔ یہ بات بھی سچی ہے کہ جو نغمہ ساز میں پوشیدہ ہے، دنیا اسکی کوئی قدر نہیں کرسکتی۔

تیسرا شعر:- اے مسلمان! تو اپنے دل کو عشق کی دستبرد سے محفوظ مت کر۔ یہ وہ آئینہ ہے کہ جس قدر شکستہ ہوگا، اُسی قدر خدا کی نظروں میں محبوب اور قیمتی ہوگا۔ یعنی تیرا دل خدا کے عشق میں جس قدر پامال ہوگا، اُسی قدر سرفراز ہوگا۔ اگر ثبوت درکار ہو تو سرخیلِ عُشّاق حضرت شیخ ہجویری المعروف بہ "داتا گنج بخشؒ" کی زندگی کا مطالعہ کرلو۔ انکی وفات کو نوسَو سال سے زائد ہوگئے۔ لیکن رجوعِ خلائق، یعنی دلکشی کا وہی عالم ہے۔

چوتھا شعر:- اس شعر میں اقبالؔ نے مسلمانوں کی عام دینی بےحسی کا نقشہ کھینچا ہے

جب مسلمان خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہیں تو اُن کا دل خود اُن سے یہ کہتا ہے کہ نہ بندیوں میں اس مقام مقدس کی حفاظت کا جذبہ پایا جاتا ہے، نہ حجازیوں میں۔ طواف تو بدستور جاری ہے لیکن طواف کی روح فنا ہوچکی ہے۔

دوسرا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ "شمع" سے دینی پیشوا مراد لی جائے اور کرمک شمع سے عوام مراد لئے جائیں، یعنی نہ خواص میں اسلام کا رنگ پایا جاتا ہے، نہ عوام میں۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ قوم، لاشۂ بیجان ہوکر رہ گئی ہے۔

پانچواں شعر:- یہ شعر آسان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسان، خطا کا پتلا ہے، دن رات گناہ کرتا رہتا ہے۔ اگر اللہ اپنی رحمت سے اسکے گناہوں کو معاف نہ کرے تو اُسے دارین میں کہیں پناہ (امان) نہیں مل سکتی، یعنی وہ نجات نہیں پا سکتا۔

چھٹا شعر:- یہ شعر بھی آسان ہے۔ یعنی مسلمانوں پر زوال کی کیفیت طاری ہے، نہ عاشقوں (غزنوی) میں وہ تڑپ نظر آتی ہے، نہ معشوقوں (رہنماؤں) میں وہ خلوص کارفرما ہے۔

ساتواں شعر:- شعر کا مطلب بالکل واضح ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ یہ شعر حاصل غزل ہے۔ جبتک انسان اپنے دل کو غیر اللہ کی محبت سے پاک نہ کرے اُس وقت تک نماز پڑھنے سے کوئی روحانی فائدہ مرتب نہیں ہو سکتا۔ جب کبھی میں یہ شعر پڑھتا ہوں، تو مجھے سری کرشن کا یہ قول یاد آجاتا ہے کہ "اے ارجن! میں تو صرف اُن لوگوں کے دلوں میں براجمان ہوتا ہوں، جو میرے سوا کسی غیر سے محبت نہیں کرتے اگر تو مجھے پانا چاہتا ہے تو میرے سوا کسی کا دھیان مت کر، کسی سے دل مت لگا، اپنی پوری شخصیت مجھ پر نثار کردے۔ میری اطاعت کر اور مجھ میں فنا ہوجا۔ میں تجھے وچن (قول) دیتا ہوں کہ اگر تو میرا ہوجائے تو میں تیرا ہوجاؤنگا"

(دیکھو بھگوت گیتا ادھیائے ۱۸، اشلوک ۶۵)

ساتویں غزل برص ۳۲۱

(۱) مطلب یہ ہے کہ عاشق اگر، کسی وجہ سے، پابندِ غیر ہو جائے تو خواہ کتنی ہی نمازیں کیوں نہ پڑھے، نہ اُسے لطف آسکتا ہے، نہ نماز کا حق ادا ہو سکتا ہے اور نہ نتیجہ مرتب ہو سکتا ہے۔ عبادت اور اطاعت (فغاں) اُسی وقت مرتبہ کمال حاصل کر سکتی ہے، جب عاشق (طائر) آزاد ہو۔

(۲) یہ شعر، خالص تغزل کے رنگ میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں بلا کی دلکشی ہے اقبالؔ نے اس شعر میں عاشق کے دل کی اندرونی کیفیت کا صحیح نقشہ کھینچا ہے۔ اگر محبوب کسی وقت، اپنا جلوہ دکھا بھی دے، تو اُس سے عاشق کے گریۂ سحری، اور آہِ نیم شبی میں کمی نہیں ہو سکتی۔ وجہ یہ ہے کہ اس کمبخت عشق کی نوعیت ہی یہ ہے کہ عاشق، معشوق کو اپنے اندر جذب کر لینا چاہتا ہے۔ جب تک عاشق کے ذہن میں دوئی کا احساس باقی رہتا ہے۔ یعنی جبتک یہ شعور قائم رہتا ہے کہ معشوق "وہ" ہے اور میں "یہ" ہوں۔ اُسوقت تک اُسے شانتی نصیب نہیں ہو سکتی۔ عشق اس "من و تو" کے امتیاز کو مٹانا چاہتا ہے۔ اور جو لوگ سچے ہوتے ہیں وہ اسی زندگی میں اس امتیاز کو مٹا دیتے ہیں۔ اقبالؔ کی شاعری اور فلسفہ دونوں کا خلاصہ اسکے سوا اور کچھ نہیں کہ لیلیٰ تو خود تیرے محمل میں پوشیدہ ہے تو اُسے نجد کے صحرا میں کیوں ڈھونڈتا ہے؟

جنہیں میں ڈھونڈتا تھا، آسمانوں میں زمینوں میں
وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں

ناظرین اس نظم کو غور سے پڑھیں، اقبالؔ کا مسلک واضح ہو جائیگا۔

(۳) بہت عمدہ شعر ہے "نہ خدا رہا" اسکا مطلب یہ ہے کہ مادہ پرستی کے موجودہ دور میں نہ کہیں خدا پرستوں کا وجود باقی رہا نہ بت پرستوں کا، نہ تجانوں میں وہ رونق نظر آتی ہے نہ مسجدوں میں، نہ کسی مسلمان میں حضرت علیؓ کی سی شان پائی جاتی ہے نہ کسی کافر میں ابولہب کا رنگ نظر آتا ہے، ساری دنیا عورت اور دولت کے چکر میں پھنسی ہوئی ہے۔

(۴) بہت خوب شعر ہے۔ کہتے ہیں کہ اگرچہ میری زندگی غیر اسلامی ماحول میں بسر ہوئی لیکن خدا کا شکر ہے کہ میں اپنی زبان سے ساری عمر قرآن اور حدیث ہی کا پیغام دیتا رہا۔ اقبالؔ کے یہاں عجم سے ہمیشہ غیر اسلامی خیالات اور تصورات مراد ہوتے ہیں۔

آخری غزل برص ۳۲۲

چونکہ آخری غزل ہے اسلئے اقبالؔ نے اس میں ساری بانگ درا کا عطر کھینچکر رکھدیا ہے۔ اگر ان چار شعروں کی شرح لکھی جائے تو ایک مستقل کتاب مرتب ہو سکتی ہے اسلئے صرف اشارات پر اکتفا کرتا ہوں۔

(۱) اے مسلمان! یہ سچ ہے کہ تو دنیا میں ظاہری یا مادّی اسباب اور وسائل کا محتاج ہے، اور تجھے کسی کام کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے کے لئے تمام ممکن وسائل مہیا بھی کرنے لازمی ہیں۔ لیکن یہ مت سمجھ بیٹھنا کہ کامیابی کا انحصار ان مادّی اسباب پر ہے تیرے دل میں یہ خیال کبھی ہرگز نہ آنے پائے، ورنہ وہ بھی تیرے جسم کی طرح "زندانی اسباب" ہو جائیگا اور اسکا نتیجہ یہ نکلے گا کہ تو مادّہ پرست بنجائیگا۔ اگر تو اسلام پر قائم رہنا چاہتا ہے تو ہمیشہ یہ یقین رکھ کہ کامیابی کا دارومدار فضلِ ایزدی پر ہے۔ اگر وہ نہ چاہے تو سارے اسباب دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔

تدبیر سدا راست جو آتی نہیں اکبرؔ
معلوم ہوا یہ کہ خدا بھی ہے کوئی چیز

(۲) اے مسلمان! عقل ہر وقت اللہ کی ہستی پر اعتراضات وارد کرتی رہتی ہے، بلکہ عقل کی پیروی کی جائے تو کوئی شخص خدا پرستی نہیں کر سکتا۔ اتباعِ عقل کا منطقی نتیجہ تشکیک (تذبذب) ہے۔ پس عقل پرست انسان تو قیامت تک سرفروشی نہیں کر سکتا۔ اسلئے اے مسلمان! تو اگر کامیاب ہونا چاہتا ہے تو مسلکِ عشق اختیار کر، عشق تجھکو سرکار دوعالم صلعم کے غلاموں کی صف میں جگہ عطا کر سکتا ہے۔

(۳) اے مسلمان! ہر وقت، حتی الامکان اپنی اصلاح میں مصروف رہ۔ اور اللہ اور اُسکے رسولؐ کی اطاعت کر، تاکہ اللہ اپنا وعدہ پورا فرمائے۔ اور پھر تجھے سروری حاصل ہو جائے۔ یاد رکھ! کہ اللہ کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ یہ بات اُسکی شان کے خلاف ہے۔ پس اگر تو چاہتا ہے کہ وہ اپنا وعدہ پورا کرے تو تجھے لازم ہے کہ تو اپنا وعدہ پورا کر۔

(۴) حضرت اکبر الہ آبادی قوم کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ اے مسلمانو! اللہ نے جو وعدے قرآن مجید میں مومنوں سے کئے ہیں وہ سب حرف بحرف صحیح ہیں۔ اسلئے تم ایسی زندگی بسر کرو کہ اللہ اُن مواعید کا ایفا فرمائے۔

حضرت اکبر مرحوم ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے تھے، اور اقبالؔ کے بہت مداح تھے۔ انکے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اقبالؔ کے ساتھ بزرگانہ شفقت ملحوظ رکھتے تھے۔ اگرچہ انکا انتقال ۱۹۲۱ء میں ہو گیا۔ اور اسلئے وہ اقبالؔ کے علمی کمالات سے آگاہ نہو سکے۔ لیکن اُنہوں نے پیشگوئی کر دی تھی کہ ایک دن اقبالؔ، آسمانِ علم و فضل پر آفتاب بنکر چمکیں گے۔ اگر اللہ نے توفیق دی تو اکبر مرحوم کے کلام پر مفصل تنقید لکھکر قوم کی خدمت میں پیش کرونگا۔ اکبر بہت بڑا آدمی تھا لیکن قوم نے اُسے صرف ایک ظریف شاعر ہی سمجھا۔

ظریفانہ

پہلی نظم برص ۳۲۵

مطلب | اس نظم کا مطلب یہ ہے کہ مشرقی قومیں مذہب کی طرف مائل ہیں اور مادّی ترقی کی طرف سے بالکل غافل ہیں۔ گذشتہ چار سو سال میں کسی ایشیائی قوم نے چین سے لیکر عرب تک، نہ کوئی آلہ ایجاد کیا، نہ کوئی علمی تحقیق کی، نہ کوئی نئی چیز دریافت کی۔ لیکن مغربی قومیں دن رات آلات ایجاد کرتی رہتی ہیں اور مشینوں کے ذریعہ سے مہینوں کا کام دنوں میں انجام دیتی ہیں۔ چنانچہ اسکا نتیجہ یہ ہے، کہ ہم تو مفلس ہوتے جاتے ہیں، اور وہ ایک کے تین تین (روپے) بنا لیتے ہیں۔

نوٹ:- ایک اور تین میں صنعتِ ایہام پائی جاتی ہے۔ اسلئے اسکے دوسرے معنٰی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اگرچہ ہم دینداری کے مدعی ہیں، لیکن حالت یہ ہے کہ ہم توحید پر ایمان نہیں رکھتے۔ اور یورپ والے جو مادیات میں منہمک ہیں اسکے باوجود تثلیث پر ایمان رکھتے ہیں۔

واضح ہو کہ نصاریٰ، تثلیث فی التوحید کے قائل ہیں۔ یعنی باپ، بیٹا، اور روح قدس، تینوں خدا ہیں، لیکن تین خدا نہیں ہیں، بلکہ یہ تینوں ملکر ایک خدا ہے۔

دوسری نظم برص ۳۲۵

مطلب | مسلمانوں نے چونکہ تعلیم نسواں کو اپنی قومی فلاح کا ذریعہ سمجھ لیا ہے اسلئے مسلمان لڑکیاں بڑے شوق سے انگریزی پڑھ رہی ہیں۔ اُن کے والدین قدیم مشرقی طرزِ تعلیم اور طریقِ معاشرت کو ناپسند کرتے ہیں۔ اسلئے اپنی لڑکیوں کو مغربی سانچوں میں ڈھال رہے ہیں۔ تیسرے مصرع میں صنعتِ ایہام پائی جاتی ہے۔

ڈراما (۱) وہ تماشہ جو اسٹیج پر دکھایا جاتا ہے (۲) یہ موجودہ طرزِ تعلیم۔

سین (۱) ہر ڈرامہ میں مناظر ہوتے ہیں، جن کو اصطلاح میں سین کہتے ہیں۔
(۲) نظارہ یا نقشہ، یا نتیجہ، یا انجام۔

پردہ (۱) اسٹیج کے اوپر خوبصورت ریشمی پردہ پڑا ہوتا ہے۔
(۲) شرعی حجاب، یا مسلمان عورت کا چہرے پر نقاب ڈال کر باہر نکلنا۔

مطلب یہ ہے کہ مسلمان، اپنی لڑکیوں کو انگریزی پڑھا تو رہے ہیں لیکن اس کا نتیجہ انہیں اُس وقت معلوم ہوگا جب مسلمان عورتیں پردہ کی رسم ترک کر دینگی۔

پہلی نظم بر ص ۳۲۶

مطلب | اس نظم میں اکبر الہ آبادی کے مشہور شعر کے ایک مصرع پر تضمین کی ہے۔ اقبال کے تمام مصرعے آسان ہیں۔ اکبر کے مصرع میں لفظ "زن" میں ابہام ہے۔ زن بمعنی عورت اور زن بمعنی زنانہ صفات رکھنے والا یعنی آج کل کی عورتیں یہ کہتی ہیں کہ جب آج کل کے مرد، خود زنانے ہوگئے یعنی ان میں مردانہ صفات مثلاً شجاعت، جوانمردی، ذوق سپہ گری، شوق شہادت وغیرہ تو مفقود ہو گئیں اور ان کے بجائے نسوانی عادات پیدا ہو گئیں تو اب ہم پردہ کس سے کریں؟ دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ جب مردوں نے کرزن فیشن اختیار کرکے اپنی صورت عورتوں کی سی بنالی یعنی صورت کے اعتبار سے زن ہو گئے تو اب عورتوں کو اپنی جنس کے افراد سے پردہ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

دوسری نظم بر ص ۳۲۶

مطلب | اے مسلمان! اگر تو تہذیب مغرب کی اسی طرح تقلید کرتا رہا تو وہ دن دور نہیں ہے جب تجھ میں غیرت اور عورت میں حیا بالکل باقی نہیں رہیگی نیز وہ زمانہ بھی عنقریب آنے والا ہے جب عورتیں، اولاد کے بجائے ممبری کیلئے دربدر ووٹ مانگتی پھر ینگی۔

نوٹ | پہلے زمانہ میں عورتیں، اولاد کی اسقدر تمنائی ہوتی تھیں کہ اگر کسی عورت کے اولاد نہیں ہوتی تھی تو وہ علاج معالجہ کے علاوہ درگاہوں پر جاکر اولاد کیلئے دعائیں کیا کرتی تھی۔

تیسری نظم بر ص ۳۲۶

مطلب | کہتے ہیں کہ مغربی تعلیم کی بدولت ہماری قوم کے نوجوانوں میں بہت جرأت پیدا ہو جائیگی کیونکہ اس تعلیم کا پہلا سبق یہ ہے کہ ایک طالبعلم دوسرے طالب علم سے ملے تو ہر بات میں شیخی بگھارے۔ اقبال نے لفظ "مار" سے ایہام کا رنگ پیدا کیا ہے۔ مارنا (۱) کسی کو لاٹھی سے یا گھونسہ سے مارنا (۲) جب ڈینگ کے ساتھ یہ لفظ مستعمل ہو تو اس کے معنی ہوتے ہیں تعلّی آمیز گفتگو کرنا یا شیخی بگھارنا اس شعر کا لطف لفظ "مار" میں مضمر ہے۔

(۲) چونکہ ہندوستان میں صنعت و حرفت اور تجارت کا بالکل رواج نہیں اسلئے یورپ کے ملکوں سے تو سامانِ تجارت آتا ہی ہے، افغانستان جیسے پس ماندہ ملک سے بھی آغا لوگ ہینگ بیچنے آجاتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ہندوستان کے باشندے ہر بات کے لئے غیر ممالک کے محتاج ہیں۔ اس شعر میں اسی احتیاج کی وضاحت مدنظر ہے۔

(۳) حاکم اور محکوم کی ذہنیت کا موازنہ اور حاکم کی فرعونیت کا اظہار کیا ہے۔ جب محکوم، کسی حاکم کے قدموں پر اپنا سر رکھتا ہے، تو حاکم کی نخوت کا پارہ اور بھی اوپر چڑھ جاتا ہے اور وہ اس کے سجدۂ عبودیت کو ایک خلاف تہذیب فعل سمجھ کر اسے متنبہ کرتا ہے کہ دیکھ! میرے فرش پر مت رینگ "فرش خراب ہو جائیگا"۔

(۴) اس شعر کے دو معنی ہو سکتے ہیں اگر اونٹ سے مسلمان قوم مراد لی جائے اور گائے سے ہندو قوم، تو معنی یہ ہونگے کہ ایک مہا سبھائی ذہنیت رکھنے والے ہندو نے طنزاً مسلمان سے یہ کہا کہ مسلمان برے ہیں، ہندو اچھے ہیں۔ اگر "جدت" اور "نوکدار" ان دو لفظوں کو مدنظر رکھا جائے تو یہ مطلب ہوگا کہ آج کل اہل دنیا کی

روش یا ذہنیت الٹی ہو گئی ہے۔ لوگ اچھے آدمی کو برا کہتے ہیں اور بروں کو اچھا سمجھتے ہیں

پہلی نظم بر ص ۳۲۷

اس نظم میں اقبال نے اُن مسلمانوں پر طنز کی ہے (ان کے طرز عمل کی مذمت کی ہے) جو حکومت یا انگریزوں کو خوش کرنے کیلئے، اپنے دینی اور ملی شعائر یا عقائد کی تردید میں بھی تامل نہیں کرتے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ اگر حضرت واعظ آجکل مالی مشکلات میں مبتلا ہیں تو پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ اسلامی تہذیب کے بجائے مغربی (لادینی) تہذیب اختیار کر لیں، بہت جلد فارغ البالی حاصل ہو جائیگی۔ ایک شخص نے جہاد کی تردید میں بہت سی کتابیں تصنیف کر دی ہیں جس کے صلہ میں حکومت نے اس کی بہت عزت افزائی کی ہے۔ اس لئے وہ جہاد کے بجائے حج کی تردید میں کوئی کتاب، تحریر کر دیں۔ امید ہے کہ حکومت ان کی بھی کافی سے زیادہ حوصلہ افزائی کرے گی۔ دو چار مربعے تو بہر حال کہیں نہیں گئے۔

دوسری نظم بر ص ۳۲۷

اس نظم میں اقبال نے ہندوستانیوں کی ذہنیت میں اُس تبدیلی پر طنز کی ہے جو مغربی تہذیب کی بدولت رونما ہوئی ہے۔ مثلاً اب جو شخص بیمار ہوتا ہے وہ کسی طبیب یا وئید سے رجوع کرنا پسند نہیں کرتا کیونکہ "گولیاں" فیشن کے خلاف ہیں، بلکہ وہ سیدھا ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے اور اگرچہ ڈاکٹر بھی "گولی" ہی دیتا ہے لیکن چونکہ اس کا نام "پل" ہے اسلئے ہندوستانی اُسے بہت شوق سے کھاتا ہے بلکہ جدید محاورہ کے مطابق "لیتا ہے"۔

اس تبدیلی کی دوسری مثال یہ ہے کہ پہلے زمانہ میں جب ہندوستانی لڑکے مکتبوں میں پڑھتے تھے، تو اپنے اساتذہ کا اس قدر احترام کرتے تھے کہ باید و شاید۔ لیکن اب مغربی تعلیم نے ان کو اسقدر گستاخ بنا دیا ہے کہ وہ اپنے استاد کو اپنا ملازم یا ایک دکاندار سمجھتے ہیں چنانچہ اُس سے کہتے ہیں کہ ماسٹر جی! اپنی تنخواہ کا بل پیش کیجئے تاکہ "پیسے چکا دئے جائیں"۔

تیسری نظم بر ص ۳۲۷

اس نظم میں اقبال نے ہندوستانیوں کی غفلت پر ماتم کیا ہے کہ ہم لوگ صنعت و حرفت کی طرف مطلق توجہ نہیں کرتے۔ زندگی کی تمام ضروریات دوسرے ملکوں سے منگاتے ہیں۔ اگر ہماری احتیاج اور غفلت کا یہی عالم رہا تو وہ دن دور نہیں جب مُردوں کو غسل دینے والے تو کابل سے آیا کریں گے اور کفن کا کپڑا جاپان سے آیا کریگا

پہلی نظم بر ص ۳۲۸

(۱) افسوس ہے کہ ہم مفلس ہندوستانیوں کا دل ہر وقت، انگلستان میں پڑا رہتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہاں کے لوگ بلوری کنٹروں میں شراب رکھتے ہیں یعنی خوب داد عیش دیتے ہیں (ان کو لطف زندگی حاصل ہے) اور غریب ہندوستانی اپنی شراب وہی پرانے مشکوں میں رکھتے ہیں۔

(۲) تہذیب مغرب کی بدولت ہندوستانیوں کی ذہنیت میں اسقدر عظیم الشان انقلاب رونما ہو گیا ہے کہ آئندہ زمانہ میں صرف وہ افراد باقی رہ سکیں گے جو اپنی وضع پر قائم ہیں اور اپنی قومی روایات پر سختی کے ساتھ عامل ہیں۔ بقیہ افراد تباہ و برباد ہو جائیں گے۔

(۳) اے ہندوستانیو! غور کرو! جو لوگ آپس میں لڑتے رہتے ہیں وہ انجام کار تباہ

ہو جاتے ہیں۔

(۴) اس شعر میں پہلے شعر کی وضاحت کی ہے، کہتے ہیں کہ انگریزوں کی حکومت سے پہلے ہندو اور مسلمان آپس میں بہت پیار کے ساتھ رہتے تھے، لیکن اب کہیں اردو اور ہندی کا جھگڑا ہے، کہیں گائے کی قربانی پر فساد ہے اور کہیں "جھٹکا" بنائے مخاصمت بنا ہوا ہے۔ "جھٹکا" حیوان کی گردن کاٹنے کا وہ طریقہ ہے جو سکھوں کے ہاں رائج ہے۔

دوسری نظم بر صـــ ۳۲۸

اس نظم کا بنیادی تصور یہ ہے کہ اقبال مسلمانوں پر طنز کرتے ہیں کہ جب تم نے ہندوؤں کی تہذیب اور رسوم اور اُن کے خیالات اور طور طریقے سب اختیار کر لئے ہیں، تو پھر اُن کو "غیر" کیوں سمجھتے ہو؟ اس غیریت کے تصور کی تردید کیلئے انہوں نے غالب کے ایک مشہور شعر کے پہلے مصرع کو ظریفانہ انداز میں بطور استدلال پیش کیا ہے کہ جس طرح شہود شاہد اور مشہود کی اصل ایک ہے تو پھر "غیر" کا ذکر فضول ہے، اُسی طرح جب مسلمانوں اور ہندوؤں کے عقائد اور خیالات میں وحدت ہے تو پھر مسلمان ہندوؤں کو غیر کیوں سمجھتے ہیں؟ یہی وجہ ہے کہ اہل دیر نے اہل کعبہ سے یہ سوال کیا کہ جب تم لوگ بتوں (مشرکانہ عقائد) سے محبت کرتے ہو تو برہمن (ہندوؤں) سے کیوں نفرت کرتے ہو؟

نوٹ: غالب کا وہ شعر جس کا پہلا مصرع اقبال نے نقل کیا ہے، یہ ہے

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے   حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

شہود کے لفظی معنی ہیں، ظہور یا حاضر ہونا، موجود ہونا۔ اصطلاحی معنی یہ ہیں کہ جب سالک کو کائنات کی ہر شئی میں خدا ہی کا جلوہ نظر آتا ہے تو اس کیفیت کو شہود کہتے ہیں + شاہد بمعنی دیکھنے والا۔ اصطلاحی معنی ہیں معشوق + مشہود بمعنی موجود یا جس کو دیکھا جائے + مشاہدہ بمعنی دیکھنا + غالب کے اس بے نظیر شعر کے دو معنی ہیں۔

(۱) لغوی اعتبار سے دیکھو تو شاہد، شہود اور مشہود کی اصل ایک ہی ہے یعنی ش ہ اور دال۔

(۲) تصوف کے اعتبار سے بھی شاہد، شہود اور مشہود کی اصل ایک ہی ہے یعنی خدا۔ وہی ذاتِ واحد، شاہد ہے اور وہی مشہود ہے اسی کو وحدت الوجود کہتے ہیں غالب نے تصوف کے مفہوم کو مد نظر رکھ کر یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ جب ان تینوں کی اصل ایک ہی ہے یعنی دوئی کی گنجائش ہی نہیں تو پھر لفظ مشاہدہ تو بے معنی ہے کیونکہ مشاہدہ تو دوئی کو چاہتا ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ شاہد اور مشہود میں مغایرت ہو۔

پہلی نظم بر صـــ ۳۲۹

۱۹۱۱ء میں قائد اعظم مرحوم نے جو اُس وقت محض مسٹر جناح بلکہ جینا تھے، وقف علی الاولاد کا مسودہ، وائسرائے کی کونسل میں پیش کیا تھا، جسے حکومت نے ۱۹۱۳ء میں بشکل قانون نافذ کر دیا۔ قائد اعظم مرحوم کی یہ پہلی شاندار قومی خدمت تھی جس نے تمام مسلمانوں کو ان کا ممنون بنا دیا۔

اقبال کی طبع ظریفانہ نے اس قانون کے نفاذ سے یہ نکتہ پیدا کیا کہ مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ حکومت، تو مدت ہوئی، قبضہ سے نکل گئی، رہی جائیدادیں تو چونکہ مسلمان آخرت کی گرفت کے خیال سے آزاد ہو چکے ہیں اسلئے رات دن عیاشی میں مشغول رہتے ہیں اور اپنی جائیدادیں کوڑیوں کے مول، ہندو ساہوکاروں کے ہاتھ فروخت کرتے رہتے ہیں۔ اندریں حالات جب کچھ عرصہ کے بعد مسلمانوں کے پاس جائیداد ہی باقی نہیں رہیگی تو وہ وقف کس چیز کو کریں گے؟ معاد کے لغوی معنی ہیں واپسی کی جگہ، مراد ہے عالم آخرت۔

نوٹ: وقف، فقہ کی اصطلاح ہے۔ اس کی رو سے ایک مسلمان، اپنی جائیداد کو یہ شکل دے سکتا ہے کہ اس کے مرنے کے بعد اس کی اولاد یا ورثا، اس سے فائدہ تو حاصل کر سکتے ہیں لیکن نہ فروخت کر سکتے ہیں، نہ رہن رکھ سکتے ہیں، نہ ہبہ کر سکتے ہیں۔

دوسری نظم بر صـــ ۳۲۹

اس نظم کے پہلے مصرع کی بندش، اکبر الہ آبادی کے مشہور مصرع سے ملتی جلتی ہے

وہ مس بولی، میں کرتی آپ کا ذکر، اپنے فادر سے
مگر آپ اللہ اللہ کرتا ہے، پاگل کا مافک ہے

اس نظم میں اقبال نے مسلمان نوجوانوں کی اخلاقی تمدنی اور اقتصادی پستی اور زبوں حالی پر زبردست طنز کی ہے۔ قصہ یہ ہے کہ ایک مُسلم عاشق مزاج کسی "مس" یعنی انگریز لڑکی پر عاشق ہو گیا۔ لیکن نہ اسکو "میٹرو" میں "ڈنر" پر مدعو کرنے کی استطاعت تھی، نہ خود کسی معزز عہدہ پر ممتاز تھا جو اس کی شخصیت یا عہدہ میں اس لعبت فرنگ کیلئے کچھ جاذبیت پیدا ہوتی اور نہ کسی فن لطیف مثلاً مصوری یا موسیقی میں مہارت تھی کہ وہ حسینہ اس پر نگاہ التفات کرتی۔ اس لئے مجبور ہو کر اس مسلمان نوجوان نے خودکشی کا فیصلہ کیا۔

یہ فیصلہ کر کے وہ اپنی محبوبہ سے ملا اور اس پر اپنا ارادہ ظاہر کیا اس نے کہا ویل مسٹر مُسلم! یہ فعل سراسر تہذیب کے خلاف ہے۔ تمہاری جان جائیگی اور میری بدنامی ہوگی، آخر اس سے فائدہ؟ علاوہ بریں نہ تم میں ہمت ہے نہ حوصلہ (صاحب ہمت آدمی کبھی خودکشی نہیں کرتا) اور میری قوم نے تمہاری قوم کو ایک عرصہ سے غیر مسلح کر دیا ہے، تمہارے پاس پستول کہاں ہے جو خودکشی کرو گے؟ تو اس عاشق صادق نے جواب دیا کہ اسی لئے تو میں آپ کے پاس آیا ہوں۔ آپ براہ کرم مجھے کچھ رقم عطا فرمائیں تاکہ میں "سرحد" سے کسی افغان کو کرایہ پر بلا کر اُس سے درخواست کروں کہ وہ میرا کام تمام کر دے۔ اس کے بعد اُس نے فی البدیہہ یہ شعر پڑھا۔

قتل میں میرے فوائد تین ہیں مخفی، ڈیر!
تجھ کو راحت، مجھ کو چھٹی اور بھائی کی مدد

تیسری نظم بر صـــ ۳۲۹

اس نظم میں اقبال نے ترکوں کی غفلت شعاری پر ماتم کیا ہے۔ جیسا کہ میں قبل ازیں "ہلال عید" کی تشریح میں لکھ چکا ہوں، سلطان عبد الحمید ثانی کے (۱۸۷۶ء تا ۱۹۰۹ء) عہد حکومت میں سلطنت کا نظام بالکل تباہ ہو چکا تھا۔ اسکی ادنیٰ مثال یہ ہے کہ جب ۱۹۱۲ء میں ترک، ایڈریانوپل میں مصروف پیکار تھے تو سامان رسد دس بارہ میل کے فاصلہ پر سڑ رہا تھا اور جنگجو سپاہی فاقوں سے مر رہے تھے۔ یعنی سپلائی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ اور اگر زخمیوں کی مرہم پٹی کا کوئی انتظام ہوتا تو ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم ۱۹۱۲ء میں ہندوستان سے ڈاکٹر اور دوائیاں لے کر قسطنطنیہ کیوں جاتے؟

اقبال نے اس نظم میں اسی حقیقت کو عیاں کیا ہے کہ اگر ترک حجاز میں اونٹوں سے کام لیتے اور "کیمل کور" (CAMEL CORPS) قائم کرتے۔ تو انہیں کس قدر سہولت نصیب ہو جاتی۔ فلیٹ (FLEET) کے معنی ہیں جنگی جہازوں کا بیڑا۔

چوتھی نظم بر صـ ۳۲۹

اس دلکش نظم میں اقبال نے لفظ "سوال" سے سارا لطف پیدا کیا ہے۔ سوال کے دو معنی ہیں (۱) فقیر کا دروازہ پر بھیک مانگنا (۲) سیاسی اصطلاح میں کسی رکن مجلس کا حکومت سے جواب طلب کرنا یا کوئی بات دریافت کرنا۔ اکبر الہ آبادی نے اس لفظ کو اس طرح باندھا ہے ؎

قومی طاقت نے جب جواب دیا ۔۔۔ کونسلوں میں "سوال" کرنے لگے

"ہم" سے مسلمان قوم اور "اُمراء" سے ہندو قوم مراد ہے لیکن "ہم" سے عوام اور امراء سے ہندو مسلمان امراء بھی مراد ہو سکتے ہیں۔
دونوں صورتوں میں مطلب ایک ہی ہے کہ پہلے زمانہ میں تو صرف غریب آدمی سوال کیا کرتے تھے۔ زمانہ کا انقلاب دیکھو کہ اب اُمراء بھی سوال کرتے ہیں"

پہلی نظم بر صـ ۳۳۰

امپیریل کونسل سے وائسرائے کی کونسل مراد ہے جسکی توسیع "منٹو مارلے اصلاحات" کی رو سے عمل میں آئی تھی اور اسکی بدولت ہندوستانیوں کو مزید نشستیں حاصل ہو گئی تھیں میری رائے میں یہی بُرکات عالیہ انگریزوں کی عیاری کی بدولت، استحوا مخاصمت بن گئیں غالب کے مصرع کا لطف اس وقت دوبالا ہو جاتا ہے جب ہم اس بات کو مدنظر رکھتے ہیں کہ امپیریل کونسل کے ممبروں کو زیادہ تر دلّی میں قیام کرنا پڑتا تھا۔ اقبال نے غالب کے اس مصرع کو ذہن میں رکھ کر یہ ظریفانہ نکتہ پیدا کیا کہ مسلمان تو مفلس قوم ہے اگر اس کے ارکان، کونسل کے ممبر ہو بھی گئے تو بیشک انہیں دلّی میں وائسرائے بہادر کی ہم نشینی کا شرف حاصل ہو

جائے گا لیکن "کھائیں گے کیا"؟

دوسری نظم بر صـ ۳۳۰

اس قطعہ میں اقبال نے ہندیوں کی غلامی پر ماتم کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ
(۱) حضور! ہم سے بلاوجہ ناراض ہیں اور ہم کو مشتبہ نظروں سے دیکھتے ہیں حالانکہ ہم تو حضور کے سچے وفادار ہیں اگر وفادار نہ ہوتے تو یہ ظلم و ستم کیوں سہتے؟ ظلم و ستم کی تشریح کروں تو یہ شرح، ہندوستان میں انگریزوں کے ظلم و ستم کی ضخیم کتاب بن جائیگی۔ صرف ایک مثال کافی ہے
(ا) ہندی اگر چوری کرے تو چکی پیسے۔
انگریز اگر چوری کرے تو ہندی یعنی وہی قیدی اُس چور کے کمرے کے باہر بیٹھ کر موسم گرما میں، دن بھر پنکھا کھینچے تاکہ اُس چور کو گرمی کی تکلیف نہ ہو۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ وہ انگریز ہے اور ہر انگریز ماں کے پیٹ سے معصوم عن الخطا ہو کر دنیا میں آتا ہے۔
(ب) ہندی اگر کسی کو قتل کر دے تو پھانسی پائے
انگریز کسی کو قتل کر دے تو "سول سرجن" یہ رپورٹ دے کہ مقتول کے جسم میں کہیں گولی کا نشان موجود نہیں تھا ہاں اس کی تلّی پھٹی ہوئی تھی جو اس کی موت کا سبب ہو گئی۔
(۲) اس شعر میں اقبال نے ہندیوں کی مجبوری یا ضمیر فروشی پر طنز کی ہے کہ ہم لوگ کسی کمیٹی میں خواہ وہ میونسپل کمیٹی ہو یا وائسرائے کی کمیٹی ہو آزادانہ اپنی رائے کا اظہار نہیں کر سکتے۔
نوٹ | حضرتِ اقبال کا ارشاد قوم کے سر آنکھوں پر۔ لیکن اس کا کیا علاج ہے،

کہ رضائے کلکٹر سے اختلاف کے بعد نہ کسی باپ کی "کرسی" برقرار رہ سکتی ہے نہ بیٹے کو نائب تحصیلداری مل سکتی ہے۔
اگر یہ بات نہ ہوتی تو حضرت مرحوم کے موجود ہوتے ہوئے، سر شادی لال چیف جسٹس پنجاب بمشورہ حکومت یو پی اور سی پی سے مسلمانوں کو جج کے لئے نہ بلاتا۔
(۳) یہ شعر تو حاصل غزل ہے جی چاہتا ہے اس کی شرح میں صفحے کے صفحے لکھ ڈالوں۔ لیکن قوم کی ناراضگی کا "ڈر" ہے اس لئے کچھ نہیں لکھتا تاہم اتنا ضرور کہتا ہوں کہ یہ سند بے بڑے معرکہ کی چیز۔ مثلاً جنرل نکلسن نے بوقت مرگ جو دو حرف اپنے اردلی کو بطور سند لکھ کر دے دئے تھے، اُن کی بدولت اس کے لڑکے "کرنل" ہو گئے۔
(۴) آسان شعر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہندیوں کا اس وقت دنیا میں کہیں ٹھکانا نہیں ہے۔
(۵) اس شعر کا مضمون وہی ہے جو پہلے شعر میں بیاں ہو چکا ہے۔ یعنی خوشامد پرست ہندی سرمایہ دار جب انگریزوں سے ملتے تھے تو کہا کرتے تھے کہ حضور تو ہمارے "مائی باپ" ہیں۔ اور ہم حضور کے تابع فرمان ہیں۔

تیسری نظم بر صـ ۳۳۲

اس نظم میں اقبال نے ان مسلمانوں پر طنز کی ہے جو مسلمان ہو کر شراب کا کاروبار یا اس کی تجارت کرتے ہیں۔
سخت کوش - محنتی + مُشرک وہ شخص جو کسی کو خدائے واحد کا شریک قرار دے + گوش بمعنی کان + حق نیوش - سچی بات سننے یا پسند کرنیوالا +

بادہ کش - شرابی + بارگوش - تکلیف دہ + کلمہ گو - مسلمان +
ایک مولوی صاحب وعظ میں یہ کہہ رہے تھے کہ ہندو مشرک ہیں اور مشرک نجس ہوتے ہیں اس لئے ان کے ساتھ لین دین کرنا، سخت گناہ ہے۔ اس مجلس میں ایک مسلمان شرابی بھی شریک تھا اور اُسے یہ تقریر بالکل ناپسند تھی چنانچہ اُس نے اُٹھ کر یہ اعتراض کیا کہ "مولوی صاحب! یہ تو بہت بڑا ظلم ہے کہ آپ کھانے پینے کی چیزوں کی تجارت پر ایسی پابندیاں لگا رہے ہیں" اس کی یہ بات سُن کر میں نے کہا "پیارے بھائی آپ پریشان نہ ہوں۔ مسلمان شراب فروش بھی موجود ہیں، آپ ان سے خرید لیا کریں"
نوٹ | یہ پُرانے زمانہ کی باتیں ہیں۔ اب تو اور ہی عالم ہے، صرف ایک شعر لکھتا ہوں :-

پینے کا شوق ہو، تو کراچی کی سیر کر
پھرتے ہیں بادہ نوش، بغل میں لئے ہوئے

پہلی نظم بر صـ ۳۳۱

یہ بڑی دلپذیر اور بلیغ نظم ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی نادانی قابل افسوس ہے کہ یہ لوگ دین کے بدلے دنیا جیسی حقیر اور بیکار چیز خرید رہے ہیں اور اس کا باعث یہ ہے کہ یہ لوگ "جدید تعلیم" حاصل کر رہے ہیں اور اس ملحدانہ نظام تعلیم کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ قوم کے افراد احساساتِ ملّی سے بیگانہ ہو جاتے ہیں۔ یعنی یہ تعلیم مسلمانوں کے حق میں سم قاتل ہے

دوسری نظم بر صد ۳۳۱ ۔

مطلب ایک دن ایک سمجھ دار کانگریسی ہندو (گائے) نے مسلم لیگی مسلمان (اونٹ) سے کہا کہ میں تو مدت سے انگریزوں کی نگاہ میں باغی اور غدار ہوں، سنا ہے تم بھی اب انگریز کے خلاف ہو گئے ہو (۱۹۲۱ء میں مسلمان بھی خلافت عثمانیہ کے معاملہ میں انگریزوں سے ناراض ہو گئے تھے)

اس کے بعد اس ہندو نے مسلمان پر یہ طنز کیا کہ اگرچہ عرب میں تمہیں کوئی سیاسی اہمیت حاصل نہیں ہے لیکن ہندوستان میں تو معاملہ بنوع دیگر ہے یہاں تو انگریز بھی تمہیں اپنے ساتھ ملانا چاہتا ہے۔ اور کانگریس بھی تمہاری قیمت سے آگاہ ہے کہ تم بلا تامل جیلیں بھر سکتے ہو۔

۱۹۱۹ء تک تو تم لوگ ہم سے الگ تھلگ رہتے تھے۔ اب کیا بات ہے کہ ہم سے اتحاد پر آمادہ ہو؟ ع کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

مسلمان (اونٹ) نے جب یہ تقریر سنی تو کہا کہ اصلی بات یہ ہے کہ اب ہم بھی کانگریس کی خوبیوں پر مائل ہو گئے ہیں۔ دیکھو جب ایک ہی ملک میں رہنا ہے تو مناسب ہے کہ ہم تم متحد ہو کر رہیں۔ تمہارے ہنگاموں نے سارے ملک میں آگ سی لگا دی ہے اور آج وہ لوگ بھی کانگریس کے پلیٹ فارم سے انگریزوں کے خلاف تقریریں کر رہے ہیں جو کل تک بول بھی نہیں سکتے تھے۔

اگرچہ ہمارا تمہارا کوئی میل تو نہیں ہے کیوں کہ تم دولت مند ہو اور ہم "چارہ بھی اُدھار کھاتے ہیں"۔ (کیا حقیقت بیان کی ہے!) لیکن مناسب یہی ہے کہ ملک کی سب قومیں (ہندو مسلم سکھ عیسائی پارسی) ایک ہی پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں۔ بس تم ہمیں بھی "بندے ماترم" گانا

سکھا دو تاکہ ہم بھی تمہارے ساتھ نغمہ سرائی کر سکیں۔

حافظ (مسلمان) کی گدڑی (ایمان) کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ اُسے بلا تامل شراب (کفر) سے رنگین کر دے۔ اور اس کے بعد اُسے اچھی طرح ..... سر بازار ذلیل و رسوا کر دے۔

نوٹ اگرچہ مطلب تو واضح کر دیا ہے لیکن طلبہ کی سہولت کے لئے مشکل الفاظ کے معانی بھی لکھے دیتا ہوں :-

گرم سخن۔ گفتگو شروع کی + رسی تڑانا محاورہ ہے، مراد ہے سرکشی یا بغاوت کرنا + حذر۔ اجتناب یا پرہیز + زنہار۔ انکار + رشکِ صد غمزۂ اشتر۔ محاورہ میں 'شتر غمزہ'، سے عیاری یا فریب مراد ہوتا ہے۔ مصرع کا مطلب یہ ہے کہ "تیری ایک کلیل، اونٹ کے سَو غمزوں سے بھی زیادہ دلکش ہے۔ گائے کی کلیل سے حیوان کی اچھل کود مراد ہے + بیمار کنایہ ہے عاشق سے + بن کنایہ ہے ملک سے + پلنگ بمعنی چیتا + یک رنگی۔ وحدت + ہمزبان یعنی ہم خیال + دلق۔ گدڑی + بجو ارزد۔ یعنی ہیچ ہے، بے قیمت ہے +

پہلی نظم بر صد ۳۳۳

میری رائے میں، اس حصہ میں، اس سے زیادہ مؤثر نظم اور کوئی نہیں ہے۔ کہتے ہیں کہ میں نے کل رات مجھ سے پوچھا کہ "کہو بھائی! کیا حال ہے؟ زندگی کیسے بسر ہو رہی ہے؟ تو اُس نے جواب دیا کہ حضرت! کیا بتاؤں کہ اس دنیا میں کس قدر ظلم و ستم ہو رہا ہے! میں رات بھر محنت کرتا ہوں تو صبح ہوتے (جب انسان غافل ہو جاتا ہے) کہیں

ایک دو بوندیں خون کی نصیب ہوتی ہیں، لیکن، اسی دنیا میں، زمیندار بھی رہتا ہے جو بلا محنت کاشتکار کا سارا خون چوس لیتا ہے (اور کوئی کچھ نہیں کہتا)

نوٹ لبسوہ دار اُس زمیندار کو کہتے ہیں جو کسی بڑے تعلقہ دار کے نیچے ہوتا ہے اور لبسوہ ایک بیگھہ کے بیسویں حصے کو کہتے ہیں۔

دوسری نظم بر صد ۳۳۳

اس نظم میں اقبال نے ظریفانہ رنگ میں بڑے پتے کی بات کہی ہے۔ مسٹر گاندھی نے مسلمانوں کو ملّی اعتبار سے نقصان پہنچانے کیلئے جو پروگرام وضع کیا تھا اس کی ایک شق یہ تھی کہ اُن کے دماغ سے یہ خیال نکال دیا جائے کہ ہمارا دین دنیا کے تمام ادیان سے برتر ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نہ وہ اپنے آپ کو ہندوؤں سے برتر سمجھیں گے، نہ اُن میں ان پر غلبہ حاصل کرنے کا داعیہ پیدا ہوگا۔ چنانچہ مسٹر موصوف نے ۱۹۲۲ء میں، جیل سے ایک مضمون، اپنے اخبار "نوجیون" میں اشاعت کے لئے بھیجا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ میں نے قرآن اور گیتا دونوں کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ دونوں کتابوں کی تعلیم یکساں ہے اس لئے اسلام اور ہندو دہرم دونوں سچے ہیں۔ اس کے بعد بنارس کے لالہ بھگوان داس نے ایک کتاب لکھی جس کا نام تھا "وحدتِ ادیانِ عالم" یعنی دنیا کے تمام مذاہب ایک ہی سی تعلیم دیتے ہیں۔ اس کے بعد جناب ابوالکلام آزاد نے ترجمان القرآن میں یہ خیال ظاہر کیا کہ تمام مذاہب سچے ہیں۔ اس کے بعد مسٹر گاندھی کے سیکرٹری مہادیو ڈیسائی نے آزاد صاحب کی الف لکھی، اس میں انہوں نے یہ لکھا کہ "مولانا کا عقیدہ یہ ہے کہ عالمگیر صداقتیں، جن پر نجاتِ اخروی کا انحصار ہے، تمام مذاہب میں یکساں پائی جاتی ہیں "

مسٹر گاندھی کو اپنے مشن میں حسب توقع کامیابی حاصل ہوئی۔ بہت سے کانگریسی مسلمان، اُن کے ہم خیال ہو گئے چنانچہ ۱۹۴۲ء میں کانپور کے ایک سربر آوردہ کانگریسی مسلمان نے مجھ سے کہا تھا کہ "تبلیغ اسلام کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ سچائی ہر مذہب میں موجود ہے" یہ سن کر میں گاندھی جی کی مہاتمائیت کا معترف ہو گیا۔

اس پس منظر کو سامنے رکھ کر اب اس نظم کو پڑھیے۔ اقبال کہتے ہیں کہ مسلمانوں پر جیل سے یہ "نئی آیت" نازل ہوئی ہے کہ قرآن اور گیتا دونوں کتابیں سچی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان اور ہندو میں صلح ہو گئی کہ تم بھی سچے اور ہم بھی سچے۔ اب صرف مندر اور مسجد کا اختلاف باقی رہ گیا ہے۔ لیکن یہ منزل ذرا کٹھن ہے کیونکہ ہندو تو مندر سے پہلے ہی بیزار تھا، لیکن مسلمان، مسجد سے نکلنے پر تیار نہیں ہے یعنی ہندو نے تو مدت ہوئی ہندو دھرم چھوڑ کر قوم پرستی اختیار کر لی۔ لیکن مسلمان ابھی تک اسلام سے وابستہ ہے۔

تیسری نظم بر صد ۳۳۳

کہتے ہیں کہ ہر مذہب کی تعلیم کا خلاصہ (تت) یہی ہے کہ ہر حال میں سچ بولو۔ اس لئے میں یہ سچی بات برملا کہتا ہوں کہ ساہوکاری، لبسوہ داری (زمینداری) اور سلطنت، یہ تینوں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔

ساہوکار، مقروض کا خون چوستا ہے۔ زمیندار، کاشتکار کا خون چوستا ہے اور سلطان، رعایا کا خون چوستا ہے نام مختلف ہیں لیکن کام ایک ہی ہے۔

نوٹ تت، سنسکرت کا لفظ ہے اس کے لغوی معنی ہیں، اصل یا جوہر ۱۲

پہلی نظم بر صفحہ ۲۳۴

حلِّ لغات | محنت و سرمایہ جدید علمِ سیاست کی دو مشہور اصطلاحیں ہیں۔ محنت سے مراد ہے کسی مزدور کا کارخانوں میں اجرت پر کام کرنا سرمایہ سے مراد ہے کسی دولتمند (سرمایہ دار) یا چند سرمایہ داروں کا ملکر کوئی کارخانہ قائم کرنا محنت سے محنت کش طبقہ اور سرمایہ سے سرمایہ دار طبقہ مراد ہے۔ آج کل دنیا میں ان دونوں طبقوں میں جنگ ہو رہی ہے + روس، محنت کش طبقہ کا حامی ہے اور امریکہ مع انگلستان، سرمایہ دار طبقہ کا + تناؤں کا خوں۔ اشارہ ہے سرمایہ داروں کی شکست کی طرف کہ اقبال کی رائے میں انجام کار ان ظالموں کو شکست ہوگی حکمت و تدبیر سے ڈپلومیسی مراد ہے + فتنۂ آشوب خیز سے اشتراکیت اور اشتمالیت کی طرف اشارہ ہے + سرمایہ دار اقوام ان کو اپنے حق میں بلاشبہ "فتنہ" یقین کرتی ہیں۔ کیونکہ اشتراکیت کا مقصد ہی سرمایہ داری کو مٹانا ہے + ٹل نہیں سکتا۔ فرو نہیں ہو سکتا + وَقَدْ كُنْتُمْ بِهِ تَسْتَعْجِلُوْنَ۔ اور تم تو (عذاب کے آنے میں شک کر کے) اسکے لئے جلدی مچایا کرتے تھے (سورۂ یونس ع ۵) اقبال نے بلاشبہ اس آیت کو بہت برمحل استعمال کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اشتراکیت دراصل وہ عذاب ہے جو اللہ تعالیٰ نے سرمایہ داروں پر انکی بداعمالیوں کی پاداش میں نازل فرمایا ہے۔ اب چونکہ سرمایہ دار مضطرب ہیں تو اقبال قرآنی الفاظ میں اُن سے کہتے ہیں کہ اے ظالمو! جب اللہ کے نیک بندے تم سے کہتے تھے کہ غریبوں کا خون چوسنا چھوڑ دو ورنہ تم پر عذاب نازل ہوگا تو تم کہا کرتے تھے کہ اپنے خدا سے کہو کہ وہ جلدی عذاب نازل کرے۔ پس اے سرمایہ دارو! اب کیوں مضطرب ہو! یہ وہی عذاب تو ہے جس کے نزول میں شک کر کے تم اس کے لئے جلدی مچایا کرتے تھے۔ یاد رکھو! یہ عذاب ٹل نہیں سکتا + یاجوج اور ماجوج۔ حَتّٰى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ۔ (سورۂ انبیاء ع ۷) یہانتک کہ یاجوج اور ماجوج کے لشکر کھولدیے جائیں اور وہ ہر بلندی سے ڈھلکتے ہوئے چلے آئیں میں نے یہ آیت اس لئے نقل کر دی ہے کہ اس میں یاجوج اور ماجوج اور ینسلون تینوں لفظ وارد ہیں۔ یاجوج اور ماجوج پرانے زمانے میں دو جنگجو قومیں تھیں جو سلطنتِ ایران میں داخل ہو کر تباہی مچایا کرتی تھیں۔ اقبال نے ان کو روس اور امریکہ پر منطبق کیا ہے وہ کہتے ہیں۔ کہ قرآن مجید میں جو یہ پیشگوئی کی گئی ہے کہ ایک زمانہ آنے والا ہے جب یاجوج اور ماجوج کے لشکر کھل جائینگے اور تمام دنیا میں پھیل کر تباہی مچائینگے، یہ پیشگوئی ہمارے زمانہ میں پوری ہوگئی آیت مذکورہ بالا میں جو ینسلون کا لفظ آیا ہے، روس اور امریکہ اسکی تفسیر ہیں کہ یہ دونوں قومیں آج برسرپیکار ہیں۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اب انمیں زبردست جنگ ہوگی۔ اور دنیا تباہ ہو جائے گی۔

مطلب | اشتراکیت نے آج تمام دنیا کے مزدوروں کو سرمایہ داروں کے خلاف متحد کر دیا ہے اور ان دونوں طبقوں میں زبردست جنگ جاری ہے۔ دیکھیے اب کون کون سے سرمایہ دار ممالک تباہ ہوتے ہیں اگر یہ سرمایہ دار ممالک یہ سمجھتے ہیں۔ کہ ہم عیاری اور چالاکی سے اشتراکی تحریک پر غالب آجائیں گے تو یہ ان کی سخت حماقت ہے۔ مزدور بیدار ہو چکے ہیں اور اب کسی سرمایہ دار سے دھوکہ نہیں کھا سکتے بلکہ وہ وقت قریب ہے جب دنیا سے سرمایہ داری کا خاتمہ ہو جائے گا۔ آج روس ایک طرف ہے اور سرمایہ دار ممالک دوسری طرف۔ گویا یاجوج اور ماجوج کے لشکر کھل گئے ہیں اور مسلمان اس جنگ میں آیت ینسلون کی تفسیر پڑھ سکتے ہیں۔

دوسری نظم بر صفحہ ۲۳۴

تمہید | اس نظم کا مطلب سمجھنے کے لئے ملک شام کی موجودہ تاریخ سے واقفیت ضروری ہے واضح ہو کہ پہلی جنگ عظیم میں اتحادی فوجوں نے ۱۸-۱۹۱۴ء میں ترکوں کو شکست دیکر اس ملک پر قبضہ کر لیا اور ۱۹۱۹ء میں انگریزوں نے غدار شریف مکہ (جسے انگریزوں نے حجاز کا بادشاہ بنا دیا تھا جسطرح ۱۸۱۹ء میں انھوں نے نواب وزیر اودھ کو، بادشاہ دہلی کا اقتدار کم کرنے کے لئے، بادشاہ ذیجاہ کا لقب دیدیا تھا) کے بیٹے امیر فیصل کو شام کا بادشاہ بنا دیا۔ چونکہ عراق اور فلسطین کو انگریزوں نے اپنے زیر اثر رکھا تھا اس لئے اس ملک کو فرانس کے حوالے کر دیا۔ لیکن شامی عربوں نے فرانس کے خلاف جنگ شروع کر دی۔ اور کہا کہ ہم جانتے ہیں کہ فیصل کے پردہ میں دراصل تم ہم پر حکومت کروگے اور ہم اس کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ہمنے ترکوں کے خلاف اس شرط پر بغاوت کی تھی کہ ہمیں آزادی حاصل ہو جائے گی غرضکہ عربوں نے فرانس کو مجبور کر دیا کہ وہ مجلس اقوام کی مجوزہ حکم برداری (MANDATE) کے طریقہ کو تسلیم کرے اور جمہوریت قائم کرے۔ چنانچہ ۱۹۲۳ء میں فرانس نے لبنان کو اور ۱۹۲۵ء میں دمشق اور حلب کے صوبوں کو متحد کر کے ملک شام کو REPUBLIC تسلیم کر لیا۔

حلِّ لغات | رندِ لم یزل۔ وہ رند جسکی رندی کو کبھی زوال نہ ہو یعنی زبردست شرابخور۔ یہاں کنایہ ہے فرانس سے: اقبال نے "رندِ لم یزل" کی ترکیب بہت برمحل استعمال کی ہے کیونکہ فرانس کے لوگ رندی اور میخواری کے اعتبار سے، ساری دنیا میں مشہور ہیں + میخانے کے قاعدوں سے یہاں سیاست کے اصول مراد ہیں + نیلی رواق۔ آسمان + مداوا۔ علاج + حکم برداری۔ جدید سیاسی اصطلاح ہے۔ عربی میں اسے انتداب کہتے ہیں۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ لیگ آف نیشنز (مجلس اقوام) جو کفن چوروں کی مجلس تھی جب کسی یورپین طاقت کو کسی ایشیائی ملک کا انتظام کرنے یا حکومت کرنے یعنی اسے غلام بنانے کا اختیار دیتی تھی، تو اس کو MANDATE یا حکم برداری کہتے تھے۔ یہ سیاسی اصطلاح ۱۹۱۹ء میں وضع کی گئی تھی تاکہ مسلمانوں کو غلام بنایا جا سکے + دردِ لایطاق۔ بڑی دلکش ترکیب ہے جو اقبال نے "تکلیف مالایطاق" کو مدنظر رکھکر وضع کی ہے مطلب اس سے ہے، وہ درد جو مریض سے برداشت نہ ہو سکے + وفد سیاسی اصطلاح ہے یعنی چند بااثر نمائندہ اشخاص کا کسی "خدائے مجازی" کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے مطالبات پیش کرنا۔ کامیابی ہو یا نہ ہو شہرت، اور تفریح تو یقینی ہے + حضرت کرزن۔ انگلستان کا مشہور مدبر اور سیاستدان ۱۸۵۹ء میں پیدا ہوا ۱۸۹۸ء میں زہرہ اور مشتری کے زیر اثر آگیا یعنی ہندوستان کا وائسرائے بنگیا۔ شاہانہ مزاج رکھتا تھا۔ اس لئے کلکتہ میں تاج محل آگرہ کا جواب بنایا جسے وکٹوریہ میموریل کہتے ہیں۔ اسکی تعمیر میں کمال یہ دکھایا کہ گرہ سے ایک پیسہ خرچ نہیں کیا تمام اخراجات اس کے خطاب یافتہ غلاموں مثلاً نظام، گائکواڑ، سندھیا اور دوات انگلشیہ کے دوسرے فرزندوں نے برداشت کئے۔ ۱۹۰۵ء میں لارڈ کچنر سپہ سالار افواج ہند سے اختلاف کی بنا پر مستعفی ہو کر واپس چلا گیا اکبر الہ آبادی نے اس واقعہ کو یوں نظم کیا تھا۔

کرزن و کچنر کی حالت پر جو کل	وہ صنم تشریح کا طالب ہوا
کہدیا میں نے کہ ہے یہ صاف صاف	دیکھ لو تم "زن" پہ "نر" غالب ہوا

۱۹۱۹ء میں لارڈ کرزن کو وزیر امور خارجہ کا منصب حاصل ہوا ۱۹۲۳ء میں مستعفی ہو گیا اور ۱۹۲۵ء میں وفات پائی۔ لارڈ کرزن نے اپنے تعلقات [illegible]

کی بنا پر سر آغا خاں کو اس بات پر آمادہ کیا تھا۔ کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کا وفد مرتب کر کے مجلس اقوام میں انگریزوں کے طرز عمل کی حمایت کریں اور باقاعدہ درخواست کریں کہ جب فرانس کو شام عطا کر دیا گیا ہے تو عراق اور فلسطین پر انگریزوں کا تسلط تسلیم کر لینا چاہئے۔

سر آغا خاں شیعیوں کے مشہور اور اہم فرقہ اسمٰعیلیہ کے شہرہ آفاق مذہبی پیشوا ہیں۔ اسمٰعیلی شیعہ ان کو "حاضر امام" بلکہ اس سے بھی بلند تر مرتبہ دیتے ہیں ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا حسن علی شاہ المعروف بہ آغا خاں ایران کو خیرباد کہکر کراچی میں آباد ہو گئے تھے۔ ان کے فرزند آغا علی شاہ نے بمبئی کو وطن بنا لیا۔ انکا نام محمد شاہ ہے آغا خاں ثالث لقب ہے۔ میری رائے میں موصوف دنیا کے خوش قسمت ترین انسان ہیں۔ اس سے زیادہ اور کیا لکھوں۔

مطلب یہ نظم اقبال نے ۱۹۲۳ء میں لکھی تھی۔ اس میں انھوں نے کمال اختصار کے ساتھ اس زمانہ کے سیاسی حالات پر جو شام میں رونما ہو رہے تھے تبصرہ کیا ہے۔ چونکہ مجھے اختصار ملحوظ ہے اسلئے میں نے تفصیل سے کام نہیں لیا۔ اور جب تک کسی طالب علم کو شام کی تاریخ، لیگ آف نیشنز کی تاریخ، اسکے کارناموں، حکم برداری یا انتداب کی عیاریوں، انگریزوں کی دسیسہ کاریوں کرزن کی کارگزاریوں اور عراق پر للچائی ہوئی نظروں، اور سر آغا خاں کے انگریزوں سے تعلقات سے پوری واقفیت نہ ہو اس وقت تک اس نظم یا اس قسم کی نظموں کا مطلب سمجھ میں نہیں آ سکتا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جب ۱۹۲۳ء میں فرانس نے مجبور ہو کر اپنی فوجیں واپس بلائیں اور شامیوں کو جمہوریت کے قیام کا موقع دیا تو اقبال نے یکمال خدا کا شکر ہے کہ اہل فرانس ملک شام کی سرحدوں سے رخصت ہو رہے ہیں۔

واقعی دنیا عبرت کا مقام ہے کہ کل تک فرانس شام پر حکمراں تھا لیکن آج آسمان اس کے خلاف ہو گیا۔ اور اس کے منصوبے خاک میں مل گئے۔

اس کے بعد اقبال نے کرزن پر طنز کی ہے کہ اب لارڈ موصوف کو عراق اور فلسطین کی خیر منانی چاہئے۔ کیونکہ جو حشر فرانس کا ہوا ہے وہی انگریزوں کا ہونیوالا ہے۔ شاید اسی لئے آغا خاں نے ہندوستان سے ایک "وفد" طلب کیا ہے کہ مجلس اقوام میں انگریزوں کے موقف کی حمایت کا مقدس فریضہ انجام دیا جا سکے۔

تیسری نظم بر صـ ۳۳۴

مطلب ایک دن ایک زمیندار اور اسکے مزارع (کاشتکار) میں اس بات پر جھگڑا ہو رہا تھا کہ زمین کس کی ملکیت ہے؟ کاشتکار یہ کہتا تھا کہ عقل و نقل دونوں کا یہ تقاضا ہے کہ جو شخص کسی قطعہ زمین میں کاشت کرے (ہل چلائے) وہ قطعہ اسی کی ملکیت ہے۔ زمیندار اس کے جواب میں یہ کہتا تھا کہ معلوم ہوتا ہے کہ تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے" یہ سنکر میں نے زمین سے پوچھا کہ تو اس جھگڑے کا خود فیصلہ کر دے تو زیادہ مناسب ہے۔ زمین نے جواب دیا کہ یہ دونوں نادان ہیں، بلکہ نابینا ہیں۔ میں نہ زمیندار کا مال ہوں نہ کاشتکار کا بلکہ یہ دونوں خود میرا مال ہیں کیونکہ مرنے کے بعد دونوں میرے ہی اندر چلے جائینگے اور کچھ دنوں کے بعد میرا جزو بنجائیں گے۔ یہ لڑائی جھگڑے سب جہالت کے کرشمے ہیں۔

پہلی نظم بر صـ ۳۳۵

مطلب نئی تہذیب نے ہماری قوم کے نوجوانوں کو بالکل ناکارہ کر دیا ہے۔

نہ ان کی ذات سے غریبوں کو کوئی فائدہ پہونچ سکتا ہے نہ وطن کو۔

الیکشن، ممبری، کونسل اور صدارت یہ سب وہ پھندے ہیں جن میں ہماری قوم گرفتار ہے اور انکی وجہ سے بھائی، بھائی سے برسرپیکار ہے۔

"میاں نجار" اس حصہ میں بلیغ ترین ترکیب ہے۔ اس سے انگریز مراد ہیں جنہوں نے ہندوستانیوں کو ۱۹۱۹ء میں "آزادی" کا پہلا سبق پڑھایا تھا۔ یورپ کے رندوں سے مغربی سیاست اور جمہوریت کے اصول مراد ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ انگریزوں نے، اس خیال سے اہل ہند کو مغربی جمہوریت کا دلدادہ بنایا تھا کہ اس کے پردے میں آرام کے ساتھ حکومت کرتے رہیں گے لیکن ہندوستانیوں نے، اب سیاسی شعور حاصل کرنے کے بعد واقعی آزادی حاصل کرنے کے لئے جد وجہد شروع کر دی ہے۔

نوٹ: اقبال کی پیشگوئی ۱۹۴۷ء میں سچی ثابت ہو گئی۔
نجار تو رخصت ہو گیا لیکن اسکی "ورکشاپ" باقی رہ گئی ہے
انشاء اللہ کچھ عرصہ کے بعد وہ بھی مٹ جائیگی"

دوسری نظم صـ ۳۳۵

مطلب اقبال نے ان دو شعروں میں، محنت کش طبقہ کی حمایت کا حق ادا کر دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ کارخانہ کا مالک (سرمایہ دار) نہایت پست فطرت نااہل، عیش پسند اور کاہل ہے، اب اسکے مقابل ذرا قرآن مجید کی اس آیت پر غور کرو کہ" انسان اسی شی کا حقدار ہے جسکے حصول کے لئے وہ جد وجہد کرے" اگر یہ فرمودۂ قرآنی صحیح ہے (اور یقیناً صحیح ہے) تو پھر سرمایہ دار کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ مزدور کی محنت کا پھل تو خود کھائے اور مزدور خون جگر پی کر زندگی بسر کرے؟

نوٹ اقبال چونکہ مسلمان تھے اس لئے ساری عمر اس مظلوم طبقہ کی بیکسی پر نوحہ خوانی کرتے رہے انقلاب اسلئے برپا نہ کر سکے کہ دنیا میں ہر شخص مصطفےٰ کمال یا لینن تو نہیں ہو سکتا۔ ہاں نظموں کے ذریعہ سے اپنے درد دل کا اظہار انہوں نے ہر تصنیف میں کیا ہے۔ چنانچہ بال جبریل میں تنگ آکر خدا سے پوچھتے ہیں:۔

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تیری منتظر روز مکافات

پہلی نظم بر صـ ۳۳۶

یہ نظم اسقدر دلکش ہے کہ شرح لکھکر اس کی معنویت کا خون کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ "کونسل ہال" کو سرمایہ داروں کے "تکیہ" سے تعبیر کرنا اقبال کی جودت طبع کی دلیل تو ہے ہی، لیکن اس سے اُن کی اُس نفرت کا اندازہ بھی ہو سکتا ہے جو ان کو مسلمان ہونے کی حیثیت سے، سرمایہ داروں سے تھی۔ بات یہ ہے کہ اسلام اور سرمایہ داری، اسی طرح ضدین ہیں جسطرح اسلام اور قوم پرستی یا اسلام اور کفر۔

واضح ہو کہ اقبال نے کونسل ہال کو سرمایہ داروں کے "تکیہ" سے اسلئے تعبیر کیا ہے کہ مغربی نظام جمہوریت میں اصلی طاقت بہرحال سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ کونسل میں جانے کے لئے ووٹ کی ضرورت ہے اور ووٹ کے لئے "نوٹ" درکار ہے۔ اور یہی حربہ ہے جسکی مدد سے سرمایہ دار ممبری کیا چیز ہے، دنیا کی ہر نعمت خرید سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس کی

مخالفت کرے تو وہ اسکو اسی دولت کے زور سے "غائب" کرا سکتا ہے۔ کسی کو پتہ نہیں چل سکتا کہ وہ آدمی کہاں چلا گیا۔ اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے لیکن مصلحتاً قلم روکتا ہوں۔

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز
ورنہ در محفل رنداں خبرے نیست کہ نیست

آخری نظم بر صفحہ ۳۳۶

اس قطعہ میں دو نام تشریح طلب ہیں (۱) امیر فیصل (۲) سنوسی۔

امیر فیصل، غدار شریف مکہ کا بیٹا تھا۔ اُسنے جنرل ایلنبی کے ساتھ ملکر ترکوں کے سینوں کو اپنی گولیوں سے چھلنی کیا اور انکی بربادی اور دمشق پر انگریزوں کے قبضہ کی خوشی میں اپنے گھر چراغاں کیا۔ مارچ ۱۹۲۰ء میں انگریزوں نے اسکو مذہب اور ملت دونوں سے غداری کے صلے میں شام کا بادشاہ نامزد فرمایا لیکن اپریل ۱۹۲۰ء میں لیگ آف نیشنز نے شام کو فرانس کے حوالے کر دیا اور فیصل کو جولائی میں وہاں سے نکلنا پڑا لیکن ۱۹۲۱ء میں خداوندان لندن نے اسکو عراق کا بادشاہ بنا دیا۔ ۱۹۳۳ء میں وفات پائی۔

سنوسی سے سید محمد ادریس السنوسی مراد ہیں جو طریقہ سنوسیہ کے شیخ تھے انھوں نے ۱۹۱۱ء میں طرابلس کی جنگ میں اطالیہ کا مقابلہ کرنے کے لئے غازی انور پاشا کے ساتھ ملکر اپنے مریدوں کی فوج مرتب کی تھی اور میدان جنگ میں خوب داد شجاعت دی تھی۔ طریقہ سنوسیہ کی بنیاد حضرت سید محمد بن علی نے ڈالی تھی جو الجیریا کے رہنے والے تھے۔ شمالی افریقہ کے اکثر مسلمان (مصر سے لیکر مراقش تک) اس تحریک میں شامل ہیں، اور قومی خدمات میں عام طور سے حصہ لیتے رہتے ہیں۔

مطلب | پہلا شعر:۔ اس شعر میں اگر "مسجد" سے اسلام مراد لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ سچے مسلمانوں نے تو بہت تھوڑی مدت میں اسلام کو دنیا میں پھیلا دیا۔ یعنی ہزاروں لاکھوں انسانوں کو مسلمان بنا دیا لیکن میری حالت یہ ہے کہ میں اپنے آپکو برسوں میں بھی مسلمان نہ بنا سکا۔

اگر مسجد سے واقعی مسجد مراد لی جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ ہمارے اسلاف کے دلوں میں الفت اسلام کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے راتوں رات مسجد بنا کر کھڑی کر دی لیکن وائے بر حال ما کہ ہم اس مسجد کو آباد بھی نکر سکے اور آج وہ مسجدیں نمازیوں کی صورت کو ترس رہی ہیں۔ واضح ہو کہ ہندوستان میں کئی ایسی مسجدیں میرے علم میں ہیں جنکو "ایمان کی حرارت والوں نے" بلا مبالغہ صرف ایک رات میں تعمیر کر دیا تھا مثلاً نگینہ ضلع بجنور (یوپی) میں ایک مسجد تھی اسکا نام تھا "مسجد کفر توڑ" جب میں ۱۹۰۵ء میں نگینہ گیا تو لوگوں سے اس کی وجہ تسمیہ دریافت کی جسپر بعض بڑے بوڑھوں نے مجھے بتایا کہ آج سے تیس چالیس سال پہلے، اس جگہ بعض مسلمانوں نے نماز کے لئے چبوترہ بنالیا تھا۔ برادران وطن نے بجنور جا کر حاکم ضلع یعنی کلکٹر سے شکایت کی اسنے کہا کہ میں خود آکر موقع کا معائنہ کرونگا جب مسلمانوں کو اس بات کا علم ہوا تو انھوں نے "شب بھر میں" مسجد بنا کر کھڑی کر دی۔ جب چند روز کے بعد کلکٹر آیا تو اسنے اسے برقرار رکھا۔

دوسرا شعر:۔ شیخ سنوسی نے امیر فیصل بن حسین غدار سے یہ کہا کہ نام و نسب کے لحاظ سے تو حجازی (مسلمان) ضرور ہے لیکن تیرے دل میں حجاز (اسلام) کی محبت مطلق نہیں ہے، ورنہ تو کافروں کا آلۂ کار نہ بنتا۔ اور دین و ملت کو نقصان عظیم نہ پہونچاتا۔

واضح ہو کہ شریف مکہ حسین غدار اور اس کے بیٹوں نے ملت اسلامیہ کو جو ضعف پہنچایا ہے، ابھی تک مسلمانوں نے اسکا اندازہ ہی نہیں کیا۔ تاریخ ملت اسلامیہ میں ان باپ بیٹوں کا نام میر جعفر اور میر صادق کے ساتھ ساتھ لکھا جائے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس بات کی قدرے وضاحت کر دوں۔ میں قبل ازیں لکھ چکا ہوں کہ سلطنت ترکی کا وجود ملت اسلامیہ کے سب سے بڑے دشمن یعنی برطانیہ کی نظروں میں خار بنکر کھٹکتا رہتا تھا۔ چنانچہ گلیڈسٹن نے ۱۸۸۳ء میں پارلیمان کے اجلاس میں یہ کہا تھا کہ جب تک دنیا میں ترکوں کا وجود باقی ہے نہ یورپ میں امن و امان قایم ہو سکتا ہے اور نہ تہذیب کو فروغ حاصل ہو سکتا ہے اس کی تہ میں یہ راز تھا کہ انگریز مشرق وسطی میں اپنا اقتدار قایم کرنا چاہتے تھے اور یہ بات ممکن نہیں ہو سکتی تھی جبتک سلطنت ترکی برقرار تھی، اسلئے ان کی دلی آرزو یہ تھی کہ کسی طرح اس عظیم الشان سلطنت کو، جو برباد ہو جانے کے بعد بھی تینوں براعظموں میں پھیلی ہوئی تھی، ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے۔ تاکہ مصریوں عربوں عراقیوں شامیوں اور تمام مشرق وسطی کو اپنا غلام بنایا جا سکے۔ اب ناظرین خود فیصلہ کرلیں کہ جو شخص، ملت کے دشمنوں کی اس ناپاک آرزو کی تکمیل میں ان کا آلۂ کار بنجائے وہ کتنا بڑا غدار اور دشمن اسلام ہوگا۔ یہ وجہ ہے کہ اقبال نے یہ مصرع سپرد قلم کیا ع تو نام و نسب کا حجازی ہے پر دل کا حجازی بن نہ سکا۔

تیسرا شعر:۔ چونکہ اس شعر میں سوز و گداز کی کیفیت پائی جاتی ہے اس لئے میں یا کوئی اور شخص لفظوں کے ذریعے اسکی تشریح نہیں کر سکتا۔ مطلب یہ ہے کہ رونے کا مزا جب ہے کہ آنسوؤں کے ساتھ جگر کا خون بھی شامل ہو جائے اور اسکی وجہ سے انکا رنگ ہلکا گلابی ہو جائے۔ یعنی اگر اسلام کی محبت کا دعویٰ کرتے ہو تو پھر خلوص (خون جگر) کا ثبوت دو محبت میں عاشق کو حقیقی لذت اس وقت حاصل ہو سکتی ہے۔ جب وہ اپنی محبت میں خلوص کا رنگ پیدا کرے۔ لیکن اس مطلب سے شعر کا لطف واضح نہیں ہو سکتا۔

چوتھا شعر:۔ کہتے ہیں کہ یوں تو میں بہت بڑا واعظ (ناصح) ہوں اور میری تقریر بہت دلکش ہوتی ہے لیکن افسوس کہ میں جو کچھ کہتا ہوں اسپر عمل نہیں کرتا۔ اس شعر میں اقبال نے اپنے زمانے کے واعظوں کی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے۔ لیکن ازراہ انکسار، انھوں نے اس عیب کو اپنی طرف منسوب کرلیا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مرحوم کی ساری زندگی کردار اور عمل کی مظہر تھی۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ عمل صرف جیل میں چکی پیسنے ہی کا نام نہیں ہے۔ جو شخص راتوں کی تنہائی میں قوم کی اصلاح اور بہبود کے لئے، خدا سے التجائیں کرے اور اپنے دل و دماغ کو قوم کے عروج کی تدبیریں سوچنے کے لئے وقف کر دے کوئی صاحب ہوش اسپر بے عملی کا الزام عائد نہیں کر سکتا۔

تمت بالخیر

باہتمام محمد یعقوب خاں لاہور آرٹ پریس میں چھپ کر شائع ہوئی۔